نقوش

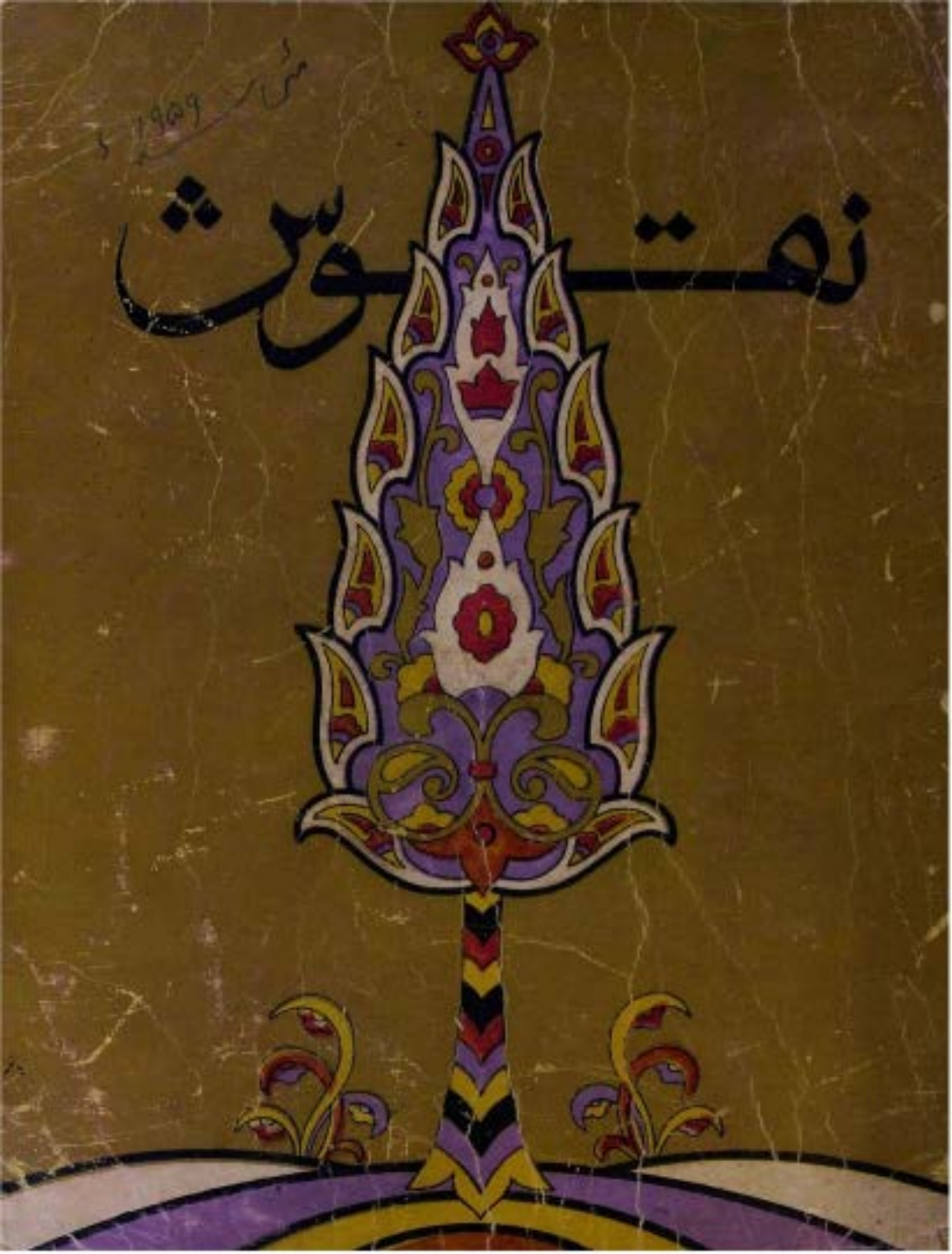

زندگی آموز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

رجسٹرڈ نمبر ۵۳۱۲

نقوش

ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵

۷۳ ۷۴

مئی ۱۹۵۹ء

(قیمت چار روپے)

ادارۂ فروغِ اردو لاہور

مدیر: محمد طفیل

ترتیب

طلوع — محمد طفیل، ۴

مضامین

۱ — شاہ نصیر دہلوی — ڈاکٹر محی الدین تاثیر، ۵
۲ — منطق الطیر — پروفیسر عبدالعلیم صارم، ۹
۳ — سودا کے ادبی معرکے — ڈاکٹر محمد حسن، ۲۲
۴ — میر حسن کی مثنوی گلزار — ڈاکٹر رحیمہ قریشی، ۳۹
۵ — عہد اکبری کا ایک کشمیری عالم — محمد عبداللہ قریشی، ۵۱
۶ — پچھیو کی ڈیا میرون — ڈاکٹر محمد حسن فاروقی، ۶۷
۷ — اردو میں خاکہ نگاری — نثار احمد فاروقی، ۷۴
۸ — داغ دہلوی — نکہت کاظمی، ۱۰۹
۹ — ۱۹۵۸ء کی اردو شاعری — ڈاکٹر وزیر آغا، ۱۲۱

نظمیں، غزلیں

۱ — یہ میکدہ ہے بزم جم نہیں ہے — جگر مرادآبادی، ۱۲۹
۲ — تعاقب — اثر لکھنوی، ۱۳۰
۳ — تیری محفل بھی مداوا نہیں تنہائی کا — احمد ندیم قاسمی، ۱۳۵
۴ — خاتمے کے معنے کا کیوں فریب کھاتے ہو — احمد ندیم قاسمی، ۱۳۶

۵ — یہ سخن روایت و نقل کے سہل امکانات سے کم نہیں — اختر انصاری ، ۱۳۷
۶ — قطعات — اختر انصاری ، ۱۳۸
۷ — اندیشہ ہائے دور و دراز — خلیل شفائی ، ۱۳۹
۸ — اس بستی کے اک کوچے میں — ابن انشا ، ۱۴۰
۹ — کوئے ملامت — مجید امجد ، ۱۴۲
۱۰ — جھوٹ نامہ — جگن ناتھ آزاد ، ۱۴۵
۱۱ — اور تو کیا اب امکاں ہوگا — حمید الماس حیرت ، ۱۴۸
۱۲ — حسن ہی حسن ہے ہستی میں رعنائی ہی رعنائی — میکش اکبر آبادی ، ۱۴۹
۱۳ — لب پر ہنسی جو آئی حیا اور بڑھ گئی — غلام ربانی تاباں ، ۱۵۰
۱۴ — تری سعی کرم بھی رائیگاں معلوم ہوتی ہے — پروفیسر شور ، ۱۵۱
۱۵ — خواب — سلام مچھلی شہری ، ۱۵۲
۱۶ — ہم چل تو پڑے ہیں جذبۂ دل جانے کہ خدا معلوم نہیں — اقبال صفی پوری ، ۱۵۳
۱۷ — اب کے آئی جو سری رو میں تو پامال رہی — خلیل الرحمٰن اعظمی ، ۱۵۴
۱۸ — کیا کہیں کیا دیکھ کر صحن چمن یاد آگیا — خالد صدیقی ، ۱۵۵
۱۹ — زخموں کا اک باغ ہے جس میں رونے کی تنہائی ہے — نور بجنوری ، ۱۵۶
۲۰ — متاع درد لی سوز جاوداں نہ ملا — عنایت علی شاعر ، ۱۵۷
۲۱ — اگرچہ سایہ فگن وحشت کے ہول رہے — رفعت سلطان ، ۱۵۸
۲۲ — اُن سے ملنے کی کوئی آس نہیں — رفعت سلطان ، ۱۵۹
۲۳ — چاندنی راتوں میں پیڑوں کا گھنیرا سایہ — شاذ تمکنت ، ۱۶۰
۲۴ — عشق و ہوس — فارغ بخاری ، ۱۶۱
۲۵ — رازِ دل جو تری محفل میں بھی افشا نہ ہوا — خاطر غزنوی ، ۱۶۲
۲۶ — بھروں کی بستی — منیر نیازی ، ۱۶۳
۲۷ — گئے ہوئے جب میں نے ترا نام لیا ہے — کوثر نیازی ، ۱۶۴
۲۸ — بہت قریب سے بھی فاصلے نظر آئے — جمیل ملک ، ۱۶۵
۲۹ — رنج رائیگاں — جلیل حشمی ، ۱۶۶
۳۰ — جوت کی کلیاں چٹکا دیتا ہے دل کے دھوئیں میں چاند — جلیل حشمی ، ۱۶۷
۳۱ — تو بھی خاموش ہے اے شمع شبستاں ہم بھی — بشیر احمد بشیر ، ۱۶۸

افسانے

۱ — خالی ہاتھ — ابوالفضل صدیقی ، ۱۹۹
۲ — بھتہ بھوچی — عصمت چغتائی ، ۲۰۰
۳ — جھوٹی زنجیر — حیات اللہ انصاری ، ۲۰۶
۴ — فاصلے — ہاجرہ مسرور ، ۲۱۹
۵ — رات ، چور اور چاند — بلونت سنگھ ، ۲۳۰
۶ — پیوند — خدیجہ مستور ، ۲۴۵
۷ — ویرانی گلیوں میں بارش — اے حمید ، ۲۵۵
۸ — کلیوں کی چکار — صادق حسین ، ۲۶۲
۹ — وقت کی آنکھ — آغا بابر ، ۲۷۸
۱۰ — بازگشت — واجدہ تبسم ، ۲۸۶
۱۱ — موت کا کنواں — احمد سعید ، ۳۰۲
۱۲ — بھیا جانی — احمد شریف ، ۳۱۰
۱۳ — شکست — نوید انجم ، ۳۱۶

فکاہی

۱۴ — یکمی احکام عشرہ — علی عباس حسینی ، ۳۲۵
۱۵ — ایک مناظرہ اور تین وعظ — ڈاکٹر غلام جیلانی برق ، ۳۲۹
۱۶ — میں یہاں اپنی شکست کی آواز — فرقت کاکوروی ، ۳۳۷

گذر گئے دن — منظور الٰہی ، ۳۴۳

تبصرے

ہمارے اُردو زبان و ادب کو ارتقاء
شرح دیوان غالب
خزینۂ معارف

محمد فضل مدیر، پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

حزہ نے نمبر کیا، اہل علم نے بھی بھرے دادِ دی۔ کاش خوب پہلے ہی جلد میں ایسی تم مجموعیت کی یہ مثالی کتاب کسی اور کو نصیب ہوتی ہوگی۔ نقوش کی ہر دلعزیزی پر ہمارا سر ہمیشہ ہی اللہ کی بارگاہ میں جھکا ہے۔

بعض دوستوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نقوش کے نمبروں نے اس کی "سالیت" کو ختم کر دیا ہے اور یہ رسالے کی صورت سے نکل کر کتاب بن گیا ہے۔ بات "یوں تو بہ ظاہر" خوبصورت کہی جاتی ہے۔ مگر وہ لوگ کبھی ہماری ترجمانی کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ رسالے کو مستقل کتاب کا روپ دینا نقوش کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

"دوستوں" کو یہ بھی دکھ ہے کہ اس کاوش کی نگاہوں سے کیوں اوجھل ہوتا ہے۔ ان میں بعض "دوست" تو وہ ہیں جن کی "شکایات" نقوش میں نہیں چھپتیں۔ بعض وہ "جو خود" رسالہ نکالتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایسے ہیں جو سورج کی روشنی میں اپنی آنکھیں بند کر کے یہ کہتے ہیں کہ سورج چڑھا ہی نہیں۔

ہم یہ اعتراض بھی سنتے ہیں کہ نقوش نے لوگوں کے ذہنوں کو بدل ڈالا ہے۔ اس لیے دوسرے پرچے بھی اس کی روش پر چلنے کے لیے مجبور ہو رہے ہیں۔ دیکھیے "سیکڑوں" پرچے اکیلے نقوش کو اپنے ٹوٹ پر نہ رکھ سکے۔ مگر اکیلے نقوش کی وجہ سے سیکڑوں پرچے اسی ٹوٹ پر نکلنا چاہتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ اب قاری زیادہ باہوش ہے۔ وہ لغویات کو پسند نہیں کرتا۔ اب تو وہی پرچے بچیں گے۔ جن میں کوئی نہ کوئی خاص بات ہوگی۔ آج اپنا اور قاری کا وقت "اب کا مال" لے کر ضائع کرنا "اب کی" کوئی خدمت نہیں۔

یہ بات بھی سننے میں آتی ہے کہ اب حاضر کی تخلیقات پر ہمارا زیادہ اصرار نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اقبال تو سیکڑوں پرچے اب حاضر ہی کی پیش کرتے ہیں۔ ہم زیادہ وضاحت نہ بھی دیں تو کیا موجودہ ادب ڈوب جائے گا؟ ہم جو کام کر رہے ہیں۔ وہ کسی اور کے بس کا نہیں رہا۔ اس لیے ہماری زیادہ تر توجہ ادب کے بنیادی مسئلوں پر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے ہر موضوع پر تاریخی دستاویزیں یکجا ہو جائیں۔ ایسے کام حکومتوں کے کرنے کے ہیں۔ یا اُن اداروں کے جنھیں حکومت لاکھوں روپیہ دیتی ہے۔ کوئی اس پر تو بھی سوسائٹی نہیں بنا سکتا۔ ہمارے "اب حاضر" کی ارتقائی نشوونما کے کبھی بھی خاتمہ نہیں ہے۔ ہم برابر تازہ واردانِ ادب بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ اگر کوئی اخبار رسالے ہر سال بھرتی کے نئے نئے افسانے، نظمیں، غزلیں اور مقالے (یہ لطائف، اقتباسات، اصطلاحات بھی) پیش کر دیتے ہیں تو وہ بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس باب میں بھی نقوش کا کوئی حریف نہیں۔ اب موجودہ دورِ عام شاہراہ ہی کو دیکھ لیجیے۔ کیا آج کل میں کسی دوسرے رسالے نے اپنا ایسا سالنامہ بھی پیش کیا ہے۔ ہم تو چپ ہیں۔ اس لیے کہ ذاتی مصلحتیں غیر فانی کاموں کے لیے ہمیشہ سدِ راہ ہی ہوتی ہیں۔

محمد طفیل

شاہ نصیر دہلوی

سید محی الدین قادری زور

جب نظام الملک آصف جاہ کو محمد محمد شاہ میں دکن کی سوبہ داری ملی اور انھوں نے اورنگ زیب کے مسلک اورنگ آباد کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا تو متعدد شاعر اور ادیب وہاں منتقل علاقوں سے آکر جمع ہو گئے۔ ان میں غلام علی بلگرامی، عبدالولی عزلت اور عادت الدین خان عاجز جیسے شاعر بھی شامل تھے، جن کے نام اور کلام آج بھی تاریخوں اور تذکروں میں اور خود ان کی محفوظ اور موجود کتابوں کے باعث روشن ہیں۔ انہی شعراء میں دہلی کے ایک بڑے شاعر شیخ محمد حفیظ تھے جو اورنگ آباد آکر راجہ مہیت رام کے دربار میں منسلک اور ممتاز رہے۔ یہ راجہ انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے تھے اور آزادی ہند کی جدوجہد کرنے والے سرفروشوں کے پیش رو تھے چنانچہ ان کا نام تاریخ آزادی ہند میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ انگریزوں کی سیاست نے ان کو ستیاناس نہ دیا اور ان کے متوسلین بھی پریشان حال اور منتشر ہو گئے۔ چنانچہ حفیظ دہلوی بھی اورنگ آباد چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے اور یہاں نواب ارسطو جاہ وزیر سلطنت کے دربار کے ان شعراء میں شامل ہو گئے جو دور دور سے آکر حیدرآباد میں جمع ہو گئے تھے۔

ارسطو جاہ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب مہاراجہ چندو لال شاہ ان کا نیر اقبال طلوع ہوا اور مہاراجہ نے ارباب کمال کی قدردانی شروع کی تو شیخ حفیظ دہلوی بھی ان کے یہاں باریاب ہوئے۔ مہاراجہ چندو لال نے حسب عادت ان کی بڑی قدر کی چنانچہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی۔ اور بعد کو ملک الشعراء کا خطاب بھی دلوا دیا۔

انھی شیخ حفیظ کی زندگی میں ان کے وطن کے ایک اور بڑے شاعر شاہ نصیر الدین بھی دکن آباد حیدرآباد آئے اور مہاراجہ چندو لال شاہ کے شاعروں میں اپنی گرجدار آواز اور مشکل زمینوں کی غزلوں کے باعث اپنی استادی کا سکہ بٹھا دیا۔ مگر چونکہ حفیظ دہلوی ملک الشعراء تھے اس لئے شاہ نصیر الدین حیدرآباد میں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر سکے۔ آخر کار ۱۲۴۶ھ جس میں بڑے ملک الشعراء نے وفات پائی اور مہاراجہ کو اپنے ایک جم پلہ استاد سخن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے سات ہزار روپیہ نقد بھیج کر شاہ نصیر کو طلب کیا۔

شاہ نصیر مہاراجہ کے حسب الطلب حیدرآباد آئے اور پچیس روپے روزانہ یعنی ساڑھے سات سو روپے ماہانہ ان کی گزر بسر کیلئے مہاراجہ نے مقرر کر دیئے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ حفیظ دہلوی کے برابر تنخواہ شاہ نصیر کو کیوں نہیں دی گئی اور ملک الشعراء کے خطاب سے بھی کیوں محروم رہے۔

شاہ نصیر دہلی کے ایک صوفی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سلیم پور قریب غازی آباد دہلی میں ۸ جمادی الاول کو ان کے بزرگوں کا عرس ہوتا تھا اور چند گاؤں دربار شاہی سے بطور معافی ان کے خاندان کی ملک تھے۔ ان کے والد شاہ غربت ایک عزلت نشین

فقیر تھے مگر زندگی امیرانہ بسر کرتے تھے اور شہر کے سواد شرفا ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے وہ خود باہر نہیں نکلتے تھے مگر ہزارہا معتقدین ان کے گھر جاکر ان سے استفادہ کرتے تھے۔ شاہ نصیر دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے لئے متعدد استاد اور ادب آموز رکھے گئے مگر شاہ نصیر ادیب و عالم و صوفی بننے کی جگہ شاعر بنے اور شاہ محمدی ظل سے اصلاح لینے لگے۔ چونکہ فطری ذوق تھا شعر و سخن کے میدان میں اتنے چمکے کہ فقر و درویشی اور تصوف و عرفان کی مسند چھوڑ کر مشاعروں اور درباروں میں اپنے کلام کا سکہ بٹھانے لگے۔

شاہ نصیر کے استاد مائل تیام الدین قائم کے شاگرد تھے اور قائم نے درد اور سودا سے اصلاح لی تھی۔ اس طرح نصیر کا سلسلہ درد اور سودا دونوں تک پہنچتا ہے۔ مگر یا تو طبیعت کی افتاد یا زمانہ کے مذاق نے ان کو سودا کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حالانکہ خاندان تصوف سے تعلق کے باعث ان کو درد کا رنگ اختیار کرنا چاہئے تھا مگر یہ رنگ اختیار کرتے تو شاید حیدرآباد ہی نہ آتے اور نہ لکھنؤ جاتے بلکہ درد کی طرح تمام عمر دہلی میں گزار دیتے۔

شاہ نصیر کو پہلے پہل بادشاہ دہلی شاہ عالم آفتاب کے دربار میں کلام سنانے کا موقعہ ملا اور وہاں ان کی ایسی قدر و منزلت ہوئی کہ شہر دہلی میں ان کے کلام کی دھوم پڑ گئی اور سیکڑوں لوگ ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کی فہرست طویل ہے مگر سرفہرست خانقاہی بند شیخ ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں مومن جیسے اعلیٰ پایہ کے شاعر موجود ہیں۔

بعد کو خود ذوق رتبۂ استادی پر پہنچ گئے اور شاہ نصیر کو اپنی قدردانی سخن کے لئے دوسرے دربار تلاش کرنے پڑے چنانچہ وہ کئی بار لکھنؤ اور حیدرآباد کے لئے نکلے اور خاطر خواہ شہرت اور عزت حاصل کی۔

شاہ نصیر حیدرآباد میں پہلی بار نواب اکبر علی خان آصف جاہ ثالث کے عہد میں ۱۲۴۰ ہجری کے قریب آئے اس وقت یہاں شیخ محمد حفیظ دہلوی کے علاوہ ایک اور بڑے شاعر جو شاہ نصیر کے شاگرد ہی تھے یعنی احمد علی خاں شہید دہلوی بھی موجود تھے۔ جو چند ہی سال قبل یعنی ۱۲۳۵ ہجری میں حیدرآباد آچکے تھے اور دربار سکندر جاہ میں باریاب تھے۔ اسی لئے مہاراجہ چندو لال خواہش کے باوجود شاید ان کو شاہی دربار میں روشناس نہ کر سکے۔ اس کے بعد اور ایک بار بھی شاہ نصیر حیدرآباد آئے تھے اور مہاراجہ ہی کے مہمان رہے۔ چنانچہ رات دن ان کی مصاحبت میں رہتے اور موقع بہ موقع مہاراجہ چندو لال ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتے تھے۔

جب ۱۲۴۲ ہجری میں شیخ حفیظ دہلوی فوت ہوئے اور ان سے قبل نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث بھی وفات پا چکے تھے اور چندو لال کی حکمت عملی کے باعث نواب ناصر الدولہ ریاست حیدرآباد کے مالک و مختار تھے اور چندو لال کا عروج انتہائے کمال کو پہنچ چکا تھا (چنانچہ خود یہ شہر چندو لال کا حیدرآباد کہلانے لگا تھا) ایسے وقت میں انھوں نے شاہ نصیر کو حیدرآباد بلا بھیجا مگر معلوم نہ ہو سکا کہ شاہ نصیر کو دربار نظام میں باریاب ہونے کا اس وقت بھی موقع دیا نہیں۔ ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عالم شہزادگی کے ندیم و مونس میر احمد علی خاں شہید دہلوی کا اس وقت دربار میں دخل تھا اس لئے امکان ہے کہ شاہ نصیر باریاب نہ ہو سکے ہوں مگر خود مہاراجہ چندو لال کا دربار کیا کم تھا۔ اور شعر فہمی و سخن سنجی اور انعام و اکرام کے لحاظ سے تو شاید پورے ہندوستان میں اس کی نظیر نہ تھی۔ تیس سو سے زیادہ شعرا ان کے یہاں ملازم تھے جن میں سے کسی کی

تنخواہ ماہانہ سو روپے سے کم نہ تھی۔ علما و حکما اور گرفتوں کے ارباب کمال ان کے علاوہ تھے۔ ماہوار کے علاوہ مہاراجہ چندولال کے بندل ونوال کے تحت اتنا انعام واکرام شاہانہ کو ملتا تھا کہ وہ حیدرآباد میں ایک بڑے مورونی امیر کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ حیدرآباد کے تمام امرا و عمائد و اعیان کی عزت کرتے تھے۔ اور مہاراجہ چندولال کی خوشنودی کی خاطر یہاں کے شعرا بھی انھی کے سلسلۂ تلامذہ میں منسلک ہوتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے شاگردوں کے مقابلہ میں حیدرآبادی تلامذہ کی تعداد دوچند بلکہ سہ چند ہو گئی تھی۔

شاہ نصیر کی طبیعت میں بڑی چستی و چالاکی تھی۔ بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی میں بے نظیر تھے۔ لکھنؤ کے مشاعروں میں ان پر رشک و حسد کے باعث بڑے بڑے طنز و اعتراض کئے جاتے تھے۔ مگر وہ اپنی طبیعت کی براقی کی وجہ سے فوراً منہ توڑ جواب دیتے تھے۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں اگرچہ ضعیف ہو گئے تھے مگر جوانوں جیسا ولولہ اور جوش باقی تھا۔ آواز اتنی بلند اور گرجدار تھی کہ پوری محفل پر چھا جاتے تھے۔ اور ان کی تھاہری وجاہت کی کمی کی تلافی ہو جاتی تھی۔ وہ سیاہ فام اور کشیدہ قامت تھے۔ مختصر سی ڈاڑھی رکھتے اور خوش پوشاکی اور خوش خوراکی اور مزاج کی لطافت و نزاکت کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کی سیاہ فامی اتنی پختہ تھی کہ بچپن ہی سے ان کا عرف میاں کلو مشہور ہو گیا تھا۔ حیدرآباد کی تاریخوں میں ان کو "بسیار کریہ منظر" لکھا گیا ہے۔

چونکہ خوش مزاج اور زندہ دل تھے اور گفتگو ایسے عمدہ انداز میں کرتے تھے کہ جس مجلس میں بیٹھتے بوڑھے اور جوان سب ان کی باتوں اور کلام سے لطف اندوز ہوتے اور نعرۂ تحسین و آفرین بلند کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مزاج میں سیر و تماشا اور چہل پہل اور شور و شغب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی میں ٹھہر نہیں سکے اور کئی بار لکھنؤ اور حیدرآباد کا سفر کیا۔ جہاں کہیں ہوتے وہاں کے میلوں۔ عرسوں اور تماشوں میں ضرور شرکت کرتے۔ اور اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جو شاہ نصیر کے شاگرد شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اپنے تذکرۂ آب حیات میں ان کے بڑے دلچسپ لطیفے لکھے ہیں۔ اور بدیہہ گوئی کی مثالیں بھی درج کی ہیں۔ چونکہ بسط موزوں طبع تھے اور ہر جگہ ان کو اپنی استادی اور پختگی کا رنگ جمانا پڑتا تھا۔ اس لئے مشکل زمینوں اور سخت ردیفوں میں غزلیں لکھتے تھے تاکہ لوگ مرعوب ہوں اور ان کو استاد مانیں۔ مگر یہ رجحان اتنا بڑھا کہ ان کا کلام رفتہ رفتہ پھول جھڑیوں اور دماکن کوپتاخوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ شعر و سخن کے لئے اصلیت سادگی اور سوز و گداز کی جتنی اور جیسی کچھ ضرورت ہے۔ اس سے شاہ نصیر کا زیادہ تر کلام محروم ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ اردو کے بلند پایہ شاعروں میں شمار نہیں کئے جاتے۔ حالانکہ بڑے دقیقہ سنج اور مشکل پسند شاعر تھے اور ان جیسی جودت طبع اور معنی آفرینی اردو کے شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ ترکیبوں کی چستی اور تشبیہوں اور استعاروں کے برجستہ اور مناسب استعمال کی وجہ سے ان کا کلام اپنی آپ نظیر ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے کلام کا مکمل مجموعہ محفوظ نہیں رہا اور نہ شائع ہو سکا۔ منتخب کلام کے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن سے ان کی صحیح عظمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بقول خود قریب ساٹھ سال مشق سخن کیا تھا۔ اور اپنی تمام عمر اسی فن کی خدمت میں گزار دی۔ آخر عمر میں تصوف اور بزرگان دین کی درگاہوں پر حاضری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ یہ دراصل ان کو وراثت میں ملا تھا مگر جدید زندگی کی خاطر پس منظر میں چلا گیا تھا۔ مرنے سے قبل انھوں نے درگاہ حضرت سید شاہ موسیٰ شاہ قادری میں اپنے لئے جگہ منتخب کر لی تھی۔ آخر کار ۱۲۵۴ ہجری میں وفات پائی اور اسی جگہ دفن ہوئے.....

مرورِ ایام کے ساتھ ان کے شاگرد بھی ختم ہوتے گئے اور حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی کے شاگردوں نے حیدرآباد کی ادبی دنیا پر تسلط جمالیا کہ لوگ شاہ نصیر کو اور ان کی آخری آرام گاہ تک کو بھول گئے۔ گزشتہ ربع صدی میں اہل علم و فضل حیدرآباد میں ان کی قبر ڈھونڈھتے ہوتے تھے مگر معلوم نہ تھا کہ کہاں دفن ہیں۔ آخرکار محمد حسینی علم کے قریب درگاہ حضرت سید شاہ موسیٰ قادری میں ان کی قبر کا پتہ چلا کر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے سنگ مرمر کا ایک کتبہ لگا دیا گیا ہے۔ جس پر ان کا نام و تاریخ وغیرہ درج ہے۔

معلوم یہ کتبہ بھی کب تک قائم ہے مگر کتبہ ہو یا قبر ایسی چیزیں ہی شاعر کا نام زندہ رکھنے اور اس کی یاد قائم رکھنے کے لئے ضروری نہیں۔ اس کا نام تو اس کا کلام زندہ رکھتا ہے اور شاہ نصیر کا کلام اردو تذکروں اور تاریخوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ البتہ حیدرآباد کی ادبی تاریخ اس امر پر ہمیشہ فخر کرے گی کہ شاہ نصیر نے مہاراجہ چندولال کی دریا دلی اور علم دوستی کے باعث اپنی عمر کے آخری دس سال اس شہر میں آرام و اطمینان اور عزت و آبرو کے ساتھ گزارے۔ جو چیز ان کو دہلی اور لکھنؤ میں نہ مل سکی اسکو چندولال نے حیدرآباد ہی میں فراہم کیا اور یہاں وہ اتنے آسودہ حال رہے کہ پھر اپنے وطن کا رخ نہ کیا۔

مغل باغات

پروفیسر علم الدین سالک

حسن اور جمال میں ایک قدرتی کشمکش ہے۔ اس مادی دنیا میں ہر چیز اس سے متاثر ہوتی ہے اور جو احساسات اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی علامت ضرور قرار دی جاتی ہے۔

ایرانی فطرتاً رنگین مزاج اور نفاست پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ ان جذبات و احساسات کو بیان کرنے کے لئے گل کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی ادب میں باغ سازی زندگی کا بھی چودہ (۱۴) طبق MANIATURE ہوتا ہے۔ ایرانی حسن و عشق کی تمام واردا تیں اسی کے توسط ادا کرتے ہیں۔

ایرانیوں نے باغ کا تصور جنت سے اخذ کیا ہے۔ چنانچہ وہ باغ تعمیر کرتے وقت اس کی ہیئت میں بہت حد تک اس کی پیروی کرتے ہیں۔ ایرانیوں کے اس تصور کی بدولت جہاں جہاں ایرانی تمدن پہنچا اور اثر انداز ہوا وہاں بہت سے تیوہار پھولوں کے نام پر منائے جانے لگے۔ ایران کے تیوہار مثلاً گل کوبی۔ گل افشانی۔ گل بازی اور عید گلابی وغیرہ اس نظریے کا بین ثبوت ہیں۔ ایران کا قومی تیوہار نوروز ہے۔ اس میں بھی پھول کثرت استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور جب تیموری ہندوستان آئے تو انھوں نے یہاں بھی اپنے قومی اور مقامی تیوہار منانے میں پھول استعمال کئے۔ چنانچہ کشمیر میں اب بھی پھولوں کے تین تیوہار ہر سال منائے جاتے ہیں۔ ہر تیموری امیر اور شہزادے کے گوشۂ دل میں چمن۔ باغ اور گل و گلزار کے لئے ایسی ہی شیفتگی اور کشش تھی جیسے ایرانیوں کے دل میں پائی جاتی تھی۔ ان کی زندگی کے لئے گل و گلزار کا ہونا لازمی تھا۔ اس دور میں فلسفۂ حیات کی ترجمانی کے لئے بھی گل اور عندلیب کا انتخاب کیا گیا اور انہیں کے ذریعے اسے نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ انھیں زندگی کا روح پرور پیغام عربوں نے دیا مگر عرب کے نخلستانوں کی گھنی چھاؤں جنھوں کے خارزاروں۔ عوار نجد کی خوشبو اور ناقۂ صحرائی کی جانفزائی کے بجائے باغ۔ بوستان۔ چمن۔ لالہ و گل۔ نرگس و سوسن کو اپنے مطالب کی ادائیگی کے لئے چنا۔ یہی چیزیں آج ایرانی زندگی اور ایرانی تمدن کی ترجمان ہیں۔ اور پھر جہاں جہاں ایرانی تمدن پہنچا اور جس جس قوم نے خوان عجم کی زلہ ربائی کی یہی چیزیں ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گئیں۔

ہندوستانی صنائع بدائع کے ماہر مسٹر ای۔ بی ہیول کا کہنا ہے کہ "ہندوستانی آرٹ میں تیموریوں کا سب سے زبردست اور خیر فانی کارنامہ چمن سازی اور گلشن آرائی ہے"۔

بابر متناظر قدرت کا بے حد دلدادہ تھا۔ وہ ہر چیز کی بہ جمیس و سیر سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اور اس رنگ و بو میں کھو کر اس کی حقیقی

روح تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ دلکش اور حسین مناظر اس کے دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچ لیتے اور اس کی روح انھیں دیکھ کر وجد میں آجاتی تھی۔ فرغانہ اس کا وطن تھا۔ قدرت نے اسے عجیب و غریب مناظر سے مالا مال کر رکھا تھا۔ وہ حسن و دلکشی کا مرقع تھا۔ اس کی فضا دل و دماغ پر ایک وجدانی کیفیت طاری کرتی تھی۔ اندجان کے خوبصورت باغ جن کی خوشبو، لالہ، گلاب اور دوسرے ہر قسم کے پھولوں سے لدے رہتے تھے۔ ہر خلوت پسند کے دل کو تسخیر کرنے کی ان کی نگاہوں میں بس جاتے تھے۔ سمرقند کا شہر اس وقت عروس البلاد تھا۔ بابر اس کے جنت نگاہ جلووں سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔

"در ربیع مسکون برابر سمرقند لطیف شہر کمتر است"

(توزک بابری)

یہ شہر حقیقت میں باغوں کا شہر تھا۔ وہاں قدم قدم پر باغ اور چپہ چپہ پر پانی کھلے ہوئے تھے۔ بابر کے اپنے زمانے میں یہ کیفیت تھی کہ:۔

"در زمانی سلطان احمد میرزا ہر تحویلدار کہ ہر باغ و باغچہ کہ می خواست می داد"

(توزک بابری)

وہ جب فرصت پہنچا اور وہاں کی بہار کی جلوہ آرائیوں سے متاثر ہوا تو یوں بولا تھا۔

"بہار او خوب می شود"

کل اس کے آخری زمانے کی سرگرمیوں کا مرکز کابل تھا۔ اس شہر کی فضا اور سواد بھی خوب ہے۔ اس لئے بابر کے ذوق سلیم اور حسن مذاق کے بعض بہترین مظاہر اسی شہر میں ملتے ہیں۔ اس کے بنائے ہوئے باغ جنوں "مجموعہ حسن اور حدیقہ جمال ہیں"۔ افغانستان کے کہساروں کی دلآویزی نے بابر کے دل پر گہرا نقش چھوڑا۔ وہ ان کو دیکھتا تھا۔ اور روحانی مسرت محسوس کرتا تھا۔ خود بابر کا علاقہ حسن و جمال کا مرقع تھا۔ قسم قسم کے پھول طرح طرح کے درخت اور گوناگوں مناظر اور پھر سبزہ کی کیا بیان اپنے اندر خاص کشش رکھتی تھی۔ بابر نے اسی مقام پر لالہ، ورد اور لالہ کی اور بہت سی نئیں دیکھیں۔ وہ نگار خانہ کے ان پھولوں کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی تسبیح میں رطب اللسان ہو گیا۔ یفتان کے باغوں اور اخواں زاروں نے بھی اس کے دل کو موہ لیا تھا۔

ان تمام خوبصورت مقامات کی سیر نے بابر کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ جہاں جاتا اسی قسم کے مناظر ڈھونڈتا اور جہاں اسے یہ چیزیں میسر نہ آتیں وہ تاسف اور حسرت کی تصویر بن جاتا۔ ہندوستان اس کی تاخت و تاراج کی جولاں گاہ ہے۔ وہ یہاں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا۔ یہاں بھی اس نے اسی قسم کے مناظر تلاش کئے۔ گو افغانستان کی سی رعنائی و زیبائی یہاں کہاں۔ اس نے خوبصورت باغ چنے مگر ہندوستان کا ذوق باغبانی اس کے معیار پر پورا نہ اترا۔ اسی لئے افسوس و حیرت کے جذبات بے اختیار اس کی زبان اور قلم سے نکل جاتے ہیں۔

بابر سے پہلے نہ یہاں کچھ ایسا جمالیاتی مذاق تھا نہ ذوق جس سے لطف اندوز ہونے کا ذوق رکھتا۔ یہاں کے باغ حسن و لطافت سے محروم تھے۔ علامہ ابوالفضل آئین اکبری میں کہتا ہے کہ "بابر کی آمد سے پہلے یہاں کے باغات کچھ ایسے اچھے نہ تھے اور ان میں تو کوئی بارہ دری ہوتی تھی جس میں آرام کیا جائے اور نہ آہستہ آہستہ چلنے والے نالے بہتے تھے"۔

بابر فطرت کی ہر خوبصورت شے کا عاشق تھا۔ وہ فطرت کو حقیقی رنگ میں دیکھنے کا متمنی تھا۔ اسے پھولوں سے بے حد محبت تھی

وہ جہاں کہیں انھیں دیکھتا ان کی ہر ہر ادا پر کچھ کچھ جاتا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دل میں اتر کر ان کے حسن و جمال کا اچھی طرح مطالعہ کرے چنانچہ ڈاکٹر بیلی پرساد کہتا ہے کہ "اس کی درشت مزاجی پھولوں کی لطافت و نزاکت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی۔ جن ایام میں وہ افغانستان کے کہساروں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس وقت بھی فطرت کے حسن و جمال کی خوشہ چینی کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔" چنانچہ غور بند کے چمنی زاروں میں اس نے کم و بیش تیس قسم کے لالہ کا سراغ لگایا۔ وہ ایک خاص قسم کے لالہ کی خوشبو سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔

"نوعے است از لالہ کہ الوان بوئے گل سرخ می آید۔ من آں لالہ را گل بہ لئے خطاب دادم و بہ ہیں شہرت یافت۔"

(تزک بابری)

باغ و فا اور چشمہ سر اصحاب اس کی دلچسپ سیر گاہیں تھیں۔ وہ بلند مقامات پر بیٹھتا اور وہاں سے دریاؤں کے بہتے نہروں کے چلنے، آبشاروں کے گرنے اور باغوں کے حسن کا نظارہ کرتا اور پھر خوب مزے لے لے کر اپنے روزنامچہ میں ان کا ذکر کرتا۔

جب اس نے آگرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو یہاں بھی اپنے تمان کی تسکین کے لئے چار باغ تعمیر کرایا جسے آج کل رام باغ کہتے ہیں۔ یہ باغ جمنا کے کنارے واقع ہے اور تیموریوں کے ذوق مے سازی کا ہندوستان میں پہلا نمونہ ہے۔ اس باغ میں اس کے شہ نشین، حمام۔ حوض۔ پانی کے چھرنے اور نہریں ہوا کیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں اس باغ کا ذکر بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔

بابر کی تقلید میں اس کے امیروں نے بھی کئی کئی باغ بنانے لگوائے۔ خود بابر نے باغ ہشت بہشت اور زہرہ باغ تعمیر کرائے۔ ان کے پکے پکے نشانات آج بھی آگرہ میں پائے جاتے ہیں۔

ہمایوں کی طبیعت اختراع پسند تھی، اس میں ایجاد و اختراع کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مگر اس کی طبیعت کا میلان الف لیلیٰ کی طرح تجوم، ہندسہ اور ریاضی کی طرف تھا۔ اسے ہندوستان کے سیاسی حالات نے آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ دشت نوردی اور جلاوطنی میں بسر ہوا۔ اس لئے وہ فطرت پسندی کے جوہر کا مظاہر کہیں نہ کر سکا۔ البتہ اس کے چھوٹے بھائی ہیرزا کامران کے دو باغوں سے جو اس نے لاہور میں لگوائے تھے ثابت ہوتا ہے کہ کامران کو اپنے اولوالعزم باپ کی طرح مناظر قدرت سے دلی لگاؤ تھا۔

اکبر اعظم درحقیقت سلطنت تیموریہ کا بانی ہے۔ اس نے حقیقی معنوں میں وہ تہذیب یہاں رائج کی جس پر آج برصغیر پاک ہند ناز کر رہا ہے۔ لاہور اور کشمیر میں اس نے کئی باغ لگوائے ہیں جن کے اب فقط نام باقی رہ گئے ہیں۔

جہانگیر بابر کی طرح شاعر، ادب پرور، نقاد، فنون لطیفہ کا دلدادہ باغوں اور گلزاروں کو والہانہ عشق رکھتا تھا۔ اس کی توزک اس دعوے پر گواہ ہے۔ وہ جہاں کوئی حسین وجمیل منظر دیکھتا اس کا قلم ایک چابک دست اور ماہر مصور کے موقلم کی طرح اس کی تصویر کھینچ کے رکھ دیتا۔ حسن ابدال کے مناظر، کشمیر کی باغ و بہار۔ کابل کے دلفریب نظارے اس کی بادشاہت ادب اور آرٹ کے زندہ جاوید شاہکار بن گئے ہیں۔ کشمیر کا شالامار اور ویری ناگ۔ کابل کا باغ نشاط۔ لاہور کا باغ دل افروز اس کا بنوایا ہوا ہے۔

شاہجہاں جہانگیر کا بیٹا تھا۔ وہ عمارات کا دلدادہ تھا مگر مناظر فطرت سے اسے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا جہانگیر کو۔ اس نے لاہور میں شالامار اور آگرہ میں، دھول پور، گنج لہ خانی یا گوالیار، چھوڑیں، کشمیر اور دہلی میں بھی اس نے کئی باغ لگوائے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں اس فن کو چنداں فروغ حاصل نہ ہوا مگر اورنگ زیب آخر تیمور کی نسل سے تھا۔ اس نے باغات کا شوق اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونا کیا بلکہ ورثہ میں پایا تھا۔ احمد آباد میں اس نے ایک لاثانی باغ گلزار رابع دورانی کے روضہ کی صورت میں چھوڑی ہے۔ اس کے خطوط میں بھی اکثر گل و گلزار کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ باغات کا زبردست مبصر تھا۔ اس کے رقعات سے اگر دو چھٹے رنگ کر کے بھیجا کر لئے جائیں تو مناظر قدرت کا ایک حسین مجموعہ ترتیب تیار ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ چمن بندی، گلشن کاری، اور باغ سازی کا مذاق بابر کے ساتھ ہندوستان میں آیا۔ اور اس کے جانشینوں نے اسے معراج کمال تک پہنچایا۔ بابر کے زمانے میں ایران و ترکستان میں اس فن کا شباب تھا۔ ہندوستان میں یہ نہ ہونے کے برابر تھا چنانچہ ہندوستان تیموریوں کی بدولت ایرانی اور ترکستانی تمدن سے پہلی مرتبہ آشنا ہوا۔ یہ علاقے فطرت کی دلفریبیوں سے مالا مال اور قدرت کی سحر کاریوں سے ہر وقت حسین مجسم بنے رہتے تھے۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑ، بلور کی طرح چمکتے ہوئے چشمے۔ بہتے ہوئے ندی نالے۔ سلک بوس ہرے بھرے درخت۔ رنگ رنگ کے پھول ان علاقوں کو جنت ارضی بنائے ہوئے تھے۔ ہندوستان بھی قدرت کی فیاضیوں سے کچھ کم مالا مال نہیں۔ بالخصوص کشمیر اپنے اندر جو کشش اور دلفریبی رکھتا ہے وہ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں مگر یہاں کی تساہلت پسند طبیعتوں نے ان سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھایا۔ اس لئے یہاں چمن سازی میں کوئی نمایاں بات نظر نہیں آتی۔

جب مسلمان وسط ایشیا اور ایران سے یہاں آئے تو انھیں اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لئے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ انھوں نے اپنے مذاق کے بموجب اس ملک کو ڈھالنا شروع کیا۔ ابتدا میں یہاں کی آب و ہوا اور سطح زمین کی ساخت نے حوصلہ شکن حالات پیدا کئے۔ مگر مسلمان ہمت کے دھنی تھے۔ انھوں نے استقلال کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ آخر کار انھوں نے یہاں کے حالات پر پورا پورا قابو پا لیا۔

نخل بندی، چمن سازی۔ باغبانی اور زراعت مستقل پیشہ تھے۔ مسلمان ان میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ انھی کی بدولت انھوں نے ایران اور ترکستان کو حسن و جمال کا سرچشمہ بنا دیا تھا۔ وہ جب ہندوستان آئے تو اس شوق کو بھی ساتھ لائے۔ اور انھوں نے اپنے اس مذاق کو اس ملک کی آب و ہوا اور رسم و رواج کے بموجب ڈھال کر خوب ہی ترقی دی۔ قابل اور چابک دست نخل بند اور باغبان بیرونی ممالک سے بلائے۔ ان کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ انھیں انعام و اکرام عطا کئے۔ حوصلہ افزائی اور قدردانی دیکھ کر انھوں نے اس میں عجیب و غریب اختراعات کیں اور دلآویزی کے نئے نئے سامان پیدا کئے۔ حتیٰ کہ ہندوستان حقیقی معنوں میں جنت نشان بن گیا۔

اب ہندوستان مسلمانوں کا وطن تھا، وہ اسے پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ یہ ملک دنیا کی نگاہوں میں سب سے زیادہ حسین و باوقار نظر آئے۔ اس کی عظمت و شوکت سے تمام دنیا مرعوب ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کی توجہ سے ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز بن گیا۔ باغات ہندوستان میں پہلے سے موجود تھے مگر ایسے نہ تھے کہ دلوں کو مسحور کر لیں یا نگاہوں میں سما جائیں، یہی وجہ ہے کہ بابر کے لطیف جمالیاتی مذاق پر پورے نہ اترے اور وہ بار بار شکایت کرتا ہے کہ یہاں اچھے باغ نہیں۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ یہاں کے لوگ باغ لگانا نہیں جانتے تھے بلکہ یہ کہ یہاں کے باغوں میں فرغانہ، سمرقند، بخارا اور کابل کے باغوں کی سی نفاست اور رعنائی نہیں پائی جاتی تھی۔

تیموریوں کے اس شوق نے ہندوستان کو بے حد فروغ دیا۔ انھوں نے سمرقند۔ بخارا۔ بدخشاں۔ کابل۔ قندھار اور ایران سے بہت سے پھلدار درخت۔ قسم قسم کے پھول۔ رنگ رنگ کے خوبصورت اور نازک پھول۔ طرح طرح کے پودے منگوائے اور ان کی یہاں پرورش کی۔ جن کی بدولت ہندوستان تھوڑے ہی عرصہ میں رشک گلزار ارم بن گیا۔ چنانچہ ابوالفضل کہتا ہے:۔

"گلہائے ایرانی و تورانی از گل سرخ۔ نرگس۔ بنفشہ دیاسمین کبود۔ سوسن۔ یمان درعاز نریا شقائق و تاج خروس۔ تلغہ و نافرمان و غطی و حبزآں بسیا شود۔

(آئین اکبری۔ جلد اول آئین بستم)

ہندوستان میں تخم اور پیوند لگانے کا رواج نہ تھا۔ تیموریوں کے وقت میں محمد قلی افشار کشمیر کے باغات کا داروغہ تھا۔ اس کی جدت پسند طبیعت نے کابل سے شاہ آلو منگوا کر پیوند لگایا۔ اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ پھر ملک میں یہ رواج عام ہو گیا۔ چنانچہ خوافی خان ۱۰۴۹ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

"پیوند دادن اشجار میوہ دار در کشمیر تمام ہندوستان محمد قلی افشار داروغہ باغات کشمیر در عہد عرش آشیانی اول خیال شاہ آلو از کابل طلبیدہ پیوند نمودہ بآب و ہوائے آنجا موافق آمدازاں ایام۔ رواج یافت و سال بسال در ہمہ بلاد ہندوستان ازیں پیوند میوہائے شاداب و شیریں بالیدن گرویدند۔"

(منتخب اللباب خوافی خان جلد اول ص۳۴۳)

تیموریوں کے وقت میں صندل کا درخت عام طور پر باغوں میں لگایا جاتا تھا۔ پستہ کی کاشت اکبر کے دور حکومت میں ہوئی۔ اور وہ خوب بارآور ہوا۔ اسی طرح بادام سرہند وغیرہ کے علاقوں میں بکثرت پیدا ہوئے۔ علامہ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے:۔

"ہم چناں تربزر شفتالو و بادام و پستہ و انار و حبزآں پیدا می گرفت۔"

جہانگیر توزک میں انگور اور دوسرے میووں کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے:۔

"در ایام دولت حضرت عرش آشیانی اکثر میوہائے ولایت کہ در ہندنہ بود بہم رسید۔ انگور بیصاحبی و حبشی و کشمشی و رشہ بائے مقررہ شائع گشت۔ چنانچہ در بازارہائے لاہور در موسم انگور عام مقدار کہ خواہند از ہر قسم ہر جنس بہم می رسد۔"

(توزک جہانگیری ص۳۰)

انناس فرنگستان کی بندرگاہوں میں بکثرت ہوتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں ہندوستان میں اس کی کاشت شروع ہوئی۔ جہانگیر کہتا ہے کہ آگرہ کے باغ گل افشاں میں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں میسر آتا ہے۔ اسی طرح انار بہت سے درخت بھی ولایت سے لاکر یہاں بوئے گئے۔ جہانگیر کہتا ہے:۔

"از درختان سرو صنوبر و چنار و سپیدار و بید مولا کہ ہرگز در ہندوستان نہال

ذکرہ بلوط بہم رسیدہ بسیار شدہ است۔ وہ وخلت صندل کہ خاصۂ جزائر بود در باغات نشو و نما یافت۔"

(تزک جہانگیری صفحہ)

اسی طرح سیب۔ ناشپاتی۔ بہی اور بیسیوں قسم کے پھل لگوائے گئے۔ تیموریوں کے وقت میں صرف کشمیر میں بیسیوں قسم کا سیب پیدا ہوتا تھا۔ آم ہندوستان کا میوہ ہے۔ مگر تیموریوں کی توجہ سے سینکڑوں قسم کا آم یہاں پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

ملتان میں بہترین قسم کا بیدانہ انار پیدا ہوتا تھا جو جلال آباد کے اعلیٰ قسم کے انار کا مقابلہ کرتا تھا۔ عالمگیر اپنے مکاتیب میں لکھتا ہے:۔

"انار بیدانۂ ملتان کہ کم ترین مریدان بارگاہ سلاطین پناہ ارسال می دارند بہتر از انار جلال آباد است۔"

(مکاتیب عالمگیر صفحہ)

اسی طرح تھٹہ کے خربوزے۔ کابل کے خربوزہ کا مقابلہ کرتے تھے۔ عالمگیر لکھتا ہے:۔

"خربوزہ تھٹہ کہ بہ خربوزۂ کابل نزدیک است۔"

بہر نوع تیموریوں نے جس علاقے میں جس بات کی صلاحیت دیکھی اسے خوب ترقی دی۔ کشمیر پھل اور پھولوں کا گھر تھا اسے بھی تیموریوں نے خوب فروغ دیا۔ ملا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"کشمیر کے بعض پھل ولایت سے بہتر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک گیلاس ہے جو سماس اور باجہ گی میں کابل کے شاہ آلو سے بہتر ہوتا ہے۔ سیب بڑا ہوتا اور رنگین ہوتا ہے۔ ناشپاتی اس حد تک نازک اور سیراب ہوتی ہے کہ بھمبر تک نہیں پہنچ سکتی۔ خربوزہ اگر خراب نہ ہو تو کابل کے خربوزہ جیسا ہوتا ہے۔ ترمز بہت بڑا اور میٹھا ہوتا ہے شفتالو لطافت و نزاکت میں کابل کے شفتالو کی طرح ہوتا ہے۔ مختلف قسم کے زردآلو بڑی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ گمان ہے کابل کا سفید چرا اور میرزائی بہتر ہوتے ہیں؟ توت بیدانہ بڑی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر کابل کے پیدانے کے برابر نہیں ہوتا۔ انار پیدا ہوتا ہے مگر کچھ ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ بادام اور پستہ بھی ہوتا ہے۔ اخروٹ جس کثرت سے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ کسی اور مقام پر اتنی بڑی تعداد میں پیدا نہیں ہوتے۔ اخروٹ کا تیل نچوڑ کر جلایا جاتا ہے۔ یہاں کی سرطوب آب و ہوا میں الکوبیہ نہیں ہوتا۔ بادشاہ کے حضور میں بعض پھل پیش ہوئے جن میں شاہ آلو کا وزن ایک مثقال سیب ساڑھے مثقال اور زردآلو آٹھ مثقال تھا۔"

(بادشاہ نامہ جلد اول۔ حصہ دوم)

پھولوں میں، پھلانا صاحب نوع پیدا کیا گیا، چنانچہ بعض پھولوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوند لگا کر ان میں مختلف رنگ پیدا کئے گئے۔ شفتالو گل یاسمین کئی رنگ کا ہوتا تھا۔ مگر سفید اور نیلا بکثرت باغوں میں ملتا تھا۔ گل سرخ کئی قسم کا ہوتا تھا۔ سوسن دو قسم کی تھی۔ عام باغوں میں اس کے پھول بڑے بڑے اور سبز رنگ کے ہوتے تھے۔ البتہ صحرائی سوسن کا رنگ نیلا ہوتا تھا۔ مگر اس کی خوشبو اس سے زیادہ تیز ہوتی تھی۔ شاہجہاں ایک مرتبہ کشمیر میں باغ فرح بخش کی سیر کے لئے نکلا تو باغ میں گل سرخ کا ایک بڑا نظر آیا جس پر پھول اور غنچے بکثرت موجود تھے۔ گنتے پر معلوم ہوا کہ چار ہزار پھول اور غنچے ہیں۔ دوسرے دن دولت خانہ کے باغیچہ میں سوسن کا ایک پودا نظر آیا جس میں دو سو بارہ کھلے اور ان کھلے پھول موجود تھے۔ علامہ حمید کہتا ہے:۔

"بیست و نہم ذی الحجہ ۵۰ھ در اثنائے سیر فرح بخش بوتہ گل سرخ بنظر اقدس درآمد کہ چار ہزار و پانصد گل و غنچہ داشت۔ روز دیگر باغچہ دولت خانہ بوتہ سوسن دیدند کہ گلہائے شگفتہ و ناشگفتہ آں دو صد و دوازدہ بر شمار آمد۔"

(بادشاہ نامہ جلد دوم)

ملا محمد صالح کا بیان ہے:۔

"مدتے در ہنگامہ اقامت چوں کشتی سوار بسیر باغ فیض بخش و فرح بخش تشریف برند بوتہ گل سرخ بنظر مبارک درآمد کہ چار ہزار و پانصد گل و غنچہ داشت بروز دیگر بوتہ سوسنی بدولت خانہ دیدند کہ گلہائے شگفتہ و ناشگفتہ آں دو صد و دوازدہ بود۔"

(عمل صالح۔ جلد دوم صفحہ ۳۱۹)

کشمیر ہندوستان کا بے نظیر خطہ ہے۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لے کر اسے طرح طرح کی رعنائیوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اس کا ہر منظر فردوس نظر اور جنت نگاہ ہے۔ اس کے حسین مناظر، دلکش فضائیں اور نظر فریب آبشاریں اس وقت تک بیگانہ، سادہ اور جوبن سے بے خبر تھیں۔ جب تک یہ علاقہ تیموریوں کے قبضہ میں نہ آیا۔ انھوں نے اسے دنیا کا بہشت اور کائنات کا حسین ترین مقام بنا دیا۔

کشمیر کی جمالیاتی ترقی کا معراج شاہجہاں کا زمانہ تھا۔ اس نے وہاں باغات لگوائے۔ پر شوکت عمارتیں بنوائیں اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ آج وہاں کا ذرہ ذرہ زبان بے زبانی سے اس کی شوکت و عظمت کی داستان اور جاہ و جلال کا افسانہ سنا رہا ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں۔ دل محسوس کرتا ہے مگر زبان بیان سے قاصر ہے۔ کیا کہے اور کیا بتائے جس طرح کوئی کامل فن مشاق ایک حسین و جمیل دوشیزہ کا بناؤ سنگار کر کے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ اسی طرح شاہجہاں نے کشمیر کی نظر فریب وادی کو آراستہ و پیراستہ کر کے بہشت نگار خانہ بنا دیا۔

شاہجہاں حقیقی معنوں میں باغوں کا زبردست معمار ہے۔ اس کے لگائے ہوئے باغ اگرچہ آج اپنی اصلی عظمت اور خوبصورتی کھو چکے ہیں پھر بھی سیاحان عالم سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ تھکے ماندے وارفتہ، کلفت زدہ دل وہاں جا کر سکون پاتے ہیں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کچھ عرصہ کے لئے دنیا کے مکروہات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر ان باغوں میں ایسی کونسی خوبی ہے کہ دیکھنے والا ان کی فضا میں اپنے آپ کو کھویا ہوا پاتا ہے۔ اس سوال کا جواب کوئی مشکل نہیں ہے تیموریوں کے

باغوں کی خصوصیات جان لینے کے بعد ان کی قوت تسخیر خود بخود معدوم ہو جاتی ہے۔

فصیل بندی تیموری باغ کے لئے نہایت لازمی ہے۔ ایران و ترکستان میں تمام باغوں کے گرد معمولی چار دیواری ہوتی تھی۔ اس کے بغیر کوئی باغ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر تیموریوں کی جدت پسندی نے اس میں بھی بہت کچھ اضافہ کیا۔ انھوں نے چار دیواری کو مستحکم فصیل سے بدل دیا۔ یہ عموماً مستطیل خوبصورت اینٹوں سے بنائی جاتی تھی اور اسی کو زیادہ مضبوط کرنے کے لئے اس پر سرخ یا سفید چونے کا پلستر کر دیا جاتا تھا۔ وہ اسی پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کے چاروں کونوں پر ہشت پہلو یا مثمن برج بنا کر اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگا دیتے تھے۔ ان برجوں کے اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں اور بیٹھنے کے لئے جگہ بنا دی جاتی تھی۔ دیوار کے ایک سرے سے لے کر آخر تک مضبوط کنگرے لگا دیے جاتے تھے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ فصیل کی شکل صورت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب فصیل میں عظیم الشان دروازے بھی تعمیر ہونے لگے۔ یہ دروازے تو ہوتے تھے، اور ان میں طرح طرح کے نقش و نگار بھی کئے جاتے تھے، یہ نقش و نگار نہایت خوبصورت، نفیس اور دلکش ہوتے تھے۔ امتداد زمانہ کے باوجود یہ اینٹ اپنی تابانی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور دیکھنے والوں کو اپنے حسن و دلآویز سے اب بھی مسحور کر لیتے ہیں۔

باغ میں داخل ہونے کے لئے ایک بہت بڑا پھاٹک ہوتا تھا جس کے ساتھ عام طور پر نقار خانہ اور ایک پہلو میں حمام اور دوسرے پہلو میں شاہی نشیمن یا خواب گاہیں ہوتی تھیں۔ ان کی عظمت بنانے والوں کے جاہ و جلال اور قدرت و جبروت کا پتہ دیتی ہے۔ اکثر اور بیشتر جن کی تعمیر میں سنگ سرخ استعمال کیا جاتا تھا، نفیس جالی دار پنجرے اس کی شان کو دوبالا کر دیتے تھے۔ دروازے سے داخل ہونے کے بعد باغ کا نظارہ اتنا موثر نہیں دیتا کہ آپ باغ کی خاموش دیواروں یا عظمت دروازے سے ان کے بنانے والوں کی سطوت و جبروت کے افسانے سن سکیں۔ وہ تمام ذوق نظارہ کو اپنی طرف جذب کرے گا اور ایک عجیب شان و عظمت کے ساتھ آپ کو دعوت نظر دے گا۔ آپ اس کی فضا سے اپنے قلب میں سرور اور سکون محسوس کریں گے۔ مگر اس کے ساتھ ہی دل مرعوب ہوتا ہوا چلا جائے گا۔ نگاہیں سراپا حیرت بن جائیں گی، وہ دیکھیں گی اور پھر دیکھنے کی کوشش کریں گی۔ ان کی کلفت اور کسل مندی آن کی آن میں دور ہو جائے گی۔

کشمیر میں تیموریوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ شاہی باغوں کا پس منظر نہایت مناسب اور موزوں ہو۔ اس کے لئے وہ اپنے تمام جمالیاتی ذوق کو صرف کرتے، اور کوئی ایسا پس منظر تراش کرتے جس کا جواب اس سارے علاقے میں نہ ہو سکے۔ ڈل کے کنارے کنارے انھوں نے جتنے باغ بنوائے، ان سب کا پس منظر پہاڑوں کا سلسلہ ہی لاتعداد ہے۔ جن کا دامن ہرے بھرے درختوں کے جنگلوں سے اٹا ہوا ہوتا ہے۔ جن کی چوٹیاں سال کا اکثر حصہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ دامن کوہ میں وہ بہتر سے بہتر موقعہ تلاش کرتے اور اسے اس طرح سے تراشتے کہ خود بخود زینوں کی صورت پیدا ہوتی چلی جاتی، ہر زینہ کافی کشادہ، وسیع، فراخ اور طویل ہوتا تھا۔ اس پر خاص وضع سے چمن بندی کی جاتی، طرح طرح کے پھول لگائے جاتے۔ پھر ان مختلف رنگ اور مختلف قسم کے ہوتے۔ ان کی ترتیب بے حد حسین و جمیل ہوتی، انھیں خاص قرینے اور سلیقے سے آراستہ کیا جاتا۔ پھولوں کی کیاریاں بنائی جاتیں، اور میدان میں سبزہ زار اور گرد و درخت۔ غرضیکہ کچھ اس قسم کا منظر پیدا کیا جاتا کہ اگر نگاہیں ہٹنا چاہیں تو ہٹ نہ سکیں۔ توجہ خود بخود جذب ہوتی چلی جائے۔ دور سے دیکھا جائے تو ایسا نظر آئے کہ پہاڑ پر اس کی چوٹی سے لے کر دامن تک چمن زار کے زینے بنا دیے گئے ہیں، ان چمن زاروں

میں بہتے ہوئے پانی کی چادریں کچھ عجیب بہار دیتی تھیں۔ پانی چھوٹی چھوٹی نہروں کی صورت میں باغ کے ہر حصے سے گزرتا تھا۔ بعض معین مقامات پر یہ نہر چار پانچ گز چوڑی ہوتی، اس کا فرش ماربل پلیٹ سے ڈھکا ہوتا۔ پانی سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے بہتا ہوا نیچے گرتا۔ ہوا، پانی کی شعاعوں اور چاندنی کی کرنوں سے فضا میں عجیب دلفریبی پیدا کرتا۔ جب یہ نہریں چادر کی صورت میں بلندی سے نشیب کی طرف جاتیں تو اس طرح نظر آتا۔ گویا سبز مخمل کے فرش پر صاف اور شفاف پانی کی سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔

تیموری باغ بنانے سے پہلے پانی کا بندوبست کرتے۔ جس جگہ قدرتی چشمے، ندی نالے یا دریا میسر نہ آتے وہاں وہ کنوئیں کھدواتے یا کسی اور موزوں طریقے سے پانی کا بندوبست کرتے تھے۔ پانی کی بہم رسانی کے متعلق مسلمانوں نے بحیثیت قوم خاص غور و فکر کیا اور اس پر انھوں نے کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں آج بھی دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں، جن سے پانی کو پستی سے بلندی کی جانب لے جانے۔ پانی کا توازن قائم کرنے۔ پانی کی چرخی، پانی کی کل، سرد و گرم آبہ کے متعلق تفصیلات مل سکتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے کسی علاقے میں چلے جائیے۔ جہاں کہیں مسلمان نے اپنا قدم رکھا وہاں اس نے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کو جب جنگ و جدل سے فرصت ملی تو انھوں نے صنعت گری کو ترقی دی۔ چنانچہ انھوں نے تکیے بنوائے، عمدہ عمدہ تعمیر کئے، مقبرے بنوائے اور باغات لگوائے۔ ان سب میں پانی کی بہم رسانی کا انتظام موجود ہے۔ باغوں میں انھوں نے اس پانی کی بدولت ایک روح پرور سماں پیدا کیا، باغوں میں بہتی ہوئی نہریں، آبشاریں، حجرے، فوارے وغیرہ ان کے اس ذوق کو پورا پورا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ آگرہ۔ لاہور۔ دہلی، خیبر، سیکری، دکن اور سب سے بڑھ کر کشمیر کے تمام باغوں کو دیکھئے۔ وہاں تمام تیموری باغوں کا جزو، یا تو قدرتی یا مصنوعی چشمے یا قدرتی پانی کے چشمے ہوں گے جس سے باغوں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اس کا حسن معراج کمال پر پہنچ گیا ہے، اتھاہ بند میں نہریں آسانی سے بن سکتی تھیں، اس لئے انھوں نے اس سے کافی کام لیا ہے۔ جہاں نہروں کو بنانا مشکل تھا وہاں تیموریوں نے پانی کی چرخیاں لگا کر مصنوعی چشمے جاری کئے، اور اس طرح اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کی۔

باغ میں پانی کئی طریقوں سے لایا جاتا، دریاؤں سے نہریں کاٹی جاتیں، اس سے جہاں زراعت کو ترقی ہوتی وہاں باغات کی شادابی کے لئے بھی پانی بافراط میسر آجاتا۔ باغ میں داخل ہونے پر نہر سے چھوٹی چھوٹی نالیاں کاٹ کر ان کا جال باغ کے چاروں طرف بچھا دیا جاتا۔ اس طرح باغ کا کوئی گوشہ پانی سے محروم نہ رہتا۔

پہاڑی علاقوں میں جہاں قدرتی چشمے موجود ہوتے وہاں ان ہی سے کام لیا جاتا۔ یہ پانی جہاں درختوں اور پودوں کو سینچنے کے کام آتا۔ وہاں باغ کی فضا میں خنکی اور طراوت بھی پیدا کر دیتا۔ عام طور پر اس بات کی کوشش کی جاتی کہ کوئی کیچ اور بدبودار پانی باغوں میں نہ پہنچے۔ اور یہ بھی کوشش ہوتی کہ پانی کو ایسے طریقے سے باغ میں لایا جائے کہ پانی کے بہنے سے نہر کی لہروں میں ترنم ریز اور شیریں گداز پیدا ہو۔ اور اس طرح ایک روح فزا نغمہ باغ کی فضا میں گونج اٹھے۔ اس مقصد کے لئے نہروں میں فوارے لگائے جاتے۔ بڑے بڑے تالاب اور حوض کھدوائے جاتے اور باغ کے بیچ و بیچ کسی موزوں جگہ بڑے حوض کے درمیان ایک مختصر سی عمارت بنائی جاتی۔ اس کی چھت، مینا کاری کے کام کی وجہ سے باغ کی دوسری تمام عمارتوں سے ممتاز ہوتی، اس کے بنانے میں اکثر چمکدار سیاہ پتھر یا سنگ مرمر استعمال کیا جاتا تھا۔ آج بھی یہ اپنے حسن اور لطافت کی وجہ سے تیموریوں کے خاص کا پتہ دیتی ہیں۔ اس عمارت میں جو عام طور پر بارہ دری کی شکل میں ہوتی اور جس میں ہوا کی آمد و رفت کا معقول انتظام ہوتا تھا، سنگ موسیٰ یا سنگ مرمر کے چبوترے بنے ہوتے جن پر

خوبصورت ستون ان کے جسم کو دوہرا کرتے نظر آتے دیواروں کی چمک آج صدیاں گزر جانے پر بھی قائم ہے۔ اس عمارت کے گرداگرد فواروں کی قطاریں ہیں ہر ایک خاص ترتیب اور قرینے سے لگائی جاتی۔ جب ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے حوض کی سطح پر لہریں پیدا ہوتیں اور اس کے ساتھ فوارے چھوٹتے تو عجیب بہار ہوتی۔ بعض اوقات ان فواروں کا پانی پتھر کے بنے ہوئے نازک خوبصورت لطیف اور نفیس آفتابوں میں گرتا۔ یہ آفتابے ایک ہی پتھر سے تراشے ہوتے تھے اور ستونوں۔ روشوں یا کمروں کے فرشوں پر لگائے جاتے۔ اس طرح تیموری باغ حسن مجسم بن جاتے اور باغ کی فضا میں ایسی دلآویزی پیدا ہوتی کہ بیان سے باہر ہے۔ رات کے وقت ان آبشاروں کے نیچے چراغاں میں روشنی کی جاتی، جب پانی اوپر سے گرتا تو رنگ برنگ کی روشنی پیدا ہوتی، چاندنی میں اس کا عجیب ملجع آمیز موسم برسات میں جب کالی کالی گھٹائیں اٹھتیں تو فضا میں کسی قدر تاریکی پیدا ہو جاتی۔ اس وقت ان چھوٹی خانوں میں رنگ برنگ پھولوں کے گلدستے رکھ دیئے جاتے۔ جس کے بعد تمام فضا میں رنگ و بو کا طوفان برپا ہو جاتا۔

کشمیر میں شالامار اور نشاط تیموری تمدن کے دو مختلف پہلو پیش کرتے ہیں مگر جہاں تک پانی کی روانی کا تعلق ہے دونوں باغوں میں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ پانی کی ایک نہر پورے جوش کے ساتھ ان باغوں میں داخل ہوتی ہے۔ ایک حوض اس پانی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔ پھر فرط مسرت سے اسے چکر دیتا ہے۔ پلٹتا ہے اور فواروں سے اڑا دیتا ہے۔ پانی بارہ بارہ پندرہ پندرہ فٹ اونچا اچھلتا ہے حوض میں گرتا ہے پھر بہتا ہے۔ آبشار بن کر نیچے کے درجے میں گرتا ہے وہاں ادھر ادھر پھولوں اور سبزہ زاروں سے اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ پھر چلتا ہے اور آبشار کی صورت میں نیچے گرتا ہے۔ اوپر سے نیچے نظر دوڑائی جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ شفاف پانی کی چادریں اور فوارے بلندی سے رقص کرتے ہوئے نیچے چلے آتے ہیں اور جب سب سے نچلے حوض میں پہنچتے ہیں تو باغ کی فضا کو اوراق کہ کر ڈالیں گم ہو جاتے ہیں جو اپنی آغوش وا کئے اس کے انتظار میں کھڑی ہے۔ پانی کی اس چادر کے گرنے سے سریلی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ فواروں سے نغمے بلند ہوتے ہیں صبح اور شام وہاں کے خوش الحان پرندان کے ہم آواز ہو کر تمام فضا کو نغمہ اور سرور سے بھر دیتے ہیں۔

تیموریوں نے پانی کے انتظام میں ایک عجیب بندوبست یہ بھی کیا کہ بہتی ہوئی نہریں، چلتے ہوئے فوارے اور گرتی ہوئی آبشاریں ان کے ایک معمولی اشارے سے رک جاتے اور چشمہ زوں میں پھر جاری ہو جاتے۔ اس مقصد کے لئے باغ کے سب سے اوپر کے حصے میں انھوں نے اس حکمت سے کنجی لگائی کہ اگر انھیں پانی بند کرنا مطلوب ہوتا تو اسے ایک طرف گھما دیتے پانی کے چھرنے بند ہو جاتے اور جب اسے دوسری طرف گھماتے تو پانی پھر جاری ہو جاتا۔

تیموری باغ ہمیشہ مستطیل یا مربع ہوتے، اور ان کے کئی کئی حصے ہوتے۔ ہر حصہ برابر کے چار حصوں میں تقسیم ہوتا۔ یہ حصے عام طور پر مربع ہوتے اور از خود مکمل ہوتے۔ یہ حصے خیابان کہلاتے۔ ایسا کرنے سے ان کی غایت یہ ہوتی تھی کہ باغ زیادہ دلکش نظر آئے۔ درختوں، پودوں اور پھولوں کے تناسب میں آسانی پیدا ہو۔ ہر خیابان کی شان جدا جدا ہوتی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی باغ کے ایک خیابان میں لالہ کی کیاریاں ہوتیں۔ دوسرے خیابان میں گلاب کے خوبصورت پودے ہوتے۔ تیسرے میں یاسمین کے پھول کھلے ہوتے۔ اس طرح باغ میں ایک گلکاری منظر پیدا ہو جاتا۔ ان خیابانوں کے گرداگرد بھی پانی کی بہتی ہوئی نہریں اور درخت بکثرت ہوتے تھے۔ درخت خاص اہتمام سے لگائے جاتے۔ ان کی بلندی اور پھیلاؤ کا خاص خیال رکھا جاتا اور ان کو برابر ناپ سے پروایا جاتا۔ اس طرح ان کی قطاریں دیکھنے کے قابل بن جاتیں۔

کشمیر میں تیموریوں کے بعض باغ قدرتی چشموں پر واقع ہیں۔ ان میں ویری ناگ۔ اچھ بل۔ صفا پور اور چشمہ شاہی کے باغ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ویری ناگ کا باغ ان سب میں قدیم ہے اور یہی وہ باغ ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ شاہانہ توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اسی لئے اس میں شاہی باغ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے میں اس باغ میں ردوبدل ہوتے رہے۔ آج ان کے بچے کھچے نشان یہاں ملتے ہیں۔ اس باغ میں بعض باتیں ایسی ہیں جو دوسرے باغوں میں نہیں ملتیں۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ چشمہ ویری ناگ کو ہشت پہلو بنایا گیا ہے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جب سورج کی شعاعیں اس پر پڑیں تو منعکس ہوں، روشنی میں تڑپ پیدا ہو، تاکہ یہ خوبصورت چشمہ زیادہ خوبصورت بن جائے۔ جو نہر اس سے نکالی گئی ہے۔ اس کی تہہ میں بھی پشت جال بچھا ہوا ہے۔ ماہی پشت جال بنانے میں یہ اہتمام رکھا جاتا تھا کہ جو مچھلی فرش پر بچھائے جائیں وہ خانے در ہوں تاکہ پانی اس سے نکلائے اور جب مچھلیاں پڑیں تو ان سے مختلف رنگ پیدا ہوں۔ بعض دفعہ چشموں کی تہہ میں سیاہ رنگ کے پتھر ایسے لگا دیتے تھے کہ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ پانی میں لہریں اٹھ رہی ہیں۔ اور اس میں رہنے مچھلیاں تیر رہی ہیں یہ اس طرح ہوتا تھا کہ پتھر کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا جاتا کہ وہ خود بخود پیچ و خم ہوتے چلے جاتے۔ اس کے بہترین نمونے اورنگ آباد، کشمیر، آگرہ اور دہلی میں مل سکتے ہیں

تیموری اپنے باغوں کا ایک حصہ نگارستان کے لئے وقف کیا کرتے تھے جس میں بادشاہوں کی تصویریں اور دیگر فنون لطیفہ کے اعلیٰ نمونے محفوظ کر لئے جاتے تھے کشمیر میں باغ نور افزا کا ایک حصہ اس مقصد کے لئے وقف تھا۔ یہ باغ ڈل کے کنارے واقع تھا۔ اکبر کے عہد حکومت میں جب قلعہ ہری پربت کی فصیل ڈل تک جا پہنچی تو دولت خانہ کی عمارت کو جو اس کے ساتھ تھی خوبصورت بنانے کے لئے اکبر نے حکم دیا کہ وہاں ایک خوش منظر باغ لگایا جائے۔ یہ باغ دوسرے تیموری باغوں کے مقابلے میں مختصر تھا۔ اکبر اس میں بیٹھ کر صاف قدرت اور ڈل کا لطف اٹھایا کرتا تھا۔ اکبر کے آخری ایام میں یہ باغ کچھ بے رونق سا ہو گیا تھا چنانچہ جب جہانگیر پہلی مرتبہ کشمیر گئے تو اس باغ کی خرابی کو دیکھ کر ناخوش ہوا۔ اس نے کشمیر کے ناظم معتمد خاں کو حکم دیا کہ باغ کو از سر نو لگائے اور مکانات کو جو خراب ہو چکے ہیں از سر نو تعمیر کرائے۔ معتمد خاں نے پوری کوشش اور مستعدی کے ساتھ کام شروع کیا چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں باغ کو تازہ رونق حاصل ہو گئی۔ باغ کے بیچ میں ایک بلند چبوترہ تیس دراع مربع بنایا گیا۔ اور اسے تین قطعوں میں تقسیم کیا گیا پھر بڑے بڑے استادوں کی نادر تصاویر سے اسے سجا کر رشک نگارخانہ چین بنا دیا گیا۔ اب اس باغ کا نام باغ نور افزا رکھا گیا۔ اس باغ کے اوپر کے حصے کی دیواروں پر جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ اور عرش آشیانی اکبر بادشاہ کی شبیہیں کھینچی گئیں۔ ان کے مقابل میں جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کی تصاویر بنائی گئیں۔ ان کے بعد میرزا کامران۔ میرزا محمد حکیم۔ شاہزادہ سلطان دانیال کی تصاویر تھیں۔ اس کی دوسری منزل میں بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص کاندھوں کی تصویریں بنوائی گئیں۔ اطراف اور بیرونی خانہ میں کشمیر کے راستے اور مناظر کے نقشے کھینچے گئے۔ ایک شاعر نے اس کی تاریخ ان الفاظ سے نکالی:۔

نجلے شاہان سلیمان حشم

شاہزادہ باغ لاہور میں باغ کے مشرقی حصہ کی عورت تصویر خانہ تھا۔ اس حصے کو "حشرت نگار" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہاں نہایت اعلیٰ قسم کی نقاشی کی گئی تھی۔

(مکاتیب عالمگیری ص۔)

تیموریوں نے اپنی نفاست پسندی کی بدولت باغات لگوائے اور ان میں رہنے کے لئے محل بنوائے۔ اور مرنے کے بعد بھی انھوں نے اپنے باغوں کو آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کیا۔ اُن کا یہ ذوق کشمیر میں خاص طور پر رنگ لایا۔ وہاں کی ہر صنعت اس سے اثر پذیر ہوئی۔ کشمیر کے بنے ہوئے شال۔ قالین۔ گبے۔ نمدے۔ پیپر ماشی کا کام۔ لکڑی اور چاندی کی بنی ہوئی چیزیں آج بھی ان کے اس تاثر کو ظاہر کر رہی ہیں۔ قالینوں اور شالوں پر خوبصورت پھول اور ان کی نازک نازک پنکھڑیاں لطیف بیلیں۔ پچ بندی کے مناظر اور باغوں کے پس منظر تیموریوں کے مذاق چمن سازی کے آئینہ دار ہیں۔

فن تعمیرات پر بھی باغ نے اثر ڈالا۔ مسلمان جاندار چیز کی تصویر کشی پسند نہ کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان میں مناظر حسن سے لطف اندوز ہونے کا مادہ موجود تھا۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنی عمارات کو پھولوں۔ بیلوں۔ گلدستوں۔ سرخولوں۔ پچی کاری۔ خاتم بندی اور رنگ کاری سے سجانا شروع کیا۔ مسجد ہو یا مقبرہ۔ محل ہو یا حویلی۔ آپ جونہی ان میں داخل ہوں گے۔ خوبصورت بیلیں۔ نازک نازک پھول۔ لطیف لطیف پنکھڑیاں اور پتیاں عجب شان دلربائی کے ساتھ دیواروں اور محرابوں پر جلوہ آرائی کرتی نظر آئیں گی۔ ان میں اس قدر نفاست اور نزاکت ہوگی کہ آنکھ دیکھے گی۔ دل لذت اندوز ہوگا۔ زبان کچھ کہنا چاہے گی مگر الفاظ پر اسے قابو نہ ہوگا۔ یہ مظاہر رنگ کاری میں خاص طور پر نمایاں ہوتے ہیں اور جب فلک میں کاشی کاری کا رواج ہوا تو اس کی آرائش زیبائش بھی گل و گلزار سے ہونے لگی۔ سرو و صنوبر کے درخت۔ انگور کی بیلیں۔ پھولوں کے گلدستے۔ صراحیاں اور خودرو پھول مختلف رنگوں میں کاشی کار تختوں پر نمودار ہوں کی پیشانی اور دوسرے حصوں پر نظر آتے ہیں۔ جب سورج کی شعاعیں ان کے ساتھ کھیلتی ہیں تو ان کی چمک دمک ایک ایسا سماں پیدا کرتی ہے کہ دل خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ لاہور میں وزیر خاں کی مسجد۔ شاہی باغ۔ علی مردان خاں کے روضہ کے تنے ہوئے نقش و نگار۔ چوبرجی مسجد رائی انگا اور قصہ اور عثمان کی بہت سی عمارتیں آج بھی جہاندیدہ سیاحوں سے خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہتیں۔

اسی طرح پر چین کاری، در خاتم بندی میں بھی باغوں کے اثرات واضح اور صاف طور پر نظر آتے ہیں مگر جو چیز باغوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی وہ کتاب ہے۔ کتاب کی جلد گل و گلزار کا بہترین نمونہ ہے۔ کہیں اس پر نازک نازک بیلیں بنی ہوتی ہیں۔ کہیں تناور درخت ہوتے ہیں جو جلد کے پورے صفحے کو گھیر لیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ان پر گلدستے یا بکھرے ہوئے پھول بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تو کتاب کا بیرونی حصہ ہوتا ہے جو اصل کتاب نہیں ہوتا۔ کتاب کی پیشانی۔ اس کی جدول۔ اور اس کے حاشیہ کی آرائش و زیبائش سراپا گلشن ہوتی ہے۔ کتاب کی تصویریں بھی بعض اوقات کسی باغ کا پس منظر لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ خط شکستہ۔ خط نسخ۔ خط نستعلیق۔ خط گلزار وغیرہ بھی باغ کے مختلف مناظر کے آئینہ دار ہیں۔

جلد سازی میں جس قدر ترقی ہوئی۔ وہ بجائے خود مسلمانوں کا ایک مستقل کارنامہ ہے۔ اس سے مسلمانوں کے ذہنی اور علمی استغراق اور حسن و جمال کے ارتقائی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

لوح یعنی کتاب کا ابتدائی ورق اور جس ورق سے کتاب شروع ہوتی اس کی پیشانی پر جو گلکاریاں کی جاتیں وہ بھی نہایت نازک اور دلفریب ہوتی تھیں۔ اس سے کتاب میں لطافت اور رعنائی پیدا ہو جاتی تھی۔ مسلمان سونے، چاندی، موتی اور مختلف رنگوں کے جواہرات کو حلول اور سیال کرتے۔ پھر اس سے مختلف رنگوں کا کام لیتے۔ انھیں کتاب کے حاشیے اور جدول پر بیل بوٹے

بنانے میں صرف کرتے۔ اس نادرہ کاری سے وہ کتاب کے نقش و نگار کو غیر فانی بنا دیتے۔ ان کی تروتازگی میں آج بھی اتنے زمانہ کے باوجود کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بیل بوٹے، گل و گلزار آج بھی اپنے اندر ویسی ہی چمک و مہک رکھتے ہیں جیسے بناتے وقت ان میں پیدا ہوئی تھی۔ ان کے بیشتر نمونے یورپ اور امریکہ کے کتب خانوں کی زینت ہیں جنھیں دیکھ کر اقبال نے فرمایا تھا:

گردہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

کتاب کے علاوہ صنعت پارچہ بافی بھی باغ کے اثر سے آزاد نہیں۔ بانڈھنو، جھیٹ۔ گل کاری۔ گل برے وغیرہ کیا ہیں؟ باغ ہی کے مختلف روپ ہیں۔

ہمارے ادب اور ہماری شاعری پر بھی باغ کی گہری چھاپ ہے اپنی مجلسی زندگی سے اگر باغ کے تصور اور تخیل کو خارج کر دیا جائے تو زندگی بالکل بے کیف ہو کر رہ جائے گی۔

مغلیہ دور کے لگائے ہوئے باغ آج بھی موجود ہیں۔ ان کی فضا ویسی ہی لطیف ہے۔ انکی آرائش و زیبائش بدستور قائم ہے۔ ان کا حسین و جمیل، جمل آج بھی روح کو سکون اور اطمینان بخش رہا ہے۔ زمانے کے انقلاب اور حادثوں نے ہر چیز پر اپنا اثر ڈالا مگر وہ اس انقلاب سے بالکل محفوظ و مامون ہیں۔ ان میں آج بھی وہ پرمسرت باتی ہے۔ ان کے دیکھنے سے قلب و دماغ آج بھی فرحت محسوس کرتے ہیں۔ سورج کی سنہری کرنوں اور چاند کی چاندنی میں ان کے فوارے جب فضا کے سکون میں تلاطم پیدا کرتے ہیں تو دیکھنے والا بے ساختہ پکار اٹھتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ۔۔۔ ہمیں است ہمیں است و ہمیں است

مضطرب اور پریشان حال انسان مصیبت سے گھبرائے ہوئے دل، تھکے ماندے دماغ جب ان باغوں کی پرسکون فضاؤں میں سرو و شمشاد کے فلک بوس درختوں کے سائے اور سبزہ کی نرم نرم کیاریوں پر استراحت پذیر ہوتے ہیں تو دنیا و مافیہا کا گمان کے دلوں سے محو ہو جاتا ہے۔ قسم قسم کے پھول اور رنگ برنگ کے غنچے اپنی خوشبو سے ہوا میں مہک پیدا کرتے اور لطیف ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اسے ادھر ادھر پھیلاتے ہیں تو ہر دل اور دماغ ان کی فضا میں مست ہو جاتا ہے۔ طبیعت اس میں محو ہو جاتی ہے۔ نگاہیں رنگ و بو کے اس خطہ میں کھو جاتی ہیں اور کانوں میں آواز آتی ہے ؎

سراپا گوش ہو جا باغ میں اے چشم نظارہ
زبان گل سے سن پار کی تفسیر ہوتی ہے

سودا کے ادبی معرکے

ڈاکٹر محمد حسن

[ایک بیانیہ خاکہ]

ادبی معرکے بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں ایک ایسے ہوتے ہیں جن میں ادبی مسائل زیر بحث آتے ہیں، نظریاتی شعور کے جوہر کھلتے ہیں، دوسرے ایسے ہوتے ہیں جن میں شخصیت زیر بحث آتی ہیں اور اصولی بات بھی ذاتی اور شخصی بن جاتی ہے۔ اور پھر ان ادبی معرکوں کے دونوں رخ مکمل ہو جاتے ہیں۔ کبھی ہجوں سے مسکے طے نہیں ہوتے ان کبھی کبھی مضحکات کی بڑی اچھی مثالیں ضرور سامنے آجاتی ہیں۔ عہد جدید کے بعض ادیبوں نے تو ان مضحکات کو بھی ادبی معرکوں کا حصہ بنانے کا ارادہ کیا۔ اور بڑی شدومد کے ساتھ اس یاوہ گوئی کو بھی ادب کی معراج قرار دینے لگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی مضحکات میں جب تک ضبط اعتدال دھوا دیات شخصی طنز و تعریض اور ذاتی تنقیص اور استہزاء سے آگے بڑھ کر کسی سماجی قدر یا اجتماعی میلان تک نہ پہنچے اس وقت تک ایسے مضحکات سے ادیب اور ادب دونوں ہی کا ستارہ گردش میں رہتا ہے اور کسی کا بھی بھلا نہیں ہوتا۔ انشاء اور مصحفی کے ادبی معرکوں نے ادب میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنی ذہانت اور طباعی کا غلط استعمال کر کے خود اپنی توہین کی ہے اور یہی حال ان تمام شعراء کا ہے جو ادبی معرکہ آرائی میں اپنی حیثیت اور وقار کو بھول گئے۔

سودا کا کلام اس اعتبار سے قابل مطالعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سودا نے بھی ہجو کے دفتر لکھے ہیں۔ اور کہیں کہیں ان کی ہجویات بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ وہ بہ صرف فریق مخالف کے حلیے، اس کے رنگ و روپ اور اس کے آباؤ اجداد کا مضحکہ اڑاتے ہیں بلکہ اس کی ولادت اور اس کے گھر والوں تک کو نہیں چھوڑتے لیکن پھر بھی سودا اپنی اکثر ہجویات میں یا تو فرد سے اجتماعی اقدار تک پہنچتے ہیں جس سے طنز ذاتی کے بجائے سماجی ہو جاتا ہے یا پھر مضحکات میں ذات کے استہزاء کو بنیادی عنصر قرار دینے کے بجائے اسے ضمنی جزو بنا دیتا ہے۔ مثلاً ان کے تین عظیم الشان ادبی معرکوں (یعنی "مسیلمہ بداہت"، "عبرۃ العاقلین" اور میر تقی کے مرثیے پر ان کے اعتراضات) میں سودا کا تنقیدی شعور اور ادبی لب و لہجہ نمایاں ہے، اور مضحکہ خیز تصویریں کم ہیں۔

یہاں سودا کے ادبی معرکوں کی ان تصویروں سے بحث کی جائے گی جو مزاح کا اچھا نمونہ ہیں۔ مزاح اور طنز تاک تیار کیے جاتے ہیں انسان کی معراج یہی ہے کہ جس پر پھبتی کسی جائے یا جس کا مذاق اڑایا جائے وہ بھی بے ساختہ اس سے لطف لینے پر مجبور ہو جائے۔ مزاح کو افراد اور اقوام کے مزاج پر چھا جانے کے لئے تہذیب کی ایک خاص منزل تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ طنز یا مزاح دراصل عدم توازن کی اصلاح و اعتدال قائم کرنے کی کوشش ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب قوموں میں یا افراد میں اعتدال اور توازن کا یہ ادراک پیدا ہو جائے تبھی وہ ذہنی طور پر اپنے کو ہنسنے ہنسانے کے لئے آمادہ کر سکتے ہیں۔ مزاح غلط پندار، افراط و تفریط کا دشمن ہے اور جب تک قوم یا افراد اس قسم کی کسی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اس وقت

مزاح نگاری معلوم ہوتا ہے اور انسان و زمان کی اس آرزو کو پوری طرح سمجھنے سے معذور رہتا ہے۔

سودا شاعری میں تفاخر سے مزاح کی یہ چاشنی کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ تصوف اور یک طرفہ نیت داستی کے سب دلچسپی کی وجہ سے روایت شاعری عام طور پر تنگ نظری یا گرمیں کا شکار نہیں ہوئی مگر زہد و مشیخ کی علامتوں کے ذریعے اس تنگ نظری اور گرمیں کو حرف ہی اڑاتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ تفلس کے ذریعے سے شاعر کو موقع ہی ملا کہ وہ اپنی ذات کو مختلف حصوں کی شکل میں دیکھے کبھی تو وہ خود اپنی ذات کو خیر مقدم کر کے اپنی کمزوریوں پر ہلکا پھلکا طنز یا زیر لب ہنسنے سے اپنے اوپر ہنسنا یا دوسروں کی ہنسی گوارا کرنا بڑے ظرف کی بات ہے اور ایک بلند تخلیقی سطح کے بغیر نہیں آتا۔ یہ روایت سودا کے کلام میں بھی اسی کشادگی کے ساتھ ملتی ہے۔ ان کی طنزیات سے بہت سے ایسے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں خود سودا نے اپنی ذات پر تعریض کی ہے اور مزاح کا ایک لطیف پہلو پیدا کیا ہے۔

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

ایک روز ایک یار نے اس شوخ سے کہا — سودا کے دیکھنے سے تجھے عار ہی رہا
بولا کہ تیرے جی بلا وت ہے اس امر میں — جب سے ہوا وہ خلق بداطوار ہی رہا

اتنا تو وہ بُرا ہے کہ چہرے کا اس کے رنگ
پھر عمر اس کی شکل سے بیزار ہی رہا

سودا کے زرد چہرے کو مٹی کی راہ سے
کہتا ہے تیرا رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

سودا کو کہتے ہیں کہ ہے اس سے مصاحبت — کتنا غلط یہ جوڑ بھی مشہور ہو گیا
اوروں کی نسبت اندوں کچھ تنگ چلا تھا وہ — دو چار جھڑکیوں میں بدستور ہو گیا

جہاں تک سودا کے ادبی معرکوں کا تعلق ہے یہی کیفیت مزاح زیادہ نشتریت اور طنز کے ساتھ ان میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے۔ سودا کے ادبی معرکے اٹھارہویں شعراء اور مجموعوں سے ہوتے۔ پہلا لاخوکین سے، دوسرا میر ضاحک سے، تیسرا میر علی اتفت سے، چوتھا مرزت کاشمیری سے، پانچواں میر تقی میر، چھٹا فدوی سے۔ ساتواں نوٹی سے۔ نوٹی کے متعلق جو کلام ملتا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اصل میں قائم چاندپوری کی ہجویں کہا گیا تھا لیکن جب قائم نے سودا پر ہجویں کی فہرستوں میں شامل کرنے وقت اس کلام سے ان کا نام ہٹا کر نوٹی کے نام کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ انیس بند کا ایک مخمس شیخ علی حزیں کی ہجو میں کہا ہے جو کسی بند و ستائی مجموعہ کلام میں نہیں ملتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترتیب آرکیٹی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ یہاں ان لطائف کی صرف وہ ترتیب پیش نظر ہوگی ہے جو مروجہ دیوان میں ملتی ہے۔ پھر مرزا مظہر جان جاناں کے طنزیہ کلام کی ہجو میں ایک مخمس بھی موجود ہے۔

سب سے پہلے لاخوکین کے ادبی معرکے پر نظر ڈالیے "آب حیات" میں مولانا محمد حسین آزاد اس ادبی معرکے کی شان نزول اس طرح

بیان کرتے ہیں:

"اشرف علی خاں نام ایک شریف خاندان شخص تھے۔ انھوں نے فارسی کے تذکروں اور مستند دواوین کے پندرہ برس کی محنت سے ایک انتخاب مرتب کیا اور تصحیح کے لئے مرزا فاخر مکیں کے پاس لے گئے ... انھوں نے کچھ انکار کچھ تکرار بہت سی تکرار کے بعد انتخاب لے کر رکھ لیا اور دیکھنا شروع کیا مگر جا بجا استادوں کے اشعار کو کہیں بے معنی سمجھ کر کاٹ ڈالا کہیں تیغ اصلاح سے زخمی کر دیا... کتاب غلطیوں سے چھلنی ہو گئی تھی اسی حالت میں مرزا کے پاس واپس آکر سارا حال بیان کیا اور انصاف طلب ہوئے ..... "

اس تمہید کے بعد "عبرۃ الناظرین" اور سودا کی بعض دوسری ہجویات میں مرزا فاخر مکیں کا خاکہ ملاحظہ کیجیے۔

عائب کہے ہے اشعار کا ہر ایک شت انداز
کہتے ہیں فضیحی کہ نہیں ہے وہ زباں داں
فضیحی و ابو الفضل کو طوطی کہیں ناداں

"از ہوش رباد مدعی ہر زہ درایاں
غیرست چرا ایں ہمہ بے ہوش نشستی"

شوکت ہو کبوتر ہے بخارے کا سو وہ باغ
بیدل زغن ہند کی دانا مرغ علی یک زاغ
تمکین نے تیرے کیا جوں الا بھے داغ

"شد زغن و زاغ بلندست دریں باغ
اے بلبل خوش لہجہ تو خاموش نشستی"

(تضمین بر غزل مکیں)

اس ادبی معرکہ کا انجام بھی سنئے سودا نے اساتذہ کے ان اشعار کی توجیہ کی تھی جو درست تسلیم کیا تھا جنہیں مرزا فاخر مکیں غلط ٹھہرا چکے تھے۔ پھر فاخر مکیں کے اشعار پر اعتراضات بھی کئے تھے۔ نقاد نے ایک شعر کے بارے میں گفتگو کی۔ شعر یہ تھا

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دل من
شکفت روئی سپہا شگفتہ کرد مرا

سودا نے اعتراض کیا کہ قدح کو گرفتہ دل کہنا بے جا ہے کیونکہ قدح کو ہمیشہ کھلے ہوئے پھول سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس پر نقاد نے کہا کہ شعر سے پہلے جو شعر تھا

چہ نشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو
بدل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو

سودا نے کہا یہ شعر تو اس اعتراض کی تائید کرتا ہے خوش تکرار یہاں تک بڑھی کہ مرزا فاخر مکیں یا ان کے ہمدردوں میں سے کسی نے تیغ چوں کرد کا نعرہ

سودا سے کہے کے مذاق کیا۔ ان لوگوں نے سودا کو گھیر لیا۔ ان کے بنا کا حال سودا کے ایک شاگرد نے اس طرح نظم کیا ہے۔

یہ سن چھری ایک شخص نے کو کھا اس کے پہ دھر دی — اور پر کھڑے دم سے لے برہ شیر
کہنے لگے لیجائیں گے ہم تم کو اسی وقت — چلنے میں کہیں کے کئے ہرگز نہ کرو دیر
سودا نے ان اشرار کی دیکھی جو یہ شدت — سمجھا کہ کریں گے نہ یہ بد ذاتی تعزیر
بچاؤ کیا کرے گا اس میں وہ بیچارا — جب دیکھی کوئی اس نے بچاؤ اس کی نہ تدبیر
ان میں سے چھری کھینچ دیں آن کے جلدی — چڑھ بیٹھا سیانے میں بھی اک نطفہ نجس زیر
اس طرح سے لے چلا تنہا اسے پا کر — وہ لشکر شیطان دغا پیشہ بے پیر
گھر اس کے سے لے پہنچے تھا جس قدم اس کو — نگاہ تماشا یہ دکھائی انھیں تقدیر
نواب سعادت علی خاں ہاتھی کے اوپر — افواج حشم اس گھڑی اگر پہنے رہ گیر

نواب سعادت علی خاں اس وقت تخت نشین تھے۔ ہو سکتے شہزادے تھے انھوں نے سودا کو "بہ تو قیر اپنی ہی ہاتھی میں بٹھا لیا"۔ بعد کو نواب آصف الدولہ کی آتش غضب اس قدر بھڑکی کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مشیخ چوک کے کھلے میدان کا حکم دے دیا تھا اور سودا کے مخالفین کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا تھا مگر خوشامدیوں کے جمگھٹے نے سودا سے سفارش کی اور سودا نے بیچ میں پڑ کر نواب کے اس غصے کو بدلوا دیا۔ سودا کی زبان سے سودا کے شاگرد نے اپنی نظم میں جو الفاظ کہلائے ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔

تکرار سخن کی تھی۔ عداوت نہ تھی مجھ سے — کچھ ان کو یہ ان کی ہے فقط حسن کی تقریر
شاعر کے لئے جنگ سخن کرنے کو باہم — بہتر نہیں ہے تیغ زباں سے کوئی شمشیر
تیغ سخن اس کی جو صائب نہیں رکھتی — اس واسطے شمشیر سے کی لڑنے کی تدبیر

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دوسرے دن نواب آصف الدولہ نے دربار منعقد کیا سودا کو بلوایا اور کہا کہ "اگر شعر کے مرد میدان ہو تو اب دو بدو سودا کے ہو کہو"۔ مرزا نے فوراً کہا "ایں از ما نمی آید" آصف الدولہ نے جواب دیا "ایں از شما می آید کہ ایں سخنہا طین خود را بر سر مزار ما بے چارہ فرستادید" فوراً خانہ بدوش کشندہ دی خواستند گریزش تا مگ برج ندہ پھر سودا کی طرف اشارہ کیا یہاں کیا در تھی فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی۔

تو فخر خاسانی و ما سا قط از د — گوہر بہ دہاں داری و ما سا قط از د
روباہ دشمناں زعم فضائے تو ہم — مرکب دولت خداوندا سا قط از د

(بحوالہ "آب حیات")

دوسرا شہرہ معرکہ میر ضاحک سے ہوا۔ میر ضاحک کا معرکہ سودا سے کئی جگہ اڑیلے ہے مگر ان کی ادبی شخصیت کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے بلکہ ان کی شخصیت میں ایسی خصوصیات اور جانب دکھائے گئے ہیں جو سوسائٹی کی حیثیت سے مضحکہ خیز ہیں۔ ایک ہجو میر ضاحک کو میر اور کمال دکھایا گیا ہے اس ہجو کی کچھ تصویریں دیکھئے۔

گھر میں اب جس کا دیکھو گھڑے کے — در پہ اس کے یہ بیٹھے یوں اڑے کے
گور سے پھر جو رستم اٹھ کر آئے — میت اس کی اٹھے یا نہ اٹھائے

ہر کسی شے کی دکان پر جب اپنی باری میں اس کو رکھے لگا
کم بہ روحِ اپنا کر لیوے کھنے بند کی طرح کھر لیوے

شادی میں اگر کسی کے گھر جائے صاحب خانہ رنڈیاں بلوائے
کیا طمع اس کی اس گھڑی میں تھی کھڑی یہ چاہے پھر میں ہی بجوائے
ماگ گر ہو کلاونوں کا داں اس جگہ گا رہا ہو جیون خاں
اور بجھا وچ بجائے دیبی داس سروں کی بندھ رہی ہو ہم اس
کیسی ہی دیبی داس پرتی لے سنے آپ یہ نہ سنے دے
بجی پیچھے ہر ایک سے بے شرم پری کا آنا سخت ہے بازم

مارے لقمے تو اس طرح جیسے کھائے کوئی پٹے کے بات

گاہ چونکے تھا گاہ اونگھے تھا گاہ مطبخ کی ہانس سونگھے تھا
اس میں یہ سو گیا تو دیکھ خواب گویا بیٹھا ہوا ہے بر سر قاب
نگہ اس قاب پر اک آدر آیا تب یہ بے اختیار ترایا
جگ میں کھانا ہے اور میرا منہ گیری یہ قاب اور تیرا منہ
کہہ کے یہ نیند میں جو الٹا ہاتھ ہاس والے کی پگڑی ہاتھ کے ساتھ
اڑگئی سر سے آگے کیا میں کہوں تھا یہ نزدیک ہووے کشت خوں

دوسری بیوی میر ضاحک کے سید ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور اس سلسلے میں سب سے بڑی دلیل یہ دی ہے:

آپ کو کہتا ہے تو سید ہوں میں جد مرا پوچھو تو ہے خیر الانام
پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں ہوا اگر ختم رسالت کا کلام

اور یہ کا شعر ہے:

یم سوزاک پدر ہے تو مشری رحم مادر میں الٹ بخلاب تیر

اس کے کچھ اقتباس دیکھئے:

لعن تیرے سر پہ کرتے ہیں عدم اے رباب دیں سے تا کسنگری
تال پر چھیکڑے ہے ہر زباں ڈنچھا وچا تا بہ ڈھونگ نجوری

تف اے جس نے سکھائے کوترے	ڈنڈی کاندھے پہ بٹیرے کی بھری
بزدل انسان وہاں میں ملا	ہے جو تیری زیر چرخ چنبری
اس سے نے دعوی معاد بتاں کہیے	ہے نہ ہوخواں کو ذرہ بھر ہری
پس بتا باعث انحطاط کا	یہ غلط کہتا ہے تو جگ ہری
دیکھ کر خلقت میں تیری شکل کو	شرم خان کہتے ہیں دیو و پری

ایک اور بند میں ضاحک کی لیاقت نوری کا تذکرہ ملتا ہے:۔

یہ تو ہے مسکن جہاں سے تو اٹھ	دور اٹھ جس گھر و داں سے تو اٹھ
جس زمیں پر ہو بوکھنے کی نوک	گردش ہفت آسماں سے تو اٹھ
مثل سگ ہے جو تاکے تیر نشال	گوشت کھا کر استخواں سے تو اٹھ
اٹھ گئے ہی ہیں اٹھنے سے حروف	یہ تو کیا معنی زباں سے تو اٹھ
سامنے کوئی اگر مار کھے تو پ	ذکر کیا ہے خوف جاں سے تو اٹھ

ایک اور مخمس بھی میر ضاحک کی ہجو میں کہا ہے اور یہ جا کہا ہے اس میں نہ تو میر ضاحک کے کسی سوانحی حسب کا ذکر ہے یا ذاتی معائب کا البتہ کسی ادبی سقم کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ یہ مخمس نما ہیں پھیر بھاڑ اور شرارت کا نمونہ ہے۔ تو میر ضاحک ہی پر فٹ ہے بلکہ ان کی ہجو ہی پر کہی ہے۔

ضاحک کے ہیے نے دھول اپنے گھر دھرایا	بے وجہات ساری بھائیوں کو لگایا
بیٹھے ہیں بیٹھ بڑے چوتڑے کو جیسے ہوا	تب شیخ سدو اس پر غصے کو کھا کے آیا

بولا کہ کیوں بے ضاحک برا کوئی منگایا

اگلے بند میں ضاحک کی زبانی اس طرز کلام پر اعتراض کیا گیا ہے اور پرسش کرنے سے معذوری ظاہر کی گئی ہے جس کے جواب میں شیخ سدو مخلوقات ستم کی دھمکیاں دیتے ہے۔ آخری دو بندوں میں ضاحک کی تند خیازی کی شکایت شیخ سدو کی طرف سے اس نظم میں اضافہ کرنے کا اور نظم جو ہے اس میں مکالمے کی زبان استعمال ہوئی ہے اور یہ واقعہ چاہے تخیلی پر مبنی کیوں نہ ہو لیکن اس دور کی معاشرت کی ایک جھلک اس میں پائی جاتی ہے اور گھروں میں عورتیں جس قسم کی رسموں کو بنتی تھیں ان کا ذکر ملتا ہے۔

ضاحک نے تب کہا یوں مجھ پاس کب ہیں کوڑے	گڑ کے تو گھگھے ہیں اور تیل کے پکوڑے
ٹھاکر و جوز کو دے بیلے کریں گندوڑے	تب شیخ سدو بولا ستیاناس ہے ارے تو

بھینسا بیچ کے چھوڑوں ضاحک میں کیا تو لایا

دھڑی بھر منہ کو بیٹھا تجھ کو بھاڑے کرنا | دو تیل کے پکوڑے تگے بلائے دھرنا
گئے اپنے پند دیکھا بھینس کا بھاڑے بھیجا | بگڑا تو ہوں نہ بھیساوں اے گدھے تو ارنا

تب جانے گا تو سیڑو سے پیروں کو میں سنایا

افسوس ہے کہ میر ضاحک نے جو کچھ سودا اور بعض دوسرے معاصرین کی ہجو میں کہا وہ اب نہیں ملتا۔ وہ سارا کلام ضائع ہو گیا۔ لیکن سودا نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ضاحک نے سودا کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے حضرات کی ہجویں لکھی تھیں۔

کہا معالج خاں نے تیرا کیا علاج — تو جان کا منہ میں لے کے گھبرے
میر و اب اور ان کے بھائی کی — ہجو کرتا ہے وہ ہیں مسخرے
میں یہ کہوں ہوں کر تو اس وضع سے — آج اگر جیتا بچے تو کل مرے
میرزا عبگیر سے نامرد اصل — نظم میں آئے ترے سب پڑے
اصنام ان کا تو لے سکتا نہیں — جن سے ہیں یہ شخص قبیح تر دے
تجھ سوا کس میر کی ایسی ہے شکل — جس کی صورت دیکھ کر شیطاں ڈرے

غیر الف مگر میر علی الف سے ہوا لیکن یہ مگر بالواسطہ تھا۔ میر آفتاب سودا کے دوست تھے احسان کی ہجو میر علی الف نے کہی تھی حکیم آفتاب کے تقاضے پر سودا نے الف کی ہجو لکھی۔ سودا نے اس ہجو کی وجہ یہ قرار دی کہ حکیم آفتاب سادات میں سے تھے اور الف نجی کی ہجو کرنا مناسب نہیں۔

جیسی یہ ہجو تو نے کی بالله کار تست — شاہ جہت اس کا شعر نہ دیکھیں نادرست
پر یہ کہوں گا واہ تو کر سخت تھا دماغ — کس بیت چار بادہ ات البتہ خیبت چیست

کان او زلیس حوالہ استاد کردہ

اس بند میں سودا کی مذہبی تنگ نظری کا بھی عکس نظر آتا ہے کہیں کہیں سودا اس ہجو میں بھی بڑی پست سطح پر اتر آئے ہیں لیکن کہیں کہیں شعر و شاعری کے بارے میں نظریہ و تعریض کے بیچ بیچ کچھ مفید جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔

جس پر ہے تجھ کو نازش وہ مال ہے نہ زر
جز یہ کہ چند شعر تو شاعر ہے اس کا چور
کہتے ہو اس کا حال تو کرنے لگے ہے شور
مطلع مشابہ ست بہ آبروئے چشم کور

بر حسن مطلعش تو آفرین صاد کردہ

غدر کا شیری کی ہجویات کی حیثیتوں سے اہم ہیں ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں سودا نے اپنے دور کے شاعروں کی عام عادات و خصائل پر بھی اظہار خیال کئے ہیں اور اس عہد کی ادبی محفلوں کی بھی جھلکیاں دکھائی ہیں دوسرے اس حیثیت سے کہ مزاح کے نئے نکتے اور نئے پہلو پیدا کئے گئے ہیں ان میں سے بعض اچھوتے ہیں اور بعض اوچھے۔ مثلاً غدر کا شیری کے ساتھ ساتھ ان کی دختر کی ہجو بھی شامل دیوان ہے۔ تیسرے اس حیثیت سے کہ ان ہجویات میں بڑی روانی اور جوش کا اظہار ہوا ہے تکنیک کے اعتبار سے بھی غدر کا شیری سودا کی بہترین ہجو ہے کیونکہ سودا کی غدر کا شیری نے سودا کی ہر ہجو کی طرح اسی کو غدر پر لوٹا دیا ہے اور اس سلسلے میں سودا کے بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً مولوی غدر کا مطلع ہے۔

غوغائے صبح تازہ بیا دہ بیا دہ خاست — آبروئے ریختہ از جوش سودا رخاست

اس پر سودا نے جو مصرعے لگائے ہیں ان سے یہ مولوی غدر ہی چسپاں کر دیا ہے۔

شعرا سودا سے تو بہتر ہے کہ کہتا ریختہ — کب کہا میں نے کہ میرا شعر ہے دلچسپ تر
بے حیائی ہے یہ کہنا میر سے کیسا ریختہ — خوش معنی آرزو نیز دہ چہار ریختہ

ابر رحمت ہے جو شعر سودا ریختہ

اس دعوے کی دلیل کے طور پر انھوں نے شاعروں کی ایک جھلک دکھائی ہے۔

ہوس میں جاہلیر زاہد دل کے نہیں باشاد — شعرا سودا و میر و میر حسن و درد
کہتے تھے سن کے تیرے جی میں ہے کیا میاں — "چوں کلاغ آمد شب گرد سرا سحاں باز گرد"

اب ہیں وہ رنگ طرح شعر درخشاں ریختہ

پہلے یہ کہنے میں آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ جواب آرزو کی زبان سے لکھی گئی اور اس کے کئی نسخہ خان آرزو کی فکر کا نتیجہ ہیں لیکن اس کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ یہ اشعار سودا کی ہجویات کے عام رنگ سے ہم آہنگ ہیں اس لئے ان کے بارے میں کسی دوسرے شاعر کا تصور کرنا آسان نہیں۔ اس قسم کی نسبت کا شیری کے چلے اور اس کی نجی زندگی کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے مثلاً

تک تو خوبرو سے ہاتھی کی تیری کم نہیں — پڑے گر جھول کا دامن اس سے گر تو ہیں
دیکھ کر تیرا نون یہ کہے وہ نازنیں — "ہست سودائے تجم ایں سیہ روئے لعیں

پیکر خشت استار قدرت پیل آسا ریختہ"

جب تو مسجد میں اذاں دیوے ہے بانگ خروس — یا بکا جورو کے تیرے خواب ہووے نا پدید
لے چھری بولے وہ ماکریں بچہ شہید — ہوں خوشی سے بے عمل بابد گوئے نا پدید

خوں خوار یں خشک لے از شور بے جا ریختہ"

اس کے علاوہ ایک اور نقص میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے اور وہ تھا ان کا مشکل پسند ہونا۔ گرد بھی خاصا غلط کا شیری ہی کی ہجو ہے۔

حصیت ہی میں گندنا ہے جو میری لوحات — لیکن اس سے نہیں تقوی پہ کسی کی آفات
یاد انصاف کرو کچھ بھی ہے معقول یہ بات — دو دلیے کے عوض بیچے ہے کل ساری رات

بھو دو دست گرفت و گفت من بشمرد

ایک اور ہجو میں کچھ اور زیادہ کھل کھیلے ہیں۔

جی میں آتا ہے کہوں جا کے میں اس حقہ سے — تیرے دیدار کی محراب ہی کیا کم شق ہے
کون جھکے جا ب ایسے نو طلق سے — لیکن اتنا تو کہوں گا کہ گذشت حق ہے

جرمانہ قیامت بتو خواہند سپرد

پھر وہ مشہور اصداں ہجو ہے جس میں شعر و سخن کے آداب کو لطافت اور مزاح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا بند ہے۔

ہوا ہی جاتے اب کوئی جا کے مرا پیام دو — کون نہ کہہ کہ یہ غزل پڑھنے کو اذن عام دو
لکھ کھلے ہو ایک کو صحبت تلمیذ دو — مجھ سے جو چاہے شعر ہی کہنے کو مفت رام دو

گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو ذرا لگام دو

اس میں میر زبیدل کے عرس کا ذکر ہے جس نے اس زمانے میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی میر زابیدل کے عرس کا ذکر اکثر فارسی اشعار و تذکروں میں ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سال اس عرس کے موقع پر تمام فارسی گو شعراء جمع ہوتے تھے اور طرحی مشاعرہ ہوتا تھا۔ یہ فارسی گو شعراء کی مرکزی تنظیم بھی کہی جا سکتی ہے۔ سودا نے ندرت کا شیری کی ہجو کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

ایک غزل کا عرس میں تم سے جو انعام ہو　　بحر میں جس کی ہر طرح شیرۂ خاص و عام ہو
تقطیع اس کی جس کے صبح سے آہ شام ہو　　اس کی ردیف سے خوش تم کو بھی پیام ہو
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو ذرا لگام دو

اسی قصہ میں چند بہت اچھی مضحک تصویریں ہیں۔

دعوت کو شعر خوانی کی آپ کی گر بتائیے　　کچی میں ڈال کشمری اس کے تئیں جلائیے
بزم میں شاعروں کی آپ ہوویں تو واں بلائیے　　جائیے بھی تو آپ کے منہ پہ یہ کچھ کے جائیے
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو ذرا لگام دو

فاضلوں کی تو بزم میں ہوتے ہو جا کے شعر خواں　　شاعروں پاس آپ کو کہتے ہو نحو داں
دونوں گروہ جمع جس جا گھر آپ میں وہاں　　بولو جواں تم ان کو سب کہیں تم کو ہو میاں
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو ذرا لگام دو

..... کس میں کرو گے میری ہجو فارسی کا قصہ پیال　　ہو گے باجو بخیتہ اس میں کسی کی کیا مجال
بولی میں اپنی تم دعا دو جو کسی کو میرے لال　　جوتی کو لے کر ہاتھ میں تم سے کہے وہ یہ سوال
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو ذرا لگام دو

..... میں کہوں تم سے مولوی کیونکر ملے یہ مشتلم　　لے لو تم اپنی شکل کو داڑھی کو رنگو لے کسم
لے کے اوس دوال سے کیجئے اس غزل کو کم　　یہ قطع گی اس طرح چاہیئے یہ کہ آ کے تم
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو ذرا لگام دو

اس عرس کی روانی کا ایک عکس مولوی نصرت کا شیری کی دختر کی ہجو میں بھی ملتا ہے۔ میر زا سودا نے دختر کے حسن، اس کی شوخی، طباعت، موسیقی اور علمی دستگاہ پر فخر کے پیرایہ میں اظہار خیال کیا ہے، اس کے دو بند ملاحظہ کیجئے۔

عدالے کی بھیں سے کاواں میں رسکے جو آتی ہو　　تو وہ بھی اس طرح سے اٹھ کے زنگولے بجاتی ہو
کرے اس لفظ بھی دیکھے گو اس کے آتی ہے　　اسے عالم سمجھے وہ جو منھوں میں بتاتی ہے
بدقت می تواں فہمید معنی ہائے ناز او
کہ شرح حکمت العین ست ژرگاں دراز او

مسدس بند شوخی کے سلسلے میں ہے اور طنز کی لطافت اور شوخی دونوں یہاں جلوہ گر ہیں۔

سنا جائے نہ شعر میں بھی اتنی ہے قباحت — سبق اس سے پڑھیں اس وقت ہوں گر میر استاد
اگر وہ دیں دلا ہم کو بلا کو آکے حاصل — سمجھنا مطلع ابر کا اس کے سخت ہے مشکل

بدعت ہی فغاں نفید معنی ہائے نازاد
کہ شرح عکت امین است مرگاں دمازاد

مزاحیہ کلام کے دو مجموعات لکھنؤ میں جمع کیے گئے ہیں جن میں سے ایک میں نہایت دلکش قصیدہ نظم کیا ہے اور دوسرے میں عام طور پر شیرینوں کا مذاق اڑایا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے دل میں سادات کی عزت نہیں ہوتی اور اثنا عشری کے آئین سے مطلقاً واقف نہیں ہوتے اور اپنا پیٹ بھرنے اور اپنی بڑائی کرنے کے علاوہ وہ کسی اور کام سے مطلب نہیں رکھتے۔

خصوصاً اس زمانے میں جو وہ مزا ملی ہے گا — جہاں کے بل خطا کو جو پوچھو تو وہ بھی ہے گا
زلیس کی فاسبی حق آل محمد کیا شتی ہے گا — کہوں کیا میں فلک اس کو بڑا وہ ہوگی ہے گا
اگر فقط ارجال افتد زیبا لانس کم گیری

میر محمد تقی کی ہجویات کے بارے میں ایک مدت تک یہ غلط فہمی رہی کہ یہ میر تقی میر کی ہجویات ہیں لیکن دراصل اس نام کے ایک اور شاعر گذرے ہیں۔ ان کے مرثیے بھی خاصے مشہور ہوئے۔ تقی تخلص کرتے تھے اور چونکہ سادات سے خلق تھا اس لیے میر محمد تقی کہے جاتے تھے۔ اس معرکہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ میر محمد تقی اپنے معاصر مرثیہ گو پر اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے کہ عام مرثیہ گو مرثیہ کہنے کا فن بھلا کیا جانیں اور اس فن کے اسلوب کو تو انکے ماہر سمجھا اور سیکھنا چاہیے۔ ایک رسالہ میر تقی کے سلام اور مرثیہ پر تو دا نے تصنیف کیا اور اس میں اصل مرثیے کے ہر بند کو پیش نظر رکھ کر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس رسالہ کی تنبیہ میں لکھا ہے۔

میر صاحب ہمرے کرم فرما — بندہ عاصی نکاں جسم و نزار
عرض رکھتا ہوں اے کرم گستر — اعتراضی سے پر بھرے ہے ڈر
کھل سکتا نہیں میں اپنے لب — اس سبب سے کہ یہ ہے جائے ادب
آپ کے ہوتے جب کسی کے حضور — مرثیہ کہنے کا ہوا مذکور
واں یہ بولی زبان گہر طراز — حق میں اس بے نوا کے بندہ نواز
یہ غزل کی جو وہ بکھیرے ہے — لفظ و معنی میں اس کے کم ہے خلل
مرثیوں کے سنے جو گیتے بند — بندش ان کی نہ آوے اپنی پسند
سنی ان کے تب آدمی فہم کے ہاتھ — شرح لکھ دے ہر مرثیے کے ساتھ
جب پہ تحریر میں سنے پسند — دل میں ٹھنڈا کہ مرثیے کا فن
ہوئے گا فن شعر سے باحصہ — میر کی گفتگو ہے وال اسپد
اس کا آگاہ ہو کوئی ہو خوب — سیکھے اس کا کہنے کا اسلوب

باہر اس فن کے جب کہے ہیں خود — دل میں تم سب کو فی نہ ٹھہرا دے
آپ کہتے مرثیوں کو تب کہ شعر — ڈھونڈھتے ہیں لنگا ہر ایک کے گھر
اتھا آیا میری بستی تمام — فرض یک مرثیہ اور ایک سلام
ہم سے میر اجب ان نے دم لیا — دم اپنا بہت بجا یا یا
مرثیہ کہنے کا جو ہے آئیں — واقعی فن شاعری میں نہیں

جیسا اوپر شعر سے ظاہر ہے سودا نے طنزیہ انداز میں مرثیہ گوئی کو فن شاعری سے مختلف قرار دیا ہے۔ اور اس کا ایک ہی معیار قرار دیا ہے کہ اسے سنکر عوام اس پر رونے لگیں۔

آپ کے مرثیے کا ہوں لت کی — خون جس سے عوام کالے دل
سن کے جس کو ہیں پہ جھونک — شام تک کوئیں سویرا صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس — یہی آتا ہے بار بار افسوس
بد ہو جیا کہ جھ جیسے روئیں — معنی اس کے نہ جھ سے حل ہو دیں
جب یہ صورت خیال کرتا ہوں — اسی غیرت کے مارے مرتا ہوں
..... ہیں تو آگاہ اس سے مرتا ہوں — جھ فی امت میں بیٹھ کر رہ ڈل

مرثیہ اور سلام پر اعتراضات کی نوعیت تم تاد بی ہے۔ اس میں استہزاء اور مزاح کا پہلو کم ہے لیکن میر حسن نے اپنے تذکرہ میں میر محمد تقی کو بڑے شد و مد سے یہ کہا ہے اور ان کی مرثیہ نگاری کا ذکر احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔

"سید نجیب الطرفین الاعرفہ گو بان حضرت ابا عبداللہ الحسین سید محمد تقی مرثیہ گو ہاشمی۔ فقیر اصلاً میرٹھ لیکن اکثر اوقات آن بزرگوار شنیدہ۔ مولد ش شاہجہاں آباد۔ الحال لبلدت فرخ آباد استقامت دارد۔ گاہ گاہے فکر شعر ہم می کنند۔"

سودا کا ایک ادبی معرکہ میر تقی میر سے بھی ہوا۔ یہ دراصل جوابی حملہ تھا تیرے سودا کے کتے پالنے کے شوق پر قطعہ کہا تھا اس کے جواب میں انہوں نے کہا جو یہ تھا

کرتی ہے زباں اپنی مری نسبت سے کوتاہ — لے گل ہوں میں اس باغ میں نے خار سر راہ
خوبی سے نہ شہرہ نہ بدی سے ہوں باخواہ — مستے بہ میکدہ ہر شام و سحر گاہ
واقف کسی سے میں نہ جھ سے کوئی آگاہ

جو پائے مشیت کے تئیں تجھ کو ارادت — خدمت میں جھے پیر خرابات کی بیعت
بے کیا سبب اس خبث کا جز یہ کہ حماقت — محو دف کا نہ عاشق ہوں کہ موجب ہو مغابت
دل کش بت ہندی مرے حق میں ہری دل خواہ

اس شعر کے عنوان ہی میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ "در جواب طعن میر تقی کہ ترا اعتبار شیخ نبود" اسے "کہ گفتہ" تو تقی کا طعن کیا تھا اور کس سلسلے میں تھا اس کا کچھ اتہ پتہ نہیں ہے ہوتا ہے۔ سودا کو لوگوں کا بہت شوق تھا اور ہر قسم کے لوگ ان کے پاس تھے۔ اس پر تیر لذاق الیاد شوا پ خلقت میں میر صاحب نے لکھا ہے کہ اس کے دلی میں تین کنیاں پالی تھیں جن میں سے ایک کو ہم پسر تی دوسری کو لونگی اور تیسری کو بڑی لکھتا تھا۔ صاحبیاں کی گالیوں کے باوجود بھی کوئی کہاں پیشہ تھا۔ میر صاحب کے قطعے کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

دلکار کے کو تو ہو، چنا وہ پئے	ہے اس کی استواں تنکی کنوں کیلئے
کتوں کو کے کہ دو سیاہ و سفید پشم	کس کس طرح سے دیکھنا ہو اب ایلغم
دلی میں تین کنیاں کہیں لیکے پالیاں	جس باں کی محبوں کہ لیتے کہا نہیں گالیاں
بے رحم تو دیر ہا رونا غم زدہ	پسری کہ تجھے پیر و سب تک تم زدہ
لونگی کا گرم غم جو ہوا سو کہ ٹھنڈا ہوا	بڑی کی ضرب ہی سے شکستہ ہیچ ہوا

سودا کے اس کا جواب اس طرح دیا۔

دنیا کے بھی جھیلے کا سگ نفس ہی ہے	شیداں ہو جو گیدڑ کہ کرو فی ہے غاب
وہ بھونکے جو اس میں کہ غفلت ہے سب	نے خوبے وہ گو ہو ہو اور کا ناب

اس حوالے میں لے شک غفلا کو ہوئے اشباہ

کہاں ہے سگ نفس کو تو نے شکاری	اس واسطے اس ساتھ تجھے دل سے ہے یاری
نہ پروش اس کی ہیں ہوا نات ہماری	ہر دار سوا میہ حوال اس نے نہ ماری

گیدڑ کبھی کھوا ہے ہے تجھ کو کبھی روباہ

آخر میں کہتے ہیں کہ یہ کار ادبیہ کا لسان کا مقابلہ کیا ہے

تھا نہ زبان پر سخن راست نہ آئے	حق ہو جو تجھ سے کوئی اس کو نہ چاہئے
کہتے کا منہ تو نہ پاک ہو آئے	ملت کی شوخ کے جو رہو ہے نہ چاہئے

خالی کریں دھو رہو لے زمزم کا اگر چا ہ

فقدی بچا ہے سودا کے معرکوں کے خاصی شہرت پائی۔ فقدی فارسی گو شاعر تھے اصفہان کی ادبی شہرت بھی تھی اور شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ یہ بھی پہلا حملہ فقدی کے حسب و نسب ہی پر ہوا اس مثنوی کا عنوان ہے۔ "در ہجو فقدی متولد بچاپ کہ در اصل نقال بچہ بود" اس مثنوی کی ابتدا ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ فقدی نے سودا کے اشعار پر اعتراضات کئے تھے جن کے جواب میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ سودا کے جس شعر پر فقدی نے اعتراض کیا تھا اس میں دین کا لفظ مشترک اور برہمن دو لفظوں کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ فقدی کا اعتراض یہ تھا کہ دین کا لفظ برہمن کے لئے استعمال کرنا درست نہیں۔ اس کے لئے دھرم کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں سودا نے کہا

آیۂ قرآن کو کیوں دھرم کہو تم	کافروں کو بے ادب کیوں لکھو تم
دونوں پا طلق دیں اندائے قرآن ہے	خواہ برہمن کہو خواہ مسلمان ہے

پھر فدوی کی زبان دانی کا مذاق اڑایا ہے:۔

کہتے ہیں یہ طرز میں اپنے یہ ہر ایک سے / مجھ سا زباں داں ہے کون پوچھ لو ہر ایک سے
شاعروں میں ہند کے ہیں گیا ایران تک / سیکھی زباں داں کی بھی جائے خراسان تک
پر جو انھوں کا سخن پہنچے کو گوش فہیم / منشی زباں داں ہے وہ بجائے علیم
ایک تماشا ان کیا گو کہ یہ کے گو جائیں / جیسے ہی یہ دھرے جائیں ویسے ہی اور قدم ہیں
پوچھا زباں ان کی سے شعر تو موزوں ہوا / کاتب بیچارہ مفت لعن کا مورد ہوا

اس کے بعد ایک نقل نظم کی ہے ایک وقت ان بندگی بھی بیٹے کا قرضدار تھا اور اس قرضے کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اتفاق سے ایک الو اس کے ہاتھ لگ گیا اس نے اسے کلاہ پہنائی اور سجا بنا کر اس کو ہاتھ پر بٹھا کر بازار سے گزرا۔ بیٹے نے پوچھا تو اس نے کہا قسمت سے ایک باز ہاتھ لگ گیا ہے شاہ میں وزیر یا اس سے [illegible] ہیں اور اس کی قدر و قیمت [illegible] بیٹے نے اپنے قرض کی ادائیگی کے [illegible] باز مجھ کو دے دو [illegible] سودے [illegible] جب بیا اور خرید کر گھر لایا تو اس کی [illegible] یہ باز نہیں ہے [illegible] بیٹے نے [illegible] تدبیر سوچی [illegible] دکان پر [illegible] ہیں وہ لوگ ضرور نکال دیتا تھا

سوچ کے کہا پھر یہ گیا بیٹے نے دل میں خیال / یوں ہی اسے بیچئے بات کو ٹھیرے ہیں ڈال
پاس مرے جو رہے کی بات جو ہے بیچئے / اور بھی تھا یہ کوئی کچھ سا ہی احمق ملے
گھر تئیں وہ لا کر باندھ بیٹھا تھا دکان پر / صبح سے بیٹھا رہا شام ہوئے تا سحر
پوچھے تھا جس کسے کو کوئی خریدے گیا / لائے تھا بیا وہیں تب یہ سخن بر زباں
سارے شہر میں بازی کی بات چلی کچھ بھی تو ہے / سب پوچھتا دام کی یہ بھی ہے اور بھی ہے

اس حکایت کو مصنف نے فدوی پر کس طرح چسپاں کیا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔

چاہا تھا اس عقل پر باز معانی کو لیں / لگ ہنگ آن کر ادا سے سخن ہو دیں
مل گیا دلی میں ایک ادنیٰ گرہ شدہ ادھر / نجم و زہرہ کے کاتب پوچھیا ان کے طور
سوزن کو سنگ سے لے دیدہ دلا کو دیا / باز معانی ثبت کا انھیں اڑا دیا
باز کی جا بوم [illegible] پہنچی ہر دو جانب / ہم جو پوچھو نقد تو یہ تخلص بتا دیں
باز جو لے بیٹے کو آنسے سے بتا دیا / حق انھیں حق نے یوں شاعری کا دیا
دل میں اب اندکے یہی فکر ہے [illegible] ہند / ایسے کیسی ریچ کر اپنے لیے [illegible] وقار
دادا ہی شہر میں اپنے ہیں اک جو [illegible] / [illegible] میں اشعار کی دستار [illegible]
بیٹھے بیٹھے ہیں وہاں [illegible] / لگتی ہے اشعار کی جا پیر ان کو [illegible]
اس پہ جو کوئی لگے کان سے سنے (؟) / پوچھے تو دیتے ہیں جواب [illegible] فدوی [illegible]

اسی بحر میں مثنوی میں غدر کے ایک اور اعتراض کا بھی سودا نے رد کیا ہے یہ سودا کا ایک شعر تھا جس کا مضمون الفاظ بدل کر سودا نے مثنوی کی بحر میں اس طرح نظم کیا ہے۔

تم نے جہاں دام کئے بند قبا میری جاں
جاکے کھلا نیفہ باغ کھول دیئے گل کے کان

غدر نے اس مضمون کو ترمیم اضافے کے ساتھ نظم کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا یا بقول سودا سیر سے ڈیڑھ سیر ہو گیا غدر کے شعر کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

کھول دیئے ناز سے تم نے جو چشم اپنی جان
کھولے صبا نے بسن غنچۂ نرگس کے کان

سودا نے ایک تو اس پر سرقہ کا اعتراض کیا۔ دوسرے یہ کہا کہ زیر لفظ کھلا ایسا کون سا معشوق ہے جو باغ میں اسطرح آنکھیں موندے بیٹھا ہے اور کبھی کبھی نرگس پر ترس کرنے کے لئے آنکھیں کھول دے اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ کان کی نسبت گل سے چھدا ہوا ہے اور نرگس کی نسبت غنچہ سے ہے اس لئے نرگس کے کان کی ترکیب صحیح نہیں۔

غدر کی ایک اور بحر جس کی مثال میں بھی کہی ہے جس میں نیئے کے لوگ تمثیل کو قائم رکھا ہے۔ اس بحر میں غدر کی صفت گوئی پر طنز کی گئی ہے غدر سے کاریگری بتایا گیا ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نظر کرو تو غدر بھی کھڑے ہیں با شعور — جو طنبے کسی کس رہا کسی کے جوڑے ہیں عرور
کسی کو صنعت شعر اس سے کچھ نہیں حاصل — ہوئی ہے بسکہ یہ صنعت گری سری مشہور

ہر ایک دیکھئے تا ہے الو نیئے کا

فہیم ہو میری صنعت پہ جائیے قرباں — بھی بولی کی میں جو چرچ اسکی زباں
کہ جو سمجھے ہے اسے کچھ نہیں ہے اس پہ عیاں — ہے سمجھ ہے وہ ہوا ہی اس کو سن حیراں

سخن جب اپنے ستا تا ہے الو نیئے کا

آخری بند میں صاف صاف اس بات کی صراحت ہے کہ غدر کے نام کے ساتھ نیئے کے لوگ کی حکایت کو مشہور کرنے کی غرض سے نظم لکھا گیا ہے۔

غرض جو چاہوں سو کر ڈالوں دم میں سکے تئیں — جو موڑ آڑی جاؤں کر جوڑے سو پیسے نہیں
کسی کا یاں دبے کچھ ہنر ہے مجھ کو عیاں — جو ہے بسکہ یہ مصرع جہاں کے ذہن نشیں

کہ غدر کی جگ میں کہا تا ہے الو نیئے کا

قیام الدین قائم سودا کے ادبی معرکے کی یہ دلچسپ مثنوی کی شکل میں محفوظ ہے جس کا عنوان ہے "مثنوی باطل ساقی نامہ جو میاں قائم" پہلے قیام الدین قائم سودا کے شاگرد تھے بعد کو انہوں نے سودا کے چند اشعار پر اعتراضات کئے اور شاگردی سے دست کشی اختیار کی۔ سودا نے اس کی سزا یہ مثنوی کی شکل میں دی اس مثنوی میں ہجو اور رد و قدح کے اچھے نمونے ہیں۔ ساقی نامہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

ساقیا بھر اس مئے جاں سوز سے جام — جس کا بھرے سلری بھی ہو غلام

گردے لب میرے کو اس سافوسے پر — آگے پھر قدمت خدا کی سیر کر
باگ بکری سے کہے ایسی ہی جھند — باگ کو بکری کرے میداں میں بند
دانت کھٹے باگ کے بکری کرے — باگ کے گھر میں جو بکری چرے

باگ اور بکری کی تمثیل دراصل قائم ہی کی معرفت لی گئی ہے۔ قائم نے اپنے کو شیر بتایا تھا اور بعض دوسرے شاعروں کو بکری قرار دیا تھا۔ اس لئے سودا نے گریز میں اور اسی تمثیل کا ذکر کر دیا ہے۔

ٹک میاں قائم کے گھر کا سے صبا — کہہ سلام شوق تو جا کر مرا
بعد ازاں کہیو کہ اتنا بھی غرور — شاعری کے فن میں کرنا کیا ضرور
اصطلا کو بکری کہے شیر آپ کو — بکری بھی گر کچھ کہے پھیر آپ کو
بات بکری کی لگی تم کو بری — دو ڈرو تم اس پہ تلوم کی لے چھری

قائم کے کلام کی ہجو کرتے ہوئے سودا نے بعض بڑی نادر تشبیہیں اور تمثیلیں نظم کی ہیں اور مضحک پہلو ڈال کر نرالے انداز سے اجاگر کیا ہے۔

جب سے اس کے ہاتھ ہے تیغ قلم — قتل معنی کا ہے میرے دم بدم
سرخیٔ جاں اس کو تجھ سے ہے بعید — جا بجا ہے خون مضمون شہید
شاعری کے بیچ یہ نام آوری — میر و مرزا سے ہے بس ہمسری
مے جو وہ دیواں دو جز آپ کا — شکل آدھ مے کے جس کو لکھ
بانسلی کا فد اوپر دور دور — نکلے اس میں جم ہوئے وہ شور
سو بھی تو اس میں غزل ایسی نہیں — چار بیتیں جس میں طالب کی نہیں
سات بیتیں جب اکیلے ہو کہو — پانچ ہو دیں مبتذل بے معنی نہ

اس ہجو میں وہ جتنے اور بھی زیادہ رواں، مترنم اور جوش سے معمور ہیں ہیں سودا کے کلام کی تاثیر اور سوز و درد پر فرق گیا ہے اور اس کے مقابلے میں قائم کے کلام کے پھیکے پن اور اعصابیہ پن پر اشارہ کیا ہے۔ ایک مضحکہ خیز تصویر ملاحظہ ہو۔

سنتے ہو اے حاضران بزم یار — ہووے جو تم میں سے میرا غم گسار
یہ کہے اس شاعر بے درد کو — چھینک جو گھسے ہے آ سرد کو
سن تو ٹک اے عار ننگ شاعری — منہ سے تیرے دور ننگ شاعری
شعر کہنے کا یہی ہوتا ہے ڈھنگ — شور کو بدنام مت کر اے دبنگ
ایسے لازم ہے جو شاعر کہائے — ایک بس میں نہ تیرے ساتھ کھائے

اس کے بعد قائم کی گئی مشہور غزل کے ہر شعر کا تجزیہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے اکثر اشعار یا تو سرقے کے مضامین پر مبنی ہیں یا بے معنی اور مہمل ہیں۔ اثر اصلاح حال کی توقع سے سودا کے تنقیدی شعور کی عکاسی ہوتی ہے لیکن اس طرح سودا نے اپنی مخالفت اور ذہنی عداوت کو ایک عقلی استدلال کی بنیاد پر استوار کر دیا ہے۔

مطلع اول جو ہے سنگِ فسنزل — رکھتا ہے سو اس میں تو اب خلل
لے کے جس پر یہ کیا شور و فساد — جس سے آباد تھی گا دو دِ صیاد
مطلع ثانی سو الگ اس کا سیر — جانے ہیں اس کو سب بنا و پیر
لیکن اس کا تازہ کرنا خوب تھا — میر کی بھی طبع کے مرغوب تھا
ہے دل پروانہ اس سے باغ باغ — طبع کو روشن کیا لے کر چراغ
سات میں سے کچھ تم دو کا حساب — باقی جو جاتی ہیں دو ان کا جواب
تیسرا جو شعر ہے اس کا یہ حال — جس کے معنی نطق کے دو رہ خیال
شعر یہ چوتھا سنو اے مہرباں — جس کے معنی نظم کر سکھے بیاں

اس کے بعد چوتھے شعر کا مضمون کئی اشعار میں نظم کیا گیا ہے اور اس کے نظم کو ظاہر کیا ہے۔

ہوئے پہلے ہی قدم میں گم ہم — کہ چلوں تجھ کو سے جو نقشِ قدم (۱)
نقشِ پا کو چلنے سے تشبیہ کیا — وہ تو ہے جس کا محض رہتا ہے سدا
گو سے پڑھے ہیں "وادیِ حسرت" میں — لیکن اس کا سوز کے دل نشیں
اس سے معنی گر اس بندش میں ہیں — عقل کل بھی وہ نہ سمجھے گا نہیں
شعر دو اچھے ہیں دیکھ کر کے غور — اس کا دعویٰ تم کرو یا کوئی اور
وہ جو مطلع ہے سوالیہ ہے پھر — لکھ رس بھتے ہیں جس کو دیکھ کر
وہ جو نکتہ سر پہ رکھتی ہے توی — پیچھے دیکھے ہوگے سیر جبری
سن چکے احوال سارے شعر کا — اب کہو تم اپنی یا بلغ العلیٰ
کون اس میداں میں بجز کوں شیر — بول اٹھو جلدی سے دیجے نہ دیر
لیکن اس جا اک عبث ہے یہ سوال — ہے کہ دوں کو اس یاں سے انفصال

غدوی کی ایک رد "ہجو" مندرجہ ہے میں یوں استاد۔ میں کیا فن ست غدوی ہجو" مجھ کیا ہے میں شامل ہے۔ لیکن یہ الحاقی ہے۔

آخر میں شیخ علی حزیں اور مرزا مظہر جان جاناں کے کلام کی جو بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ شیخ علی حزیں اور سودا کے تعلقات کے بارے میں مختلف رائے ہیں۔ کچھ کا بیان ہے کہ سودا کو ملک الشعرائی کا خطاب بھی شیخ علی حزیں ہی سے ملا تھا اس کا ایسی سودا کا اس شعر سے کرتے ہیں۔

ممکن نہیں یہ روح مقدس سے حزیں کی
ایسی جو غزل ہووے تو سودا اصلاح پھوڑ

لیکن اس روایت کی صحت میں شبہ ہے کچھ محققین کا بیان ہے کہ شیخ علی حزیں کسی ہندستانی کی فارسی یا ریختہ شاعری سے قائل نہ تھے مگر جب سودا کا یہ شعر سنا

بلند کہے تیرے صید نہ چھوڑ نالے ہیں
تڑپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

سودا سے متعلق یہ ہے کہ سنی تو پیچھے وہ اس قدر بے اختیار ہوئے کہ سینے سے لگا لیا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ سودا کے شعر سے مرزا صاحب کو اور بھی چڑ ہوگئی۔ بہر حال مرزا کی ہجو کے باوجود سودا ان کی استادی اور کمال فن کے معترف ہیں۔ میرزا مظہر جان جاناں کے طرز شاعری پر سودا کا طنز بہت مشہور ہے۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختے کے بیچ — سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ — واقف جو ریختے کے ذرا ہوئے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ یہ ہے — اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شاہ کی لاٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں
کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

اس کے علاوہ دو مختصر ہجویہ قطعے فدوی پنجابی اور میر محمد تقی کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔ فدوی پنجابی کی تضحیک کے پانچ اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

شاعر جو ہے فدوی کہ یہ شاعروں کا — مادہ وہ زن فکر سے یاروں کا ہے تو ہوا
معقول شعر اس سے لگا ہے ساتھ ہم نے — جس میں ہیں نہ ان کی نہ ادھر کی نہ ادھر کا
کوئی باہم اس کے گھر کا پتہ بتلائے — اور جو کہ کہے کہ پوچھو بتلائے سب مجھا
حسرت سے دھول دھپا اڑا ہے شعر کا — یاں تنگ کو تو اپنا کہتا ہے یہ بچلا
غرض اس کا یہی ہے دعویٰ کہو ہیں کیا کہاں؟ — یا خضر کا گھر ہے ہزار کا ہے کلا

میر محمد تقی کی ہجو میں جو نظم لکھی ہے وہ بھی طالب آبادی کی ہجو میں ہے۔ اس میں کاتب کی زبان سے میر کی غلطیوں کی صحت ظاہر کی گئی ہے۔

ایک مشفق کے گھر گیا تھا میں — سو بہ نقل ان عجائب ہے
ان کے گھر میں ہے ایک مرد بزرگ — خوش نویسی کے فن سے کاسب ہے
دائم اس کو نوشت کا ہے شغل — ہے بجا گر کہوں کہ کاتب ہے
پہنچا ناگاہ وہ آ کے مجلس میں — اور وہ نفس شوم غالب ہے
ورد تجھ سے ہاتھ اٹھاؤں میں — کیا کروں شکر قرض واجب ہے
میں جو پوچھا سبب کہا مت پوچھ — بات کہنی یہ نامناسب ہے
لیکن اس واسطے میں کہتا ہوں — درد مند کا تو طالب ہے
ہے جو کچھ نظم و نثر عالم میں — نذر یار اور میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح — لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

یہ سودا کے دہلی سوکوں کا ایک سیاسی خاکہ ہے۔ اس میں صرف ان معرکوں کی مختصر تصویروں کو پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن ان ادبی معرکوں کی اہمیت سلم ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں بعض جگہ ذاتی عناد اور بحث ہو لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ تنقیدی شعور کا عکس ہیں۔ ان سے ہمارے عہد کے مذاق کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس دور کے معاشرتی احوال کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور ہجو میں بہت خوش رنگ تصویریں ملتی ہیں۔ یہ تصویریں ہی ہم سے اس دور کے ادبی ماحول کی اہمیت کی شہادت دیتی ہیں۔ اس کی ضرورت ہے کہ ان ادبی معرکوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا جائے اور ان کی مدد سے اس دور کے ادب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

میر حسن کی غزل گوئی

ڈاکٹر وحید قریشی

میر حسن کی غزل گوئی کا زمانہ وہ ہے جب پاک و ہند میں فارسی اپنے دن پورے کر چکی تھی۔ مغلیہ خون کی پرچھائیاں ماند پڑنے لگیں فارسی ادب کی شان و شوکت بھی رفتہ رفتہ مٹنے لگی تھی۔ ایران سے نئے اثرات کا سلسلہ ایرانی قزلباش منقطع ہونے لگا تھا۔ ہندی فارسی اور اردو کا میل ہونے لگا۔ فارسی غزل کی روایات جو اورنگ زیب عہد میں مستورم ہو چکی تھیں اب بھی جاری و ساری ہونے لگیں۔ تمثیل گوئی اور تہ داری کا رواج ہوا۔ اردو میں ابہام گوئی کے بعد تازہ گوئی کا آغاز ہوا۔ یہ دور میر و مرزا کا تھا۔ اکبری دور کی غزل اس دور کے شعراء کو سونپ گئی۔ اردو میں ایسی چلت ہوئی۔ شاہ حاتم نے بھی پرانا بستہ لپیٹا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے نوجوانوں کی صف میں داخل ہو گئے۔ اب الفاظ کی بھول بھلیوں میں پڑنے کی بجائے سیدھے سادے غزل کا رواج ہوا۔ اس میں بھی فارسی کا رنگ شامل تھا۔

دلی کے اثرات جن کی اساس میر و مرزا کا کلام ہو گئی تھی سیاسی انتشار کے سبب آوارہ خرام ہو گئے۔ جب مغلیہ چراغ کی لو جھلملانے لگی تو شمع دہلی تقسیم ہو گئی۔ بنگال میں علی وردی خاں اور اودھ کی ریاست میں سعادت خاں نے سنبھالی۔ سعادت خاں کی اولاد اس پر حکومت کرنے لگی۔ روہیل کھنڈ بھی دہلی سے جدا ہو کر چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا۔ فرخ آباد، ٹانڈہ، رامپور وغیرہ اس طرح کی حکومتیں قرار پائیں۔ ناصری سلطنت نے دلی کا سہاگ لوٹا اور علوم و فنون کے دھارے صوبائی خود مختار حکومتوں کی طرف بہنے لگے۔ میر و مرزا بھی خانہ ویران ہوئے اور انھیں بھی دوسرے درباروں پر دستک دینی پڑی۔ ناصری عہد سے لے کر ابدالی کے حملوں تک شعراء کی نفسی و مکانی کایا پلٹ عالم ہا اچھتا نے اور اس کے گرد و نواح میں راجپوت کوس لن الملکی بجا رہے تھے۔ جنوب میں نظام الملک کی ریاست کے بہانے میں مرہٹوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ احمد شاہ ابدالی بادشاہ شمال کی طرف یورشیں کرتا تھا۔ اس طوفان میں انگریزی اقتدار جنوب میں ابھرنے لگا۔ مشرق میں اس کے قدم بنگال کی سرزمین میں جمنے لگے۔ پاک و ہند کا برصغیر آگ کے بے شمار گولوں کی آماجگاہ بن گیا۔

محلوں کے زوال نے، انفرادی شجاعت اور دلیری کی تو قدر کی اور نامی گرامی سرداروں کی شہرت کا ڈنکا بجتا رہا لیکن اس سے سیاسی نظام کے بادل نہ چھٹ سکے۔ انفرادی دلیری اجتماعی دلیری کا بدل نہ ہو سکی۔ سوسائٹی میں زوال سرایت کر گیا۔ لیکن سیاسی زوال ادبی زوال نہ تھا۔ اسی تاریکی اور افراتفری کے دور میں اردو کے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ اس سے انکار نہیں کہ سیاسی اور سماجی زوال کا اثر اردو شاعری خصوصاً غزل کے موضوعات پر پڑا ہے۔ کبھی زمانے کا غم انفرادی غم بن کر کبھی اجتماعی غم شہر آشوب بن کر ادب میں نمودار ہوتا رہا۔ شعراء کی زندگیاں بھی بادِ بلا کے مقابلے میں ہانپتی کانپتی دکھائی دیتی ہیں۔ شعرا ان انقلابات کے ہاتھوں بھوکے خانہ بدوش دربدر ٹولیوں بن گئے۔ رزق کی تلاش میں

ہمارے یہاں آ کر دنیا جہت کا مقام نظر آئی۔ ایسے میں تصوف ہی سکون دل سکتا تھا۔ اس دور میں تصوف شیعہ اور سنی دونوں فرقوں میں پایا جاتا ہے پیری مریدی کے سلسلے بھی دونوں میں رائج تھے۔ اس لیے شیعہ سنی کا امتیاز ایک عمومی پہچان بن کر رہ جاتا ہے۔ اور شاعری میں بھی کبھی کیفیت ان کی، کبھی دعا سی تعلقی زوال کا بالواسطہ اظہار ہیں۔ لیکن فی نفسہ اس دور کی اردو شاعری گھٹیا شاعری نہ تھی۔

قاعدہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ استادی شاگردی کا ادارہ ایک قوی اثر تھا جس نے نقال سے لے کر کامیاب تقلید تک راستے کھول دیئے۔ مختلف شعراء کے طرز دور دور تک چلنے لگے۔ تازہ گوئی کا میلان دلی میں پامال ہوا تو فرخ آباد، یہاں سے فیض آباد اور لکھنؤ کی بستیاں ان تحریکات سے آباد ہو گئیں۔ دلی کے مقابلے میں لکھنؤ اور فیض آباد کو ایک فائدہ اور بھی حاصل تھا۔ تصوف شاعرانہ سطح پر ان دو کا مسئلہ نہیں لیکن دنیاداری کی سطح پر تو یہ امتیاز موجود تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے تک میں یہ مذہبی اختلاف سیاسی اختلاف بن چکا تھا۔ ایرانی الاصل لہری کا امتیاز بھی اسی بنیاد پر تھا۔ دلی میں اختلافات کی یہ رسم لیلا خاصے دن منائی جاتی رہی۔ جب یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں تو شیعہ سنی بھی تقسیم ہو گئے۔ فیض آباد کے نواب شیعہ تھے انھوں نے شیعہ قبائل کی سرپرستی شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ شعراء دور دور سے فیض آباد تک رسائی حاصل کرنے لگے۔ میر حسن کا خاندان بھی اسی نسبت سے فیض آباد اور لکھنؤ پہنچتا ہے۔ حسن کے والد میر ضاحک ہوئی تھے۔ انھوں نے میر درد سے بھی زلہ بانی کی تھی وہ غالی شیعہ بھی غالباً نہیں تھے لیکن دل پورے کو سونے کے لئے تو نوابان اودھ و شجاع الدولہ کے دامن میں پناہ لینی ضروری تھی۔ اس طرح میر حسن کا بچپن دلی میں، اور بھرپور جوانی فیض آباد کی گلیوں میں بسر ہوئی اور لکھنؤ یا آخر ان کا گوشۂ عافیت بنا۔

اس حیثیت سے میر حسن کی غزل گوئی کو دیکھا جائے تو دلی کی اس فضا سے متاثر تھے جو میر و سودا کا میدان خاص تھا اور جسے ہم نے تذکرہ نگار تازہ گوئی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے فیض آباد آنے سے پہلے یہاں کی ادبی روایت بھی بکھر چکی تھی۔ یہاں بھی اول اول تازہ گوئی کا چرچا تھا۔ لیکن میر ضیاء الدین ضیا کے اثر سے غزل میں روایت لفظی اور انداز بیان میں قدرے پیچیدگی آ گئی تھی۔ پورب کی فضا میں میرا سودا۔ اور دور کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ تصوف کی گرم بازاری بھی ہے۔ اورنگ زیب تمثیل گوئی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک نیا رجحان لفظی صنعت گری اور پیچیدہ خیالی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بزرگوں کے یہ اثرات ایک طرف اور دوسری سمت میر سوز کی طرز نادرہ کی مخصوص نسل "چہلا" اور گفتگو بھی وجود میں آ چکی تھی۔ ان کے دوش بدوش جعفر علی حسرت کی شاعری تھی۔ جہاں گفتگو کے انداز نے معاملہ بندی کی بعض صورتوں کو بھی دیانت کر لیا تھا۔ میر حسن اس مسلم پر کھڑے ہیں۔ ان کے ایک طرف اردو اور فارسی شاعری کی قدیم روایات ہیں۔ اور بزرگ معاصرین کا فیض صحبت ہے اور دوسری طرف نئی نسل کی معاملہ بندی ہے۔ میر حسن ان دو ادوار کے درمیان ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیض آباد کے دینی و تعلقات، گھر کے صوفیانہ عقائد اور تعلیمانہ طور و طریق، سالار جنگ کی دیانتداری اور اجاشی۔ میر سودا کی متانت اور کھرکھاؤ، سوز کی بول چال، اورنگ زیب کی مثالیہ شاعری، نوجوان شعراء کی معجزیں اور اچپلاہٹ حسن کی شاعری کا خمیر اس سے اٹھا ہے۔

ان کے کلام کو دو واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۱۸۳ھ کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے۔ اس میں مثنوی در شادی آصف الدولہ، رموز العارفین (۱۱۸۸) اور دیوان غزلیات و متفرقات (اولین اشاعت ۱۲۰۳ھ) شامل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب حسن کی انفرادیت پوری طرح اجاگر ہوئی۔ دوسرا دور ۱۱۹۹ھ سے ۱۲۰۹ھ تک ہے جس میں مثنوی قصہ جواہر (۱۱۹۹ھ) قصیدہ در تہنیت عید (۱۱۹۹ھ) گلزار ارم (۱۲۰۲ھ) اور سحر البیان ہیں۔ غزلیں اکثر و بیشتر پہلے دور سے یادگار ہیں۔ ان کے دیوان کی پہلی اشاعت غالب

۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ لیکن ۱۹۳۱ء تک ان کے اشعار کی تعداد سات آٹھ ہزار تک ہو چکی تھی۔ دوسرے دور میں صرف چند غزلیں ہو سکتی ہیں کیونکہ ان کے دیوان میں اشعار کی تعداد تو ہزار سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہیں ہے۔ اس اعتبار سے میر حسن کی غزل گوئی کا جائزہ دراصل ان کے ابتدائی کلام کا جائزہ ہے۔

غزلوں میں میر حسن کی شخصیت دبی دبی سی مٹی مٹی سی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے معاصرین سے بہت زیادہ متاثر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دیوان غزلیات میں بھرتی کے شعر بھی بہت ہو گئے ہیں۔ ان کی غزلوں کا ایک تہائی حصہ معمولی درجے کی تک بندی پر مشتمل ہے۔ سرسری دو تہائی ایسا ہے جو ان کے مقام کو متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس دو تہائی میں حسن کی شخصیت کچھ ابھرتی ہے لیکن ابھی حسن وہ مقام حاصل نہیں کر پائے جو میر انیس میں ان کا رنگ خاص بنتا ہے۔

ان کی غزلوں کا سرسری جائزہ لینے سے خیال ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کوئی ہموار لفظ نظر گوئی خاص رجحان موجود نہیں ہے۔ ان کا دیوان ایک سیلابی قوت کا نشان معلوم ہونے لگتا ہے جس میں جذبات کی کوئی ایک سطح نہیں ہے۔ کبھی فلسفیانہ خیالات میں معمولی دنیاداری کی باتیں ہیں۔ کبھی تیر کے جھاؤں میں کبھی سوز کے ہمراہ ہیں۔ کبھی حسرت کے دوست کبھی سودا کے رفیق۔ ایک سیلاب ہے جو بے تحاشا اور بے ضرورت جدھر چاہتا ہے نکل جاتا ہے۔ مستقبل کے امکانات جھلک مارتے ہیں اور پل میں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بادی النظر میں مصحفی کی طرح یہ دعویٰ کا جھاؤ ہے کہ وہ کسی خاص رنگ کے پیرو نہیں لیکن بغور دیکھنے پر حسن کے اس رنگ خاص کا سراغ مل جاتا ہے جو ان کے بعد کے کلام میں بڑا نمایاں ہے۔

حسن کے استاد ضیاء طباطبائی تھا میری کے مقلدوں میں سے تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا نامقبول الفاظ کو خوبی سے شعر میں کھپانا۔ ان سے خاص ہے حسن نے اول انھیں کی پیروی کی۔ اشعار حسن کو بھی پسند تھے۔ اس طرح میر ضیاء کی تنقید سے مثنوی کا آغاز ہوا۔

تماشا کر نگاہ لطف سے اک بار گلشن کا — کرتا اہل چمن میں گرم ہو بازار گلشن کا
نہیں تیرے ابرو و مژہ جیسے صنم شمشیر و تیر — دیکھے ہیں ایسے تو توتے ہیں کم شمشیر و تیر

ان مشاعروں میں پورے الفاظ کہنے کا طرز ہے اور ایک معنوی الجھاؤ کا انداز ہے جو ضیاء سے شروع ہوا اور لکھنؤ کے شعراء بالعموم خاص کام بن گیا۔ جذبات کی جگہ خیالات تھے اور وہ بھی گنے چنے جنھیں رنگ تکنیک کا حصہ جان کر اپنا پلیٹ کر باندھتے رہتے تھے۔ جذبہ اور اس کا خلوص غائب ہے۔ حسن کو جلد ہی اس کا احساس ہو گیا اور انھوں نے سودا، میر، قائم کے مسلک کو اپنا لیا۔ اس دور کی یادگار صرف مثالیہ انداز اور تصنع (Pseudo) ہی باقی رہ گئے جو مولانا نسبتی سے مخلص تھے اور حسن نے بھی ان کو اپنے ہاں جاری رکھا ہے۔

میر و سودا کے زمانے سے حسن زیادہ متاثر ہیں۔ اس گروہ میں جذبے کا اجالا اور تجربے کا ابلاغ اہمیت رکھتا ہے۔ دوسروں کی بجائے اپنی بات کہنے کی لگن ان میں زیادہ ہے۔ ایہام گو شعراء کی طرح یہ لوگ ہر جذبے کے فہم کو دو متوازی اکائیوں میں بانٹنے کے خواہشمند نہ تھے بلکہ یہ لوگ اکہری دو سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے ہر بڑے شاعر کی آواز دبستانی اشتراک کے باوجود ایک دوسرے سے الگ ہے۔

میر کی خود رحمی ان کی نرم و نازک غم انگیز آواز شروع سے پہلوانا ہوا انداز جس میں ذرا سی بے احتیاطی شعر کو سپاٹ کر سکتی ہے متقدین کے لیے شوق کا باعث ہو گئی۔ میر نے غم کو اجتماعی رنگ دینے میں کامیاب ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں متوسط ہیں جن کا بلند بانگ تغزل۔ اصناف کا

تسلسل روایت کی پاسداری تنہائی کا احساس، نئی ثقافت کا خیال۔ دلی کا نوحہ۔ غیر مرئی اشیاء کی تصویر کشی یہ سب کچھ بھی میر حسن کو پسند ہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو خواجہ میر درد کی سادہ نگاری ہے۔ درد کا تصوف ان کی عالی فکری اور کسک میر حسن کو بہت پسند ہے۔ حسن میر تقی میر کی غزلوں میں شعر کہنا قابل فخر سمجھتے ہیں۔ میر کی لمبی بحروں کی انھوں نے پیروی نہیں کی حالانکہ ان بحروں میں میر کے رنگ کو اپنانا زیادہ آسان ہے۔ وہ چھوٹی اور رنگین ہوئی بحروں میں میر کا رنگ اخذ کرتے ہیں۔ لیکن میر کی جنونی کیفیت اور بے لحاظی آہ و بکا حسن کو پسند نہیں۔ وہ صرف اس کے لہجے کو اپناتے ہیں۔ انھیں میر کی بے ذاتی اور قلندرانہ وضع بھی مرغوب نہیں۔ شاید اس لئے کہ حسن نے کلام میر کو خواجہ میر درد کے پہلو میں کھڑے ہو کر دیکھا ہے اور اس کی نظر بھی انھیں گوشوں پر پڑی ہے جو درد کو پسند تھے مثلاً ؎

کب میں گلشن میں باغ باغ رہا — میں تو جوں لالہ داں بھی داغ رہا
سیر گلشن کریں ہم اس بن کیا — اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا
دل خدا جانے کس کے پاس رہا — ان دنوں جی بہت اداس رہا
کیا مزا مجھ کو وصل میں اس کے — میں رہا بھی تو بے حواس رہا
جب تلک میں جیا حسن تب تک — غم میرے دل پہ بے قیاس رہا
جان دو دل میں اداس سے میرے — اٹھ گیا کون پاس سے میرے

سودا سے میر حسن نے زیادہ کام لیا ہے۔ الفاظ کی تراش خراش جو سودا کے ہاں نظیری سے آئی ہے۔ شوکت الفاظ۔ بھاری لہجہ۔ سودا کی غزل گوئی کے نمایاں پہلو ہیں میر حسن اس سے بھی کام لیتے ہیں۔

کس کو سنوں یہ رنگ جو گلدان میں — میں پھر رہا ہوں اپنے ہی شور فغاں میں
زیر زمیں ہیں اشک بہے اور فلک پہ آہ — میں بھی تو چھپا ہوں زمین آسمان میں
غیروں کی آہ و زاری کی نوبت گئی کہ — ڈنکا ہے اب تو باتوں کا میری جہان میں
جوانی یاں نہیں رہتی کسی کی — یہ عمر اے جاں نہیں رہتی کسی کی
ترقی و تنزل ہے ہمیشہ — یہ عز و شاں نہیں رہتی کسی کی
حسن مت یاد کر ان صحبتوں کو — سلامیاں نہیں رہتی کسی کی

میر حسن احساس کمتری میں مبتلا تھے لیکن جب وہ اپنی پوچا پر آتے ہیں تو زیادہ کامیاب نہیں رہتے۔ وہ سودا کی شخصیت کی بجائے اس کے کلام کے خارجی پہلوؤں سے زیادہ متاثر تھے۔ موضوعات کا اشتراک کہیں کہیں ضرور ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نوحہ۔ دلی کا نوحہ۔ دلی کی یاد۔ ماضی کا تذکرہ۔ یہاں سودا کے انداز کو اپنانا زیادہ آسان ہے۔ حسن بھی اسی خنک بادپا پر روانہ ہو جاتے ہیں ؎

کبھی بستا تھا اک عالم یہاں آکا — یہ دل جواب کہ اجڑا سا نگر ہے
دل غم سے تیرے لگا گئے ہم — کس آگ سے گھر جلا گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع — رو رو کے جگر بہا گئے ہم
مانند حباب اس جہاں میں — کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

غوطاں کریں گے دیدۂ پرآب دیکھنا ایکے ہیں بے طرح سے یہ تالاب دیکھنا

حسن اور سودا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حسن حسیں کسری کا شکار ہو کر اپنی ذات کا اظہار براہ راست نہیں کر سکتے۔ وہ اس کے واسطے بالواسطہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کبھی صیغۂ واحد متکلم استعمال بھی کرتے ہیں تو ان کا کلام جاندار نہیں ہوتا۔ وہ بالواسطہ اظہار میں زیادہ کامیاب ہیں۔ اسی لئے اپنا ماتم کرتے ہوئے وہ میر کی طرح خود ترحمی کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے اس طرح کے اشعار میں ایک کبھی ہوئی سی کیفیت ملتی ہے۔ یہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ حسن نے میر کے کلام سے استفادہ میر درد کی وساطت سے کیا ہے۔ رنج و ملال کی یہ کبھی ہوئی کیفیت۔ بر تقی تیر میر درد اور میر سوز میں مشترک ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حسن ان اقدار کے اصلی نمائندے ہیں جو میر اور درد اور اثر میں پائی جاتی ہیں۔ درد سے ژولیدہ فکری کا اقرار میر حسن نے جا بجا غزلوں میں بھی کیا ہے۔ انسان کی زیبوں پر غور میں کمی ہیں۔ زبان، کلاسیکی اور روزمرہ کی پیروی سے قطع نظر حسن کے داخلی رجحانات کی تعبیر میں بھی میر درد کو خاصا دخل ہے۔ درد کے صوفیانہ خیالات اب لہجے کی نرمی میر حسن کو بہت بھا گئی ہے۔ میر حسن سوز اور تیر کے رنگوں کو الگ الگ زیادہ کامیابی سے پیش نہیں کر سکے لیکن درد کے معاملے یہ بات نہیں۔ یہاں وہ درد کے مخصوص رنگ کو بھی نباہ جاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر ان کی انفرادیت کا مرکز وہ لفظ کلام درد سے چل کر میر اور سودا کے رنگ کو ملا جاتا ہے۔ درد کا کلام میر حسن کا نقطۂ تحریک ہے۔ اس کی مدد سے وہ دوسرے شاعروں کے کلام کو دیکھتے ہیں۔ حسن نے درد کی آواز کو دوسرے معاصرین کی آوازوں سے ملا کر اپنا رنگ تیار کیا۔ میر حسن جب اس طرح تخصیصوں کو فراموش کر کے محض رنگوں کی امیر مشق کرتے ہیں تو ان کے ہاں تقلید کی وہ گھٹن اور سیکنڈ ہینڈ حالت نہیں پائی جاتی جو اشعار کو سپاٹ کرتی چلی جائے۔ ایسے موقعوں پر میر حسن کی ذات شجر کی عمل میں کارفرما ہوتی ہے۔ شعر کہنے سے پہلے وہ جس کا اپنا رنگ کلام میں۔ مندرجہ ذیل اشعار اس کے گواہ ہیں۔

تجھے جو خیال بات اس سے باتوں کا جہیں دماغ کب تھا
یہ تھی تمیں آپ نہ کہتے تجھے آنسو حسن بات کیا تجھ کو غم تھا کسی کا
جان میں میری جب ان آئی تھی کل جب کسی کے پاس ان آئی تھی
پھر دہک اٹھی آگ دل کی ہائے ہم نے رو رو ابھی بجھائی تھی
گل بگولوں سے بھر گیا تھا دشت کس کی وحشت نے خاک اڑائی تھی
ستم تربت مجھ کو یاد آئی اپنی اوقات مجھ کو یاد آئی
دلبرو ہم اپنے جب ملیں گے اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے
یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے کب جانے اس سے کب ملیں گے
جان و دل و ہوش و صبر و طاقت اک بت نے اس کے سب میں گے
دنیا ہے سنبھل کے دل لگانا یاں لوگ عجب عجب ملیں گے
ظاہر میں تو آ کے جب نہیں ہے کوئی ہم یار سے کس سبب ملیں گے
ہوگا کبھی وہ بھی دن جو ہم واماندہ سے روز و شب ملیں گے

میر حسن کے کلام کا یہ رنگ بھی ہے کہ وہ معاصرین اور متقدمین کی پیروی کرتے کرتے کبھی کبھی اپنا راستہ بھی نکال لیتے ہیں جہاں قدما کی شعوری پیروی میں حسن دب جاتے ہیں اور اپنا آپ ظرف وہاں بچا لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ شخصیت کی بجائے تحریک سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔ بزرگ معاصرین اور قدما کے شعری سانچے داخلی اظہار کے لئے نئے تھے

اور حسن اپنے ردعمل کو داخلی انداز میں پیش کرنا چاہتے ہیں ان پیمانوں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن نفسِ تی اعتبار سے میر حسن ایک نیا گروہ تھے
یا کم سے کم میں زیادہ گہرائی ہے۔ یہ دہلی جانے کو بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں کہ ایک خارجی تصویر بنا کر پیش کرتے تھے۔ غزل میں اس کی صورت نو عصر حاضر سے فیض حاصل کر کے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میر حسن، سودا، حسرت۔ یہ تسلسل اشارہ سے بھی اثر لیتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اس کا انداز، تیور کے خود ذکیہ ہم نئی نسل پر میر، سودا اور حسرت کی حکمرانی تھی۔ سودا کے شاگردوں میں رضا قلی آشفتہ، نوازش حسین مرزا خانی اور سید انشاء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہم بول چال کے انداز کو سودا نے غزل میں داخل کیا۔ وہ جذباتی سطح جو اردو شاعری کے نئے تھی، سودا اس کا بھی خیال رکھتے تھے۔ لیکن ان کے یہ دو جذبے مشکل ہیں تھے۔ اگر ان کی زبان یا لہجے کی پیروی کرتے تو رنگ سودا میں رہ جاتا۔ اگر انکھنو کے طریقے کو اپناتے تو بازاری بول چال لفظوں اور عورتوں کی بولی پا جاتے۔ انشاء نے خلافت شامل کر کے رنگ سودا کو دوسرا چوکڑی مضبوط جگت اور اچھل کود تک پہنچا دیا۔ اسی طرح حسرت نے امانت کے شاگرد ہونے نے بھی معاملات عشق کی نکاسی میں تازگی کی۔ اخلاقی و معاشرتی سطح کو نظر انداز کر دیا۔ امان کی ال بھی غزل حرکات و سکنات کی تحریک تصویر بن گئی ہے۔ مصحفی اس طرح کی شاعری کو تیغ مہ بھالا کی شاعری قرار دیتے ہیں لیکن نہیں آباد۔ تعجب ہیں اسی قسم کی شاعری کا چلن تھا۔ میر حسن اسی ماحول کے پروردہ تھے بزرگوں کی برکات کا سایہ ان کے سر پر تھا۔ نوجوانوں کی چہلی جمعیت ان کے سامنے تھی۔ امان و مصحفی کے درمیان وہ میر سوز سے کندھا جوڑ کر چلنے لگے۔ سودا ان دونوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ میر حسن کے لئے پل سے گذرنا بہت آسان تھا۔ وہ قدم کے انداز پر شعر میں مکالمہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو ۔۔۔ کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
خاک میں مت ملاؤ دل کو مرے ۔۔۔ جی میں کچھ تک اپنا گھر دیکھو

حسن کبھی کبھی سودا کی طرح نئے نئے الفاظ بھی گھڑنے لگتے ہیں لیکن ان کے ہاں یہ انداز جلد ہی ترک کر دیا جاتا ہے۔ گفتگو کو شعر میں حسن کے محاکاتی انداز کے قریب ہے اس لئے اس میں زیادہ کامیاب ہیں۔ وہ بس کچھ بھی ہیں اور ان کا ہمنوا بن انھیں انشاء کی طرح غزل کی روایات کی پروا بھی اکساتا ہے لیکن یہ چیز کامیابی سے وہ نہیں نبھا سکے۔ انشاء کی طرح کبھی کبھی وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ البتہ حسرت اور جرأت کو مسلسل نبھاتی ہوئی لفظوں سے دیکھتے ہیں۔ میر حسن کی طبیعت تسلسل اور ربط چاہتی ہے۔ غزل میں مسلسل گوئی اور مربوط گوئی جو حسرت اور جرأت نے دریافت کی میر حسن کے حسب حال بھی ہے ان کے ہاں ایسی ہیں بائیس مسلسل غزلیں بھی مل جائیں گی۔

اب تک میر حسن کے کلام کے جن پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ادب اقدار اور شخصی واردات کی آمیزش کے نتیجہ دار تھے۔ ان واردات سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ میر حسن خلق اسالیب میں لکھتے ہیں ان کا اپنا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے۔ یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ میر حسن کی غزل گوئی ان کی شاعری کے پہلے نصف حصے کو ظاہر کرتی ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں نہیں ہوتی اور وہ دوسروں کے اسالیب کے ہو جھتے دیے بجھے دکھائی دیتے ہیں۔ ابھی وہ اپنے آپ کو دریافت نہیں کر پائے لیکن اس تگ و دو میں ان کی وہ انفرادی خصوصیت بھی ملتی ہیں جس پر انھوں نے اپنی شاعری کی عمارت کی بنیاد رکھی۔ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ میر حسن نے خارجی پیمانے سے میر حسن نے محاصرہ میر درد کی مساعدت سے حاصل کئے۔ اور میر سودا کے کلام کو بھی اسی نظر سے دیکھا۔ داخلی پیمانوں کے لئے نوعِ معاصرین کے اسالیب حسن کے کام آتے ہیں امان کا محاکاتی رنگ ان کے مزاج کا گہرا حصہ بن جاتا ہے۔ ان کی حیثیت لفظی ان کے ہاں بعض جگہ بڑی مجدد کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس کا انھیں علم بہت کم ہو سکا۔ بعض جگہ ان کی حیثیت لفظی میں زبان کا معمولی سا چٹخارہ بھی نہیں ہے۔

کل جو میرا خوش نگہ گزرا ہیں سے اے حسن
محفلِ یاراں ہمارے واسطے دارِ فنس بن گئی
تم ابھی دعوے تھے ہر بزم کو صہبا تو ہے
رفتے رفتے دوستو یہ بزم میخانہ بن گئی

○

اپنے شائق کو وہ جب دیکھے ہے تب ہیں ہو
تیغ ابرو پہ دکھلاتی ہے جوہر اپنا
غیر کے ہاتھ سے لگوائی ہے مہندی اس نے
قتل کا خون کروں گا میں مکرر اپنا

○

قلم جو چوٹ کے دیکھے میں تیرے ناخن پر
تو مشتیاق میں ان کے قلم ہوا ہے گلاب

○

تیرے دربار حسن کے تیرے دل ہوا ہے بند
آسلسلے میں اپنے ہیں بھی مرید کر

○

میرا تو دل تسلا تیری باتوں سے شیخ رہ
تو بھی تو دیکھ کیا تری صلتی ہیں زباں

○

ہیں وہ جو با تمکین انہیں کا خرام رہ
دل کو نہ اپنے مقتدیِ بایزید کر

○

میں جتنا سوچ کرتا ہوں مجھے کچھ بن نہیں آتی
بڑائی ہر بڑی ہر بات جو کچھ تو بناتا ہے

○

خدا کرم ہے یا ہم ہے یا نالہ و افغاں
شب الجزر میں یار سے کیا کیا نہ ہوتی ہے

یہ گھٹیا شاعری میر حسن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ان اشعار میں نہ تازگی ہے نہ گہرائی۔ نہ جذبات ہیں نہ احساسات۔ معمولی درجے کی لفظی صنعت گری ہے جو قابلِ فخر نہیں ہو سکتی۔ اس طرح قدیم تمہیدات کا ذکر عشاق داستاں کا تذکرہ ان کے اشعار میں گرمی پیدا نہیں کرتا۔ وہ قیس و فرہاد کے قصے تو کہتے ہیں لیکن یہ ان کی داستان کو رنگین نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی ان کے شبِ غم کی جو ان معمولی درجے سے بلند نہیں ہوتی۔

دل بجز کعبی رہ دل سے یہ جو اس نے
تم نے اس کو کہیں لیلیٰ مقدر دیکھا ہے

○

صبر کر تو عوض دامنِ یوسف کی ہو پہلے عمر
کعبی رہ اس سے ہو گے کنعاں چلک جاتا تھا

○

ساقہ ناقہ کے خدا جانے کدھر ہو گئی
گرد محمل بھی نہ پہنچی آہ مجنوں کی طرف

○

حشر تک کچھ ہو تو بھی کہ نہ بھولے راہ
ناقہ لیلیٰ چلا ہے آج مجنوں کی طرف

پھر چشم حسن یار میں پھرتی ہے کہ اعجاز — کنعاں کو بھی اک بار ہے تلک دیے پیراہن سے
رشتی ہے کہ اپنی یاں خسرو کے ساتھ شیرلا — بگڑی ہے پہاڑ اس پہ تیشہ سے کہ کن سے

○

منت تو سر تیشۂ فرہاد تب میں ہاں — جب سر سے کوہ و دار و در بچے

○

کوہ و بھر آیا ہے سونا قیس اور فرہاد کا — لیلیٰ و شیریں کا خالی محمل و تشت نہیں ہے

○

بعد مجنوں کے ختم سے خالی — یہ بیاباں ہم نہ چھوڑیں گے

○

فرہاد قیس دو حق و محمود ہوں جدھر — ہم بھی وہیں ہیں اہلی انھوں کی تمنا ہیں

یہ بلاشبہ اس کی شاعری کے لئے بہتر نہیں ہو سکے۔ شراب کا تذکرہ بھی ان کی غزل میں بے جان تذکرہ ہے۔ ان اشعار میں یا رسائی اللہ ندی کی مکمل ہے۔ یہ حسن کی ذات اس سے چھلکا نہیں پا سکتی سحر البیان کی بات دوسری ہے۔ اس میں شراب کا تذکرہ حسن کی اپنی ذات سے متعلق نہیں رہتا کردار کا فعل بن گیا ہے۔ اس لئے شراب وہاں اپنا لطف دے گئی۔ البتہ حسن کی غزل میں شراب کی حیثیت رکھا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ حسن شراب نہیں پیتے تھے لیکن ہے پیتے ہوں لیکن شراب پینا الگ بات ہے اور شراب کے بارے میں اچھے شعر کہنا بالکل دوسری بات ہے۔ جب اضافی گرفت کمزور ہو جاتی ہے تو وہ عشق کے گناہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن عشق ہر جگر ان کے ہاتھ اضافی گرفت کا شکار نہیں۔ تاہم شراب اور عشق پر اضافی گرفت کی چند مثالیں دیکھیں۔

خواہ کچھ ہو کرامت خانہ خوش ہم سے سن — جس طرف دل کی طبیعت ہو ادھر کو چلئے

○

اک وفاداری ہے آب و گل اپنی ہی حسن — پھر طبیعت نہیں پھرتی جدھر جاتی ہے

○

اس بت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسن — یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بری لگے

○

ماجرا دل کے لگانے کا کہا اس سے تو حسن — چھپ سکیں مجھ سے تو اپنی نہ لگن کی باتیں

○

حسن گر پارسا ہوں میں تو نا چاری ہے — نظر ہے جام پر میری اور دل ہے شیشہ پر

○

لے جام کی خواہش ہے نہ مے کی مجھے ساقی — میں نشۂ مستی سے ہوں سرشار ہمیشہ

○

حسن کے لئے اگر یہ کچھ نہیں تو پھر ان کی شاعری کس مرکز سے کسب نور کرتی ہے؟ — ان کی غزل گوئی کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں جذبات کی

توانائی اور احساس کی شدت وجود ہے انگ کی تلاش کے لئے ہیں ایک طرف وہ حسن کی شخصیت کو دیکھتا ہوگا، دوسری طرف ان مخصوص الفاظ و تراکیب کا جائزہ لیتا ہوگا جو ان کی شاعری کے محور بنتے ہیں جن معاملہ بندی میں کھلتے ہیں وہ معاملات عشق کی نوک گراتی میں کامیاب ہیں۔ منظر کشی اور سراپا نگاری میں نکھرتے ہیں جنسی اشتعال انگیز مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جوانی کا نوحہ کرتے ہیں بڑھاپے کے خائف ہیں۔ وصل اور ہجر دونوں سے مزہ لیتے ہیں بیان کی کامیاب شاعری کے محبوب موضوع ہیں۔ ان کی شخصیت احساس کمتری میں مبتلا ہے لیکن برتری کا احساس نہیں بنتا انفعالی رنگ رکھتا ہے وہ مذہب اور اخلاق کی طرف جھکتے ہیں ان کی طبیعت رندی و شہباز کی طرف مائل ہے کشمکش ہوتی ہے حسن بڑھاپے سے گریزاں اور شباب کی مرتی رفتاری سے ہراساں ہیں۔ یہ کشمکش بھی داخلی عذاب بن جاتی ہے۔ اس سے ان کے مزاج میں ایک لاابالی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ احساسات کے نقاش ہیں جو جذبہ بھڑکاتا ہے اسے سخن دعن پیش کر دیتے ہیں۔ انھیں اس سے سروکار نہیں کہ وہ ان کے لئے کیا ہیں۔ اس سے ان کے جذبات کا تضاد ظاہر ہے۔ بعض احساسات شعوری سطح پر آکے تلاطم پیدا کر دیتے ہیں اور اشعار کو بے روح کر دیتے ہیں۔ بعض ابھر کر حسن کی شاعری کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یہ جذبات کی ایک سطح ہے نہ احساسات کی۔ یہ کیفیات کی وہ سطح ہے جو دنیاداری کی ہر شے ایک لمحاتی کیفیت ہے جس سے شاعر کبھی رم کر کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے ایک بے نوکا لازندگی ایک بے اور سن زندگی کی پکار حسن کی غزلوں میں گونجتی رہتی ہے۔ وہ پیدائشی طور پر MAGOS کے رسیا ہیں۔ اسی لئے ان کی غزل گوئی کی کامیاب نبج وہ ہے جہاں احساس کمتری یا دست نمودار ہو۔ جہاں جنسی جذبہ کوئی خیالی پیکر تراش لے جہاں عاشقی انفعالی سطح پر اجاگر ہے۔ جہاں خوب اور دلفریب کی آگہی میں تذبذب کی حالت ہوتی رہے جہاں ہر خیال ایک تصویر بن جائے۔ مذہبی لحاظ سے حسن عشق کو بڑھتے ہیں لیکن جب اس حقیقے کو وہ بھول جاتے ہیں تو اچھے عاشقانہ شعر کہتے ہیں۔ دنیا کا غم انھیں ضرور ہے اور اس کی اندوہ کی انھیں پریشان کرتی ہے۔ وہ تنہائی کے واہمے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن آزاد کی صورت اسی میں ہے کہ وہ FANTACY کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غزل یہ جب کبھی FANTACY کام دیتے ہیں کامیاب بنتے ہیں۔ نغمہ خلط کرنے کے لئے ان کے پاس موسیقی اہم ہے۔ دھن، رنگ اور صندوہ آہنگ ان کی شاعری کے لئے تحریک کا کام دیتے ہیں۔ موسیقی ان کی روح کی گہرائیوں میں ایک تحریک روشن کرتی ہے اور وہ بے خودی سے اس میں کھو جاتے ہیں۔

مات مطرب نے سنے اک نغمہ	ایسا چھیڑا کہ گرد یا خلقوں
○	
بسمل کی طرح اب تک ہیں آنسو میں نہائے	مطرب نے سنائے ایسی شب ایک ترانہ لی
○	
نغمہ و عشق سے ہیں سب ساز و ترانے پیدا	ایک آواز سے دو ساز کے ہیں تار ملے
○	
ہے مطرب پر سنگھے میں تو بے	لاہی ڈھب کی تان پڑتی ہے
○	
نیرنگیاں تمام ہیں یہ نغمہ ساز کی	نغمے جو یہ نکلتے ہیں نئے نئے
مطرب غزل سرائی میں چھیڑ ہے تو نے کیا	سو بھید خیال پھر تری لے سے نئے نئے

عاشقی ان کی زندگی اور ہمارا خیالات کا نقطۂ اتحاد ہے۔ اب تک تصوف نے (جو سنی اور شیعہ فرقوں میں رائج تھا) عشق کو مذہبی درجہ دیدیا ہے جس

کے والد (ضاحک) اور حسن کے دلی نغمت (سالار جنگ) موسیقی کے ماہر تھے۔ اس سطح پر وہ موسیقی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ اس لئے اس کا ایسا بن جانا مشکل نہ تھا۔

حسن کی غزلوں میں بعض اوقات صوت کے عجیب و غریب تجربے بھی ملتے ہیں۔ یہ بھی موسیقی کا اثر ہوگا۔ وہ اشعار میں الفاظ کے بعض ایسے جوڑے بناتے ہیں۔ جن سے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حروف علت کی ترتیب میں انھوں نے بڑا کمال دکھایا ہے۔

حسن بھی آدمی ہے کچھ خفا ہوتے ہو حسنؔ — زیادتی، جوتی، بادہ، اسودائی، آوارہ

○

گھروں سے اپنے بن ٹھن کر نکلنا ہے دلیروں کا — اکڑنا ناز پر انداز پر، اپنے تجمل پر

○

معذور حسن کو جو بے طاقتی کہے — عاشق ہے دردمند ہے اور مبتلا ہے وہ

○

صحبت سے کوئی کیونکہ حسن کے نہ ہوئے خوش — شاعر ہے یار باش ہے قابل مزہ ہے

ان اشعار میں حسن نے آہنگ کے لئے ہر دوسرے مصرعے میں لسانی اعتبار سے لمبے وقفے لگا دیئے ہیں۔ انھیں ہم لشرام کہہ سکتے ہیں۔ اشعار میں بعض اصوات کی ترتیب بھی قابل غور ہے۔ پہلے شعر میں و، ی اور و کی آواز کو ایک ترتیب میں قائم کیا ہے۔ مصرعہ کے شروع اور آخر میں ان اصوات کے درمیان فاصلہ کم اور درمیان میں فاصلہ زیادہ ہے۔ لشرام اور حروف علت کی مقررہ ترتیب نے (کہ دوسرے بعد کی اور اس کے بعد آئے) شعر کے آہنگ کو اجاگر کیا ہے۔ دوسرے شعر میں ان اور ی کا استعمال کیا ہے اس میں دو باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ (۱) اصوات کی تکرار ہے اور (۲) ان، ی اور ی کی مگر ترتیب قائم کی ہے۔ چوتھا شعر فن کے اعتبار سے زیادہ پیچیدہ۔ نظام اصوات بھی مرکب ہے۔ اس میں حروف علت کے علاوہ اس میں ش کی آواز کی ترتیب بھی مقرر کی ہے۔ اور ساتھ ہی لشرام یا وقفے بھی ہیں۔ تین طرح کے صوتی نظام باہم دیئے گئے ہیں۔ اور شعر کا یہ نادر پارہ حسن کے داخلی موسیقی پر دال ہے۔ حسن موسیقی کے دلدادہ تھے۔ ان کے زمانے میں اضافی قدروں کی شکست و ریخت ہو چکی تھی۔ ان کی سرسائی نے اپنی نغمہ خوانی کر دی تھی۔ حسن بھی غزلوں میں خدمت انجام دیتے رہے۔ آخر آخر میں اس جنگ میں، نہ ہی کی نوح ہو گئی۔ اور حسن کی شاعری میں شراب و کباب داستان و رنگ مذہبی خلاف کے بغیر ادب کی آب و تاب سے آنے لگتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حسن ادیب ہو گئے۔ یہ مطلب ضرور ہے کہ وہ ذہنی طور پر آزاد اور ہو گئے تھے اور کم از کم تخیلی سطح پر وہ مذہبی تو دکوز ہوش کر چکے تھے۔ سحر البیان اس کی زندہ مثال ہے۔

حسن کی شاعری کا عصر اہم جنسی ہے۔ جنسی رجحان نے ان کی غزل گوئی کے ایک حصے کو (جو عاشقانہ پر مشتمل ہے) ہن نرکیا۔ اس میں اس اور کی نفسیات کو بھی دخل ہے اور حسن کے اپنے کردار کو بھی اس گھر کا ماحول چاہے کچھ بھی ہو جس اور بلدہ سے وہ متعلق تھے جنسی جذبے کے کھل کھلا اظہار میں مانع نہ تھا۔ ممکن ہے عملی زندگی میں وہ پارسا ہی رہے ہوں۔ شاعری میں (خصوصاً جب وہ تخیل کے پروں پر پرواز کرتے ہیں اور خیالی کی تخلیق فرماتے ہیں) پارسا نہ تھے۔ ان کی شاعری انسان کے جنسی جذبے کے احساس کے لئے ایک SUBSTITUTE ہے۔ جب کبھی تو زندگی میں نہ دیکھتا ہے اور کبھی جاندار جیتی جاگتی عورت کو دیکھ کر ہی اس کی شعر گوئی کرتا ہے۔ کبھی محبوب کی زلفوں میں پھنسا چاہتا ہے۔ کبھی جامد ساکت مناظر میں حرکت اور جان دیکھ لیتا ہے۔ ایک بے عمل آدمی کی زندگی تخیل ہی میں حرکت دیکھ سکتی ہے۔ حسن بھی اسی گوشے میں ان کی جوانی اور بڑھاپے کی کشمکش بھی نظر آ جاتی ہے جس کی

یہ بیسویں صدی کی تخلیق ہیں اور حسن کی دنیا ایک نئے موڑ پر یک لخت شناسا ہو جاتی ہے۔ سو یہ نئی قول اور سرکی چاندنی، گھر کی چاندنی حسن کے جذبات کے لیے سہارا کا کام دیتی ہے۔ دوسری طرفوں میں بھی چاندنی کی یہی چھب ہے۔ حتیٰ کہ عرب کی صحرا کی لقمہ تر بن جاتی ہے۔

ظلم ہے کس بے درد شب کا ہے — یہ شب ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے

○

جلے ہے چاند ہو دیں شب کے بھی — اس اہرد کا عکس گراہ میں پڑے

○

کیا بھوکی رات ہے گرانہ چراغاں — پھر جلنے لگے داغ حسن شام سے تیرے

○

شب ماہ کی سیر ہے اور تو ہے — یہ دہرے مزے ہم بہم دیکھتے ہیں

○

پرے ہیں بھی کچھ سیر کی ہے چاندنی — بے ساقی دے جام کبھی اپنی شب ماہ

روشنی کی یہ کرن چاند ہی سے نہیں پھوٹتی ہر منظر دلکش اور تابناک ہے۔

جلوہ گر چہرا تا ہوا میں ہو شب ہو گیا — مہ تیرے سکھوٹے کے آگے ماہ نخشب ہو گیا

○

کئی میں دانت چمکتے ہیں سو حسن سے — کہ شب میں کتنے دیوں نے ہم قطاری کی

○

دھجے دلبروں کے اشک ناں نہیں جنی یہ — تحریر ہے طلائی ترا ل کی سورتوں میں

○

جس طرف گرد ماہ کے ہالہ ہو جلوہ گر — یار تھا پہ نو مطلع تیرے دامن کا گھیر ہے

میر حسن کی مثنوی ۱۸۰۵ء بڑی دلچسپ گھریلو ہوئی ہوئی ہے۔ ان کی طبیعت کا خاص میلان اسی طرف ہے مندرجہ ذیل قول میں روشنی کی چکاچوند کے درمیان حسن کی شخصیت بڑی گھریلو ہوئی تشبیہیں پیش کرتی ہے۔

دل اک نگہ کو کر کے پریشان لے گئی — پہلو سے فرقت کی جھلک جان لے گئی

چھاگل کو دیکھ کے ہاتھ باغاں پھول — بالے کی جھمک سب مرے اوسان لے گئی

ہم تھے ہی بیٹھے دل دیا ہوش و عقل و صبر — تقسیم کر کے اس کی ہر اک آن لے گئی

تیر کا نگہ بھی تھا ہے کرتی کرا لکھنہ میں — جس دل سے لاگ تھی اسے پہچان لے گئی

اس چشم گریہ ناک نے عالم ڈبو دیا — جدھر گئی ادھر کو یہ طوفان لے گئی

دل کا تو چین لے گئی سکھوٹے کی یاد اور — راتوں کی نیند رات کے پریشان لے گئی

مستی کو دیکھ اُس کی، آپ میں نہ رہیں ——— کیا جانوں کس طرف وہ مرا دھیان لے گئی

○

یہاں محبوب کا جسم اور اس کے پہناوے کی چیزیں حسن کے لئے مہمیز جذبہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ محبوب کا لباس اس کے اعضا کی آرائش و زیبائش چین و نگہداشت کی تصویر کشی۔ بردہ داری کی تردامنی۔ ناخن کی شادابی، شیدا کا حسن پسند حسن کے لئے تعریفی تجربے کی سان بن جاتے ہیں جس پر ان کی تیغ زباں کے جوہر کھلتے ہیں۔ میر حسن عالم طور پر ہر منظر کو روشنی اور سفیدی کی صورت میں دیکھتے ہیں یہ اُن کے ذہن کی خاص اختراع ہے۔ وہ بار بار چاند سورج کا ذکر کرتے ہیں۔ نہروں کی چمک۔ سبزے کی لہک۔ کلیوں کی چٹک۔ آگ کی دہک حسن کے لئے جاذب نظر ہیں اس کا مشاہدہ بڑا قوی ہے۔ منظر روشنی میں جو کچھ بٹے اور تھرتھری پنہاں ہوتی ہے حسن اس کا ادراک بھی کر لیتے ہیں روشنی کی لہروں کی کمی بیشی ان کا پھیلاؤ اور سکڑاؤ حسن کی وادی نگہ اس کا مشاہدہ بھی کر لیتی ہے۔ روشنی میں یہ حرکت حسن کے جذبات کی کارفرمائی کے سبب بھی ممکن ہے اور اسے مشاہدہ کی گہرائی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی جھلک دیکھئے۔

کل نام خدا ایسا رنگ اُس کا چمکتا تھا ——— گورشید بھی دیکھ اسے آنکھ اپنی جھپکتا تھا

چہرے کا عجب عالم تھا نور و شفق میں ——— ہر اب چمکتا تھا کندن سا دمکتا تھا

یہ کس خورشید کا جلوہ ہے پرتو اپنی آنکھوں سے ——— کہ اب تک نور ہی آنکھوں میں میری تھرتھراتا ہے

شب چاندنی میں کس کا مکھڑا دمک رہا تھا ——— مہتاب کا بھی دیدہ اس ہی کو تک رہا تھا

میر حسن کا یہ رجحان ان کی مثنویوں میں ہر کہیں زیادہ واضح ہوا ہے۔ غزلوں میں رنگ کی یہ آنچ کچھ زیادہ پھیلی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔

مجموعی اعتبار سے میر حسن کی غزل گوئی میر و سودا کے مقابلے کی چیز نہیں ہے۔

عہد اکبری کا ایک کشمیری عالم

محمد عبداللہ قریشی

کشمیر کے علماء میں شیخ یعقوب صرفی نہ صرف اپنے زہد و تقدس کی وجہ سے وجہ احترام سمجھے جاتے ہیں بلکہ اپنے وقت کے ایک بڑے عالم، جامع کمالات بزرگ اور عہد اکبری کے ایک نہایت زبردست شاعر ہیں۔ آپ کے والد کا نام شیخ حسن گنائی اور دادا کا امیر محمد تقی گنائی تھا جو عامی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

گنائی دراصل سنسکرت زبان کے لفظ گن سے بنا ہے جس کے معنی ہیں علم۔ کشمیری اور فارسی میں بھی گن، علم، ہنر یعنی مشق کو کہتے ہیں۔ علم یہ ایک لقب ہے جو اہل علم حضرات کو حکومت کی طرف سے ملتا تھا چنانچہ تاریخ حسن کشمیر میں مذکور ہے۔

"گنائی بہ زبان فارسی مشق را گویند"

اسی طرح "واقعات کشمیر" کا فاضل مصنف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری لکھتا ہے:۔

"گنائی در عرف آن وقت زبیندہ عامی گفتند۔ (صفی گرنہ نام پٹواری ہیں لقب برد"

اور جب ہم گنائی خاندان کے نامی اہل علم بلکہ اولیائے کبار مثلاً بابا عثمان اور شیخ گنائی، شیخ بابا دانہ خطائی، حاجی طاہر، زنگنائی، حاجی خان، فتح جو اب نوری، شیخ محمد بلی وغیرہ کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو اس شعر کی صداقت پر یقین آجاتا ہے کہ

گن نائی بکشمیر دانا بود　　خدا داد تدبیر و خاصہ بود

اور چونکہ ایک لقب خدا داد لیتے اب گنائی طبقہ میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جو بیرونی ممالک سے آئے اور وہ پیشوخ بھی ہیں جو کشمیر کے برہمنوں اور ہندو ذات کے دوسرے فرقوں سے مسلمان ہوئے۔

شیخ یعقوب صرفی کے متعلق تاریخ اعظمی، تاریخ کبیر کشمیر، تاریخ حسن اور کشمیر کی دوسری تاریخوں میں لکھا ہے کہ وہ امیر حسن گنائی کے فرزند اور بایزید عاشی کی اولاد سے تھے۔ گویا بایزید عاشی اس خاندان کا سب سے پہلا فرد ہے جو کشمیر آیا اور تاریخ گلشن کشمیر کی تحریر کے مطابق انھیں بہترین مشنوی نویس اور بہترین مشق ہونے کی وجہ سے گنائی کا خطاب ملا۔ بایزید حضرت عاصم بن حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے تھے۔ چنانچہ طاہر اباب شاہی بحوالہ سکندر بتوں کے عہد میں ایک نامور شاعر ہوئے ہیں اور جنہوں نے کشمیر کی ایک مبسوط تاریخ الہی ہے جو اسی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ شیخ یعقوب صرفی کے خاندان کو عالمی کی قرار دیتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

لہ آپ مصنف تحفۃ الصفوہ ہیں جہاں الدین پاروی سرینگر کے محلہ میں مزار کے گنبد کے واقع ہے۔

شیخ حسن بود ایں خوش نسب — زاہل ایمان کثیر پوش لقب
گنائی لقب داشت ایں عالمی — گزیدہ خدائش در بحر یمن
گنائی ست نام بزرگش دیار — چناں گنائی شد او یا غلط

شیخ یعقوب صرفی کے چھ بھائی اور تھے جن میں میر کمال الدین اور میر نور اللہ تین بڑے اور باقی چار چھوٹے تھے جن کے نام یہ ہیں میر محمد شریف، میر گدا، میر ابراہیم اور میر حمید۔ یہ سب کے سب آسمان ولایت کے درخشندہ ستارے تھے۔ گو صرفی دینی اور دنیوی ترقی کے لحاظ سے ان سب پر فائق تھے تاہم اپنی ایک مثنوی مخاری نامی میں اپنے ان بھائیوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

ہمہ ہفت تن بودہ اورا پسر — چو ہفت اختر آسماں جلوہ گر — شیخ حسن گنائی
مرا ناں سیار ترتب حرمط — کلاں تر زمن نیک نیک کس فقط
کمالش پیر فن دانش کمال — کہ دانش افزوں ز حد مقال — میر کمال الدین
ز خود تر شاہ فرد تر نام — بجب مکمالات عالی مقام — میر نور اللہ
ز من خورد تر ناں بفطرت لطیف — کہ نام وے آمد محمد شریف — میر محمد شریف
پس از وے کہ آمد محمد یمن — از انجملہ ہم صحبت و ہم سخن — میر محمد
بصورت مرا داد بر زور نیک — بمعنی مرا دست فرزند نیک
بہ شعر و معما ست شیریں کلام — بداہہ طلاقت سلوکش تمام
پس از من بجائے من و ہست بس — نیرد ایں سعادت بزاد ہیچ کس
براہیم از خود تر آمدہ — ز اسرار دیں ماہر و آمدہ — میر ابراہیم
ہمہ خورد تر حمید نیک خوست — فرشتہ خصال و ملک خوئے دوست — میر حمید

تاریخ حسن میں مذکور ہے کہ صرفی ۹۲۳ھ مطابق ۱۵۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ کتاب نفیس گزیدۂ مصنفہ شیخ عبدالوہاب نیازی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے لفظ شیخ ہی سے آپ کی تاریخ پیدائش نکلتی ہے۔ اس وقت سلطان محمود شاہ کثیر کا بادشاہ تھا۔

ابھی آپ سات ہی برس کے ہوئے تھے کہ آپ نے قرآن مجید حفظ کرنا اور شعر کہنے شروع کر دیئے۔ ابتدا میں آپ نے خود صفدی پھر حاجی کے سپرد کیا ہوا تھا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد تھے چنانچہ صرفی خود کہتے ہیں ؎

چو در سال ہفتم ز ہنگام قدم — بعلم و عمل گشتہ شوق بجم
پدر کرد ی اصلاح اشعار من — باصلاح بودی مدد گار من
سپرد است آنگہ مرا بایکے — کہ بودست از اولیا نیکے
محمود نام و ز حاجی لقب — ز جامی گرفتہ فنون ادب

طالبی نے آپ کو فن تجوید و قرأت کی باقاعدہ تعلیم دی اور جب آپ کی یہ غزل دیکھی تو آپ کی خداداد ذہانت اور فہم کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا کہ وقت آئے گا جب یہ ہونہار بچہ جامی کی جگہ کا نگرین جائے گا۔

ز نرگس مرحلقاں آئینہ در دے تو ام — سیل خوباں در چو لے رو بے نیکوئے تو ام
گر بیم خیز سامان گرمت کب نشتن — وداع جاں نمی بجز بوئے تو ام
آرزو ست در جان و تمنا یت بدل — یکز بر سوز دے جان دوم سوئے تو ام
از کشاکش ہا سر شک و ناخ گشتہ ام — من کدام ہم خوبان کہتہ کوئے تو ام
گرچہ کی ساز دپری دیوانہ مرام بادے — گویت دیوانہ از بیگانہ گیسوئے تو ام

من کہ جز محراب بود سجدہ گاہ دیگرم
نیست جز تصویر جانان جز طاق پرئے تو ام

سند رجہ ذیل اشعار بھی انہی دنوں کے ہیں ؎

بعشق آں پری رخسار زنجیر دل مجنوں
بلو ریش ہست مشکل کاید از قید جنوں بیروں

ناصح ابرو کمانم دار و از مژگان خدنگ
گشتہ خوباں جہاں را دیدہ ام آخر زماں خدنگ

اتباع تقریظ کرنے کے بعد آپ نے مولانا فخر الدین احمد حافظ تقریر کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا جو اپنے وقت کے نہایت زبردست فاضل اور عارف تھے۔ اصل اگر قطب الدین ابن کمال شاہی دیگاہ میں مدرس تھے۔ وہ ۹۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ مرثیہ نے اس مصرعہ سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے ؎

میرد در سجدہ جاں سپرد بحق

آپ نے صرف کی کتابیں وہیں پڑھیں کی اور فن شعر معما، انشا و خط میں مہارت کر دیا۔ حافظ تقریر گرچہ انکھوں سے معذور تھے مگر ذہانت سے محروم تھے۔ پھر بھی دل خدا کے فضل سے روشن اور بیدار رکھتے تھے۔ وہ فاکساں سرنگے سے کچھ فاصلہ پر تھے۔ بل کے سامنے خلوت خانہ ہمایوں کی ایک سمت میں درس دیتے تھے ۹۵۷ھ میں فوت ہوکر سمرقند کے سامنے ہی دفن کئے گئے۔ مرثیہ نے ان کی وفات پر بھی ایک دردانگیز مرثیہ لکھا ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

آں حافظ علم و ادب بود تقریر از فضل رب
تاریخ نوشتش سبب شد عالم تقریر داں

۹۵۷ھ

انھوں نے علوم کے دقیق مسائل مترل کو سکھائے اور فن منطق و علم کلام میں ہر ایک کے لئے سرمایہ ناز ہوئے۔ جانچہ آپ اس ذوق کو پورا کرنے کے لئے اس راستے کے کسی بہتر کامل کی تلاش میں مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہ علم حاصل کرو چاہے چین ہی ہو اپنے دھن کو خوب یاد کیا اور وہ حجاز مالک کاسار اختیار کی کے سمرقند واپس آگئے اور مولانا عبداللہ کی خدمت سے کہ جہاں جاکر آپ تھوڑے ہی دنوں میں اپنے ہم درس کو پیچھے گئے۔ اور مقدم شیخ کمال الدین حسین خوارزمی کے روحانی جانشین یعنی خلیفہ مقرر ہو گئے۔ شیخ حسین محمد ذی حجہ ۹۵۷ھ میں فوت ہوئے۔ ۹۵۰ھ میں

لہ منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۴۲۔

بمقام شام فوت ہوئے۔

اپنے مرشد کے ارشاد کے مطابق عرفی ہندوستان واپس آئے اور کچھ عرصہ ڈل کے کنارے محلہ درگجن کی بلندی پر شیخ سلطان کی تعمیر کردہ خانقاہ میں بیٹھ کر سلسلہ کبرویہ کی ہدایات کے مطابق عام تبلیغ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بہت سے مرید آپ کے حلقہ میں شامل ہو گئے جن میں یعقوب شاہ چک بادشاہ کشمیر کے وزیر اعظم یوسف میر کا بیٹا محمد میر بھی تھا۔

چند سال بعد آپ کے دل میں پیر مرشد کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ آپ اپنے خلیفہ میر محمد کو مسند دعوت و ارشاد پر بٹھا کر خود خراسان کے راستے سمرقند روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شیخ کمال الدین حسین مرین اللہ تعالیٰ عنین کی زیارت کو گئے ہوئے ہیں آپ بھی بغداد کی راہ سے ہرات پہنچ گئے۔

سیر و سیاحت کے دوران میں آپ جہاں جہاں گئے اللہ والوں سے ملے ان کا ذکر آپ نے اپنی کتاب مغازی النبی کے مقدمہ میں تفصیل سے کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ کابل میں آپ کی ملاقات مولانا جلال الدین دوانی میر عبداللہ اور ابوالمعالی وغیرہ چند عالموں سے ہوئی۔ یزد خاں میں آپ محمد امین محمد علی شمس الدین وغیرہ ولیوں اور شاہ یوسف مجذوب سے ملے۔ وہاں سے کولاب پہنچے اور امیر سید علی ہمدانی کے مزار کا طواف کیا۔ بلخ میں محمد زاہد بلخی، حاجی عبدست محمد خاں اور چند دیگر بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ بدخشاں میں شیخ نظام الدین۔ قاضی محمد صالح اور ابوالخیر سبزواری عارف محمد بخاں میں جلال ولی، شیخ ناصر محمد کیک۔ اوب میں سلطان علی۔ مولوی امیری محمد امین اور محمد سعید سے ملاقات ہوئی۔ اس جگہ خواجہ جانی کا سلطان بھی دیکھا جن کی اولاد سے اس وقت خواجہ یار سا موجود تھے۔ وہاں سے تاشکند۔ بخارا۔ سمرقند۔ اکول۔ مشہد۔ طوس۔ سلم۔ خراسان۔ عراق اور قزوین ہوتے ہوئے بغداد پہنچے۔ امام الامت امام ابوحنیفہ کوفی کا مزار حاصل کیا۔ پھر کربلائے معلیٰ اور حلب ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور گجرات میں سید محمد مہدی۔ جونپور میں ابراہیم خاموش۔ ٹھٹھہ میں سید علی، لاہور میں شیخ موسیٰ اسپنگر۔ عبدالشکور۔ حبیب اللہ۔ المعصابہ میں سادات علی۔ سرہند میں حضرت مجدد الف ثانی۔ تھانیسر میں پیر جلال پانی پت میں مولیٰ ان اللہ حصار میں جنید ثانی۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز۔ آگرہ میں سیادت پناہ جلال فتح پور سیکری میں شیخ الاسلام شیخ سلیم چشتی[1]۔ اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی۔ نارنول میں امام عزدان۔ احمد آباد میں اہل فضل پٹوہر۔ منڈا محمد غوث۔ ملک زین الدین علی جونپور شاہ سید عبدالرحمٰن۔ سید محمد امین۔ ملک تاج۔ محمد کمال محمد شریف۔ محمود عبدالشکور عبدالرزاق۔ عبدالصمد۔ شیخ اللہ داد اور گجرات میں علی جان کی زیارت سے آنکھیں روشن کیں۔ یہاں سے پھر مکہ معظمہ حضرموت۔ زبید اور عدن کا سفر کیا اللہ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد حرمین الشریفین سے پوری تفتیش و تجسس کے بعد وہ کتابیں جمع کیں جو ہندوستان میں بالکل نایاب تھیں نیز مندرجہ ذیل مشہور شیوخ کے حلقہ میں شامل ہو کر ان سے اجازت حدیث بخاری مسلم ترمذی شمائل وغیرہ کی سند حاصل کی۔

(۱) عبدالعزیز (۲) مولوی صادق طاری (۳) شیخ حسن خیاری (۴) شیخ عبداللہ جو حضرموت کے فخر روزگار تھے (۵) شیخ ولایت آب محمد مکی (۶) ابوسلیم (۷) محمد علی محمد حسن (۸) شیخ علی ہندی (۹) شیخ یوسف عرفی (۱۰) شیخ عثمان حبشی۔ الدسوقی (۱۱) شیخ ابن حجر مکی سے جو ایک زبردست محدث اور امام تھے علم حدیث کا درس دینے کی سند حاصل کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

صحیحین و مشکات و حزب بحرت — ہم از سور و ملکات و مشکرت
بتحقیق و تدقیق خواندم تمام — بدرس عام خواص و عوام
بام ملقب بہ ابن الحجر — کمالاتش افزوں ز حد بشر

---

[1] شیخ سلیم چشتی نے آخری بار حج کو گئے تو عرفی کو آپ کے ہمراہ جانے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

شدم مماثل حب مع ترمذی — گرد واع پکت ازاں مقتدی
تبصیح آں درس عبدالعزیز — گزیدیم خواندیم مشکات نیز
تبصیح مشکات گشتہ سہ بار — شرف بہ تردیض و تسویح کبار

صدر الشیخ محی الدین بن عربی کی تصانیف بالخصوص فصوص الحکم پڑھا ہوا تھا۔ اور آپ مشائخ کرام و علمائے اس اصطلاح سے زیب تن فرماتے تھے کہ جو بھی دعوے کرتا تھا اور کوئی شخص آپ کے مقابلہ پر ہونے کا یقین نہ کرتا تھا۔

۹۵۳ھ میں آپ کی شادی سید علاؤ الدین کی دختر سے ہوئی جس سے ایک لڑکا محمد یوسف پیدا ہوا مگر وہ عین جوانی کے عالم میں داغ مفارقت دے گیا۔

شیخ یعقوب صرفی نہایت زبردست عالم اور صاحب دل بزرگ تھے۔ اس لئے ہندوستان کو کشمیر میں آپ کے بہت سے مرید پیدا ہو گئے۔ قیام ہندوستان کے زمانہ میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے آپ نے علم حدیث و تصوف کا درس لیا۔ الشیخ یعقوب صرفی کے ان سے طریقہ مجددیہ کی تعلیم حاصل کرنے کا مصنف لکھتا ہے کہ صرفی اپنے وقت کے بہت بڑے روحانی پیشوا تھے۔

بابر کو آپ کی ذات سے دلی عقیدت تھی۔ اکبر اعظم نے بھی اکثر آپ کو اپنی مجلسوں میں شرکت کر کے طرح طرح کی رعایات و مراعات سے سرفراز کیا۔[1] ملا عبدالقادر بدایونی نے آپ کے دوستانہ مراسم نہایت گہرے تھے چنانچہ جب آپ لاہور سے مراجعت فرما کے کشمیر جانے لگے تو ملا ہی یار سے اپنے ایک خط بدایونی کے نام روانہ کیا جسے ملا بدایونی نے بڑے فخر کے ساتھ اپنی کتاب منتخب التواریخ میں نقل کیا ہے۔ اس خط میں آپ نے ملا بدایونی کی جدائی کے صدمہ کا حال بڑے دردانگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ خط کا انداز بالکل شاعرانہ ہے۔ اس میں آپ نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ اگر آپ کو سوداتے کشمیری کاغذ کی ضرورت ہو تو مجھے لکھیں تا آپ کو اپنی نظیر کے ساتھ بھیجنے کا انتظام کیا جا سکے۔ اس خط کی عبارت یہ ہے:[2]

"مردی قادری! دعا در دنیا زا خلاص طاز بتقدیم رسانیدہ شہود تحریر خود شید نظری گردانند کہ باعث ترک سنت سنیہ مذہب خلص حقیقی غالباً آں عابد بود کہ چوں طریق ترضیہ ما و عدالسفر از شرائط ما یہ است و با فعل بدعی نماند قدمت براں نبود و با ضرورت ترک آں سنت بایستی نمود امید کہ از حاشیہ خاطر منیف مآثر انیا منیا نخواہند ساخت و بدعا مت خیر گریر مستحفظ الغیب نخواہند پرداخت دگر حاجت بکاغذ کشمیری بر تے سوداتے باشد اعلام نمایند تا بندہ از کشمیر سوداتے تغیر خود فرستادہ کہ نقوش آں کاغذ پشتہ چاں کی مدد گر بیچ اثرے از سیاہی نماند چنانچہ تجربہ کردہ باشند۔ والسلام علیکم والاکرام لدیکم۔"

کشمیر پہنچنے پر شیخ یعقوب صرفی نے ایک اور خط لکھا جو آخری خط ہے جو بدایونی کو وصول ہوا۔ اس میں القاب و خطاب سلام و نیاز اور شوق ملاقات کے بعد دلی زبان میں اپنے خطوں کا جواب نہ دینے پر بدایونی سے گلہ کیا ہے۔ پھر تحریر فرمایا ہے کہ جب گرمیوں کی وجہ سے دوپہر کے وقت آپ نواب ابوالفیض فیضی فیاضی کے مکان خانہ میں تشریف فرما ہوں اور نواب کی زبان سے لطیفہ نکات سنیں تو اس اسیر محنت حرماں کو بھول نہ جائیں۔ شیخ محی الدین محمد کی

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۳۲

[2] منتخب التواریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۳۳ - ۱۳۴۔

طرف سے سلام نیاز قبول فرمائیں۔

آخر میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے چند اشعار اسد خاں کی تعزیت میں بطرز جدید کہے تھے۔ ان کا مسودہ کہیں گم ہو گیا ہے اگر ان کے ملازموں کے پاس نقل رکھی ہو تو مجھے بھی بھجوا دیں۔

اس خط کی عبارت یہ ہے:۔

"خدام کرام من بجستن عن الصنایع و المناقب و الطاف اعمی مولانا و بالفضل و الکمال الشیخ عبدالقادر نفع نمایند۔

قطعہ۔

اذ وفات جاودانی بے شک	در فنون نعیست است فزوں
پس دلیل زیادت معنیش	گر بنالیش بعودت است قزوں

نیازمند چاہے کہ ترجمہ می شود۔ ہر چند کہ در جواب آں بابر عدم لیاقت جواب نتواند بدایں نگار ما التصدیع نمی دہد۔ ما بر سال قلم خلوص عرض بندگی بے اختیار جاری سگزرد۔ امید کہ ہر گاہ کہ در صفحۂ خاطب نیامی صنیم۔ دعائے توفیر عمر و توفر عمر و توانائی جسم و تجرع برف آب گرم می فرمودہ باشند۔ و استماع نکات شریفہ و مقالات لطیفہ می نمودہ باشند۔ یاد سیر صحبت جاں خواہند کرد۔ بیت ؎

اے بہ بزم وصل حاضر غائباں را دستگیر
نا گمانت حاضراں از غائباں کوتاہ نیست

عن المخلف الاعز الارشد فاضل محمد الشیخ محی الدین محمد نیاز مندی قبول فرمایند۔ وفقہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ لتحصیل العلوم النصیبہ و المعنویہ بحرمت من کی بقعۂ الشریفہ قدس سرہ اللطیف دعائے بنا بر عنایت حق الجوار حق سبحانہ و تعالیٰ میرساند طلب می نمایند۔ در آنجا نیز بحاجت نیاز بندگی فقیر مسموع می دارند۔ ما می باید کہ نظر بر حق نفس الامری کنند کہ ظاہر ما ہی حق بر آں حق راجح باشد (الخ) تا ما را بدعوت خیر یاد کنند کہ آن از تو بجا ئے ما دارد۔ واللہ تعالیٰ اعلم بحالیات الجاد مضمرہ کہ بطرز جدید بسمت نظم نیز دہ گیدا آنچہ گفتہ مسودہ آں از فقیر گم شدہ۔ غالباً طالبان اماں مسودہ اشعار گم کردہ باشند۔ اگر اس آنکہ نقل از نسخہ خود فرستند۔"[1]

اس خط کے جواب میں بدایونی نے جو اصل لکھا ہے۔ اس میں عربی کے کمالات کی داد تحسین کی ہے۔ یہ خط بھی مکتوب الیہ کے مجموعہ میں موجود ہے۔

عربی کا ذوق اہل فضل و کمال میں بہت بلند تھا۔ چنانچہ آئین اکبری (جلد اول صفحہ ۱۹۳) میں مذکور ہے کہ تمام مذہبی امور میں آپ کی ذات سند مانی جاتی تھی۔ بدایونی لکھتا ہے کہ وہ مسلسل درس دیتے رہتے تھے اور جید علوم عربی مثلاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں مجتہد انہ مقام رکھتے تھے۔[2]

آپ کے اخلاق و عادت میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ بہت تحمل اور تحاوت میں اپنے تمام ہمعصروں سے بڑھے ہوئے تھے اور سیاست

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۴۵ - ۱۴۳

[2] منتخب التواریخ بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۲۲

اللہ کی حفظ میں بھی رہے آگے تھے چنانچہ جب آپ اسلامی دنیا کی سیاحت سے واپس اپنے وطن تشریف لائے تو کشمیر کی حکومت جبار شاہ کی تھی۔ شہر یو خاندان کا تخت الٹ چکا تھا اور چک کشمیر کے تخت و تاج کے مالک بن چکے تھے۔ ملک میں خلفشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ شیعہ سنی آویزش سے کئی گھر تباہ ہو چکے تھے کتنے ہی بے گناہ موت کے گھاٹ اتارے جا چکے اور کئی معزز آدمیوں کی جان خطرہ میں تھی غرض امن پسند لوگوں کے لئے اس جنت ارضی میں سکون و اطمینان کی کوئی جگہ نہ تھی۔ یعقوب شاہ چک نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ وہ سخت متعصب شیعہ بادشاہ تھا۔ اس نے مذہبی جنون میں سنیوں کو بزور تشیع شیعہ بنانا شروع کر دیا۔ جس پر فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ دست و گریباں کی تیز آندھی چلی۔ سنیوں نے شیعوں کے اور شیعوں نے سنیوں کے مکانات و معابد جلا کر خاک سیاہ کر دیئے یہاں تک کہ گلیوں کے گلیوں سے زمین لالہ زار ہو گئی۔

سنیوں میں قاضی موسیٰ سرخیل عہدہ قضا پر فائز تھے۔ بادشاہ نے انھیں مذہبی تعصب کی بنا پر بھرے دربار میں قتل کرا دیا۔ ان کے اس بے رحمی کی خبر سے شہر میں کہرام مچ گیا۔ "تشہیر کرائی" اور اس طرح اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ جب لاش ان کے مکان کے قریب پہنچی تو قاضی موسیٰ کی دو برس بیوہ بوڑھی ماں نے نیچے اتر کر اپنی اوڑھنی بیٹے کے خون میں لت پت کر دی اور کہا۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے میرے بیٹے کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اس نے علم پڑھا اور اس پر عمل بھی کیا۔ حق و صداقت کی خاطر اپنی جان دینی گوارا کی مگر اپنا دین و ایمان نہ بیچا اور میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔

ان حادثات کو دیکھ کر صوفی بے حد مغموم و پریشان ہوئے۔ جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو آپ نے بادلِ ناخواستہ اور چند دیگر اکابر کے ساتھ مل کر اکبر اعظم کی دنیا کا رخ کیا۔ جہاں پہنچ کر آپ نے نہایت مناسب طریقے سے بادشاہ کو کشمیر کی جانب متوجہ ہونے اور اسے اس مصیبت سے نجات دلانے کی دعوت دی۔ انھوں نے مندرجہ ذیل شرائط پر خود بھی مدد دینے کا وعدہ کیا۔

(۱) بادشاہ و مذہبی امور میں دخل اور رفع اجناس وغیرہ کے معاملات میں دخل نہ دے۔

(۲) حکام و اہلکار کشمیریوں کو ہندی غلام نہ بنائیں۔

(۳) بادشاہ گان کشمیر و تتمہ کے حدود بدستور عہد ظلِ قدیمی سے مصون و مامون رہیں۔

(۴) چونکہ اہالیٔ کشمیر سے مستقبل کے بعث مصدقہ دینار ہو رہے ہیں اس لئے فی الحال انھیں امور ملکی و مالی سے علیحدہ رکھا جائے۔

اکبر نے امین الحق قاسم کی سرکردگی میں سات ہزار فوج روانہ کی جس نے شیخ یعقوب صرفی کی باغیانہ کشمیر پر حملہ کیا۔ اور یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کشمیر قیامت تک کے لئے مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اس فتح کے بعد صوفی نے اپنی فطری نفاست پسندی سے تھوڑے ہی عرصہ میں ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔

اس چمن میں رہنے پر بھی انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ایک مختصر سا جو حضرت امیر خسرو دہلوی اور مولانا عبدالرحمن جامی کی طرح مولانا صوفی گجوری کے خمسہ یا پنج گنج کا جواب ہے۔ مختلف علوم و فنون پر چند رسالے بھی مرتب کئے جن میں فن سماع کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ چنانچہ ذیل کا مصرعہ بنام شیدا بھی آپ کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔

ما من بروز خ نقاب انداختہ وز کعبہ آورد زراہ ساختہ

کشمیر میں مغلوں کی حکومت قائم ہوئے ابھی آٹھ ہی برس ہوئے تھے کہ ۱۰۰۱ھ ذیقعدہ یا مطابق تاریخ اعظمی کشمیر و تاریخ حسن کشمیر ۱۰۰۲ھ ذیقعدہ ۱۵۹۳ء کو ہجرت کے بیالیسویں سال کے بعد صوفی نے بمقام سرینگر انتقال کیا اور آپ کو محلہ زینہ کدل میں دفن کیا گیا۔ "شیخ احمد بود" "شیخ اہل محمد" اور "فخر امم" وغیرہ مادوں سے آپ کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ خواجہ اللہ دیہ ایوانی کہ آپ کے کمال علوم و اتقا کے معتقد تھے نے اپنے جذبات قلبی کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

۱؎ منتخب التواریخ جلد دوم مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۶۵ء ص ۴۳

یاراں ہمہ رفتند در ویرانہ گرفتند — ماست قدم بر در خمار بماندیم
از نکتۂ مقصود نشد ہیچ حوالے — تا دیں و دلِ دنیا بے کار بماندیم

خواجہ حبیب اللہ نوشہری کے آپ کی تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے ؎

شاہ یعقوب قطب دہر شہ — قدس اللہ سرہ العزیز
کردہ روشن دلِ مریداں چوں — بود بر چرخ فیض بخشی مہ
سوئے عرش بریں عروج نمود — بر براق اجل چو شد ناگہ
چشم ظاہر اگرچہ محروم است — دیدۂ باطنم بروے گاہ
آمد آرے دلے ز خواہد مرد — فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر
چوں فنا فی اللہ آمد وصفش — شدہ موصوف از بقا باللہ
گفت ہاتف بسالِ تاریخش — پنج بفزا دو سالہ ہی شش

ہست "فخر الانام" تاریخش — گر نشد زیبندہ تو ببخش[1]

سال تاریخ فضل ہادیٔ دیں — اول و آخر چراغ یثرب و بطحا[2]

جب کا مزار اب تک مرجع خاص و عام ہے۔ اور زیارت حضرت ایشاں کے نام سے مشہور ہے۔ لفظ ایشاں ترکستان میں شیخ، مرشد، استاد، پیر اور ملا کے لئے بولا جاتا ہے۔ مشہور خواجہ احرار ہی کا انتقال ۸۹۵ھ میں ہوا ہے مگر تذکرہ نگاروں میں حضرت ایشاں ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ادھر ہی حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی کا مزار بھی حضرت ایشاں ہی کے نام سے مشہور ہے۔ انہی معنوں میں یہ لفظ فتح یعقوب عرف کے لئے تکسیر میں مستعمل ہوتا ہے۔

سلک اخیار قرآنی کے قصہ کی پہلی مثنوی ہے جو حزن اسرار کے جواب میں ہے۔ اس کا موضوع اخلاق اور تصوف ہے۔ اس میں تزکیۂ نفس اور تصوف کے نکات عموماً عمدہ بیان کئے ہیں اور ان کی تشریح کر دی ہے۔ جا بجا حکایات بھی بیان فرمائی ہیں۔ اس مثنوی کے ابیات کی تعداد ساڑھے چار سو ہے۔ اس میں حمد و نعت اور مدح شاہی کے بعد رمز و نکات اور قصے بیان کرنے کے بعد بھی علوم پر فخر کرنے والوں کو اس طرح متنبہ کرتے ہیں ؎

اے شدہ مغرور بناموس علم — غلغلہ ہا خفتہ از ناموس علم
علم جان است کہ بر تن زند — علم جان است کہ بر دل زند
علم کہ بر تن زند آں مار تست — علم کہ بر دل زند آں یار تست
علم کہ شد موجب کبر و غرور — ظلمت جان دولت او مدز دور

---

[1] تحفات گردیزی قلمی نسخہ صفحہ ۳۲۵
[2] صادق الخبر از مولوی فقیر محمد جہلمی صفحہ ۳۹۵

علم تو چوں حادث و زنفاست | فخر بریں علم خودن خطاست

پھر توبہ و استغفار کی تلقین کرتے ہوئے دلسوزی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

دے دل تیرہ و تار از گناہ | روئے تو از تیرگی دل سیاہ
ظلمت عصیاں بدلت تا بچے | تیرگی آہ و گلت تا بچے
۲۴ غائم کہ بروز حساب | تا نچہ بپرسند چہ گوئی جواب
نے پدر و مادر دستت بیدیار | نے زن و فرزند نہ خویش و تبار
۲ نفاست بخشش ازدہ دول | تا نشود تہمت خدا مشتعل

حقیقت آشنا اس لوگ گوشت کے ایک لوتھڑے کو دل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قبول حق نے ؎

مطلع انوار الٰہی دل است | مخزن اسرار الٰہی دل است

یہ مثنوی ۹۹۳ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے ؎

شکر خدا عزّ و جل مدام | ساختہ ایں سلک جواہر تمام
سلک لآلی چوں کردم رقم | نام رسالہ شد و تاریخ ہم
۹۹۳ھ

قصہ کی دوسری کڑی مثنوی داستان ہے۔ یہ ایک قدیم مشہور داستان ہے جسے مختلف زبانوں میں ترکی، فارسی اور عربی کے مختلف شاعروں نے نظم کیا یا نثر میں لکھا ہے۔ حق سے پہلے یہ قصہ خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ فارسی میں سب سے پہلے ابوالقاسم عنصری والمتوفی ۴۳۱ھ نے چوتھی صدی ہجری کے آخر یا پانچویں صدی کے شروع میں اس کو مثنوی کے قالب میں ڈھالا۔ اس کے بعد اسی عہد کے شاعر ابوریحان البیرونی والمتوفی ۴۴۰ھ نے اس قصے کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ نیشی جرجانی نے پانچویں صدی ہجری میں، امیر زخاری نے گیارہویں سلجوقی کے عہد میں، عنبری اصفہانی، شیب جوشقانی اور اسیری ترشیزی نے دسویں صدی ہجری میں اس داستان کو منظوم کیا۔ خود اکبر اعظم کے زمانہ میں مولانا عنقی نے ایک مثنوی میں اس داستان کو نظم کیا جس کا ایک نادر نسخہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ حق نے اسی بحر میں اپنی مثنوی لکھی ہے۔ البتہ جہاں مولانا عنقی نے دانش کو شاہ عرب کا زندانی و عذرا کو شاہ یمن کی نور نظر قرار دیا ہے وہاں حق نے دانش کو یمن کا شہزادہ اور عذرا کو اشتقفہ کے سوداگر کی لڑکی قرار دے کر داستان سرائی کی ہے۔ حق کی مثنوی دانش و عذرا دراصل مولانا نظامی گنجوی کی شیریں و خسرو اور مولانا جامی کی یوسف زلیخا کا جواب ہے۔ لیکن حق نے زیادہ تر یوسف زلیخا ہی سامنے رکھا ہے اور اسی کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مثنوی ۹۹۳ھ کے آخر میں تصنیف ہوئی۔ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

بحمد اللہ کہ شد نامہ مرتب | بترتیب خوش و حرز جذب
ختم نامہ حق نی دیدہ لائق | کہ نام خویش بود معشوق و عاشق
۹۹۳ھ

اس مثنوی کا آغاز اس بیت سے ہوتا ہے ؎

خمار ناب حجاب از پیش بخشا | بشتاقاں جمال خویش بنما

قصہ شاد و لب اور دلگیر ہے۔ اخلاص و عمل، ذکر و فکر، شکر و قناعت، توکل و قناعت کے متعلقات اور باطن کے لئے اکسیر اعظم کا حکم رکھتے ہیں۔ دانش و عذرا کی ابتدا ایک ایسی مناجات سے ہوتی ہے جس سے حقیقی توحید پرستی اور عرفان کے جذبے بیدار ہوتے ہیں ؎

خدایا تو غفار و غفوری — بحکم خویش ستار و صبوری
من بیدیں گنہگارم سیہ کار — بدامن ریشم بد خار بد خار
چو در علم ازل دانستہ حالم — قباحت ہائے افعال و خصالم
زبحر مغفرت یک قطرہ خواہم — کہ سازد پاک از چرک گنہ ہم
گنہ ہم گر بود چوں کوہ البرز — بنہم امرسلیں یا سید مرز
شفیع گر نباشد پیش تو کس — بدرگاہت شفیع بے کسی بس

نعتیہ اشعار میں بھی عشق و محبت اور سوز و گداز کی جھلک نظر آتی ہے ؎

محمد کا بتدائے آفرینش — بدا تش بودہ تزئین پنیش
نبی بود آدم و ختم النبیین — کہ ہم بود دین انبیاء و المرسلین

ایک مقالے میں اپنے بیٹے محمد یوسف کو نصیحت کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

الا اے میوۂ دل نور دیدہ — مسرت بخش جان غم رسیدہ
اگر داری ہوائے علم در سر — علی باید وگرنہ جہل بہتر
نخواہم کسب علت بہر دنیا — کہ تا باشد بصدر عزت جا
شوی قاضی و مفتی و مدرس — بہر حالت بدل شیطاں مسوس
برو حق بس است از علم خوانی — کہ فرض ست و واجب جانی
بحق باش و بحق دار و بحق باش — کہ اہل حق ترا گوید شاباش

اگر در گوشۂ عزلت نشینی
ذلت در جہاں ہرگز نہ بینی

یہ اندازِ نصیحت ہوئی ڈاکٹر پرس لکھنؤ میں طبع ہوا تھا اب بھی کسی جگہ مل جاتا ہے۔ اس کا ایک خوش خط با تصویر قلمی نسخہ کتاب خانہ راہپور میں موجود ہے۔

لیلیٰ مجنوں بھی آپ کا ایک منظوم قصہ ہے۔ اور محض قصہ ہی نہیں بلکہ عشق مجازی کے پردے میں عشق حقیقی کے اظہار کا ایک دلآویز ذریعہ ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

حباب از عشق رو گرچہ مجازی ست
کہ از ہر حقیقت کارسازی ست

اس کے اشعار گنتی میں ۱۵ ہزار کچھ سو چار ہیں یہ ۹۹۵ھ کی تصنیف ہے ملاحظہ ہو ؎

صد شکر خدا کہ شد درین کار — تو فیق ہمہ امید وگار
پرورد سخن کرد فت بیروں — کن ختم کلام صرفی اکنوں
در خاتمۂ سخن طرازی — تاریخ او شرح عشقبازی

۹۹۵ھ

مثنوی النبی کی مطلیہ بہائیہ مثنوی تین ہزار تین سو سی اشعار پر مشتمل ہے قرآنی کے حمد کا چوتھا جزء مدسکندہ کا جواب ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ۔

خدایا خدائی مسلم تراست — خداوندی ہر دو عالم تراست
توئی آفرینندۂ کائنات — تو قیوم کونین قائم بذات
فرازندۂ نہ رواقی سپہر — فروزندۂ مشعل ماہ و مہر

اس کے بعد چار سو اشعار میں مولانا قرنی نے اپنی سرگزشت اور سیر و سیاحت کی کیفیت قلمبند کی ہے۔ پھر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی حالات، سام دعوت تبلیغ دین اور غزوات کے بھی صحیح واقعات بیان فرمائے ہیں اور آخر میں کہا ہے ۔

بحمداللہ ایں نامہ یافت — بترتیب دلخواہ انجام یافت
چو کردم طلب سال ختم کتاب — مرا گفت پیر خرد در جواب
طلب گر ز خوبان ایں مطلبی — زحرف دوم الدمغازی النبی

اس مثنوی کا کچھ حصہ محمدی پریس لاہور نے ۱۸۹۹ء میں طبع کیا تھا۔ باقی ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ کتاب مومنوں کے حلقے میں بڑی مقبول ہے۔ حال ہی میں تیسری مرتبہ محمد کمیل تاجی نے مثنوی النبی کو کشمیری زبان میں نظم کیا ہے جس کے بعض اچھے حصے دیہاتوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔

مقامات مرشد عمر کا آخری حصہ ہے۔ جو ہفت پیکر یا ہفت نامہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ مولانا نظامی نے اپنی مثنوی میں بہرام گور کے عشق و محبت کی داستان نظم کی تھی مگر قرنی نے ساڑھے تین ہزار اشعار کی اس مثنوی میں اپنے مرشد مخدوم شیخ کمال الدین حسین خوندی کے مقدس حالات و کشوف مقامات بیان فرمائے ہیں جو اپنے جوش عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ۔

افتتاح الکلام بسم اللہ — الذی لیس فی الوجود سواہ
ہمہ ذرات کائنات گواہ — انہ لا الٰہ الا اللہ

حسب ایل مدد شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ نورنگار مثنوی بھی ۱۸۹۹ء میں مکمل ہوئی ۔

سال ہجری ختم ایں نامہ — نو اختم تا نویسد شمس خامہ
گفت با بندہ ضعیف نادرہ گو — از مقامات پیر راہ بجو

اس مثنوی کے آخر میں قرنی نے اپنے چھوٹے بھائی میر محمد ہاشمی کی ظاہری و باطنی تربیت کے لئے چند نصیحتیں بھی نظم کی ہیں اور دنیا، مذہب اور تہذیب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے خدا شناسی کی طرف راغب کیا ہے ۔

رباعیات کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی آپ کی یادگار ہے۔ یہ رباعیاں اللہ لایں لیکچرز میں ۱۹۰۱ء ان کا سال تصنیف ہے۔ یہ زیادہ تر صوفیانہ خیالات پر مبنی ہیں۔ چند رباعیاں حاضر ہیں ۔

خوش آنکہ دلش صاف زہر رنگ شود — ہر لحظہ بہر معنی دلتنگ شود
با دلبر من کہ رنگ و بے رنگی است — ہم رنگ کسے شود کہ بے رنگ شود

اے شاہِ جہاں دہر شریعت دہ تو — اے افسرِ عزّ و جاہ زیبندہ تو
آمد ز درِ دلم سرِ افگندہ تو — تو پادشہ و پادشہاں بندہ تو

اے خسرو خوباں چہ ظاہر چہ نہاں — بر خاک درِ تو دہ نے خوبانِ جہاں
جز بندہ گیِ تو نیست در شرعِ دگر نیت — ہر دو جہاں آزادہ نے پادشہاں

مقصود تو مرتضیٰ کہ محبوب رسی — با سنّتِ او نشست چو یعقوب رسی
گر ہست مناسبت بطالب ترا — امید کہ از طلب بمطلوب رسی

رندی و مستی کی ایک رباعی بھی دیکھئے ؎

رفتم بہ درِ مغاں ز بہرِ مے ناب — از جام ازل شراب نابم دہ ساقی
ہرگز نخورم بکاسِ سر مے ناقی — غلمانِ تو جویبارِ ما را دہ ساقی

مرتضیٰ کو امیر کبیر سید علی ہمدانی سے خاص عقیدت تھی ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

من بندۂ شاہِ ہمدانی ہستم — پروردۂ آں علی ثانی ہستم
ہر کس کہ محب و خدمت و قبول دہاں — از صدقِ دلش محب جانی ہستم

ایک اور مقام پر آپ کے مناقب اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بستہ ام ایں سلسلہ از بہرِ من — تا شود دل دیوانہ و شیدائے من

دیگر

مرتضیٰ مسکیں کہ ہوا خواہ اوست — از ازل تا جاں بندۂ درگاہ اوست

ان اشعار میں جو مضامین پڑھے وہ تحقیق و تشریح کے طلب تھے۔ مولانا مرتضیٰ نے یہ کام بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ان مسائل کی خوبی تشریح کردی ہے۔

شرح صحیح بخاری اور فتاحیات امام بخاری بھی آپ کی تصنیف بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی کتاب تو جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے حدیث کی مشہور کتاب صحیح بخاری شریف کا حاشیہ ہے۔ مگر یہ کتاب اب بالکل نایاب ہے اپنے کشمیر کے بعض قدیم کتب خانوں میں حدیث کی کوئی نہ کوئی کتاب ایسی مل جاتی ہے جس پر کہیں کہیں مرتضیٰ کے حواشی پائے جاتے ہیں۔

فتاحیات ایسی جزء اور متواتر احادیث کو کہتے ہیں جن کی سند تابعین، تابعین اور صحابہ تین واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو۔ مولانا مرتضیٰ نے امام بخاری کی فتاحیات کی شرح لکھ کر نہ صرف ایک مخطوطہ کے نواقص اتمام دیئے ہیں بلکہ دین کی بھی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

کشمیر کی بعض بزرگوں سے آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۱۔ تفسیر مطلب الطالبین۔ یہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے اور اردو کے رنگ میں ہے۔

(۴) شرح اربعین: یہ ان چالیس حدیثوں کا منظوم ترجمہ اور حاشیہ ہے جن میں شاہ ولایت کی مدح و ستائش پائی جاتی ہے۔
(۵) حماسہ: یہ ۹۰۰ھ کی تصنیف ہے اور فارسی زبان میں ہے اس میں جنگ وغیرہ کے متعلق اشعار واقعات بیان کئے گئے ہیں۔
(۶) قصائد: یہ بھی دو قلمی ہیں اور مجموعہ اہلبیت کی مدح میں لکھی ہیں۔
(۷) حاشیہ ترجیع ترکیب: یہ اصول فقہ کی کتاب ہے کثیر ہیں اس کے بھی نسخے موجود ہیں۔
(۸) مناقب اولیاء: جس میں خلفاء راشدین کے فضائل و مناقب بیان کئے گئے ہیں۔
(۹) رسالہ ترجیع: یہ ۱۰۰۰ھ میں مولانا رکنا کی فوائد کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب بھی ایک دفعہ چھپ چکی ہے۔ اب نایاب ہے۔ اس میں نقشوں کے ذریعہ واقعات بیان کر کے علم دین کی تعلیم کی گئی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

عرق نہ جوئی نگفتہ کہ برعت و رنگ	از نگی سعادت بود گوہر سنگ
پیش ارسطو و افلاطون گفتہ	بے رنگے مشہور نہ شود ہر گز گنگ

(۸) گنزا جواہر
(۹) رسالہ ذکریہ

ان کے علاوہ شیخ یعقوب عرشی نے فیضی کی مشہور تفسیر سواطع الالہام کی تبیید و تلخیص فارسی زبان میں لکھی۔

فلکیات سے بھی وہ بہت شغف رکھتے تھے زائچہ کے دو دفتر کی تحریر لکھنی شروع کی تھی۔ جس کے متعلق ملا عبداللہ اور ملا بدایونی کا خیال ہے کہ اپنے علمی کمالات کا ایک بہترین آئینہ یادگار چھوڑ جاتے مگر یہ مکمل نہ ہو سکی۔

آپ کے علاوہ دیوان کا ایک نایاب نسخہ خوشنما گرو سیدہ اور کرم خوردہ نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود ہے جو بالکل پڑھا نہیں جاتا۔
چند مختصر رسالے بھی ہیں۔ جن میں سے ایک علم ۱۰ تربیت کے متعلق ہے۔

نمونے کے طور پر فارسی کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

نہ ہر ہزار یکے گرد سبزہ گر	در ہر پیمانہ آں نخ نیکست جلوہ گر
نطفہ ہر طفل شاہ و گدست ہر دست	ہیں طرفہ گر دوست ہر دست جلوہ گر

از تو پرسم دناں خاک در پرسم | نہ ہیشش زہر دم صاحب نظر پرسم

عاشقت جوئی گر ساختہ پیدا نشانے ما | ما بوائے محنت و محنت بوائے ما
دولت جلقے اوست بجدے کہ حق دہد | ایں طرفہ گر گشتہ زبون دولتے ما
باہم جالنیں تو مجنون عامری | گو نکہ بعد انبشتہ بجائے ما

مشکن ازے غم دل ما دریں کہن دیر کیست | دل بامید نے ہیں کہ در و منزل کیست

برج فلکده چاشنگیر اس در نقب را　　پیش از زوال شام رسید آفتاب را

گر بلبلیں گزدی پائے رسم باید کرد　　قدر کوتاہ از سر خویش گذر باید کرد

خالت ذکر پریاں گوشہ بروں نشست　　ہر کجا گوشہ نشینے است ہمیں در کارے ہست

ہم زوال دزدیدہ جبرئیل و ایوان را　　دزد سر باخانہ ی روز و شبانِ خانہ را

ضعف تن عجب حمایت بیمار محبت را
کز تواند کشید از ناتوانی بار صحبت را

آخر میں حزیں کی پسندیدہ غزلیں پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کا کلام کس قدر ہمہ رنگ ہے۔ یہاں اس کا جھومار ہے ؎

عشق را نیست رہ بوادیٔ ما　　ولے رہا و نا مرادیٔ ما
بسپردیم نقد جاں بہ تمت　　کز جز او نیست اعتمادیٔ ما
شادیٔ ما چنان بہ حزیں　　قیس چرخ از سزا و نشادیٔ ما
عادت ما و نا و مستغنی　　یارہ از صبر عادیٔ ما

صہبائی از شیخ کارہا بخشود
پیر ما پیر آمدہ است ہادیٔ ما

ایں حکایت کہ نے و میوہ شام است اینجا　　روز و شب باغبانی از پئے آرام است اینجا
متی ہے کند از ہستیٔ خود آزاد است　　ہر کہ آزاد نہ خود گشتہ غلام است اینجا
عشق برزد ز ہوا پختگی و خامیٔ عقل　　خام چوں پختہ شود پختہ تر خام است اینجا
نالہا فرد من اگرچہ ز رنگیں است　　نا امیدم چہ کنی رحمت عام است اینجا
آن تجلی کہ شد از طور عیاں پرتوے　　جلوۂ ما و من از گوشۂ بام است اینجا

محو دیدار بقاماتِ تجلی حزیں است
چہ کھیش نہ تمنائے کلام است اینجا

اس زمین میں سب سے پہلے کمال خجندی نے غزل لکھی تھی پھر سودا، حاجی، لطفی، بیخودی، عزلت، نظیر وغیرہ نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ حزیں کے بعد صاحب مخمور تشنہ شیخ علی حزیں نے بھی غزلیں لکھیں۔ اور آخر میں علامہ اقبال نے ایک غزل کہی جس کا مطلع ہے۔

ہست ایں سیکدہ را خاصیت عام است اینجا　　قسمت بادہ بہ اندازہ جام است اینجا

شب ہجراں زہار بس چہ کنم — گر تنالم زہجر بس چہ کنم
در سر من ہوائے قامت او — سرو دشمناد را ہوس چہ کنم
دہن وصل او بدست رقیب — گر و انیست دسترس چہ کنم
چند منع من از فغاں کردن — جز فغاں نیست ہمنفس چہ کنم
سار بال چوں بر د محمل دوست — غیر زاری چوں پس چہ کنم

بلبل باغ قدسم اے صرفی
دہ چہ سازم دریں قفس چہ کنم

ساقیا بر د بجبہ کوشش گذار ہے — کانجا ست یک طمانچہ بہ از صد ہزار ہے
گر جلوہ گر بچبہ نگرد د جمال او — بے ہودہ است عمر نیاید بکار ہے
در راہ کعبہ نقرۂ نیک تا بکے؟ — احرام آں حریم نبند د بیار ہے

صرفی ز آستاں وے اگر کم نبود
یا رب چرا بمکد اد گرد یار ہے

چند رہم نالہ از درد دل پر خوں کنم — یا گریم در خود و رب ندائم چوں کنم
بیدے من حالتے دارد ز اغلاطوں مگر — ہنشیں من شود بچو خویش بچوں کنم
چار زن دانستہ ام چوں رفت از میزم — اندروں سینہ اش یا رب چہاں پر خوں کنم
کے تواں کردن شکایت ناں ز ناہر ہا — در کنم از جیب خود با گردش گرداں کنم
بر لب جاناں شہد با خود از رشک کاں — دیدہ پر خوں چو جام بادہ گلگوں کنم

رشتہ شعر م اے صرفی شود موزوں تر
وصف آں رفتار خوب قامت موزوں کنم

رخ نمودن ازاں پری عجب است — از پری آدمی گری عجب است
گر شہا نند بندہ اش چہ عجب — نیک از و بندہ پروری عجب است
گر نہ تاج مرصع خاک رہش — تاج داری و سروری عجب است
اے گدایاں در گدوئے تو اند — گر سوئے بندہ بنگری عجب است
سر من در صفائے آئینہ — بار خ تو ہمابری عجب است
در زمان تو از بہتاں دگر — نازنینی و دلبری عجب است

لطف طبع تو صرفیا در شعر
از ظہوری و انوری عجب است

علامہ ابوالفضل کہتا ہے کہ عرفی جملہ صفات حسن بہرہ وافر رکھتے تھے۔ مگر مولانا عبدالقادر صاحب فانی کے نزدیک "شروانی عرفی اردو" اور دیکھا جائے تو غزل گوئی عرفی کے ذریعہ سے واقعی زندہ تھی۔ وہ صاحب کمال تھے۔ شاعر تھے۔ مگر غزل کے میدان کے مرد نہ تھے۔ اسی نے غزل کی دنیا میں انھیں کوئی حیثیت نہ دی۔ "بل نہ ہا" اس دور کے مشہور غزل گو نظیری، طالب اور نسیمی وغیرہ تھے۔ ان کے مقابلے میں عرفی کی غزلیں بہ حیثیت مجموعی بہت پھیکی اور بے مزہ نظر آتی ہیں۔ ان شعراء کی مشکل پسندی، مضمون آفرینی اور غزل کے برعکس عرفی نے سادہ گوئی کی جانب توجہ دی۔ وہ حسن و محبت کی واردات بھی بہت کم بیان کرتے ہیں۔ البتہ تصوف کے مسائل جو بجائے خود بس اتنا انھیں نہایت اعلیٰ پیرایہ میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرفی کا دیوان آج تک ارباب فن کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکا۔ اور آسانی سے بہت کم نسخے ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔ البتہ مثنوی گو کی حیثیت سے ان کا پایہ نہایت بلند ہے اور یہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی کائنات ہے جس پر وہ بلاشبہ فخر کر سکتا ہے۔

۱؎ آئین اکبری جلد اول صفحہ ۵۸۱۔

بچھیو کی ڈیکامیرون

محمد احسن فاروقی

جس مصنف نے سب سے پہلے اپنی تصنیف کو ناول کا نام دیا وہ بچھیو تھا۔ یہ امر زیر بحث ہی رہے گا کہ اس کے مختصر افسانے جو ڈیکامیرون میں یکجا کر دیئے گئے ہیں کہاں تک ناول کہلائے جانے کے قابل ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ناول کے موجد یا اس کی روح سے ہم کنار ہونے کے لئے ہمیں ڈیکامیرون کا سہارا ضرور لینا پڑتا ہے۔

بچھیو ان لوگوں میں سے ہے جن کو نشاۃ ثانیہ کا پیمبر کہا جاتا ہے۔ بجا اور اس کی ڈیکامیرون میں نشاۃ ثانیہ کی وہ روح ہے جو جدید دور کے ادب کی عام طور پر اور ناول کی خاص طور پر روح کہلائی جا سکتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے لیڈر عام طور پر تین ہستیاں بتائی جاتی ہیں۔ ایک دانتے جو اس دور کے روحانی اور اخلاقی تصب العین کا نمائندہ ہے۔ دوسرا پیٹرارک جو اس دور کے جوش اور جذبات کا اور تیسرا بچھیو جو اس دور کی مادی دنیا پر نظر اور اس دنیا کی خوشی اس کے جس اور اس کی تمام مسرتوں سے آزادی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ انسان کی زندگی میں ترقی کی طرف لے جانے والا ایک مخصوص نقطہ تھا۔ ذہنی قوتیں مذہب کی قید سے آزاد ہو کر ایک نئی دنیا تعمیر کر جا رہی تھیں۔ اس دور کے لوگ دنیا کی تلاش میں نکلے علماء نے مذہبی کتابوں سے تنگ آ کر پرانے یونانی اور رومن ادب کی تصانیف میں گہری دلچسپی لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اور اس کے معائن زندگی کے کوئی سمجھے نہ رہے۔ آزادی کی لہر تمام عالم پر چھا گئی۔ انسان تمام نظروں سے بالاتر نظر آیا اور تمام قوموں، زمانوں اور ملکوں کے انسان ایک ہی قسم کے نظر آئے۔ مذہب کی جگہ تہذیب Civilization نے لی۔ انسانیت کی تعمیر نئے سرے سے کی گئی۔ جسمانی تہذیب اور ذہنی تہذیب کو حاصل کرنے کے لئے تعلیم اور تربیت کا ایک نظام بنایا گیا جس کے ذریعہ نئی کردار پیدا کرنے کی امید کی گئی۔ اس کردار میں مذہبی عقیدے کے بجائے ذہن، علم اور ادب کو جگہ دی گئی۔ خوب سے خوب عورت سے اخلاقی محبت کو زندگی کی سب سے بڑی قدر قرار دیا گیا۔ ہر فرد کو اپنی عقل پر بھروسہ کر کے اس کی زندگی کا اہم فرض شہر، مذہبی عمل میں مصروف ہونے سے بہتر عمل یہ تھا کہ ہر فرد علوم و فنون کو حاصل کرے اور عملی اور فنی کارنامے پیش کرنے میں اپنا وقت صرف کرے۔ یہی کارنامے مشہور ہو کر اس کی آئندہ زندگی بنائیں گے اور اسے حیات ابدی بخشیں گے۔ غرض ایک نیا انسان ظہور میں آئے گا جو مذہب سے آزاد تہذیب سے بھرا ہوا، آفاقی ذہن رکھنے والا اور طاقت ور ہوگا۔ ایسے انسان کی کرسا سے عالم کو ایک کریں گے۔ چنانچہ اس تصب العین پر عمل کیا گیا۔ عملی زندگی میں تہذیب سے آزادی نے یہ گل کھلایا کہ ہر فرد دنیا کی برائیوں میں حصہ لینا اور دل چسپی لینے لگا ضمیر غائب ہو گیا۔ اخلاقی محبت مردوں کے نہایت درجہ آزاد تعلقات میں ملیامیٹ ہوئی۔ عیاشی، بوالہوسی، نہایت درجے عام ہو گئی۔ بچھیو نشاۃ ثانیہ کی زندگی کے اس عملی پہلو سے وابستہ ہے۔ اور اس کی تصنیف اس پہلو کی پوری واقفیت کے ساتھ عکاسی کرتی ہے۔

اس کا والد نشاۃ ثانیہ کے اس اثر میں پورے طور پر ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا والد فلورنس کا شہری تھا۔ اس کا باپ پیرس میں تجارت کرتا تھا۔ یہ

اس کے باپ کو عشق ایک عورت سے ہو گیا جس سے یہ بچہ پیدا ہوا جس کا نام جیوانی رکھا گیا۔ اس کی اس طرح پر پیدائش اس کی تصانیف کے رنگ کی اور اس کے رجحان طبع کی اہم بنیاد ہے۔ ایسے خاندان میں پیدا اور پرورش ہونے ہی کی وجہ سے اس کی نگاہ زندگی کے ان حالات پر پڑی جو اس نے اپنی تصانیف میں واضح کئے ہیں۔ وہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا اور تجارت میں لگ گیا۔ یہ تجارت نیپلس کے شہر میں تھی۔ یہاں اس کا تعلق شاہی خاندان کے دربار سے ہو گیا اور اس دربار میں اس کا سابقہ بہت سی عورتوں سے پڑا۔ اس نے قانون کی تعلیم بھی حاصل کی مگر اس کو ختم نہ کر سکا۔ وہ علم دوست ضرور تھا۔ ڈانٹے کی زندگی کے حالات اس نے جس کاوش سے لکھے ہیں وہ اس کی علم دوستی کی مثال ہیں۔ نشاۃ الثانیہ کے افراد کی طرح وہ ذہنی قابلیت کا بھی ساتھ رکھتا تھا اور ادبی ذوق کو اپنے مذہب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ محبت کے لقب انہیں سے بھی وہ قدرتی طور پر متاثر ہوا تھا۔ ... بادشاہ کی حرامی لڑکی تھی ایسا عشق ہوا جو اس کے فن کی بنیاد اور اس کے کمال کا باعث ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تصنیف میں فیامتا کے نام سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عشق کس قدر سنجیدہ ... اور روحانی نقطہ نظر سے مفید تھا مگر اصل روحانیت اس کا میدان نہ تھا۔ ڈانٹے نے ان سب لوگوں کو برا کہا ہے جو جسمانی لطف میں گم ہو جاتے ہیں مگر بوکیچو تو جسمانی لطف میں اپنی زندگی بسر کرتا تھا اس کو ان لوگوں سے ہمدردی ہے جو تکلیف میں ہیں اس وجہ سے کہ انہوں نے سب اصول چھوڑ دیئے ہیں اور ان لوگوں کے حالات ہی میں اسے زندگی کا حسن دکھائی دیتا ہے۔ ... وہ زندگی بسر کرنے ہی میں زندگی کا مقصد پاتا ہے ... ساتھ ... وہ دنیا کی ہر خرابی کو ... لطف اندوز ہوتے جاتے ہیں ... شوق سے دیکھتا ہے۔ اسے کسی نقطہ نظر سے تعلق نہیں ہے۔ کبھی وہ ہوس پرستی میں ڈوب جاتا ہے کبھی جنسی الجھنوں میں کھو جاتا ہے کبھی جنون کے عالم میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی زندگی زیادہ نہیں چل سکتی۔ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں اسے خوف ... موت سے ڈر ... لگتا ہے وہ مذہب کی طرف واپس آتا ہے اور ہر وقت قریبی ... رہتا ہے وہ ڈانٹے پر لکچر دیتا پھرتا ہے اور آخرکار ۲۱ دسمبر ۱۳۷۵ء کو مر جاتا ہے۔

ڈیکیمرون اس وقت کی تصنیف ہے جب کہ اس کی ہوس پرستی اپنے عروج پر تھی۔ یہ تصنیف بھی محبت کی روداد ہی کی ... کے قصوں پر لکھی گئی ہے اس معنی میں نشاۃ ثانیہ کی ہر تصنیف سے وہ ہم آہنگ ہے۔ اس تصنیف کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے "اپنی جوانی کے شروع سے اب تک میری روح کو ایک اعلیٰ اور دل جلانے والی محبت نے ... تھا۔ جس محبت نے یہ تکلیف بھی دی ... ہونے کے بعد بڑی فرحت بخش ہو گئی۔ میرے دوستوں نے میری مدد کی اور میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ میں خواتین کا خاص طور پر شکر گزار ہوں۔ بہت ہی خاص طور پر ان خواتین کا جو ان سو قصوں کو پسند کریں جو دس دن میں سات خواتین اور تین مردوں نے وبا کے زمانے میں بیان کئے تھے۔ ان قصوں میں اکثر ناکام محبت کے واقعات ملیں گے اور ایسے واقعات بیان ہوں گے جن کے نتائج عجیب اور قدیم و دل ... لبھانے والے ... ان کو پڑھ کر خواتین لطف اندوز ہوں گی اور نصیحت بھی حاصل کریں گی اور یہ جان لیں گی کہ دنیا میں کس چیز سے رغبت کریں اور کس چیز سے نفرت کریں اور کن باتوں پر عمل کریں۔ اگر خواتین اس مقصد تک پہنچ سکیں تو انہیں محبت کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے مجھے ... سے آزاد کر کے یہ قوت بخشی کہ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کا اہل ہوں۔" آگے چل کر وہ اس وبا کا حال بیان کرتا ہے جس کی بنا پر قصوں کے بیان کرنے والوں کو شہر چھوڑ کر دیہات میں جانا پڑا اور اپنا وقت کاٹنے کے لیے قصوں کے ذریعہ دل بہلانا پڑا۔ یہ وبا بڑی خطرناک قسم کی تھی۔ اس کو طاعون کہنا چاہئے۔ فلورنس کے شہر میں باوجود تمام صفائی اور احتیاط کے یہ وبا پھیل گئی۔ موسم بہار میں اس کے اثرات بہت ہی زیادہ نمایاں ہوئے۔ بیمار کا ... میں پہلے کچھ غدود نمایاں ہوتے پھر یہ غدود پھیلتے اور جسم پر کالے دھبے پڑ جاتے۔ کوئی علاج فائدہ نہ کرتا اور مریض مر جاتا۔ یہ مرض جلد دوسرے لوگوں کو لگ جاتا اور اکثر بیمار کے کپڑوں سے جانوروں میں پھیل جاتا۔ یہ حالات دیکھ کر تمام لوگ حد سے زیادہ ... ہو گئے ... تمام لوگ شہر سے بھاگ گئے۔ ... لاشوں کے ڈھیر نظر آتے ہیں ... دیکھ کر لوگوں کے اخلاقی قوانین بھی ٹوٹ جاتے۔ انہی حالات میں ایک گرجا کے ... دن ... سات خواتین جمع ہوئیں۔ یہ ساتوں اچھے خاندان کی خوب صورت تہذیب یافتہ اور خوش مزاج تھیں۔ کسی کی عمر ۲۸ برس سے زیادہ نہ تھی اور ۱۸ برس سے کم نہ تھی۔ ان کے صحیح نام بتانا ضروری نہیں۔ ان کے ایسے نام بتائے جائیں گے

کردار کو خیال کرتے ہیں یوں بیان کئے جاتے ہیں پہنتا فیتا۔ فوتیا۔ ایسلیہ۔ فوتیا۔ نیتیل اعلا الاتر۔ ان میں سے پہنتالے یہ لڑکے ظاہر کی کو دیہات میں چلا جائے۔ فوتیا نے کہا کہ کچھ دنوں کے لئے پہنتا بھی مزدوری ہے اس وقت تین مرد گھر میں داخل ہوئے جن کے نام ہیلیو، فلاسٹر اور ڈیوتھے۔ یہ خواتین سے رشتہ بھی رکھتے تھے اور ان میں سے جن سے محبت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ یہ دشمن شہر سے روپیل دور ایک محل میں رہنے لگے۔ یہاں وہ آرام سے مقیم ہو چکے تو پہنتالے نے کہا کہ وقت کو دل چسپی سے گذارنے کیلئے اس افراد میں سے ہر روز ایک کو سردار یا حکمہ مقرر کیا جائے اور اس کی صدارت میں باقی لوگ قصے بیان کریں۔ چنانچہ پہلے دن کے لئے پہنتا کو حکمہ بنایا گیا اور اس نے ایک قصہ بیان کیا اور پھر باقی تو معززات نے اپنے اپنے قصے سنائے۔ دوسرے دن فوتیا حکمہ مقرر ہوئی تو یہ پاکیزہ قصے بیان کئے جائیں جن میں لوگوں نے بڑی پریشانیوں کے بعد آخر میں ایسی خوشی حاصل کی جس کی انہیں امید نہ تھی۔ تیسرے دن نیتیل کی صدارت میں ایسے قصے بیان ہوئے جس میں لوگوں نے جدوجہد کے بعد کسی چیز کو حاصل کیا پھر کھو دیا اور آخر میں پھر پالیا۔ چوتھے دن خاسترڈ وڈی نگرانی میں محبت کے ایسے قصے بیان ہوئے جن کا انجام بہت خراب تھا۔ پانچویں دن نیتیل سے شروع ہو کر ایسے قصے بیان کئے گئے جن میں مصیبتوں کے بعد عاشق خوش قسمتی سے ہم کنار ہوئے۔ چھٹے دن لاسٹر سے شروع کرتے ہوئے ایسے قصے بیان ہوئے جن میں کسی برجستہ جملے کے ذریعہ کوئی مصیبت ٹلی تھی یا کسی نقصان سے بچ جانے کی صورت نکلی تھی۔ ساتویں دن ڈیوتھے نے ایسے قصوں کی ابتدا کی جن میں عورتوں نے اپنے شوہروں کو دھوکہ دیئے تھے آٹھویں دن فوتیا سے شروع ہو کر ایسے قصے بیان ہوئے جن میں ایسے دھوکوں کا ذکر تھا جیسے کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اور بیویاں شوہروں کے ساتھ روا رکھا کرتی ہیں۔ نویں دن ایلیہ نے ایسے قصوں کی ابتدا کی جن میں متفرق باتیں تھیں۔ دسویں دن پہنتالے سے شروع کرتے ہوئے سب نے ایسے قصے بیان کئے جن میں محبت کے تحت کوئی بات سخاوت کے ساتھ کی گئی تھی۔ اسی طرح ڈیکامیرون یعنی دس دن میں ایک سو قصے ایک ساتھ جمع ہو گئے۔ دنیا کے ادب میں بہت سے قصوں کو ایک ساتھ جمع کرنے کی تراکیب میں سے یہ بھی ایک اہم ترکیب ہے۔ سنسکرت میں بیتال پچیسی کے قصے، الف لیلہ کے قصے، انگریزی میں چاسر کینٹربری ٹیلز خاص مثالیں ہیں۔ ڈیکامیرون، عمان سب سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بیتال پچیسی میں ایک بیتال سب قصے بیان کرتا ہے۔ الف لیلہ میں ایک ملکہ اپنے بادشاہ شوہر کی بری عادت چھڑانے کیلئے تمام قصے بیان کرتی ہے۔ مگر ڈیکامیرون میں، سو فردیں جن میں سے ہر ایک تہذیب یافتہ ہے۔ عرف چاسر کی ترکیب اس ترکیب سے زیادہ دل چسپ نظر آتی ہے۔ دو چالیس آدمیوں کو ایک زیارت یا جاترہ پر جاتا ہوا دکھاتا ہے اور پچیس افراد انگلستان کے ہر طبقہ اور ہر قسم کے نمائندہ ہیں۔ چودھویں صدی کی پوری دنیا ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور ہر فرد ایک خاص زندگی رکھتا ہے۔ بچھیو کے دس افراد بھی ایک شریف طبقے کے ہیں۔ ان میں نیفا کو چھوڑ کر کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ پھر چاسر کا ہر قصہ قصہ گو کی فطرت کو عیاں کرتا ہے۔ بچھیو کے قصوں کو قصہ گویوں کی فطرت سے کوئی تعلق نہیں۔ غرض، جو ترکیب بچھیو نے استعمال کی ہے وہ اپنی طرز پر بڑی دل چسپ ہے اور وہ مقامات بھی جہاں مناظر قدرت سے پُر ہیں جہاں یہ قصے بیان ہوئے ہیں۔

یہ قصے سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ہماری توجہ کو شروع سے آخر تک نہ کھینچ لیتا ہو۔ یہ سب قصے بچھیو کے گھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ عرب، ایران، مصر، فراس کی تصانیف میں ان میں سے زیادہ تر قصے ملتے ہیں۔ بچھیو نے مختلف میں مختلف لوگوں کی زبان سے سنا تھا۔ یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کیوں کہ تمام دنیا کے قصہ گویوں نے قصوں کو کہیں نہ کہیں سے مزہ لیا ہے اور شاذ و نادر ہی خود گھڑا ہے۔ سب سے اہم چیز ان قصوں کا مجموعی تاثر ہے۔ یہاں ہمیں ایک پوری دنیا ملتی ہے اور ان سب قصوں کو پڑھنے کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ایک پوری دنیا کا نظارہ کیا۔ یہ ویسی ہی دنیا ہے جیسی کہ ہمیں ہر روز دکھائی دیتی ہے جس میں اچھائی اور برائی کی جلی چل رہی ہے اس میں تنوع ہے، افراد کی کثرت ہے۔ چودھویں صدی کے اٹلی میں زندگی کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ انسانی فطرت اور کثرت کا بھی مکمل نقشہ یہاں موجود ہے پھر یہاں انسان کو پوری واقعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جیسے زندگی پر کوئی فلسفہ یا اخلاقی نظریہ حاوی نہیں ہوتا ویسے ہی یہاں بھی کسی قسم کے اصول اور فرائض نظر نہیں آتے۔ خاص طور سے

NUMANIA

یہاں طبع گرہے۔ مرد اور عورت بالکل صحیح اور پورے طور پر ممکن نظر آتے ہے۔ زندگی بسر کرنے کے طریقے انسانوں کی بنیادی فطرت پر صحیح تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے عشق کا سلسلہ ہنسا یا مسکراہٹ پیدا کرتا ہے۔ یہ رنگ بعض جگہ ایک لطیف اور بعض جگہ ایک شدید طنز میں بدل جاتا ہے بعض جگہ جون و جلال اور بعض جگہ خلوص اور اخلاق اور بعض جگہ گہرے جذبات کا سایہ اس پر پڑ جاتا ہے۔ عشق انسانی فطرت کی اعلیٰ محبت اور پیمانہ شفقت کی نظر سے دیکھتا ہے یا اخلاقی اور عیاری کو وہ زندگی کا لازمی جزو قرار دیتا ہے۔ ڈیکامیرون کے قصوں کی عریانی پر سخت اعتراضات کئے گئے ہیں اور اس بنا پر بکیچو پر سخت تنقید بھی کی گئی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رقاصیں مخرج پر کتنے زیادہ عریاں تھے اور بکیچو نے ان کی عریانی کو کس قدر کم کر دیا پھر بھی ہیں اس کی اظہاری کرتا ہے اور نہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے اخلاق کو سراہا جائے۔ وہ خاک نشیں ہے اور بے دردیہ کہتا ہے کہ وہ اہل خانہ سے ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے ہر واقعیت نگار کی طرح وہ محض زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جنسی تعلق اس کا بہت ہی دل چسپ موضوع ہے۔ یہ موضوع ہر قصہ میں ہے اس کی زیادتی بعض وقت واقعیت کے خلاف نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بکیچو کو جوان اور خوبصورت عورتوں کے جنسی حالات کے سوا اور کسی چیز سے غرض ہی نہیں تھی اس کی دنیا کی عورتیں اور مرد سب زنا کار ہیں اور ان کی حرکات کو وہ مخرب اخلاق سمجھ کر نہیں بلکہ دل چسپ سمجھ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کیلئے جنسی بنائی تقدس کا سوال نہیں زندگی اپنی جگہ پر ایک قدر ہے وہ ایسا ہی غیر جانب دار ہے جیسا کہ آفاقی ذہن ہونا چاہئے، وہ جرم پیشی و تحکم تاری کا قائل ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ڈیکامیرون میں ہمیں زندگی اپنے پورے تنوع کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ان قصوں میں ہر ہر قسم کے واقعات موجود ہیں۔ کہیں مراحل طے ہو رہے ہیں، کہیں منازل قطع ہو رہی ہیں، کہیں بیاکاری مذہب پر ہنس رہی ہے اور کہیں زناکاری اخلاق کو ختم کر رہی ہے۔ ہر طبقے کے لوگ یہاں موجود ہیں بادشاہ اور دان کے درباری یا امرا اپنے رنگ میں مست ہیں، تاجر کمانے کی دھن میں ہر چیز کی نہیں بلکہ ہر مذہبی اور اخلاقی قدر کو فروخت کرتے نظر آتے ہیں مذہبی لوگ ریاکاری کی عبا اوڑھے ہوئے گداگر منافع جوچ رہے ہیں، گرجوں میں پادری اور نفس خدا سے توبہ کر رہی ہیں اور شیطان سے ہم آغوش ہیں۔ گھروں میں چلتر باز محض شوہروں سے طرب گاہ رقیب کی مزدوری کرا رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بکیچو نے دنیا کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا ہے جس میں تمام زندگی کے عکس آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ یہ آئینہ بالکل سطحی ہے اور کوئی تصویر یا عکس اس میں اپنی شکل یا اپنا رنگ نہیں بدلتا۔ زندگی کے اس مکمل نقشے کو دیکھ کر یہ مرد محسوس ہوتا ہے کہ کاش میت کا کچھ رنگ اس پر مرور آیا ہوتا تو اچھا تھا کوئی اخلاقی نقطہ نظر اس پر چھا جاتا تو اس تصنیف میں بحیثیت فن پارے کے ایک زیادہ بہتر توازن اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات انسانی زندگی کا بڑا اہم جزو ہیں اور زندگی کے واقعیاتی نقشے میں ان کو اہم جگہ ملنی چاہئے مگر بکیچو کے یہاں اس کی اتنی بہتات ہے کہ جس کا ٹھکانا نہیں۔ اس کے قصوں کی تمام عورتیں زناکار ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی عورت ایسی نظر آتی ہے جو پاک دامن ہو۔ تمام قصوں میں ایک گریسلڈا ہی اپنے شوہر کی وفادار ہے، یہ ماکوئس سالوزو کی بیوی ہے۔ یہ غریب گھر کی عورت ہے اور مارکوئس اس کو بہت تکلیف دیتا ہے مگر وہ کسی طرح کسی برائی میں نہیں پڑتی۔ اس کا قصہ دسویں دن کا دسواں قصہ ہے اور اسی پر ڈیکامیرون ختم ہوتی ہے اس کے علاوہ جو بھی قصہ اٹھا جائے اس میں چلتر باز عورت ہی نظر آتی ہے جو شیطان سے رشتہ جوڑنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور بدمعاشی کرکے نہ اسے احساس گناہ ہی ہوتا ہے اور نہ شرم ہی آتی ہے۔ بطلات اس کے ان عورتوں کے شوہر عام طور پر بڈھے احمق ہیں مرد کو عورت کا اس قدر زمردار سمجھا جاتا ہے کہ عورت کا غلط راہ پر جانا بھی مرد کی غلطی شمار کیا جاتا ہے۔ اسلئے کہ وہ شوہر علط پر ہمیشہ ہنسا جاتا ہے چنانچہ بکیچو کے قصوں کے تمام شوہر مزاحیہ کردار ہیں۔

مزاح ہی بکیچو کا خاص میدان ہے "ڈیکامیرون" میں بہت سے قصے ایسے ہیں جو ہمیں ہنساتے ہیں بہت سے بعض جذبات کو ابھار کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ میں رومانی رنگ میں عظمت کا تاثر بھی پنہاں ہے اکثر بھی مختلف اثرات کے حامل ہیں۔ قصوں میں ہمیں زناکار کسان بھی ملتے ہیں، پختہ کار تجار بھی نظر آتے ہیں۔ متہذب یا نیم اچھی سوسائٹی کے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی ہے، مگر زیادہ تر قصے اور کردار مزاحیہ ہی ہیں۔ یہاں ہر طرح کا مزاح

اثر ہوتے ہیں کچھ قصوں میں محض مذاق ہے جو ہنسنے ہنسانے کو لکھا گیا ہے۔ جیسے ساتویں دن والے قصوں میں جن میں عورتیں اپنے شوہروں کو دھوکا دیتی ہیں۔ کچھ قصوں میں ذہانت، حاضر جوابی اور چوٹوں کی صورت نمایاں ہوتی ہیں۔ جیسے چھٹے دن والے قصوں میں جن میں کسی کی برجستہ ریمارک یا فقرے یا جملے سے قصہ کا رخ ہی بدل جاتا ہے۔ بعض کی شوخی ظرافت میں بدل جاتی ہے۔ اکثر جگہ طنز کا رنگ بھی غالب ہو جاتا ہے۔ مگر بوکیشیو اپنے کمال پر اس جگہ نظر آتا ہے جہاں وہ مزاحیہ کردار سامنے لاتا ہے۔ جو بیک وقت دلچسپ اور لطیف مزاحیہ پہلو بھی ہے۔ مگر اس کا مزاح خاص طور پر مذہب سے متعلق لوگوں میں نظر آتا ہے۔ پادریوں کے اکثر قصے محض مزاحیہ کرداروں کی عکاسی میں ہیں۔ مگر اس میں طنز بھی آ جاتا ہے۔ خانقاہوں میں راہبوں اور راہبات کے حالات اس نے صاف صاف درج کیے ہیں۔ وہ پادری جو اس سے متعلق لکھے ہیں، اور بھی زیادہ بدمعاش دکھائے گئے ہیں۔ ریاکاری، جعلسازی، زناکاری، چوری ہر قسم کے گناہ یہ مذہب کی آڑ میں کرتے ہیں۔ عام لوگ اگر گناہ کریں تو ہم کو اس کا معلوم ہوتا ہے مگر ان کے گناہ مستور پوشیدہ ہیں کہ یا وہ بزرگ ان کی پہچان کرتے ہیں۔ بوکیشیو دکھانا چاہتا ہے کہ مذہبی نظام کس طرح بدی کا مرکز ہو چکا ہے۔ دنیا کے لیے پادری بیان کے درجے پر نظر آتے ہیں اور بیشتر ان میں ہر قسم کی بدمعاشی پھیلاتے ہیں۔ نیک پادری صرف ایک ہے جو سب سے پہلے قصہ میں نظر آتا ہے۔ اس کا نام بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ اگرچہ ایسے لوگ تھے بھی، وہ گمنام تھے۔ سب سے پہلے قصہ میں سرچاپلیٹو کا اور اس کی حیات کا سب طریقہ یہ واضح کرتا ہے کہ مذہب اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کا ایک عام ذریعہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کے نیک بندوں سے دنیا خالی نہیں تھی مگر جن لوگوں کو مذہب کی حفاظت کرنی تھی انہوں نے جس طرح اس کو اپنی دنیاداری ترقی کا آلہ کار بنا رکھا تھا۔ مذہبی لوگوں اور مذہبی نظام کی اس طرح پول کھولنے کی بنا پر ڈیکامیرون کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھا گیا اور اس کے خلاف بہت کچھ کہا گیا۔ مگر یہ بھی بات اپنی جگہ پر راسخ ہوتی ہے اور کچھ یہ وجہ بھی ثابت ہو گئی کہ مذہب کی غلط تعبیروں سے انسان کو آزاد کرانا ضروری ہے۔ غرض بوکیشیو کی نظر بنیادی طور پر مزاحیہ نگار کی نظر ہے۔ مزاحیہ نگار کی ہمدردی، انسان دوستی اس کے مزاج کا اہم حصہ ہے جو دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ اس دنیا میں مذہبی قدریں بالکل مٹ چکی ہیں۔ مذہبی لوگ بدمعاشیوں کے مراکز ہیں۔ مذہبی اہلکاروں دنیا میں بدمعاشیاں پھیلا رہے ہیں۔ عام لوگ مذہب کو دھوکے کی ٹٹی کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ زن و شوہر کے تعلقات محض رسم یا ایک قسم کی تجارت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اعلیٰ قدروں کا کہیں ذکر نہیں۔ جنت کتابوں میں ہے جو ہم گزر زندگی میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ تو وہ بھی عالم اور حیثیت HUMANIST ہے۔ اسے ہر جگہ انسان کی حیثیت پر فخر ہوتا ہے اور وہ ایسے خالق پر عقیدہ رکھتا ہے جس کا سلسلہ عام اپنی دلچسپی ہے۔ اگرچہ غالب جگہ طنز کا رنگ قائم ہو گیا ہے یہ رنگ بھی بڑھ جاتا ہے اور کامل ہمدردی کے ساتھ وہ تمام عیب کو دیکھتا ہے کہیں محض کھلا کر ہنس دیتا ہے اور زیادہ تر مسکراتا ہوا جو ہنسنے سامنے سے گزر جاتا ہے اس نے دنیا جیسے سامنے چھوڑی ہے وہ مذہب یا اخلاق کی عینک لگا کر دیکھنے والے کو شاید گندگی نظر آئے مگر زندگی پر کچھ نظر رکھنے والے کے لیے یہ دلچسپی ہے جس کے وہ اپنے زمانے میں حق اور جس دور میں اور ہر زمانے میں رہے گی۔ انقلابات اگر اس کی سطح کو پوری طرح خوب کر دیں گے مگر اس کی تہوں میں وہی سب کچھ ہے جو بوکیشیو نے دکھایا ہے اور ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ جنت کے ماتحت نظر کرنے والے بہت سے بہم مول لیتے ہیں۔ جنت اس دور میں جہاں ہے کہ دنیا کے ہر رنگ کو دیکھے جائیے اور ہنسے جائیے۔ نشاۃ الثانیہ کا انسان کیسے تعجب ہے اور جوں جوں ہماری زندگی ترقی کرتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے وہ ہر فرد کی جو گہری نظر اور بیدار دل رکھتا ہے۔

ٹھیک اسی بات پر ہوگی کہ اس دنیا کی ہر برائی کو دیکھ کر مسکرا ہی جانا چاہیے۔ زندگی کے تمام بھی مقاصد ختم ہو گئے اب ایک ہی مقصد رہ گیا ہے۔

غرض بوکیشیو ہمیں مذاق ہی مذاق میں ایک بڑے اچھے فلسفۂ حیات تک لے جاتا ہے۔ یہ اس کی تصنیف کی اہم دائمی قیمت ہے۔ گو وہ دنگا کی کسی سے پیچھے نہیں رہ جاتا اس کے نظریۂ حیات سے ہم اختلاف بھی کر سکتے ہیں مگر اس کے فن کی حیثیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ قصہ گوئی کی قدرتی صلاحیت اس کے قصوں میں بڑے ضبط اور بڑی نمایاں نظر آتی ہے کوئی قصہ ایسا نہیں ہے چاہے وہ مختصر ہو یا طویل جس کو شروع کر کے

ختم کرنے سے پہلے چھوڑ جاتے ہیں۔ نہایت قدرتی طور پر واقعات کا تسلسل جاری رہتا ہے اور ایک واقعہ دوسرے سے ایسا پیوست ہوتا جاتا ہے کہ آپ کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ قصے کے ارتقا میں [illegible] انسان کی حرکات [illegible] چھوٹی ہیں مگر ان قصوں میں بنیادی کردار کی کوئی خاص زندگی نہیں۔ کہانیوں میں بھی محض واقعات کا تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔ دوسرے دن کے ساتویں قصے کی ہیروئن بابل کے سلطان کی لڑکی کے کردار کا [illegible] جو ادھر ادھر بہتی پھرتی ہے جس پر کوئی تاثر نہیں جتنا کہ اس کے چاروں طرف کے آدمیوں سے تعلق کا نقطۂ جذبات و عمل جیسا ہے۔ وہ SUSPENSE پیدا کرنے کی قوت خاصی ہے اور بکیچو میں اس حد تک موجود ہے کہ اس کو شہزادی شہرزاد کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے ہر قسم کے قصے بیان کئے ہیں۔ بعضوں میں بیرونی دنیا کے مشکلات اور عمل اور مہمات کا سامنا ہے۔ بعضوں میں محض گھریلو زندگی کی لطیف کشمکش ہے اور بعضوں میں عام دنیا کے واقعاتی تغیرات ہیں۔ مگر ہر قسم کے قصوں پر اس کی [illegible] قصہ گوئی حاوی ہے اور کسی قصے سے ہمیں [illegible] یا تکلف محسوس نہیں ہوتی ہے۔ قدرت کے ساتھ ساتھ ایک شعوری تجربے کا بھی احساس ہوتا ہے۔ قصوں میں زبردست Situations ہیں جن میں قدرتی صلاحیت شعور کے ساتھ فن کاری کا کرشمہ دکھا رہی ہے۔ یہی احساس ہر قصے کی تحریر سے ہوتا ہے۔ ہر قصے کا بنیادی ڈھانچہ کبھی ظاہر نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمام پیچ و خم اور کانٹ چھانٹ کر واقعات اتفاقی ترتیب سے اس طرح رکھا گیا ہے کہ ہر قصہ ایک مکمل اور جیتی جاگتی چیز ہے۔ ہر قصہ زندگی کی ایک قاش ہے اور اس کو خوش اسلوبی سے اس طرح رکھا گیا ہے کہ ہر قاش اپنا الگ مزہ رکھتی ہے۔ یورپ کے تمام شاعروں اور نثر نگاروں نے بکیچو کی ڈیکامیرون سے قصے اخذ کئے۔ مگر کوئی ان قصوں کی تعمیر میں فرق نہ کر پایا۔ دنیا کے قصہ گویوں میں بکیچو کا مقام ہمیشہ بلند رہے گا۔

ڈیکامیرون کے قصوں کی فنی حیثیت قصہ گوئی کی صلاحیت ہی کی بنا پر مستحکم ہوتی ہے۔ ان میں فن کردار نگاری سے مطلقاً پرہیز نہیں۔ بعض [illegible] کے [illegible] بکیچو اپنی کردار نگاری سے کام لیتا ہے۔ قصوں میں واقعات وار [illegible] ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ زندگی کے ہر طبقے اور ہر مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں کچھ کچھ گوشت پوست زندہ ہیں۔ ان کا کچھ نہ کچھ نفسیاتی تاثر ہمارے ذہن پر رہ جاتا ہے اور بعض کردار ایسے بھی بچے جا سکتے ہیں جو شیکسپیئر کے کرداروں کی طرح ذہنی اور عملی زندگی کے حامل ہیں۔ اس سلسلے میں دس کردار خاص طور پر سب سے زیادہ اہم سمجھے جا سکتے ہیں۔ سب میں پہلا ہمیں پانچویں دن کے دسویں قصے میں پیٹرو [illegible] کی بیوی کا کردار ملتا ہے جو اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں ایک لڑکے کو گھر میں رکھ کر اس سے تعلق کرتی ہے اور اسی اثنا میں پیٹرو کے آجانے پر اس لڑکے کو ٹوکرے میں چھپا دیتی ہے۔ اس کی یہ چال کھل جاتی ہے مگر وہ اپنے شوہر کو [illegible] کر لے جاتی ہے۔ پہلے دن کے قصوں میں تین کردار [illegible] ہیں۔ ان میں سے پہلا [illegible] قصے میں [illegible] کا کردار ہے جس کی [illegible] آئینہ کے سامنے تقریر [illegible] چھوڑتی ہے۔ دوسرا کردار ساتویں قصے میں [illegible] ملتا ہے جس کا شوہر اسے زنا کے الزام میں عدالت کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ اپنے [illegible] سے جواب دیتی ہے نہیں چھوٹ جاتی [illegible]۔ تیسرا دسویں قصے میں [illegible] ہے جو [illegible] کو جسے [illegible] گر [illegible] کی [illegible] کرنے کے [illegible] جلانے کے لئے [illegible] ۔ ساتویں دن کے قصوں میں دوسرے دن کے قصے کی ہیروئن ہے جو اپنے عاشق کو شوہر سے چھپانے کے لئے ایک دیگ میں چھپا دیتی ہے [illegible] شوہر [illegible] وہ شوہر سے کہتی ہے وہ خود بھی اس سے [illegible] ہے اور اس کا [illegible] ہے۔ آٹھویں دن کے قصوں میں سے دوسرے [illegible] اور اس کی [illegible] اپنی [illegible] میں دیکھا ہیں۔ [illegible] دن کے قصوں میں سے پانچویں میں [illegible] اس کی بیوی [illegible] شہزادوں کی [illegible] سے دونوں کے کردار میں عجیب جان پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر میں دسویں دن کے دسویں قصے کی ہیروئن گریسلڈا آتی ہے۔ ڈیکامیرون کا یہ آخری قصہ [illegible] کمال ہے۔ گریسلڈا کا [illegible] کردار، واقعات کی [illegible] اور قصے کی دلچسپ تعمیر سے بلاشبہ تمام قصوں سے بہتر قرار دیئے جانے کے لائق ہے۔ اگر ڈیکامیرون کے قصوں میں سے سب سے بہتر قصہ چھانٹنے کی کوشش کی جائے تو شاید سب سے زیادہ ووٹ اسی قصے کے حق میں آئیں گے۔

بچھیرو کی "ڈیکامیرون" اطالوی ادب میں ایک زبردست شاہکار ہے ہم لوگ اس کی اہمیت کو سرسری سے اس لئے گزر کرتے ہیں کہ ہم بڑے ذہین اور اخلاق پسند ہیں اور اس تصنیف کے قصوں میں جو بات ہے وہ ہمیں مغرب اخلاق نظر آتی ہے۔ غیر اگر یہ عریاں نگاری ہمارے تہذیبی شعور کے دامنوں کو نہیں چاک کرتی تو ہم یہ دیکھیں گے کہ تہ اشاعت کی اس زبردست پیش رو نے ایسا کارنامہ چھوڑا ہے جو جدید دور کے مغرب ترین فن یعنی ناول یا افسانہ کی بنیادیں مستحکم کرتا ہے۔ بچھیرو کی اسی زندگی پر نظر اور اس کا فن سب ہی آج کل کے ناول نگار یا افسانہ نگار کیلئے بہت اہم ہیں۔ کہتے ہیں اور آج کل کے قاری کیلئے بڑی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ "ڈیکامیرون" جیسا کہ مقبول خاص و عام رہی۔ یورپ کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ موجود ہے۔ اس سے اثر پذیر ہونے والوں میں یورپ کے بڑے بڑے شاعروں اور افسانہ نگاروں کے نام ہیں اور اس کا اثر زمانے کے ہر دور پر اگر نہیں پایا جائے تو پڑھنے والے گا۔ اردو داں کو اس کی عریاں نگاری اس کی طرف جانے سے روکتی ہے مگر دسویں دن کا دسواں قصہ بھی تصنیف کا اخلاقی نقطہ ہر طرح عریانی سے دور ہے۔ اس کا ترجمہ ہمارے یہاں بچھیرو کا متعارف کرانے کیلئے نہایت بہتر ثابت ہو۔

اُردو میں خاکہ نگاری

نثار احمد فاروقی

اُردو نثر کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں۔ اس کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) سے ہوتا ہے۔ اس میں بھی مزاح نگاری کی ابتدا غالب (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء) سے سمجھنی چاہیے۔ خاکہ نگاری یا (SKETCHES) بھی ایک حد تک لطیف مزاج سے تعلق رکھتے ہیں۔ عنوان مزاح میں جو کچھ کمی فرق ہے اس سے یہاں بحث نہیں لیکن خاکہ نگاری کے سلسلے میں یہ غور کرنا چاہیے کہ یہ شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔ یہاں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور ان سے شخصیت کی مُضحکی تصویر کو بھانپا بھی جاتا ہے مگر ان پر تنقید یا ان کی تشخیص خاکہ نگار کے فرائض میں داخل نہیں۔ اسکیچ میں خاکہ نگار کی ایمان داری، قوت مشاہدہ، احساس تناسب اور معتدلانہ عبارت کا امتحان ہوتا ہے۔ اسکیچ میں ممکنہ حد تک (WIT) لطیف مزاح (HUMOUR) اور (PARADOX) کے لیے بہت گنجائش ہے لیکن طنز، ہجو یا ہجو کی حاشیٰ مطلق نہیں ہو سکتی۔

اسکیچ کے لیے اُردو میں "خاکہ نگاری" "مرقع" "تصویر" وغیرہ (اصطلاحیں) استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں خاکہ سب سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ اسکیچ (SKETCH) کا پورا مفہوم اسی لفظ سے ادا ہوتا ہے۔ ادب کی جس صنف کے لیے ہم انگریزی میں اسکیچ یا (PEN PORTRAIT) کا لفظ برتتے ہیں اس میں کسی شخصیت کے اہم اور منفرد پہلو اُجاگر کیے جاتے ہیں۔ اچھے اسکیچ کی تعریف یہی ہے کہ بعض گوشوں کی نقاب کشائی ایسی ماہرانہ خاصت کے ساتھ کی جائے کہ اس شخصیت کا خاص تاثر پڑھنے والے کے ذہن میں خود بخود پیدا ہو۔ اچھا خاکہ وہی ہے جس میں کسی انسان کے کردار اور افکار دونوں کی جھلک ہو۔ خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت، اس کی سیرت، اس کا مزاج، اس کے ذہن کی افتاد، اس کا زاویۂ فکر، اس کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آجائیں۔ خاکہ میں مبالغہ ہو سکتا ہے، نثر میں عبارت آرائی اور تخیل کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خاکہ ایک ایسی صنف ہے جس میں روداد حکایت ہو یا مبالغہ اور صنعت سرائی ہو تو پھر وہ خاکہ نہیں رہتا۔

خاکہ سوانح عمری سے بھی مختلف چیز ہے۔ سوانح عمری میں خاکے کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن خاکے میں سوانح عمری شکل سے عاری ہے۔ اُردو کے سرمایے میں کچھ ایسے مضامین ہیں جو سن پیدائش سے شروع ہو کر سنہ وفات پر ختم ہو جاتے ہیں۔ جیسے اکثر و بیشتر ان کا خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ

ع ابی۔ اے کیا، ڈکر ہوئے، پنشن لی اور مر گئے!

ان مضامین سے ضابطہ نہیں ہونا چاہیے۔ چاہے ادب کی کتنی ہی اعلیٰ صنف میں شمار کر لیے جائیں لیکن "خاکے" پر پورے نہیں ہو سکتے۔ اچھے خاکے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ "خاکہ" ہو۔ اس میں غیر ضروری تفصیل سے کام نہ لیا جائے۔ وہ تاریخ یا سوانح نہ ہو۔ یعنی کارناموں سے زیادہ "کارگاہ دل" کو پیش کرتا ہو۔ اس میں ایسے اتنے گوشے ملحوظ نہ ہوں جن سے مضامین خلق کا خوف ہو اور یہ لکھی نہ ہو کہ ع

"گفتنی" اور "ناگفتنی" باتیں

خاکے میں لطیف مزاح اور "تحفہ آفرینی" ضروری ہے لیکن طنز کی گنجائش نہیں۔ جہاں اس میں طنز یا "تیکھا پن" آیا وہیں سے بگاڑ کی سرحد شروع ہو سکتی ہے۔ خاکے کو ہجو نہیں ہونا چاہیے نہ وہ "مدح تمامی" ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہو؟ جواب یہی ہے کہ وہ "خاکہ" ہو۔

اچھے خاکے کی کچھ بنیادی شرطیں ہیں لیکن یہ مشکل سے ایک جگہ جمع ہوتی ہیں۔ اردو میں سب سے اچھا خاکہ جس میں اعلیٰ درجے کے ایکچ کی ساری خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں، فرحت اللہ بیگ کا مضمون "نذیر احمد کی کہانی" ہے۔ اس میں فرحت اللہ نے صاف بیانی سے بھی کام لیا ہے اور نہایت بے تعصبی اور دیانت داری کے ساتھ نذیر احمد کی کمزوریاں بھی بیان کر دی ہیں لیکن خاکہ نگار کی حیثیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بعض لکھنے والوں نے یہ غلط استنباط کیا کہ چند "ناگفتنی" باتوں کو بیان کر دینے سے اچھا خاکہ تیار ہو سکتا ہے اور اس مغالطے میں انھوں نے پگڑیاں اچھالنی شروع کر دیں۔ یہ اچھے خاکے کے کھلے اور صاف سے صریحی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کمزوریاں ہر شخص میں ہوتی ہیں لیکن ایکچ میں صرف کمزوریاں ہی بیان نہیں کی جاتیں۔

کچھ لکھنے والوں نے خاکے کے اس طرح لکھے گویا صرف اپنے تاثرات کا اشتہار دینا چاہتے ہیں۔ جس سے زندگی میں ایک بار بھی ملاقات ہوئی اس کا بھی خاکہ لکھ دیا اور کسی شخصیت کا پہلا مطالعہ ہی خاکہ لکھنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ انسان خود اتنا بڑا موضوع ہے کہ دنیا کے سارے علوم اور موضوعات و مضامین اس کے اندر سمائے ہوئے ہیں۔ وہ ہر علم اور موضوع کا مصدر بھی ہے اور مرجع بھی۔ اس لیے کسی انسان کی شخصیت کا مطالعہ گویا اس کی سیرت کے بنیادی عناصر، اس کے ذہن اور مزاج، اس کے انداز فکر اور اس کی داخلی دنیا کا مطالعہ ہے جس سے زیادہ دلچسپ اور نازک کوئی موضوع نہیں ہو سکتا اور اس پر کچھ لکھنا بڑے ہی وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کے بعد ہی ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کا ایک وسیع میدان ہے اور اس موضوع پر ہمارا سرمایہ کچھ اتنا حقیر اور کمتر نہیں کہ سرسری طور سے اس کا جائزہ لیا جائے۔ پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ ہر دور کے کچھ نمائندہ لکھنے والوں کا تذکرہ اس مضمون میں سما سکے۔

اچھے خاکوں کا ابتدائی عکس انشاء اللہ خاں انشا (متوفی ۱۸۱۷ء) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ان کے قلم میں ایکچ لکھنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں جن کی جھلک "دریائے لطافت" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں انھوں نے "میر خورشید علی" اور "بی نازاں" کا کردار اور مکالمے پیش کیے ہیں یا اپنے بعض معاصرین پر چٹکیاں لی ہیں یا عورتوں کی خاص گفتگو دکھائی ہے۔ بعد کے مثال مرزا صدر الدین اصفہانی اور مولوی عبد الغفور نساخ جیسے کردار بھی اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ "دریائے لطافت" میں ایک جگہ انھوں نے میر ظہیر جان جاناں سے اپنی ملاقات کا حال بھی لکھا ہے:

> "آخر کار میں نے صلاح بنوائی ڈھاکے کی۔ جامہ پہنا سرخ رنگ کا چیرہ سر سے باندھا اور پگڑی بھی اسی قبیل سے تھی۔ ایک کٹار پٹکے میں اڑسا۔ اس ہیئت سے داتھی پر سوار ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موسوف جامع مسجد سے متصل ایک بالا خانے پر رہتے تھے جو ان کے لیے کیول مادھو نے بنوایا تھا۔ جب میں اوپر پہنچا تو دیکھا کہ جناب ہم دم ہیں کہ اور بغیر ٹوپی پہنے اور کمر سے پاجامہ رنگ کے دوپٹے کا سہ سر باندھ کر ٹانگے ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں نے نہایت ادب سے سلام عرض کیا۔ بڑی شفقت اور خوش اخلاقی سے جواب سلام کا دیا۔ اب دیتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور مجھ ناچیز کے سر کو بغل میں لے کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ میں نے عرض کیا:

"ابتدائے سن عیسوی سے اواخر ربیع الاول سنہ ۱۲۱۱ھ تک کا حال ایک مختصر رسالہ میں لکھا تھا۔ اب اس کے بعد کا حال لکھنے بیٹھا ہوں۔"

آپ نے ارشاد کیا:

"اپنے تئیں بھی بوڑھی سے تمہیں سے اشخاص کے ساتھ سوانح و حیات رہا کی ہے۔"[1]

چونکہ انشا کی طبیعت میں شوخی اور شگفتگی تھی اور جرأت و رندانہ کے ساتھ ان کی انفرادیت اور قوت اخذ و مشاہدہ عمر بھر ساتھ رہی تھی اس لیے وہ بیتی خاکے لکھ سکتے تھے لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے فضول اور مہمل شاعری میں اپنی پوری زندگی برباد کر دی۔

خاکوں کی باضابطہ ابتدا دراصل محمد حسین آزاد سے ہوتی ہے اور نثر کے بہترین فنی نمونے سب سے پہلے ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "آب حیات" میں ملتے ہیں۔ آب حیات اُردو شاعروں کا تذکرہ ہے لیکن اس میں مرقع کشی اور خاکہ نگاری کے جتنے اور جیسے نمونے ہیں اس حیثیت سے کتاب کا جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا حالانکہ تذکرہ یا تاریخ سے زیادہ یہ مرقع نگاری میں اہمیت رکھتی تھی۔ محمد حسین آزاد کے انشائی کی تعریف کرتے ہوئے شبلی نعمانی نے جو کچھ کہا تھا اس ایک جملے میں "آب حیات" کے محاسن اور اس کے معائب دونوں کی طرف بھی جامع اشارہ تھا ہے:

"آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، ہم اِدھر اُدھر کی گپیں ہانک رہا ہے تو وہی معلوم ہوتی ہے۔"[2]

نئی تحقیقات نے اس کی تاریخی حیثیت بہت مشتبہ کر دی ہے لیکن اس کا اسلوب اور اس کی خاکہ تصویریں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔ ان کے ہاں کہیں بیانیہ انداز (NARRATION) ہے کہیں مصوری اور منظر نگاری کرتے ہیں کبھی مرثیہ شاعری کرنے لگتے ہیں افراد کے نہیں محلوں کے نقشے انھوں نے جمائے ہیں۔ اس محل کے سربرآوردہ شاعروں کا استقبال کیا ہے، ان کی ایک ایک ادا کو لے لے کر بیان کیا ہے، پھر ان کی محفل کے اکھڑنے کا ماتم کیا ہے اور آنسو بہا بہا کر انھیں رخصت کیا ہے۔ یہ ایسا انداز ہے جو "آب حیات" سے پہلے کسی تذکرے کو نصیب نہ ہوا تھا اور "آب حیات" کے بعد بھی کسی کے حصے میں نہ آیا۔ محمد حسین آزاد کی قوت تخیل بہت بلند پرواز ہے وہ سنجال لیتے ہیں اور جس محفل کا نقشہ کھینچتے ہیں اسے دل میں اتار دیتے ہیں زبان میں بسا دیتے ہیں۔ جس رنگ کو لگاتے اسے یادوں اور خیالوں کے رنگا رنگ پھول برسا کر سدا بہار بنا دیتے ہیں، پڑھنے والا اسی عالم میں کھو جاتا ہے۔ میں شخص کا حال لکھتے ہیں۔ مُردہ صد سالہ بھی ہو تو مسیحائی سے اسے زندہ و متحرک بنا دیتے ہیں۔ دلی کی ٹکسالی زبان گویا سونے پر سہاگا ہے جس میں شگفتہ مزاج کی آمیزش بھی ہے تکلف سنجیدگی یا علمی رعایت کا بھی کوئی اچھا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس لیے ان کے قلم سے شعرا کے جو خاکے لکھے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جب تک اُردو زبان بولی جائے گی ان کی ادبی چاشنی میں کوئی کمی نہ آئے گی۔

---

[1] دریائے لطافت / ۲۷-۲۸ (۱۹۳۵ء) اس میں صرف نکتے انشا کے اُردو میں لکھے ہوئے ہیں۔ بقیہ عبارت فارسی سے ترجمہ ہے جو مرزا حیرت نے اُردو میں منتقل کیا تھا۔

[2] بحوالہ داستان تاریخ اُردو / ۳۹۹ (۱۹۵۷ء۔ آگرہ)

یہ آزاد نے تاریخ نہیں لکھی مرقع کشی کی ہے۔ وہ خود مقدمے میں لکھتے ہیں:

"..... جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں، انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی پوری چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو۔"[1]

چنانچہ آزاد نے پابندی سے یہ التزام کیا ہے کہ کسی شاعر کا ذکر کریں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں لکھ دیں۔ لباس اور ضاع و اطوار اور طرز بود و ماند، اہل محفل وغیرہ کا بھی ذکر کریں اور اسی التزام کی مجبوری نے انھیں اکثر جگہ قیاس آرائی سے کام لینے پر آمادہ کیا۔ اکثر یہ قیاس حقیقت سے منحرف بھی ہو گیا ہے لیکن تصویر خیالی بھی انھوں نے جیسی کھینچ دی ہے اس پر مشکل ہی سے کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میر کا لباس:

"کھڑکی دار پگڑی، ایک انگرکھا جس کے گلے کا جامہ ایک پرانا پستہ لیے کا سرے بندھا، ایک رومال چوڑی دار پتہ کیا ہوا اس میں کوڑیاں، مشروع کا پائجامہ جس کے ناڑے کے پائنچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ٹیڑھی باشت اونچی لوگ کرتی ہے ایک طرف سیدھی سب سے نمایاں، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں چھڑی۔"[2]

خلیہ بیان کرتے ہیں وہ کبھی براہ راست اور کبھی اشاروں میں یا بالواسطہ صاحب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ شیخ ناسخ کا حلیہ ان میں "بلند بالا، فراخ سینہ، گندمی رنگ، سر کھلا، روئے کا گنگ بانہ سے بیٹھے رہتے تھے جیسے شہ نشین پر جاڑے میں تن زیب کا گرتا۔ بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دوہرا گرتا پہن لیا۔" ان کا رنگ سیاہ فام تھا۔ آزاد کی نکتہ بینی دیکھیے:

"زمانے کی زبان کو پکڑ سکتا ہے۔ بے اب گستاخ، آدم کے بھتیجے" کی پھبتی کہا کرتے تھے اسی رنگ، روغن کی رعایت سے خواجہ صاحب (آفتاب) نے چوٹ کی۔

روسیہ زنگی کا یوں پاؤں سے کیے فگار
جیسے سلیٹ کی سب پر زخم ہو شنبر کا

شیخ صاحب نے غور نہ کیا اس کا مذاق کیا ہے اور شاگرد بھی روغن قاز مل کر استاد کے رنگ کو ہلکا کرتے تھے اور حریف کے رنگ کو شاتے تھے۔"

آزاد کے لکھے ہوئے خاکوں کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے لطائف سے انھیں دلچسپ بنا دیتے ہیں اور عادت بشری کا بھی بے ساختہ اٹھاتے ہیں مثلاً مندرجہ بالا عبارت میں "روغن قاز مل کر استاد کے رنگ کو ہلکا کرتے تھے" ان کے مخصوص انداز کا جملہ ہے جس میں طنز کا خلیہ اور آزاد کا ذہن دونوں نکھر آتے ہیں۔

آب حیات کے خاتمہ کو ایک نذر کہا ہے اور اسے آزاد نے پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کے ۔۔۔ مشاہیر شعرا کے مداح، ہری اور زبان مذکور کی محمد بہ محمود ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان ۔۔۔ کیا ہے۔ اس میں وہ تقی سے غالب تک سارے ہی مشاہیر شعرا آ گئے ہیں لیکن مرقع نگاری کے

---

[1] آب حیات / ۴-۵ (طبع دہم) [2] ایضاً / ۲۰۵ [3] ایضاً / ۳۴۸

میاں داد، اصباہ سے تیز، انتہا، مصحفی، آتش، ذوق، غالب اور بحر الشعرا کے ترجموں میں بڑے لطیف اشارے ملتے ہیں۔ بحر کا حال حاشیے میں لکھا ہے لیکن مختصر اور غنی ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ ہے:

"مولوی صاحب (بحر الشعرا) کی بگل (داڑھی) اس پر بڑی اور نکیلی، سر منڈا ہوا، اس پر مخمل کا حاشیہ دار ٹوپی کھٹ بڑھئی نظر آتے تھے۔ حکیم صاحب (آغا جان عیش) نے کہا کہ شعرا کو تخلص بھی ایسا چاہیے کہ ظریفانہ و لطیفانہ ہو اور خوش نما ہو اور شان و شکوہ کی عظمت سے نامبارد ہو۔ بہتر ہے کہ آپ بحر تخلص کریں۔ حضرت سلیمان کا بازار نقار اور قاصد غنچہ گام تھا وغیرہ وغیرہ چنیں و چناں مولوی صاحب نے بہت خوشی سے منظور فرمایا....."[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بادشاہوں اور امیروں کو سخرا پن بگھرنانے کی طبیعت کو یہ خدا لوقی ہے۔ نظر تو خود شاہ نے خطاب عطا فرمایا" خانزاں اکبین شہیر الملک بحر الشعرا، منتقار جنگ بہادر اور (مصر) ہنیا بھی کر دیا کہ ان کی شاعری کی بنیاد کاغذ پر ہو گئی۔ پھر تو سر پر لمبے لمبے بال ہو گئے۔ ان میں چنبیلی کا تیل پڑنے لگا اور داڑھی دو شاخہ ہو کر کانوں سے باتیں کرنے لگی۔"[2]

آزاد کی دوسری تصنیف "دربار اکبری" میں بھی جا بجا خاکہ نگاری اور قطع کسی کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن تسلیم کرنا چاہیے کہ "آب حیات" کی خوبیوں کو نہیں پہنچتی۔ آزاد کے اسلوب میں جدت اور تازگی کے ساتھ احساس اور تخیل کی کارفرمائی بہت ہے۔ حامد حسن قادری نے صحیح لکھا ہے کہ:

"اگر کسی شخص کو آزاد کی سوانح زندگی، انقلابات و مصائب، افتاد طبع اور نسب و وطن کا حال معلوم نہ ہو اور وہ ان کی آب حیات، نیرنگ خیال، قصص ہند اور دربار اکبری، مختصر ان نادر و غیرہ کتابیں جو آزاد جنوں سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں مطالعہ کرے تو پڑھنے والا آزاد کے اسلوب تحریر کی جدت و دلکشی کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے گا کہ یہ مصنف "ہنیالی بندہ" اور "عالم خیال" کا رہنے والا ہے، اس کی ذہنی فضا احساسات و تاثرات سے بھری ہوئی یا اس کے دماغ پر تخیل کے بادل چھائے ہوتے ہیں۔"[3]

آزاد کی تحریر کا ایک وصف لطیف طنز بھی ہے جس کے نمونے آب حیات میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ وہ بظاہر راوی کی طرف منسوب کر کے بڑی سے بڑی بات آسانی سے کہہ گزرتے ہیں جس سے ان کی تحریروں میں "تیز فہم قارئین" کی خلش پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً میر ضاحک جان کے حالات میں ایک حاشیہ:

"افسوس ہے اہل وطن کے خیالات پر جنہوں نے ایسی ایسی لطافتوں پر ہنسی کی آج کل کے ازروئے اعتقاد آخر میں ایک طرہ اور بڑھا یعنی تخالی ہر جزائے صبیح و ملیح بود کہ بدیش جاں سپرد ند" یا شاید ایسا ہی ہو۔ عالم الغیوب خدا ہے۔"[4]

---

[1] آب حیات/۲۸۳ [2] ایضاً/۲۸۴ [3] داستان تاریخ اردو/۳۹۰ (طبع کانی) [4] آب حیات/۱۴۲

اس عبارت کا ایک ایک ٹکڑا آزاد کے ذہن کا غماز ہے۔ ضمناً یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ عبارت مذکورہ میں جو فارسی کا جملہ اس طرح لکھا ہے گویا کسی کتاب سے اقتباس کیا ہے یہ محض آزاد کی اختراع ہے[1]۔

اچھا خاکہ دراصل کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ (OBJECTIVE STUDY) ہے۔ مرقع نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا عندیہ ظاہر نہ ہونے دے بلکہ صرف مشاہدات اور واقعات کی بے لاگ عکاسی کرے۔ اس اعتبار سے محمد حسین آزاد ناکام رہے ہیں۔ اس کی مثالیں پیش کرنے میں طوالت ہے۔ غالب، ذوق اور مصحفی و انشا کے حالات پڑھنے سے صاف یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزاد کی حمایت ذوق اور انشا کو حاصل ہے۔

آزاد کے بعد اور فرحت اللہ بیگ سے پہلے کوئی ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے خصوصیت سے خاکہ نگاری میں کوئی کاوش کی ہو۔ ڈپٹی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار کے نام یہاں لیے جا سکتے تھے کیوں کہ توبۃ النصوح اور فسانہ آزاد میں ظاہر دار بیگ یا خوجی کے کردار حیات جاوید حاصل کر چکے ہیں لیکن یہ فرضی اور تخیلی کردار ہیں۔ ہمارا موضوع صرف زندہ شخصیات کے خاکوں سے بحث کرنا ہے۔

آزاد اور فرحت اللہ بیگ میں خاکہ نگار ہونے کے اعتبار سے بہت سی خصوصیات مشترک ہیں مثلاً یہ کہ دونوں دہلی کی بامحاورہ زبان لکھتے ہیں۔ دونوں قدامت کی خوبیوں کے پرستار ہیں۔ دونوں کی تحریروں میں نکتہ آفرینی اور لطیف مزاح کا شمارہ ہے لیکن فرحت اللہ کا قلم کہیں بھاری بھی ہو جاتا ہے یعنی وہ بے تعصبی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ کامل طور سے تو دیانت دار انھیں بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ دوسرے تمام خاکہ نگاروں کے مقابلے میں بہت کم متہم کیے جا سکتے ہیں۔ مزاح ان کا مزاج ہے[2]۔ اس سے وہ ہر جگہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مزاح الفاظ سے کم اور حالات سے زیادہ پیدا ہوتا ہے لیکن اس میں "ہمدردی" اور بے تعصبی بھی ہوتی ہے۔ مزاح ایک عالم برزخ ہے یا زیادہ مناسب لفظوں میں "پل صراط" کہنا چاہیے۔ اس میں ذرا سی لغزش ہو تو رشید احمد صدیقی کے لفظوں میں "نتیجہ جنت ہوتا ہے یا حوالات"۔ فرحت اللہ بیگ اس تلوار کی دھار پر بے تکلف دوڑتے ہیں۔ وہ کسی کی پگڑی نہیں اچھالتے۔ انھوں نے متعدد خاکے لکھے ہیں جن میں "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" "مولوی عام اور بقائے دوام کے دربار سے خلعت پا چکی ہے۔" "ایک وصیت کی تعمیل" وحید الدین سلیم کا ایک خاکہ ہے اور "نذیر احمد کی کہانی" کے بعد اسی کا ذکر کرنا چاہیے۔ ان کے علاوہ "لالہ سری رام" "بادیا رام عشرت فانی" "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" "المنظر اللہ" "خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان مرحوم" "حکیم آغا جان عیش" اور "نواب عبد الرحمن خاں احسان" وغیرہ مضامین بھی "اسکیچ" کی تعریف کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔

ان کے لکھے خاکوں کی یہ فہرست بھی نہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے ان کا قلم نہ صرف خاکہ نگاری کے لیے موزوں تھا بلکہ ان کی طبیعت بھی اس رجحان کی تھی اور وہ اپنی اس خصوصیت سے بے خبر نہ تھے۔ عبد الرحمن خاں احسان یا آغا جان عیش وغیرہ پر انھوں نے جو مضامین لکھے ان کی تحقیق و تنقید کے معیار سے گھٹے ہیں ان میں بھی یہ وصف باقی ہے۔ آزاد کی طرح وہ بھی اپنے زمانے میں پوری فضا قائم کر کے لکھتے تھے اور خود کو اسی زمانے میں پہنچا دیتے تھے۔ جملے، لباس، بول چال، وضع و طریق، گھر کا کلچر اور دوسری عام چیزوں میں ان کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے۔ اس کا اندازہ ان کے ہر مضمون سے ہو سکتا ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے کوئی نبض شناس ہیں کبھی کبھی وہ شخصیتوں کے چہروں کی تحریریں پڑھنے لگتے

---

[1] تفصیل کے لیے "آزاد بہ حیثیت محقق" از قاضی عبد الودود، مطبوعہ نوشتے ادب پٹنہ جلد ۱، ش ۲ ص ۹ (اپریل ۱۹۵۶ء)

نظر آتے ہیں۔ مزاح اں کی تحریر میں آثار رہا ہوا ہے کہ اسے روخو بھی جدا نہیں کر سکتے۔ نذیر احمد کا حلیہ ملاحظہ کیجیے:

"رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دوہرا بدن گدرائی نہیں بلکہ مڑنے کی طرف کی تہ رہا تھا۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مُرمُروں کا تھیلا ہو جاتا ہے بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لیے اس کا تکمہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہبند) باندھتے تھے اس کے پائنچے اڑسنے کی بجائے ادھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے، اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اُٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ کا یا تہمد کے کونوں کے اُڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ ریہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے ورنہ باقیوں کی یہ بکثرت منتقش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر بھار کا نمونہ ہو جاتی تھی۔"[1]

نذیر احمد کی کہانی کا کمال یہی ہے کہ اسے صرف 'کہا' کہا جا سکتا ہے۔ اس سے نذیر احمد کی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی، چلتی پھرتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ان کا حلیہ، اس گفتگو کا انداز، عقاید، اخلاق و عادات، پڑھنے کی کیفیت، پڑھانے کا طریقہ، یہ سارے نقوش پوری فراوانی کے ساتھ ابھرتے ہیں اور نذیر احمد کی شخصیت کو روشن بنا دیتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے مزاح اور نکتہ سنجی نے ان کے سیدھے سادے بول چال کے انداز نے اور روزمرہ کی بامحاورہ زبان نے اس میں اور بھی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ ان کی ذہانت و فطانت، غیر معمولی علمی قابلیت، بے مثال بلکہ تقریر و فصاحت، کفایت شعاری، بلکہ کنجوسی، حاضر جوابی اور نکتہ آفرینی، بہت کا ایسا شاندار عکس پیش کیا ہے جس کی دوسری مثال اردو کے پورے سرمایے میں نہیں ملتی۔ وحید الدین سلیم کا خاکہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں بھی یہ اوصاف موجود ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے بعد اردو میں خاکہ نگاروں کے جو نام سامنے آتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا عبدالرزاق کانپوری (مصنف "البرامکہ")، آغا حیدر دہلوی، رتن ناتھ سرشار، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی اور عبدالمجید سالک یہ سب تقریباً ایک ہی صف کے لکھنے والے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ فرق مراتب کے باوجود ان کا انداز ایک ہے۔

خواجہ حسن نظامی سادہ اور دل نشین نثر لکھنے میں بے نظیر دشاید ناقابل تسلیم کیے گئے ہیں، موضوع پر تو سب ہی لکھتے ہیں لیکن لکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے بغیر کسی موضوع کے بھی لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ "بازی الفاظ" "بات میں بات" اور "بے بات کی بات" ان کا آئٹ ہے۔ انھوں نے بعض لوگوں کے خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان میں حسن نظامی کا دلنشیں اسلوب تو موجود ہے لیکن شخصیت کا مطالعہ

---

[1] مضامین فرحت، حصہ ۱ / ۱۱-۱۲

نہیں۔ ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ صرف "علمی تصویر" پیش کر دیں شخصیت ان کے موضوع سے باہر ہے۔ چونکہ وہ اشاروں کنایوں کی خوبی اور پرکاری پیدا نہ دیتے ہیں اس لیے غور و فکر اور تدبر ہی ان کی تحریروں میں معنی تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ایک عام قاری ان تصویروں میں بھی اتنی طبع کا سامان تو بہت مل سکتا ہے خیال آتا ہے کہ خواجہ صاحب نے چھوٹی چھوٹی سینکڑوں کتابیں لکھیں۔ وہ ایک بے مثال اسلوب بیان بھی رکھتے تھے۔ اور کسی کی نہ سہی اپنی ہی کوئی سیریل اور مسلسل سوانح عمری لکھ جاتے تو وہ تاریخی اہمیت کے علاوہ ادبی قدر و قیمت میں ان کی سب تصانیف پر بھاری ہوتی۔ وہ جو بیک وقت مختلف کے فن سے پوری طرح واقف تھے۔ اپنی بات منوانے کا ڈھب جانتے تھے اور ان کی نظر میں رل مل دینے والی شیرینی تھی۔ جتنا اچھا انشا پرداز حسن نظامی نے اردو کو دیا ہے اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ایک انگریز مورخ نے کہا تھا کہ جو شخص انگریزی زبان اور ادب پر عبور حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اپنی ماتیں اور اپنے دن ایڈیسن کی تحریریں پڑھنے میں کھپا دینے چاہئیں۔ خواجہ حسن نظامی کے لیے بھی ایسی ہی بات کلیم الدین احمد نے کہی ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔[1]

حسن نظامی کی طرح مولانا محمد علی جوہر بھی بہت بڑے "لکھاڑ" تھے۔ ان کی طول نویسی ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ مطلب کو اتنا طول کیوں دیتے ہیں؟ تو محمد علی نے جواب دیا "اس لیے کہ مجھے مختصر لکھنے کی فرصت نہیں" یہ بالکل صحیح ہے۔ مختصر عبارت میں زیادہ مفہوم ادا کرنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور غور و فکر کرنے کے لیے وقت اور فرصت لازمی۔ محمد علی جوہر نے بھی بعض اچھی لکھی ہیں۔ یہ زیادہ تر سرسری قسم کے ہیں اور ان کے مجموعہ مقالات، مضامین میں شامل ہیں لیکن یہ زیادہ تر وقتی اور تاثراتی ہیں۔ "حکیم اجمل خاں" "آج رخصت جہاں سے داس ہوا" اور "بی اماں" ایسے ہی مضامین ہیں۔ ان میں اول الذکر دو مضامین محمد علی کے خصوصی انداز میں لکھے گئے ہیں ان کے لب و لہجے میں "سوز دل کی زباں" زبان زنی ہے اور طبیعت کی جذباتی فوارگی بھی ہے۔ پھر بھی یہ اعلیٰ درجے کے "انشائیے" نہیں کہے جا سکتے۔ دوسرے درجے میں بھی مشکل سے ٹھہریں گے۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی زندگی ایثار اور قربانی کی روشن مثال ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف دراصل اپنی ہی بصیرت اور بصیرت کا اعتراف ہے۔ بقول عارف رومی:

ماوح خورشید مداح خود است

عبدالحق نے تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی آزمائش کی ہے لیکن ان کا تخلیقی کارنامہ ایک ہی ہے یعنی "چند ہم عصر" ــــ جس میں اٹھارہ مختلف شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ عبدالحق بلاشبہ ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کی تحریروں میں محمد حسین آزاد کی مرقع کشی، حالی کی حلاوت اور سادگی، شبلی کی برجستگی، مہدی کی لطافت، نذیر احمد کی محاورہ بندی، عبدالماجد دریابادی کی تحمید آفرینی اور طنز، غالب کے مزاح (۱۳۷۱ھ) اور ابوالکلام کی شوکت بیان کا نہایت خوشگوار آمیزہ اور رچا ہوا مرکب ملتا ہے۔ وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ اسلوب کے سامنے موضوع کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ صحیح، صاف، دلنشین اور سنجیدہ نثر لکھنے میں جو جوش عبدالحق نے ایجاد کی ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کی تقلید کی جائے۔ "چند ہم عصر" میں عبدالحق کے اسلوب کی ساری خوبیاں کچھ جوہر رنگ میں ظاہر ہوئی ہیں۔ چند خاکوں کا یہ مجموعہ اس وقت تک دلچسپی سے پڑھا جائے گا جب تک اردو میں غالب کے خطوط اور ابوالکلام کی "غبار خاطر" کا سکہ دلوں پر بیٹھا رہے گا۔ عبدالحق نے ان خاکوں میں محبت یا عداوت سے بلند ہو کر نہایت غیر جانب داری سے شخصیات کا مطالعہ کیا ہے۔ محمد حسین آزاد،

---

[1] سخن ہائے گفتنی / ۲۶۶

فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی اور منٹو کی نظر عموماً شخصیت کی کمزوریوں پر پڑتی ہے اور وہ ان کے اظہار میں حق گوئی و بیباکی کے ساتھ کبھی کبھی تمسخر و تضحیک سے بھی کام کر جاتے ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق کے یہاں منفی گرفت (NEGATIVE APPROACH) نہیں ہے۔ وہ انسان اور انسانیت کی عظمت کے ثنا ساہیں۔ انھیں "نام دیو مالی" اور "نورخاں" کے کرداروں میں بھی انسانی عظمت کا سراغ نظر آجاتا ہے۔ اس انداز فکر میں خود مولوی عبدالحق کی سیرت کا عکس بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ نورخاں کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے:-

"انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں ع پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے"[1]

شخصیت کی پرکھ میں اس کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ خاکہ نگار کے ذہن میں خوبیوں اور کمزوریوں کا معیار کیا ہے کیونکہ حسن اور خیر کے بنیادی تصور کو چھوڑ کر باقی اوصاف و زمانہ کسی نہ کسی درجے میں اضافی حیثیت ہی رکھتے ہیں اس لیے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ خاکہ نگار نے شخصیت کے کن محاسن کی ستائش کی ہے اور کن کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ہر جگہ انسان کی محنت، جفاکشی، راست گفتاری، بے لوث خدمت اور وسیع ظرفی کی آن پر زور دیا ہے۔ خصوصاً "نام دیو مالی" اور "نورخاں" کے کردار پڑھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ مولوی عبدالحق کی نظر انسانیت کے حسن اور اس کی عظمت و رفعت کی ثنا ساہیں۔ وہ بڑے بڑے ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے، کاموں کی ستائش کرتے ہیں:

> "جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ کیسی کیسی اور بڑائی کے لکھتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری لگن اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ پھر کندن ہو جاتا ہے حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پرچا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔"[2]

سید احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "نورخاں" کا خاکہ پڑھ کر ہمیں اپنے ماحول میں روشنی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ نورخاں کے کردار کی بلندی اور شخصیت کی دلکشی ضرور ہے لیکن مولوی عبدالحق کے اندازِ نگارش کو بھی اس میں اتنا ہی دخل ہے۔ "چند ہم عصر" میں مولانا شبلی، سرسید احمد خاں اور نیر واسطی کے خاکے بھی بہت عمدہ ہیں۔ ان سے شخصیت کے بعض نئے اور غائب جہات سامنے آتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی تحریر میں مزاح کا عنصر بھی شامل ہے لیکن ان کی مسکراہٹ میں بھی وقار اور سنجیدگی باقی رہتی ہے۔ وہ اس لیے ہنستے ہیں کہ ہنسنا

---

[1] چند ہم عصر / ۱۰۵ (طبع سوم) [2] ایضاً / ۱۸۸

صحت کی علامت ہے اور شگفتہ طبیعت کا تقاضا ہے۔ شوکت تھانوی کی طرح محض ہنسانا یا فرحت اللہ کی طرح محض ہنسنا انھیں کبھی گوارا نہیں۔ عبدالحق کے مزاج کی بہترین جھلکیاں تو ان کے خطوط میں ملتی ہیں[1] لیکن خاکوں میں بھی ظرافت اور زندہ دلی اسی طرح موجود ہے جیسے بادلوں سے چاندنی چھن رہی ہو۔ پڑھ کر لطف آتا ہے اور مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ اس قسم کی جھلک ان کی تحریر میں شگفتگی پیدا کر دیتی ہے۔ میر صاحب کے حال میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "ایک دفعہ ایک صاحب نے ان کے سامنے مرزا صاحب (غالب) کا ایک شعر پڑھا اس میں کوئی لفظ بدل گیا تھا۔ ہنس کر فرمانے لگے مرزا صاحب کا شعر غلط نہیں پڑھنا چاہیے گناہ ہوتا ہے۔ یہ آیت حدیث نہیں جیسا چاہا پڑھ دیا۔ عقیدت کی انتہا ہو گئی۔"[2]

———

> "ایک روز میر صاحب کہیں باہر سے آئے۔ میں نے شامت کے مارے ان سے پوچھ لیا کہ میر صاحب آپ کہاں گئے ہوئے تھے؟ وہ کہنے لگے: "بھئی آج آنکھ ذرا سویرے کھل گئی۔ جی میں آئی ذرا ٹہل آؤں۔ پھر ضروریات سے فارغ ہو کر منہ ہاتھ دھویا، کپڑے پہنے۔ اتنے میں یہاں حامد آ گئے۔" میں نے بات کاٹ کر کہا کہ میر صاحب میں نے تو یہ پوچھا تھا کہ آپ آج صبح صبح کہاں تشریف لے گئے تھے۔ فرمانے لگے "کہہ تو رہا ہوں۔" اب انھوں نے وہیں سے بات شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی: "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنے میں یہاں حامد آ گئے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ کرنول کے ایک پرانے رہنے والے ہیں۔ میں انھیں حیدرآبادی سمجھتا تھا۔ ان کا سارا کنبہ یہیں ہے۔ انھوں نے یہاں کے پرانے قصے بڑے مزے کے بیان کیے......" اب مجھے الجھن ہونے لگی اور میں نے قطع کلام کر کے کہا کہ "حضرت میں نے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے تو آپ سے صرف اتنا دریافت کیا تھا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے۔ یہ آپ نے کیا قصہ چھیڑ دیا؟" کہنے لگے "میں تو یونہی کہوں گا۔ تمھیں سننا ہے تو سنو نہیں تو جانے دو۔"[3]

مولوی عبدالحق خود بھی زندہ دل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی شائستگی اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ لطائف کے نقل کرنے میں بھی انھوں نے شوخی عبارت سے کام لیا ہے۔ سرسید بھی ظرافت کے باذوق، خوش طبع اور ظریف واقع ہوئے تھے۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں تو ان کی گل افشانیٔ گفتار دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ عبدالحق کا لکھا ہوا ایک لطیفہ ہمیں سرسید کے ہاں نوابوں کی سیر بھی کراتا ہے۔ یہ سرسید اسٹیج کے اور تہذیب الاخلاق کے سرسید سے کتنا مختلف ہے اس کا اندازہ اس کی بذلہ سنجیوں سے کیا جا سکتا ہے:

> "مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) ایک بار ان کے ہاں مہمان تھے۔ ایک روز وہ نہانے کے لیے کرتا پاجامہ پہنے سید صاحب کے بڑے کمرے میں آ گئے جہاں وہ بیٹھے کام

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو نقوش، مکاتیب نمبر [2] چند ہم عصر/۱۷۹ [3] چند ہم عصر/۱۸۰-۱۸۱

کیا کرتے تھے۔ مولوی مشتاق حسین کی توند زیادہ بڑھی ہوئی تھی پاجامہ کھسک کھسک جاتا تھا اور وہ بار بار ہاتھ سے اوپر چڑھاتے جاتے تھے۔ سید صاحب نے جو دیکھا تو کہنے لگے
"میاں مشتاق حسین! تمھارا پاجامہ ہمیشہ گھوڑی پر سنگار رہتا ہے۔"[1]

اسی طرح انھوں نے مولوی سید علی بلگرامی کا خاکہ اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے جس میں دلچسپی کے ساتھ خلوص کی گرمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ شگفتہ بیانی اور ظرافت سے عبدالحق کی کوئی تحریر خالی نہیں۔ اس میں بھی ایسے کئی لطیفے موجود ہیں:

> "مرحوم کے مزاج میں مزاح بھی تھا چنانچہ اس زمانے میں جب کہ وہ قدیم ہند کا تذکرہ کر رہے تھے انھوں نے اپنے ایک دوست کو وہ باب سنانا شروع کیا جس میں ہندوستان کی قوموں کا ذکر تھا اور ہندوستان کی ایک قدیم وحشی قوم کا بھی ذکر تھا۔ جب مرحوم پڑھنا ختم کر چکے تو اس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟ اتفاق سے اس وقت ایک مولوی صاحب جو مرحوم سے ملنے کے لیے آئے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارے سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں۔"[2]

ایک خاص خصوصیت عبدالحق کے لکھے ہوئے خاکوں کی یہ ہے کہ انھوں نے اس میں جا بجا اور "جا و بے جا" اپنا تذکرہ نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں "ضمیر واحد متکلم" بہت کم ملے گی ——— یہی ایک خوبی ایسی ہے جو ان کے خاکوں کو بلند معیار بنانے کی ضمانت ہو سکتی تھی۔ "چند ہم عصر" میں بعض خاکے سرسری اور مختصر سے لکھے ہیں۔ ایک خطبہ بھی شامل ہے۔ کہ اس میں محمد علی اور اکبر حیدری کے خاکے مکمل بھی ہیں لیکن مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، نور خان، محسن الملک، حالی، حیدری صاحب، نام دیو مالی اور سرسید احمد خاں کے خاکے مناسب ہیں۔ یہ عبدالحق کے شاہکار اور ادب اردو کے جواہر پارے ہیں۔ ان کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔

مولوی محمد عبدالرزاق کانپوری جو "البرامکہ" اور "نظام الملک طوسی" جیسی لاجواب تاریخی کتابیں لکھ کر کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں کتاب "البرامکہ" لکھنے سے ذہن خود بخود مولوی عبدالرزاق کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے۔ ان کی لکھی ہوئی ایک کتاب "یادِ ایام" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن نے شائع کی تھی۔ اس میں زیادہ تر سوانحی اور تاریخی انداز کے مضامین ہیں اور ۲۰ اشخاص کا انھوں نے ذکر کیا ہے جن میں سرسید، شبلی، اکبر، جسٹس امیر علی، محسن الملک، ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، وقار الملک، رحمت اللہ رعد، شرر، تسلیم، میرزا حیرت، سید جعفر حسین لکھنوی، سید محمود اور راس مسعود شامل ہیں۔ یہ مضامین دراصل راس مسعود کی فرمائش سے لکھے گئے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ بہت دنوں ریاست بھوپال کے محکمہ تاریخ سے وابستہ رہے۔ انداز بیان و نگارش خاص ہے مگر اس میں سادگی کے ساتھ علمی مزاج اور سنجیدہ ادب بھی موجود ہے۔ تصنیف و تالیف میں وہ شبلی کا سا انداز رکھتے ہیں مگر شبلی کی سی استدلال و معیار نہیں ہے۔ اور یہ ساری خصوصیات ان مضامین میں بھی موجود ہیں۔ ان میں صرف شخصیات کی جھلکیاں ہی موجود نہیں بلکہ بہت سے وہ تاریخی واقعات بھی محفوظ ہو گئے ہیں جن کے شاہد عینی مولوی عبدالرزاق تھے اور ہمارے پاس ان کے سوا کوئی ذریعہ واقفیت کا نہ تھا۔ چونکہ یہ مضامین خاص اہتمام اور فرمائش سے لکھے گئے ہیں اس لیے ان کی تیاری میں بعض کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔ اگرچہ ان میں سوانحی رنگ غالب ہے۔[3]

---

[1] چند ہم عصر / ۱۹۲ [2] ایضاً / ۴۴

لیکن انھیں نثر کے بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ایک خاکے میں جو سوانحات ہوتی ہیں وہ کم و بیش ان میں مل جاتی ہیں ——— مولانا شبلی مرحوم بڑے نفاست پسند اور خوش مذاق انسان تھے صحت اور نفاست کا اہتمام کتابوں کی طباعت میں بھی رکھتے تھے۔ منشی رحمت اللہ رقمہ کا مطبع نامی پریس کانپور میں اعلیٰ طباعت کے لیے مشہور تھا لیکن کتاب چھپنے میں تاخیر بہت ہوتی تھی۔

"سیدہ آباد سے جب مولانا روم کی سوانح عمری طبع ہو کر آئی تو انتہائی آرزو تھی کہ چھ مہینے میں کتاب طبع ہو جائے مگر اس کی طباعت میں کئی سال ہو گئے۔ مجبور ہو کر مجھے لکھنا کہ جس حالت میں ممکن ہو کتاب چھپوا دو آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہوں۔ چنانچہ کتاب چھپ گئی۔

ایک سال کے بعد میری کتاب سوانح آئی تب میں نے لکھا کہ آپ تو توبہ کر چکے تھے۔ اس کے جواب میں تحریر کیا کہ میری حالت اس حاملہ عورت کے مشابہ ہے جو روزہ کی حالت سے مجبور ہو کر عہد کرتی ہے کہ اب وہ کام نہ کروں گی جو باعث درد و رنج ہو۔ لیکن وضع حمل کے بعد وہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہتی ہے ——— یہی میرا اور رحمت اللہ رقمہ کا حال ہے جب کتاب طبع ہو کر آ جاتی ہے تو پھر پچھلی باتیں بھول جاتا ہوں اور حسن پرستی مجبور کر کے نامی پریس میں کتاب چھپواتی ہے۔"[1]

بہر حال ان مضامین کی حیثیت رنگا رنگ ہے۔ ان میں تاریخ و سوانح بھی ہے معاشرت کی جھلکیاں بھی ہیں، تنقید و انتقاد بھی ہے شخصیت نگاری بھی اور دلچسپی بھی کہیں کم نہیں ہوتے پاتی۔ کتاب پڑھنے کے بعد معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور طبیعت کو انبساط حاصل ہوتا ہے۔

آغا حیدر دہلوی کے مضامین "پس پردہ" ۱۹۳۶ء میں کتاب نما پریس علی گڑھ سے شائع ہوئے تھے جنھیں عبدالاسلام نے مرتب کیا تھا۔ آغا حیدر دہلوی کو روزمرہ گفتگو لکھنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ ان کا لب و لہجہ محاورے تشبیہات اور زبان کا چٹخارا سب کچھ موجود ہے۔ "پس پردہ" میں پندرہ مضامین شامل ہیں جن میں سے بیشتر پہلے "علی گڑھ میگزین" میں شائع ہو چکے تھے۔ اس میں سٹرجیات، مسٹر سید حسن اور مرحوم نیڈو (مسز سروجنی نائیڈو) کے خاکے بھی کھینچے گئے ہیں جن میں طنز کی بھگاتی زبان ہے۔ انداز بیان ہوتا "ہوا میں اڑ جانے والا اور پھر وہ شیریں ہے۔ جس کا خاکہ کھینچا ہے گویا فوٹو اتار دیا ہے مشابہ کی مجموعی پرکشش کرتا ہے۔ سروجنی نائیڈو کا سراپا دیکھئے کتنی جزئی تفصیلات کے ساتھ اور کیا مزے لے لے کر بیان کیا ہے:

"اب چلئے کی جان، روح رواں سروجنی کی بابت سنئے۔ قد کا ٹھگنا پر تناسب، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھنی ہوئی چمپئی رنگت، کتابی چہرہ، کھڑا کھڑا نقشہ..... خوب خوب گہری گہری کالی کالی جنوبی جٹ کے اور پھٹا سا خوب گدرائے کسوم کا ٹکڑا بڑی بڑی نرگسی آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی دیکھنے میں کمزور مگر چلتے اور گفتگو کرتے ہیں ہوا سے باتیں کریں۔ آنکھوں کے ڈھیلے ہر وقت نرواں رہتے ہیں پتلیاں خوب سیاہ اور بڑی بڑی جن کی چاروں طرف بڑے بڑے سیاہ گھنے پلکوں کا جھنڈ ہے جس میں یہ بجلی ہر وقت رکھ کرتے رہتے ہیں۔ بعد کہیں اس جھنڈے سے یہ کالے

---

[1] یادگار شبلی، ص ۱۳۰ (۱۹۴۶ء)

شیرازی کبوتر رکھتے ہیں، نہیں آتا کہ تیتر دور دور کے کوسے کاٹ آتے ہیں۔ بڑی آنکھیں کیا بادام غضب کی ہیں۔ موتی کوٹ کر بھر دیے ہیں لیکن ساتھ ہی ان سے حجاب و شرم دیدہ اور عصمت و عفت ٹپکی پڑتی ہے۔ یہ دیکھو کہ شہر شہر ملک ملک کیسی پھرتی ہیں۔ ہزاروں بانکے مردوں میں اٹھتی بیٹھتی ہیں، چاہیے تھا کہ دیدے کا پانی ڈھل جاتا مگر نہیں، آنکھیں وہ دیا ہے کہ بعض بے حیا مردوں کی طرف اٹھتے ہی ان کو بھی حیادار بنا دیتی ہے۔ . . . . متناسب اعضا ہیں۔ چھب تختی بڑی پیاری ہے جس کے سبب جاسنر بجا اور بھیں غضب کی ہے۔ کان کرنوں ہیں اور لو پر نیچے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جھکی ہیں۔ بال بڑے گھن دار کالے بھونرا سے ہیں۔ باقی رخسارے پر ذرا کچھ اور ہٹ کر ایک تھا سا ہلکے سیاہ رنگ کا تل ہے کہ جب ہنستے وقت گال اوپر کی طرف بڑی خوبصورتی سے کاٹھ پیدا کرتے ہوئے پڑتے ہیں تو شامت زدہ آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ بیدھے رخسارے میں ہلکا سا گڑھا پڑتا ہے جس کے متعلق دلی والیوں کا خیال ہے کہ ساس پر بھاری ہوتا ہے۔ . . . . خوبصورت ٹھوڑی جیسے ہاتھی دانت کی کوری لبوتری سانچے میں ڈھلی ہو۔ اچھی گول گول ناک کلائیاں . . . . وغیرہ وغیرہ۔"[1]

غرض کہ یہ خاکے اور یہ آماز بیان بھی اپنی وضع کا ایک ہی ہے۔ ان مضامین میں خاکے تو ضمناً آ گئے ہیں ورنہ اصل میں یہ بیگانی شادی کے خنکے کے لیے ہی لکھے گئے ہیں۔ ان کے پڑھنے میں لطف ضرور آتا ہے مگر یہ لطف استعمال کا ہے خاکوں کا نہیں۔

اسی صنف کے لکھنے والوں میں ہم نے بیتاب نائن پکچرسٹ کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ ان کے مضامین ۱۹۳۷ء میں "مضامین پکچرسٹ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تعداد بیس ہے اور متعدد مضامین شخصیات پر ہیں لیکن انھیں کسی طرح بھی "اسکیچ" نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے دو تین اسباب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کا انداز تنقیدی ہے یعنی علمی و ادبی کارناموں کی محاسن و مساوی کا اظہار کیا گیا ہے دوسرے ان کا لب و لہجہ اور جسمانی ساخت ایسی نہیں جو "خاکوں" کے لیے ضروری ہے۔ یہ صرف تنقیدی مضامین ہیں۔ ان میں صرف پشتہ شمس نائن ورژ ایک ایسا مضمون ہے جس میں خاکہ ہونے کی چند علامتیں مل جاتی ہیں۔

اسی طرح پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا ایک مضمون جو شمس العلما محمد حسین آزاد پر لکھا گیا ہے کیفی نام کر خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی اسکیچ کے اوصاف نہیں ہیں۔ یہ ان کے مجموعہ مضامین "منشورات" میں شامل ہے۔ محمد حسین آزاد پر سب سے اچھا اسکیچ آغا محمد باقر نے لکھا تھا جو پہلے اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوا[2]۔ اس کے بعد اسی کا تقریباً خلاصہ "نقوش" کے شخصیات نمبر میں شائع کیا جا چکا ہے[3]۔ اس میں آزاد کی سیرت اور شخصیت کی جھلکیاں اچھی پیش کی گئی ہیں لیکن ایک نقص بھی ہے وہ یہ کہ عقیدت کا رنگ نمایاں ہے کیونکہ محمد باقر آزاد مرحوم کے پوتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی جامع صفوہ کمالات بزرگ ہیں۔ اب تو وہ صرف روحانیات کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں لیکن انھوں نے فلسفہ، الٰہیات، تصوف، ادب، مذہب، سیاست، صحافت ہر کوچے کی سیر کی ہے۔ ہر راستے کے چپے چپے سے گزرے ہیں۔ "خدنگ"

---

[1] پس پردہ / ۱۳ تا ۱۵ / ۱۹۲۶ء [2] اورینٹل کالج میگزین / فروری ۱۹۳۹ء [3] نقوش، شخصیات نمبر حصہ اول۔

کی حیثیت میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ صاحب طرز انشا پرداز، نظم میں جاں کنی اور نثر میں بھی نزاکت اور "ملتانی" ہے۔ انھوں نے گاہ بگاہ "آپ بیتی" بھی لکھے ہیں لیکن ان متفرق مضامین سے قطع نظر ان کی دو کتابیں "محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق" اور "حکیم الامت" مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات و حفظات اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے سوانحات اور تاثرات کا مجموعہ ہے۔ اس میں سوانح یا خاکے کی گنجائش نہیں تھی لیکن "محمد علی" ان کی ایسی تصنیف ہے جس کے بارے میں میں نے بارہا اپنے احباب سے کہا ہے کہ جو اردو دان اسے پڑھے بغیر گیارہ روپے بچا لے گیا۔ مولانا محمد علی کی شخصیت اس دور بلکہ ہمیشہ ہی عجیب و غریب تھی۔ ایک زمانے میں ہر گلی کوچے سے "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کی صدائیں بلند ہوتی تھیں سارے ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں ان کا غلغلہ مچا ہوا تھا مگر آج کسی کی زبان پر لے دے کے بھی محمد علی کا نام نہیں آتا۔ سیاسی اختلافات اپنی جگہ پر لیکن ایمان کی روشنی فراست کا نور، اخلاص و ایثار کی گرمی اور جذبۂ خدمت کا شعلہ تو قائد اعظم کی تابندگی مزاج اور گلہ آفرینی کی لطافت اور عمل کی بھی روح محمد علی کی شخصیت میں ہمیشہ نظر آتی ہے۔ ان کی ترجمانی کرنے کا حق بھی مولانا یا بادی نے ادا کر دیا ہے۔ اس کتاب سے جو کہ میں بے حد متاثر ہوں اور خود محمد علی سے بھی اس لیے ہو سکتا ہے کہ بعض اہل نظر میری رائے کو جانب دارانہ سمجھیں لیکن میں اگر بالفرض غلطی پر بھی ہوں تو اس پر اصرار کرنے میں مجھے لطف آئے گا۔ یہ تو قطع نظر کی بات ہے لیکن یہاں "آپ بیتی" کی حیثیت پر بحث ہے۔ یہ بات ہر شخص تسلیم کرے گا کہ محمد علی جسے دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے سوانح عمری نہیں صرف خاکہ ہے۔ نہایت طویل اور مفصل خاکہ جس میں ہندوستان کی ربع صدی کی سیاست جھلک رہی ہے بلکہ عالم اسلام کی پوری تاریخ جھلملا رہی ہے۔ انداز بیان کی اثر انگیزی اس حد تک ہے کہ پڑھتے پڑھتے ہم اپنے تاثر میں نہیں رہتے کبھی ہنستے ہیں بے اختیار کبھی روتے ہیں بے طرح۔ مولانا دریابادی نے کتاب عقیدت سے لکھی ہے۔ وہ اس سے منکر بھی نہیں لیکن اس عقیدت کے باوجود شخصیت کے پہلے کا کوئی نقش بگڑنے نہیں پایا ہے نہ ہم اس کتاب کو "کتاب المناقب" یا "مدحیہ قاموس" کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے لکھا یہ سوانح عمری نہیں "طویل خاکہ" ہے اور سوانح نگاری کے لیے ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میدان میں انوکھا اور کامیاب تجربہ۔

شخصیات پر جو متفرق مضامین عبدالماجد دریابادی کے قلم سے پچھلے ۴۵، ۵۰ برسوں میں لکھے گئے ہیں ان کی تعداد کئی درجن ہو تو عجب نہیں۔ مہدی افادی، اکبر الہ آبادی اور شبلی پر انھوں نے خوب لکھا ہے۔ ان کے نظر میں اچھا "خاکہ" لکھنے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ ظاہر بھی ہوتی ہیں۔

اب ہمارے سامنے رشید احمد صدیقی کے لکھے ہوئے خاکے آتے ہیں۔ یہ ایک مجموعہ کی صورت میں "گنج ہائے گراں مایہ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۴۷ء میں کتابی دنیا (دہلی) نے چھاپا تھا۔ اس کے بعد ایک ایڈیشن حیدرآباد سے بھی نکلا اس مجموعے میں تیرہ اسکیچ ہیں۔ ان کے علاوہ "مذاکر صاحب" ان کا لکھا ہوا طویل خاکہ ہے جو علیحدہ کتابی صورت میں آ چکا ہے۔ "اقبال سہیل بھی ان کا مفصل" مضامین رشید" میں شامل ہے۔ بعد میں جو خاکے اور لکھے گئے ان میں سید سلیمان ندوی (معارف، سلیمان نمبر) افضل الملک ڈاکٹر عبدالحق مرحوم (معارف) نواب محمد اسمٰعیل خاں، اقبال سہیل اور مولانا آزاد وغیرہ کے خاکے شامل ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں لکھے ہوئے تمام خاکوں میں رشید صاحب کا ایک خاکہ بھی ایسا نہیں ہے جو "گنج ہائے گراں مایہ" کے معیار کی برابری کر سکے۔ جس میں مولانا سلیمان اشرف، اصغر گونڈوی، محمد ایوب عباسی اور نصیر الدین علوی پر لیے اسکیچ شامل ہیں جن کی نظیر اردو میں نایاب نہیں تو

کیا ہے ضرور ہے۔ اگر معاملہ صرف میری پسند پر چھوڑا جائے تو میں محمد ایوب عباسی کے اسکیچ کو رشید صدیقی کا شاہکار کہتا ہوں۔ جس طرح مولوی عبدالحق نے "نام دیو مالی" اور "نور جہاں" جیسی سادہ اور غریب شخصیتوں میں انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا جلوہ دیکھا ہے اور ان کی عظمت کو دلوں پر نقش جمایا ہے، اسی طرح ایوب مرحوم کی بے ریا اور بے رنگ شخصیت میں ہمیں مشرقی تہذیب و شائستگی اور قدروں پر عملی کی وفاداری اور اخلاص و ایثار کا بہترین نمونہ ملتا ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے کی سادہ معاشرت کی ایک پاکیزہ علامت ہیں۔ رشید صدیقی نے یوں تو سلیمان اشرف، محمد علی اور اصغر کے خاکے بھی بڑی محبت اور عقیدت سے لکھے ہیں لیکن وہ کسی کی شخصیت سے خود بھی اتنے متاثر نہیں جتنا ایوب سے۔

"وہ موجود تھے تو ان کی شمال نما فطرت کی بھی مثلاً ہوا پانی، روشنی ہوا اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی لیکن ان میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آجائے تو پھر دیکھئے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہتا ہے اور یہی متقابل الصفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔"[1]

ایوب کی دلکش شخصیت کا جو پہلو ہمارے سامنے آتا ہے اس کی ساری دلکشی و رعنائی ان کی سیرت میں ہے:

"وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے، دولت مند نہ تھے کچھ بہت زیادہ بھی نہ تھے، نہ انھیں جوڑ توڑ آتا تھا۔ نہ خوش پوشاک، نہ خوش گفتار، نہ خوش باش نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں۔"[2]

رشید صدیقی نے ان کی محبت، سادگی، دلسوزی، خورد پروری، حسن سیرت اور جذبۂ خدمت و ایثار کی جن الفاظ میں کی ہے کہ پڑھنے والا ایوب کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اردو کے خاکوں میں یہ اسکیچ ہی حیثیت رکھتا ہے جو معماروں میں تاج محل کو اور ہیروں میں کوہ نور کو حاصل ہے۔ دوسرے خاکوں کے برخلاف اس کا لہجہ تاثراتی بھی زیادہ ہے۔ رشید صدیقی کے اسکیچ عموماً ایک ہی رخ پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے تاثرات بیان کرنے میں جھجکتے نہیں اور "ہیرو" کے لیے ان کی عقیدت و محبت بھی صاف جھلکتی ہے لیکن اسکیچ میں جو خامیاں رہ جاتی ہیں انھیں وہ بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان اکثر حالی سے ملتا ہے مثلاً اقبال سہیل کا تعارف یوں شروع کیا ہے:

"مولانا سہیل سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے، یونین کے الکشن لڑتے تھے اور مجنوں کہلاتے تھے۔ اب سنتے ہیں صرف عقیدے رکھتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا ایسی ہو اس کا انجام یہ کیوں نہ ہو۔"[3]

الفاظ کی نشست اور دروبست کے خاص اہتمام سے وہ عموم میں بھی لطف پیدا کر دیتے ہیں اور ان کا مزاح اسی سے عبارت ہے:

"علی گڑھ میں داخلے کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگان قوم جو سال بھر ہم

---

[1] گئی بائے گراں مایہ/۴۷ (دہلی، ۱۹۴۷ء) [2] ایضاً/۴۸ [3] مضامین رشید/۳۰۴ (دہلی)

سب کو گالی اور اشتہارات کو پیام دیتے رہتے ہیں نئے ایڈیشن کے شروع ہوتے ہی ہم کو توہین عامہ کا مستحق قرار دے دیتے ہیں۔ پہلے حملہ آنے شروع ہوں گے پھر تار بھیجے تا نگے۔ خلاصہ یہ پارٹی ایک ہی ہوتی ہے یعنی اگر آپ کا ہے یا یونینسٹ قوم کی ہے اور حکومت ہندوؤں کی۔[1]

شخصیت نگاری میں رشید صدیقی کا زاویۂ نگاہ سب سے الگ ہے۔ وہ ہے زندگی اپنے ارتقا محبت اور مشرقی شائستگی کے راہ رو ہیں اور ان محاسن کو وہ سروں میں بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے تمام خاکے اسی نقطۂ نظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہر شخص کے ذہن میں کردار کی عظمت و رفعت اور بلندی و استواری کا جو اگر معیار ہوتا ہے اسی معیار پر وہ دوسروں کے عیب و ہنر کی پرکھ کرتا ہے اگر زیادہ گہرا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ مشاہدات بڑی حد تک لکھنے والے کے ذہن کی صدائے بازگشت اور اس کی افتادِ طبع کا عکس ہوتے ہیں۔ یہاں ہم ان جیوں کے لکھے ہوئے مختلف خاکوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے ان کا مطالعہ اگر اس نقطۂ سے کیا جائے تو بہت سی نفسیاتی گرہیں کھل جائیں گی۔ مثلاً ایک تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس نے خاکہ لکھا اور جس کا خاکہ لکھا ان دونوں کے مزاج میں کہاں اختلاف ہے اور کہاں ہم آہنگی ہے۔

رشید صدیقی قدامت کی خوبیوں کے پرستار ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو انفیشن کے طور پر ہر قدیم چیز سے بھڑکتے ہیں یا روشن خیالی کے نام پر ہر حماقت سے سمجھوتہ کر لینا مستحب سمجھتے ہیں۔ وہ اکبر اور اقبال سے متاثر ہیں اس لیے اتنے ہی قدیم ہیں جتنے اکبر تھے اور اتنے ہی "جدید" ہیں جتنے اقبال۔ اسلامی تہذیب اور مشرقی وضع کو انھوں نے دیکھا ہی نہیں اچھا اور جکھا ہے۔ بعض ناقدوں کا خیال ہے کہ وہ "زندوں سے ڈرتے ہیں اور مُردوں پر شیر ہیں" کسی نے کہا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے خاکوں میں واحد متکلم "بے دھڑک" اور بے موقع بھی استعمال ہوا ہے اور یہ کہ ان خاکوں سے صرف خاکہ نگار کے تعلقات اور تاثرات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان پر "کول" ہونے کا الزام تو اب بہت ہی عام ہو گیا ہے۔ ان الزامات کی تاویل توجیہ یا تردید کرنا چاہے موضوع سے خارج ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایوب عباسی، اصغر گونڈوی اور سلیمان اشرف کے بیکیچ پڑھ کر ان کی سیرت کے ایسے خطوط و خال ابھرتے ہیں جن میں عام انسانیت کا عکس چھپا ہوا ہے اور جب ہم اردو میں خاکہ نگاری کے مختصر سے سرمایے کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو چند ہم عصر کے بعد "گنج ہائے گراں مایہ" سے اچھی کوئی کتاب اس پورے دور میں نظر نہیں آتی۔

اسی صف کے ممتاز ادیبوں میں عبدالمجید سالک کا نام آتا ہے۔ ان کی پوری زندگی سیاست اور صحافت میں گذری ہے۔ خصوصاً ان کی "سرگذشت" پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں جو ایک نظام کا مائم گذارا اور دوسرے کا خالق تاریخ صدی سے زیادہ افکار و حوادث کے بغور مشاہد رہے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں لیکن ان کی صحافت ادب سے قریب ہے۔ اس میں زبان و بیان کی شگفتگی اور طرز و اسلوب کی جاشنی شامل ہے۔ سالک کے قلم نے اردو صحافت میں جس کو "عام معیار" بھیا ہے ظاہر ہے اسی شستہ و شائستہ مزاج پیش کیا ہے اس کی مثال اردو صحافت میں شاید ہی کوئی مل سکے۔ انھوں نے بعض خاکے لکھے ہیں جن کا

---

[1] گنج ہائے گراں مایہ / ۵۴۰

ایک مجموعہ ۱۹۵۵ء میں "یارانِ کہن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں بیس خاکے ہیں جن میں سے چند تو محض "لطیفے" کے ہیں اور ان میں ادب سے زیادہ "صحافت" نظر آتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو شخصیت سے زیادہ سیاست پر تبصرہ ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مولانا آزاد، مولانا اگر آئی چالندھری اور مولانا ظفر علی خان کے خاکے اچھے لکھے گئے ہیں۔ کتاب میں جا بجا الف عین کی ہے ایک تو مسالک کا مخصوص انداز نگارش ہے، دوسرے ان سے شخصیت کے بعض دلکش پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے خصوصاً مشرک علی کی باغ و بہار شخصیت کو تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے

> "مولانا شوکت علی عربی نہیں جانتے تھے لیکن جب کبھی بعض عرب بزرگ ان سے ملنے آتے تو مولانا ان سے عربی میں باتیں کرنے کی کوشش کرتے یعنی عربی کے دو تین گھسے پٹے لفظ کہے اور جو کمی رہ گئی وہ ہاتھوں اور آنکھوں کے بلیغ اشاروں سے پوری کر دی۔ فٹافٹ عرب سے باتیں کر رہے تھے۔ "یا شیخ! اَنْتَ بَرَکَۃٌ لَنَا وَنَحْنُ (آنکھیں بند کر لیں) فِی کُلِّ عَالَمٍ نَارُکُمْ (انگلی فضا میں گھمائی) خُلُوصُ نَافِشٍ۔ خُلُوصُ نَافِشٍ۔ خَیْرُ اللّٰہِ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اور اوپر اللہ کی طرف اشارہ کر دیا)
>
> ایک دن چند نوجوان سر ہو گئے کہ آپ عربی تو جانتے نہیں اسی میں باتیں کیسے کر لیتے ہیں۔ کہنے لگے: "واہ! عربی کیوں نہیں جانتے، ہم خوب عربی جانتے ہیں۔" کسی شوخ نے پوچھا: "اچھا یہ تو بتائیے گھٹنے کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟" بے تامل جواب دیا "گھٹنا تو عرب میں ہوتا ہی نہیں!" اس کے مارے قہقہوں کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔"[1]

"یارانِ کہن" کے بارے میں خود مسالک نے لکھا ہے کہ "اس تذکرے میں ان بزرگوں کے سوانح حیات لکھنا یا ان کی تصانیف پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں صرف ان کی شخصیتوں کی ہلکی سی جھلک دکھانا مقصود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اس مقصد میں ناکام نہیں رہا۔" دوسری بات یہ کہ کتاب "صرف چند روز میں لکھی گئی ہے۔" اس اعتذار کے بعد ان خاکوں پر سختی سے نکتہ چینی کرنا شاید مناسب نہ ہو لیکن اتنا تو کہوں گا کہ مولانا مسالک کے قلم میں "جھلک" ہے اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اردو کے طنز و مزاح کو ایک تصنیف اس سے بھی دیں گے جو ہماری زبان کا سر فخر سے بلند کر دے اور ایسی کتاب "روزنامہ صحافت" سے قدرے بلند ہو کر ہی لکھی جا سکتی ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ شخصیت نگاری میں مسالک کا زاویۂ نظر معاندانہ یا کینہ پرورانہ و متقرانہ نہیں رہتا۔ وہ ایک راوی کی زبان سے لکھتے ہیں اور ایک مبصر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ خان کی نظر صرف استہزا و مصائب کے خارزار میں الجھ کر رہ جاتی ہے نہ وہ فقط محاسن و محامد کی قصیدہ خوانی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ البتہ مزاح کا پہلو وہ ضرور تلاش کر لیتے ہیں اور ایسے موقع پر ان کی خلاقی (Creative Faculty) ان کو کوئی نہ کوئی نکتہ سجھا دیتی ہے۔ زبان وہ بڑی شیریں لکھتے ہیں جو ادب لطیف (مروج اصطلاح میں نہیں بلکہ "لائٹ لٹریچر") کے لیے بڑی مناسب واقع ہوئی ہے۔

---

[1] یارانِ کہن ص ۲۵-۲۶

(۲)

اُردو میں جن اور بھی نے خاکے لکھے ہیں ان کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن وہ ہمارے جتنے لکھنے والے ہیں ان کے درمیان کوئی نمایاں سطح حاصل کرنا تاریخی اعتبار سے یا ادبی نقطۂ نظر سے انھیں ادوار میں تقسیم کر دینا بہت مشکل ہے اس لیے ہم نے قصداً آئندہ خاکہ نگاروں کو قبول کرنے سے احتراز کیا ہے۔ پھر بھی تمام سہولیات کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کچھ نہ کچھ فرق مراتب یا تقسیم زمانی کا لحاظ رکھا جائے اسے محض اپنی سہولت کے خیال سے تین حصوں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہماری یہ تقسیم یا "درجہ بندی معناً قابل قبول ہو یا کسی خاص اصول و معیار سے کی گئی ہو۔ اس میں صرف اپنے مطالعے اور تحریر کی سہولت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

دوسرے گروپ میں ہیں جو چند نام پوری صف میں نمایاں نظر آتے ہیں ان میں سرور، دیوان سنگھ مفتون، مالک رام، ایم اے (مصنف "ذکر غالب") نگار، نکہت، اعجاز حسین، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی اور غلام احمد فرقت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دیوان سنگھ مفتون اُردو کے نہایت کہنہ مشق صحافی ہیں جن کی پوری زندگی ہمہ رنگا رنگ گندی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے تجربات اور چھوٹے سے چھوٹے مشاہدات سب قلمبند کیے ہیں جو کتابی صورت میں "ناقابل فراموش" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو بڑی کتابی تقطیع کے سوا چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ دلچسپی کا یہ حال ہے کہ "ذکر و مخونیہ" کے بعد اتنی دلچسپ کوئی کتاب اُردو کے پورے سرمایے میں نہیں مل سکتی۔ "ذکر و مخونیہ" کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ اسلوب نگارش کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے۔ "ناقابل فراموش" کی زبان میں بعض خامیاں بھی ہیں گی لیکن "ناقابل فراموش" کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں زندگی کے حقیقی تجربات و واقعات ہیں، افسانوی رنگ، طلسماتی فضا اور تخیل معقول قسم کی غیر معمولی آسمانیاں نہیں ہیں جبکہ "ذکر و مخونیہ" میں بعض واقعات ایسے بھی ہیں جنھیں عقل تسلیم کرنے سے انکار کر سکتی ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف مفتون کے سیکڑوں ملنے والوں کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ خود مصنف کا کردار بھی سامنے آتا ہے۔ سب سے حیرت انگیز توان کی بے پناہ قوت حفظ و مشاہدہ اور غیر معمولی حافظہ ہے وہ شیخ سعدی کی طرح زندگی کے پامال حقائق اور پیش پا افتادہ واقعات سے بصیرت حاصل کرتے اور عبرت دلاتے ہیں۔ بظاہر نہایت حقیر اور معمولی بات کو بھی وہ نہ صرف یاد رکھ سکتے ہیں بلکہ کسی نہ کسی موقع پر اس کا اظہار کر دینے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ "ناقابل فراموش" کے دیباچے میں انھوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ بہت اچھی اور صحیح زبان لکھنے پر قادر نہیں، لیکن وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان ہی میں بہت کچھ بلکہ سب کچھ کہہ گزرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی بے باکی اور صداقت نگاری سب کو مسلم ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے سیکڑوں شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں اور حقیقت یہ ہے "حقیقت" کی تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ بات کو سیدھے سادے لفظوں میں بے تکلف کہہ دینے کے عادی ہیں۔ استعارے اور کنایے ان کی تحریروں میں نہیں ہوتے نہ وہ دور از کار اور "یاد رہا" باتیں بناتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس کی تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ کتنی ہی شخصیات ہیں جن کے تاریک پہلو مفتون کی شعلہ نوائی سے روشن ہو گئے ہیں اور کتنے ہی "اوہام" ہیں جن کی حقیقت مفتون کی بے باک نگاری کے طفیل میں سامنے آگئی ہے۔

نفرت اور محبت ان بنیادی جذبات میں سے دو ہیں جو ہر انسان بلکہ ہر ذی روح کی جبلت میں شامل ہوتے ہیں۔ مفتون بھی اس سے عاری نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک انسان ہیں اور نارمل انسان ہیں۔ میری آپ کی طرح انھیں بھی کچھ شخصیتوں سے محبت ہے کچھ سے نفرت ہے

لیکن انھوں نے جسے جیسا پایا ہے بے کم و کاست لکھ دیا ہے اور جس کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے بے رنگ بیان کر دیا ہے۔ دوسروں کی کمزوریاں بیان کرنے میں تو وہ کیا تامل کرتے، جہاں موقع ملا ہے انھوں نے اپنے اوپر بھی اس "بے دردی" سے تنقید کی ہے کہ شاید ان کا مخالف بھی نہ کر پاتا۔ بہرحال یہ کتاب مطالعے کے قابل ہے اور اسے اردو ادب میں بڑا بیش قیمت اضافہ سمجھنا چاہیے جس میں ایک بڑی پُرشور طوفانی زندگی کے پچاس برسوں کے تجربات بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ارباب نظر اس کتاب کی ادبی حیثیت کے تعین میں "عقل" سے کام نہ لیں گے۔

مالک رام غالبیات کے ماہر اُردو کے دیدہ ور نقاد، مؤرخ اور محقق ہیں۔ ان کا بیش قیمت کارنامہ غالب کی زندگی اور کلام پر ہے۔ "ذکرِ غالب" کی مقبولیت کا یہ حال کہ اس کے تین ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ "تلامذۂ غالب" ابھی چند ماہ پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ غالب کے دیوان کا صحیح ترین نسخہ ان کا ایڈٹ کیا ہوا چھپ گیا ہے ——— مالک رام کی تحریروں میں ربط و تسلسل کے علاوہ شگفتگی اور سادگی ہے۔ خصوصاً تحقیقی مضامین میں جتنا دلکش لب و لہجہ ان کا رہتا ہے اتنا کم دیکھنے میں آیا ہے۔ انھوں نے بعض خاکے بھی لکھے ہیں جو بے حد کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ جوشائستہ لب و لہجہ مولوی عبدالحق کے بیسیوں سیرتی اور صاف زبان میں "چند ہم عصر" لکھی گئی ہے وہی اوصاف مالک رام کے لکھے ہوئے خاکوں میں بھی موجود ہیں۔ ان کے یہ خاکے کتابی صورت میں ابھی نہیں چھپے ہیں لیکن موصوف کی اجازت سے راقم الحروف نے ان کی گرد آوری کا کام شروع کر دیا ہے۔

ان کا بہترین اسکیچ "نواب صدر یار جنگ" پر ہے۔ اس میں نواب صاحب مرحوم کی باوقار اور وضع دار شخصیت اپنے تمام مشرقی محاسن اور تہذیبی روایات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ایسے ہی "نواب سائل دہلوی" پر ان کا خاکہ اُردو کے چند بہترین خاکوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ یہ دونوں اسکیچ "نقوش" کے شخصیات نمبر (حصہ دوم) میں شامل ہیں۔ سید سلیمان ندوی اور بیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے اسکیچ "معارف" (سلیمان نمبر) اور "آج کل" میں شائع ہوئے تھے۔

لیکن ایک اعلیٰ درجے کا اسکیچ اور بھی ہے جو اُردو میں اپنی طرز کا انوکھا تجربہ ہے۔ یہ مرزا غالب کا خاکہ ہے جو انھوں نے پہلے پہل علی گڑھ میگزین کے "غالب نمبر" کے لیے لکھا تھا۔ اس میں ایک فرضی کردار کی غالب سے ملاقاتیں دکھا کر ان کے عادات و اطوار، شاغل و افکار اور گھریلو زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ ضمیر واحد متکلم کی تھی اور باقاعدہ قرائن ہی نہیں تاریخی معیار سے بھی واقعات سب ہی کے اس سے بہت لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید مضمون نگار کوئی بڑے سن رسیدہ شخص ہیں کہ غالب سے ان کی دوستی اور ملاقاتیں رہی ہوں گی بعض لوگوں نے غلط لکھ لکھ کر اس کی تصدیق کی۔ جب یہی خاکہ "احوالِ غالب" (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو) میں شامل ہونے لگا تو مالک رام نے اس پر نظرِ ثانی کی، کچھ گھٹایا، بعض مطالب کا اضافہ کیا اور آخر میں ایک نوٹ بھی دے دیا کہ پڑھنے والوں کی غلط فہمی کا ازالہ ہو سکے۔

خاکہ لکھنے کے لیے ذاتی ملاقات اور مشاہدہ و تاثرات کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالی غالب کی آنکھیں دیکھنے والوں میں سے تھے انھوں نے بھی مرزا غالب کے عادات و اطوار اور سیرت و اخلاق کا آشنا و واضح نقش پیش نہیں کیا۔ مالک رام نے غالب کو کہاں دیکھا ہے اور مضمون میں ہمیں دکھایا ہے۔ یہ خاکہ ۷ صفحات کو محیط ہے اور اس کے لکھنے کا مقصد یہی خاکہ:

"میرزا کی روزمرہ کی زندگی کا پہلو نمایاں ہو اور دکھایا جائے کہ وہ گھر کے اندر کیسے رہتے سہتے تھے، ان کی عام دلچسپیاں کیا تھیں، وہ دوستوں سے کیسے ملتے جلتے تھے، ان کے ماحول

گرد و پیش کے باوجود ان کی شخصیت کا کیا رنگ تھا۔ ایسی باتیں عام طور پر تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کے موضوع سے خارج سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے لیے مسالے کی بھی کمی نہیں تھی میرزا کی اپنی تحریروں ہی میں کافی معلومات موجود ہیں۔ لواز م خاندان کے بعض بڑے بزرگوں سے بھی مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ یادگار غالب میں بھی بعض اشارے ملتے ہیں۔ کبھی یہ بھی کہ اتنے لمبے عرصے کے حالات کو سمیٹا کیسے جائے بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ "صدر یشہ دیگراں" کو بیانیہ انداز زیادہ دلنشین رہے گا جانچا بھی گیا۔

میں بادہ خوار نہیں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ بعض اتنی سی بات پر آپ مجھے "مولی" بھی نہیں مان لیں گے۔ اگر میں کہوں کہ یہ میرے مکشوف ہیں تو عین ممکن ہے کہ آپ مجھے کسی ماہر طبیب سے مشورہ کرنے کی صلاح دینے لگیں لیکن ایمان سے کہیے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے کیا آپ کے خیال میں یہ آسانی سے ممکنہ ہے کہ آپ اسے ماننے سے انکار کر دیں۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ اس خاکے سے غالب کی شخصیت کا جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ کسی کتابوں کے مطالعے سے بھی ممکن نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ خاکہ غالبیات کے سلسلے کی تمام کتابوں کا نچوڑ ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک خاکے کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔

مالک رام اپنے موضوع پر حاوی ہو کر اور اسے ہضم کر کے لکھتے ہیں۔ وہ واقعات کی جمع و ترتیب کا غیر معمولی ملکہ رکھتے ہیں۔ اسکیچ لکھنے کی تمام صلاحیتیں ان کے قلم میں موجود ہیں۔ ان کی تحریروں میں غور و فکر کے ساتھ متانت اور رکھ رکھاؤ بھی ہے۔ ان کی "آنا" بھی ہر جگہ نہیں کھٹکتی اس لیے انھوں نے جو اسکیچ لکھے ہیں وہ صرف "تاثراتی" ہی نہیں واقعاتی ہیں۔

تلمیذ کا تعلق حیدرآباد کے ایک معزز ادبی گھرانے اور اردو کے کہنہ مشق ادیب سے ہے۔ ان کی تحریروں میں ہمدردی اور پختگی ہے۔ انھوں نے تاریخ و تنقید کے ساتھ ہی لطیف تحریریں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے معلومات وسیع ہیں، زبان شگفتہ اور نظر گہری ہے۔ وہ حیدرآباد کی تہذیب کے گہوارے میں پلے ہیں۔ ایک زمانے میں ہندوستان کی بڑی بڑی علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیتیں کسی نہ کسی طرح حیدرآباد ہی سے وابستہ رہی ہیں اور ان میں سے بیشتر سے تلمیذ کا ملنا جلنا رہا ہے۔ انھوں نے بعض متفرق مضامین کی صورت میں بھی اور مفتوش کے شخصیات نمبر (حصہ دوم) میں حیدرآباد کی چند شخصیتوں کے عنوان سے بھی بعض لوگوں کا تعارف کرایا ہے۔ یہ ۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ طویل تعارف اس قابل ہے کہ چند اور مہیب باتوں کا اضافہ کر کے مبلغ، کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ تلمیذ کا قلم لکھنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور پڑھنے والوں کو پر جانے کے گر جانتے ہیں اس لیے ان سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اردو کے "خاکوں" میں نہایت بیش قیمت اضافے کریں گے۔ کسی حد تک ان کی تحریروں میں ایک کمزوری کو بھی دخل ہے۔ یعنی وہ جا بجا "لکھی گئی" "جاوے جا" اپنا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس سے خاکے کی فنی خوبی مجروح ہوتی ہے۔ اگر وہ اس معاملے میں ڈاکٹر عبدالحق کی پیروی کریں تو اردو کے بہترین خاکہ نگاروں میں ان کی جگہ خالی ہے۔

---

[1] احوال غالب / ۱۲۴ (۱۹۵۳ء)

ڈاکٹر اعجاز حسین نے ۴۴ شخصیتوں کے خاکے لکھ کر "ملک ادب کے شہزادے" کے نام سے کتابی صورت میں پیش کیے ہیں۔ ان میں بعض اہم اور بیشتر غیر اہم شعراء کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اکثر خاکے تشنگی کی حد تک مختصر ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ "جھلکیاں" کہا جا سکتا ہے۔ پھر کتاب کا نام "ملک ادب کے شہزادے" بھی عجیب و غریب ہے۔ ملک ادب میں صرف شعراء ہی نہیں بستے اور بھی کچھ لوگ پڑے ہوتے ہیں۔ انھیں محض "رعایا" میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال ڈاکٹر اعجاز حسین نے بعض شخصیتوں کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے اور ایک آدھ جگہ میں ہی ایسی چبھتی کی بات کہہ جاتے ہیں کہ اس شخص سے تعارف رکھنے والا تو بے حد لطف اٹھائے گا لیکن جو واقف نہ ہو وہ بھی محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان کی دقتِ نظر کی داد دے گا۔ لیکن ایسے خاکے معدودے چند ہی ہیں ورنہ بہت سے نام انھوں نے "از راہِ تفنن" یا "بہ سبیلِ حایت" بھی شامل کر لیے ہیں جو نہ ہوتے تو کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیتے۔

اس کتاب میں جن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے ان کی صورت، اخلاق، حرکات و سکنات اور زندگیت پر روشنی ڈالی ہے مگر سنجیدگی یا بیان کی ندرت و لطافت اس میں مفقود ہے۔ پوری کتاب میں ایک جگہ بھی مسکرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بعض جگہ اعجاز حسین نے صاف گوئی سے کام لیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اپنے مشاہدات اور تاثرات بے کم و کاست لکھ دیں۔ اتنے التزامات کے باوجود افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب میں کوئی خوبی ایسی نہیں جو اسے "تذکرۂ اول" کی چیز بنا دے یا جسے اطمینان کے ساتھ ڈاکٹر اعجاز حسین کے بڑے نام سے منسوب کیا جا سکے۔

اشرف صبوحی دلی کے روڑے ہیں۔ انھوں نے دلی کی ٹھیٹ زبان کے ٹھاٹھ دکھائے ہیں اور اس تاریخی شہر کی تمدنی علامتوں کے خاکے لکھے ہیں جن میں مٹھو بھٹیارا، گھسیٹا قصائی، میر ٹوڈو، پیر بخش کوتوال اور میر باقر علی جیسی شخصیات شامل ہیں۔ ان لوگوں کی شخصیت میں دلی کی روح اور دلی کا آب و رنگ نظر آتا ہے۔ دلی جس نے ہندوستان میں سب سے بڑی زبان اردو کو جنم دیا، دلی جس نے ہندوستان کی سب سے بڑی حکومت "مغل سلطنت" کو پروان چڑھایا اور پھر خاک میں ملتے دیکھا۔ وہ دلی جو کل ایک تمدن کا گہوارہ اور ایک تہذیب کا ایک گہوارہ تھی اور جو آج مخلوط کلچر کا "پٹارا" ہے ——— اس دلی میں اشرف صبوحی نے آنکھیں کھولی ہیں۔ اس کے در و دیوار سے باتیں کی ہیں اور اس کے گلی کوچوں میں بیٹھ کر کباب بیچنے والی یا داستان سنانے والی سادہ شخصیتوں کی آنکھوں میں جھانک کر ان کی روح سے شناسائی پیدا کی ہے۔ ایسی پرتو شخصیات کے خاکے انھوں نے لکھے ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیے تھے۔ یہ خاکے صرف اس اعتبار سے ہی کامیاب نہیں کہ ان میں دلی کی پرانی وضع کے لوگوں کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے بلکہ اشائل کے لحاظ سے بھی بے مثال ہیں۔ دلی کا ٹکسالی محاورہ، ہر فن کی اصطلاحیں، مناسب مقام استعارے اور لب و لہجہ کا لوچ ایسا ہے کہ مشکل سے کسی کی تحریر میں جمع ہو پاتا ہے۔ خواجہ محمد شفیع، خواجہ حسن نظامی اور شاہد احمد دہلوی کے بعد دلی کا محاورہ اشرف صبوحی کی تحریروں میں ہی ملتا ہے۔

صوفی کی چند عجیب ہستیاں" مختلف پیشے اور شعبے کی ہیں اور سب ہی اپنی جگہ دلچسپ ہیں لیکن داستان طرازی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے میر باقر علی کا خاکہ نوالے کی چیز ہے کیونکہ اس میں میر باقر علی کی سیرت و شخصیت کے علاوہ ان کی داستان گوئی کا نمونہ بھی آ گیا ہے۔ ایک بار میر صاحب سے ملاقات ہوئی تو:

"میر صاحب کے کئی ہم مشرب یعنی چنیا بیگم کے عاشق بھی تھے۔ میر صاحب کو گھورنے کی

لت کب سے تھی اور کس طرح لگی اس کا تو علم نہیں مگر تھی اور اس حد تک تھی کہ بغیر نشہ گئے داستان نہیں کہہ سکتے تھے البتہ اور باتیں انجیموں کی سی نہ تھیں۔ مزاج صفائی پسند تھا، طبیعت میں بھی کثافت نہ تھی جب پیالی چڑھا کر داستان کہنے بیٹھتے تو انجانوں کو انجمی ہونے کا شبہ بھی نہ ہوتا۔ بیرصاحب فرمایا کرتے تھے کہ "علمی نظر والے جانتے ہی نہیں کہ افیم کیا ہے؟ وہ صرف آنا ہی جانتے ہیں کہ دیکھنے میں کالی اور مزے میں کڑوی ایک شے ہے جسے اہلِ ظاہر نے مکروہ کہہ دیا ہے۔ انھیں کیا خبر کہ اس کے چوگے میں ایک زبردست فلسفہ ایک اعلیٰ مذہب بند ہے۔ مردانِ خدا سے پوچھو اس کا باطن کیسا لالوں کا لال ہے۔ "سو تو اقبل ان تقولوا" کی مجسم تفسیر بن جاتے ہیں۔ جہاں اسے گھونٹ شروع کیا اور رستۂ اخلاق و تزکیۂ نفس کی نیا پڑی۔ سرکش سے سرکش اور ظالم سے ظالم آدمی اسے پیتے ہی رحم کا پتلا اور خدا ترس بن جاتا ہے۔ اس کے اثر سے بڑے بڑے غرور اور خود پسند سرنگوں ہو گئے ہیں۔ ہزاروں سوسا اس کی بدولت بیدلوں سے زندہ آگئے۔ سیکڑوں ہیرا ک پانی میں ڈوبنے سے بچ گئے۔ اس کے صدقے میں ہیبتوں صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آواز میں وہ تیزی کہ بجلیاں ہونٹ چاٹیں۔ خیال آفرینیاں اس بلا کی کہ بوستان خیال کو مات کر دیں۔ زبانی بہادری کے یہ ٹھاٹھ کہ رستم و اسفندیار تھرا جائیں اور سنگرمزاجی یہاں تک کہ اگر ایک فوج بھی چڑھا لائے تو سر عقدِ زبین کے بوسے لے کر بھی اونچا نہ ہو۔ زبان سے سوائے صناعت کے کیا مقصود ہے کہ کوئی لفظ تو اخلاق سے گرا ہوا نکل جائے۔ تواضع کا یہ حال کہ ایک گنڈیری کے جب تک چار ٹکڑے کر کے بھائیوں کو نہ کھلا لیں خود نہ آئے۔"[1]

ان صناکوں کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں اور اس کامیابی کا بظاہر ایک سبب تو زبان و بیان کی شیرینی، عذوبت اور شگفتگی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے "معمولی" کرداروں پر لکھے گئے ہیں جو صرف ایک تہذیب اور ایک تمدن کی علامت ہیں۔ اسی لیے مصنف کو اپنے ظاہر کرنے کا موقع بہت کم ملا ہے۔ سب خاکے "بیانیہ" انداز کے ہیں لیکن اس میں صنعتی شخصیات بالکل سامنے نہیں آتیں۔

شاہد احمد جیسی "عہد ساز" شخصیت سے تعلق تو نہیں رکھتے لیکن جن لوگوں نے ترقی پسند تحریک کے ہندوستان گیر ہونے سے پہلے ہی ادبی شہرت و رفعت کی بلندیوں کو چھو لیا تھا ان میں شاہد احمد کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور "ساقی" کے ایڈیٹر ہیں۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار بلکہ صاحبِ طرز نثر نگار نہ صرف اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشاپرداز بلکہ "ادیب ساز" شخصیت ہیں۔ دلی کی خالص ٹکسالی زبان لکھتے ہیں اتنی سلیس با محاورہ اور رواں دواں کہ ان کے قلم سے جو ترجمے بھی

---

[1] دلی کی چند عجیب ہستیاں / ۴۸-۴۹ (۱۹۴۳ء)

ہوئے ہیں وہ اُردو میں اضافہ بن گئے ہیں۔ انھوں نے ترجمے کو بھی ایک فن بنا دیا ہے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اسکیچ بھی لکھے ہیں جو متفرق رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ "رتی کی چند شخصیتیں" اور "حلیم بیگ چغتائی" مظفوش کے شخصیات نمبر (مقصد قتل) میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ وہ خاکے "استاد بیخود دہلوی" اور "خواجہ حسن نظامی" پر علیحدہ شائع ہوئے تھے۔ یہ دونوں اسکیچ اُردو کے سرمایے میں اضافہ ہیں۔ ایسے دلچسپ اور ہمہ گیر خاکے جن میں کوئی شخصیت اپنے بھرپور رنگ و آہنگ کے ساتھ سما گئی ہو بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ پہلے ہی خاکے میں۔ شاہد احمد دہلوی کا حاشیہ مزاح بہت تیز ہے۔ وہ تاثرات میں ترتیب کا بھی لحاظ رکھتے ہیں اور تناسب بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں "سنجیدہ شوخی" یا "شوخ سنجیدگی" کا احساس ہوتا ہے۔ وہ نہ گدگدیاں کرتے ہیں نہ کلیلیں بھرتے ہیں نہ اغلاط سے کھیلتے ہیں نہ اسکیچ لکھتے ہوئے کسی شخصیت کو مسخ کرتے ہیں۔ ان کا مدعا اپنا اشتہار دینا یا دوسرے کا نام اُچھالنا بھی نہیں ہوتا۔ وہ اسکیچ کی نزاکت اور ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے ہیں اور بغیر بھٹکے یا بھٹکے ہوئے اپنے مشاہدات بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں سچائی کی کھنک اور بے تعصبی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ "بیخود دہلوی" اور "خواجہ حسن نظامی" کے اسکیچ ان کی قوت اخذ و گرفت کا بہترین ثبوت ہیں۔ ان کا بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ خود شاہد احمد دہلوی نظر نہیں آتے جہاں اپنا تذکرہ کرتے ہیں وہ بھی اور بڑی خندہ آگیز ہوتا ہے یا جہاں شخصیت کے مطالعے میں کسی اہم موڑ کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ احتیاط ہر شخص کے بس کی بات نہیں اور عام لکھنے والوں میں اسی کا فقدان ہے جس سے بہت سے اچھے خاکے خاک میں مل گئے ہیں۔

اسی ذیل میں ایک قابلِ ذکر نام غلام احمد فرقت کا بھی ہے جو "نارد" اور "ماوا" لکھ کر اپنی شہرت بوئے گل کی طرح پھیلا گئے ہیں پیروڈی لکھنے میں شاید ان کا "مصرع ثانی لکھ کی" کوئی سامنے نہیں آسکا۔ مزاح نگاری میں ان کا مخصوص رنگ ہے انھوں نے نثر و نظم دونوں پر ہاتھ مارا ہے۔ انھوں نے اسکیچ زیادہ تعداد میں تو نہیں لکھے اور جو لکھے ہیں وہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں لیکن "ماوا" اور "نارد" میں اچھے خاکے کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے مجموعہ مضامین "صید و صید" میں بعض خاکے شامل ہیں ان میں حسرت موہانی پر ان کا اسکیچ بہتر ہے۔ حسرت ہماری ادبی و سیاسی تاریخ میں نادرِ روزگار شخص تھے۔ ان پر فرقت نے نئے نرالے انداز سے قلم اٹھایا ہے اور حسرت کی پہلودار زندگی کا جیتا جاگتا مرقع پیش کر دیا ہے۔

> "سنہ ۴۶ء یا ۴۷ء میں ایک دن میں نے (مولانا حسرت موہانی کو) دیکھا کہ اپنی آبادی جہاں پرانی کتابوں کی دکانیں ہیں وہاں مولانا ایک بچہ والے سے کرایے پر بحث میں مصروف ہیں۔ اس روز ان کے سر پر بجائے ترکی ٹوپی کے سفید قراقلی تھی..... اس کے نیچے ٹپکے تھے جو حجام کی حسرت میں گرتے گرتے لاوارثوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر اُتر آئے تھے۔ اس کے نیچے ایک کوٹ تھا جو زکوں کی اس صدی میں پہن کر تھا کہ انھوں نے اپنے یہاں سے اسے متروک کیوں قرار دیا اور اس کوٹ کی بدولتی کے لیے انھوں نے دو ایک جیبوں کا اور اضافہ کر لیا تھا تاکہ جس وقت کتب فروش ان کی لکھی ہوئی غالب کی شرح کے نسخے انھیں واپس کریں تو ان کے ہاتھ مصروفیت سے بچے رہیں..... ان کا خیال تھا کہ چوک سے اپنی آبادی اور اپنی آبادی سے چوک تک

وہی تین چار آنے سواری کرایہ ہے جو جنگ چھڑنے سے پہلے تھا چنانچہ اپنے نوش خو ہیئر
مکلے میں مولانا کے والے سے فرما رہے تھے "میں دیکھتا ہوں کہ تم رنگ بیرنگی کا
شکار ہوتے چلے جا رہے ہو۔ بڑے شرم کی بات ہے" اور یکہ والا اپنی ہیرا پھیری چلانے
میں اس طرح مصروف تھا کہ گویا یہ ساری باتیں کسی اور سے ہو رہی ہیں۔۔۔۔[1]

مولانا حسرت موہانی ۱۹۵۱ء میں ایک بار لاہور پہنچے۔ کچھ واقفین ان کے استقبال کو اسٹیشن پر آئے۔ انھوں نے مولانا کا شہرہ تو بہت
سنا تھا دیکھا کبھی نہ تھا۔ وہ سیکنڈ اور فرسٹ کلاس میں ڈھونڈتے رہے اور یہاں:

گاڑی کے بالکل کنارے تھرڈ کلاس کا ایک ڈبہ لگا ہوا تھا جس میں چھت تک پنجاب
کی دیہاتی عورتیں اور مرد بھرے تھے اور پرے دھکا پیل کے ساتھ اتر رہے تھے۔ اسی
میں سے ایک صاحب گھٹنے کپلاتے اور دھکے کھاتے اترے جن کی وضع قطع پر لکھنؤ ٹپیکل
سفید بے داغ داڑھی اچھے سے پڑی ہوئی مخمل باریک بڑی بڑی آنکھوں پر ایک سلیٹی شیشوں والی
عینک جس کا فریم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ ہمارا بھی تصور معاف کرا دے کیونکہ
کھال اترنے کے بعد فریم کی ریڑھ کی ہڈی نے نہ رہے جانا کہنا شروع کر دیا تھا۔ الغرض
حضرت نوح علیہ السلام کے ہیرے کی مچھری جس کا کپڑا اپنا سیاہ رنگ چھوڑنے کے بعد
عام دنیوی رنگوں سے مختلف رنگ اختیار کرنے پر کمر بستہ تھا بغل میں ایک بستر جسے سستی
باندھ کر پھانسی دے دی گئی تھی۔ ایک عبارت گزار لوٹا جس کے ماتھے پر بار بار خانہ کعبہ
کی زیارت کرنے کے سبب سیاہ گھٹے پڑ گئے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی جو کسی زمانے
میں تو ہو گی خوبصورت چھڑی، ہی ہو مگر اس وقت تو وہ تازہ کی ڈنڈی معلوم ہونے لگی تھی۔ تھوڑی
دیر بعد جب وہ اپنا تھرڈ کلاس کا زرد ٹکٹ لیے پلیٹ فارم سے باہر نکلے تو نہ جانے کیوں ان
کے گرد مجمع ہو گیا اور کچھ نے بستر کچھ نے تھیلا ان سے لینا شروع کیا مگر اس پر ان کی
من مانی کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔۔۔۔[2]

ظرافت کے اسلوب میں اچھا خاکہ لکھنے کی بڑی گنجائش ہے۔ اس کا حامل مزاح بھی نہیں ہے۔ وہ واقعات ہی سے نہیں ہیئت اور تصور سے بھی مزاح پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی قوت مشاہدہ بڑی اچھی ہے اور لفظوں کے تقصی کے علاوہ بے نفسی بھی ہے۔

(۳)

اب ہم بالکل جدید عہد کے خاکہ نگاروں کی طرف آتے ہیں۔ یہ لوگ مغربی علوم اور طرز فکر سے آشنا یا متاثر ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے

---

[1] صید و صوف / ۲۷-۲۸ [2] ایضاً / ۳۵-۳۶

خاکے اس صنف کے تجربات ہیں بعض اہم نئی اور بنیادی سمتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں بعض لکھنے والے ایسے بھی ہیں جنھوں نے کبھی خاکہ لکھا ہے جیسے عصمت، کچھ وہ ہیں جنھوں نے صرف خاکے ہی لکھے ہیں مثلاً محمد طفیل۔ لیکن سب کا رنگ الگ ہے اور اچھا ہے، جی خوش اور اچھوتا ہے۔ ہم نے اس جائزے میں نہ زیر دعویٰ کیا ہے نہ اسے لکھتے ہوئے ارادہ یہ رہا ہے کہ اسے تمام سرمایے پر محیط اور حاوی کہا جائے یا کیا جائے۔ پھر بھی جتنا قابل ذکر سرمایہ ہے اس کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ اگر تمام سرمایے پر بہت ہی تفصیل سے اور فنی اعتبار سے تنقید کی جاتی تو یہ مضمون کتاب بن سکتا تھا۔ ہم نے ایسا خطرہ مول لینے سے قصداً احتراز کیا ہے۔ بعض کتابیں ان سطور کی تحریر کے وقت دستیاب نہ ہو سکیں مثلاً چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ" مجبوراً اس پر چند تعارفی سطریں لکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ ایک آدھ کتاب ایسی تھی جو قابل ذکر نہ تھی "مثلاً" چھوڑ دیے ——— اسے قصداً نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ تمام رطب و یابس لکھ کر اس جائزے کو طویل کرنا مقصود نہیں۔

ہم نے اپنی رائے کے اظہار میں حتی الوسع آزاد رہنے کی کوشش کی ہے اول تو کوئی ایسی بات نہیں تھی جو "نرا دعویٰ" ہوتا اور جسے بہ دلائل ثابت نہ کیا جا سکے اور جہاں کسی رائے کا اظہار کیا ہے وہاں روایت، خوف و طمع اور صلہ و تحسین کی پروا کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ جن احباب کو ناگوار گذرے ان کا تنگ گذار ہوں اور جنھیں مسرت ہو ان سے شرمندہ ——— کیونکہ دونوں کا استثنا میرے منشا کے خلاف ہوگا۔

بہر حال اس عہد میں جن حضرات کے نام سامنے آتے ہیں ان میں چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، منٹو، محمد طفیل، فکر تونسوی اور معین الدین دردائی قابل ذکر ہیں۔

چراغ حسن حسرت نے "مردم دیدہ" کے نام سے چند خاکوں کا مجموعہ بہت زمانہ ہوا شائع کرایا تھا۔ یہ کتاب کئی سال پہلے ہماری نظر سے گذری تھی اور اب اس کے نقوش ذہن میں اتنے دھندلے رہ گئے ہیں کہ ان کی بنیاد پر کوئی واضح تنقید نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی یہ اچھی طرح یاد آتا ہے کہ "مولانا آزاد" پر انھوں نے اچھا اسکیچ لکھا تھا۔ ان کی تحریر میں شگفتگی اور بانکپن بھی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ادبی وقار اور متانت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتے "سندباد جہازی" کے قلمی نام سے انھوں نے بہت کچھ لکھا اور حال ہی میں ان کے فکاہیہ کالم "صرف و حکایت" کا انتخاب بھی لاہور سے چھپ چکا ہے۔ وہ اردو کے قابل فخر صحافی اور مزاح نگار تھے۔ اپنا منفرد اسٹائل رکھتے تھے۔ مشاہدہ اور مطالعہ وسیع تھا۔ "مردم دیدہ" میں انھوں نے جن شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں۔ وہ بھی ان کی شوخ نگاری اور ظرافت کا اچھا نمونہ ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں اخلاق احمد دہلوی کے لکھے ہوئے چند خاکوں کا مجموعہ "اور پھر بیاں اپنا" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔ یہ کتاب تلاش کے باوجود دیکھنے کو نہ مل سکی۔ اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیسی ہے۔

اردو کے مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی نے اپنے منفرد انداز میں بعض شخصیتوں کے مختصر لیکن دلچسپ خاکے لکھے ہیں جو "شیش محل" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی انھیں کبھی "تان کر بی" خاکے کہا جا سکتا ہے کیونکہ بعض بے حد مختصر ہیں اور چند سطروں میں ختم ہو گئے ہیں۔ طویل ترین "خاکہ" بھی تین صفحوں سے آگے نہیں بڑھا۔ بعض صرف "ایک جھلک" "ایک مرقع" یا "دل لگی" کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا مقصود ہنسنے ہنسانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس مجموعہ میں ایک سو بارہ شخصیات کے نام آگئے ہیں لیکن ان میں بارہ بھی ایسے نہیں جو "اسکیچ" کی تعریف پر پورے اترتے ہوں۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شوکت نے بعض

شخصیتوں کی بڑی دلچسپ جھلکیاں دکھائی ہیں اور اپنی ذہانت اور مشاہدے کی گہرائی کا ثبوت دیا ہے۔ کبھی وہ صرف واقعہ نگاری کرتے ہیں، ان کا طرزِ نگارش ہمیشہ تجزیہ رہا ہے اور اس میں وہ غیر معمولی طور پر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کبھی الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں۔ اکثر ان کا انداز بیان ہی خندہ آور ہوتا ہے۔ کتاب "شیش محل" یقیناً دلچسپ ہے۔ اس میں زندگی کی ایک اور زندہ دلی کی رمک ملتی ہے۔ بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کھلے دل سے لکھی ہے۔ صاف گوئی کے باوجود دلچسپ اور ایثار ہے کچھ خاکے ایسے ہیں جن کا پھر یہ لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو ان لوگوں سے ملا ہو اور انھیں خود قریب سے دیکھ چکا ہو۔ مثلاً الہ آباد کی مشترکہ تہذیب، سالک و مولوی، جوش، رفیع احمد خاں، آرزو، صدیقی اور ساغر نظامی کے خاکے "یقیناً دلچسپ ہیں اور ان شخصیات کی عام زندگی اور اخلاق و طبع کے بعض دلچسپ پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ دلچسپی کے لیے چند اقتباسات دینا مناسب ہوگا امید اسٹھی کے حال میں چند سطریں لکھی ہیں:

"کلام استادانہ ہے، فن کے ماہر ہیں مگر گفتگو کریں تو کچھ میں نہ آئے۔ شعر خواہ کسی بحر کا ہو پڑھنے مثنوی کے انداز سے ہیں۔ نے سمجھ میں آجاتی ہے، الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی گفتگو کچھ لینا ہے تو اس کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر شکلت ہیں ٹوٹے ہوئے الفاظ فرما رہے ہیں ورنہ عام طور پر گفتگو صرف یہ کچھ میں آتی ہے کہ گویا لقما بھی لقمن کر کے کسی حوض میں ڈوب رہا ہے۔"

یا اسی طرح امین سلونوی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"مشاعرے میں جس سنجیدگی سے آپ محل اشعار کی داد دیتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے کسی شاعر نے کوئی محل شعر پڑھا، تمام مشاعرہ خاموش رہا صرف امین صاحب جھوم جھوم کر داد دے رہے ہیں، ہائے ہائے پھر فرما رہے ہیں۔ آپ نے صنعت تاخیل فضلیں پیش کی ہے شاعر سلام کر رہا ہے اور محل شعر بار بار پڑھے جا رہا ہے۔ اب کیا مجال کہ امین صاحب کو کوئی خاموش کر دے۔ جس کسی نے اشارے سے منع کیا امین صاحب نے اسی کی طرف شاعر کو متوجہ کر دیا۔ دیکھیے آپ بھی داد دے رہے ہیں۔ حضرت یہ تو اشعار ہے، شعر کا نقص مقیاس السعود بنا جا رہا ہے۔ شاعر اس تماشے پر کہ کلو بھی مان رہا ہے اور سلام بھی کر رہا ہے۔"

اور بھی چند ایسے ہی دلچسپ خاکے "شیش محل" میں ملیں گے مثلاً ساغر نظامی کے تعارف میں پہلی ملاقات کے بعد شوکت نے اس طرح لکھے ہیں:

ساغر: "شوکت صاحب! یہ نظم بھی ایک کتیہ ہے کہ معری کی خرافاتیت شاعری لطافت نائیوں کے صعوبات کا ایک بھی انبار ہوتی ہے۔"

شوکت: "مگر ساغر صاحب میرے لیے تو یہ حیرت انگیز ہے کہ آپ شعر بھی کہہ لیتے

ہوتے ہیں اور میرے جذبات نقدان اظہار کے باوجود جانگداز دل بھی کہہ رہے
ہیں ع۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

ساغر: "یہ دراصل آپ کی فطرتی طبیعت تھی کہ میں گنبد مینا کے سریں سایے کو چھوڑ کر
عروس البلاد کے مجلہ شعر انگیں میں نغمہ آرا ہوں"

داڑھی پر ہاتھ پھیر کر موحوش کیا "ایجاز کفر کا بیزبان ہے"

چوڑی دار پاجامے کی چرٹیاں مرتب کرتے ہوئے فرمایا "کس قدر شعر یہ دلکش بات کہی ہے
آپ نے۔ ایک بیکدۂ رقصاں و رزاں کا کیف اس ایک جملے میں محبوس ہے"

مختصر یہ کہ دو قاموسی پاگل ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ایک آدھ ملاقات تو ایسی طرح ہوئی کہ دونوں اپنی اپنی کہتے تھے اور سمجھنے کا دونوں طرف ذکر نہ تھا۔ پھر زبانے تک پہنچے تو ماوری زبان بولنے کی کوشش کی مگر ہر ملاقات میں ساغر صاحب کوئی نہ کوئی ہمارے سامنے مرورلاتے رہے کبھی "ردِ عمل" کبھی "نئے تقاضے" کبھی کچھ نہیں تو بات بات پر "ساحر کے ساحر" کی رٹ۔ مختصر یہ کہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کی گفتگو میں لغات پڑھ جائے"

شوکت کی تحریر بھی گفتگو جیسی ہوتی ہے۔ وہ مزاح کو الفاظ سے مصور کر دیتے ہیں۔ ان کے قلم میں بے ساختگی اور بہترین ادبیت بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ کاش شیش محل میں ایک سو بارہ ماموں کی جگہ صرف بارہ "خاکے" ہوتے جو پوری تفصیل سے لکھے گئے ہوتے جن میں ایک طرف شوکت کا اپنا انداز نگارش ساری رعنائی و زیبائی کے ساتھ جھلک رہا ہوتا دوسری طرف شخصیتوں کے بعض دلچسپ پہلو، ظریفانہ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ عیاں ہو گئے ہوتے۔ شوکت اب "بیسیار نویسی" کا شکار ہو گئے ہیں۔ انھوں نے مجبور ہو کر قلم فروشی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ لیکن "پیشے میں عیب نہیں" اگر وہ اس کے ساتھ ہی بعض "غیر سرسری" قسم کی چیزیں بھی لکھتے رہیں۔

مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے مگن ہے ایک آدھ سکیچ اور بھی لکھا ہو لیکن "دوزخی" ان کا ایسا کارنامہ ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ ضروری نہیں رہتا کہ ان کے لکھے ہوئے دوسرے خاکوں کی چھان بین یا خواہش بھی کی جائے۔ یہاں بھی عصمت نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہے۔ مختصر ہونے کے باوصف اس کی خوبی یہ ہے کہ زبان بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ اسے پڑھ کر دل میں ایک خلش سی ہونے لگتی ہے اور دماغ کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔ یہ ایک اردو کے ادب العالیہ (کلاسکس) میں شامل کیے جانے کے قابل ہیں۔ اس میں نشتر کی سی تیزی ہے۔ طنز کی ایسی بھرپور تلخی اور خلوص کی ایسی پُرسوز شدت اردو کے کسی ایک میں نہیں مل سکتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لفظ لفظ میں خون کے آنسو جم گئے ہیں۔ صاف اور سہل زبان دل کو ہلا دینے والا لب و لہجہ اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی سنسنی ——— عصمت نے جو تاثر پیدا کرنا چاہا ہے اس میں وہ اپنے مقصد سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی ہیں۔ اچھے خاکوں کی گنتی ہی مختصر فہرست بنائی جائے "دوزخی" اگر اس میں شامل نہیں تو فہرست یقیناً نامکمل رہے گی۔

"دوزخی" پڑھ کر عظیم بیگ کی شخصیت ہی ہمارے سامنے نہیں آتی ان کے فن سے بھی بعض ایسے پردے اٹھ جاتے ہیں

جو فن کار کا رشتہ اپنے فن سے ظاہر کرتے ہیں۔ تنقید کے جدید نظریات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ فن کا نفسی و جمالیاتی تجزیہ کر کے تلاش کی جائے کہ اس میں خود فن کار کہاں تک تحلیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ادب کے روپ قول سے آج تک ایسے سلسلہ اور نہ نشیں نشتوں کی سُراغ لگانے کی کوششیں ہمارے ناقد کرتے رہے ہیں مگر عصمت نے اس خاکے میں بہت ہی مختصر طور پر جس طرح مصوّر بیگ کے آرٹ کا اور ان کے فن کے نفسی رشتوں کا سُراغ دیا ہے وہ بڑے سے بڑے تنقیدی تجزیے میں بھی ممکن نہ تھا۔

فنی اعتبار سے یہ اسکیچ بے حد عمدہ نمونہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنفہ کی گرفت (APPROACH) قطعاً منفی ہے لیکن اس سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ سراسر مثبت ہے ——

"ایک ایک نقطہ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھلی جاتی ہے ساہ بال بھرے بھرے وہ خوار و دکھوں ڈولی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں۔ وہ اندھیرا ناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح لہراتے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال۔ وہ پیلی نیلاہٹ لیے ہوئے بلند پیشانی۔ پژمردہ اداس ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے ناہموار دانت اور وہ ماتھا سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسی نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ پتلی پتلی کمزور سی ٹانگیں جن کے سر پھورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر کے دیکھ کے ڈر کی وجہ سے ہر مرگ ان کے سرہانے کی طرف سایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے ہنرے جیسے سینے پر دھڑکن کا شبہ ہوتا تھا۔ کیچے پر ہزاروں گہرے جھریوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چھلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔" [1]

"وہ جھوٹے تھے ان کی زندگی جھوٹی تھی سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو رُلا دیا اور سارے جگ کو رُلا دیا۔ وہ ایک حضرت تھے جو عذاب دنیا میں کرنا نازل ہوتے تھے۔ اب دوزخ کے سامان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار کو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ شرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر بہر کھائے اور تیر انداز دں کو کر کے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تیخ نظر سے بڑی ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی بل کھا کر ہنسے یقینی ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی، مکھیوں کے غولوں سے اس کی گردن ڈب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم

---

[1] چوتھی لکیر، ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۲، ۱۴۳

چہرا اجاڑ ہو گا مگر وہ ہنس رہا ہو گا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی۔ نیلے ہونٹ لمحے سے پل سہے ہوں گے مگر کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ [1]

یہ اقتباس ذرا طویل ہو گیا لیکن بے اختیار دل چاہتا ہے کہ پورا خاکہ ہی نقل کر دیا جائے۔ بعض چغتائی اردو کی بہترین افسانہ نگار ہیں ان کی "حقیقت نگاری" سے بعضوں نے تو پناہ مانگی ہے لیکن اگر وہ "دوزخی" کے سوا اور کچھ نہ لکھتیں تب بھی ان کا نام اردو میں ہمیشہ زندہ رہتا۔ مغربی زبانوں کا ادب پڑھ کر جو مبہم سی خلش احساس کمتری کی اُردو والوں کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے وہ "دوزخی" جیسے مضامین پڑھ کر دور ہو سکتی ہے۔

سعادت حسن منٹو کا قلم بے محابا چلتا ہے۔ وہ جس موضوع پر سوچتا ہے اپنا ذہنی نقطۂ نظر عام روش سے قدرے مختلف رکھتا ہے۔ اس نے سماج کے ایک "نادیدہ درگاہ" طبقے (ہیجڑا) کو اپنا موضوع بنایا اور کامیاب افسانے لکھے۔ ادب میں جس چیز کو فحش کہا جاتا ہے اس پر بے تکان لکھا اور اسے بھی "آرٹ" بنا دیا۔ منٹو کی ہر فن میں بہت سے ناپختہ ذہن یاوہ گوئی اور فحش نگاری پر اُتر آئے مگر

"تری تقلید میں کبک دری سے تھرکیں کہاں"
چلا جب ہنس تو الٹی انساں کی چال اس کا بھلا بگڑا

اسی طرح منٹو نے جو خاکے لکھے ان میں افسانوی فضا اور داستان طرازی کا انداز اختیار کیا ہے۔ خاکہ نگاری میں یہ منٹو کا نیا اور کامیاب تجربہ تھا جس نے اردو ادب کو نیا لب و لہجہ عطا کیا۔ ان خاکوں میں جو "گنجے فرشتے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں سچائی کی کھنک لیے کھرا بین، مشاہدے کی گرفت اور انداز بیان کی ندرت عہد حاضر میں سب سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ ان میں کثیر ابہام، اشاریت اور افسانوی ٹچ (TOUCH) سے بھی کام لیا گیا ہے ——— یہ خاکے نہ تو نری "قصیدہ خوانی" ہیں نہ محض "ہجو" ——— وہ صرف اپنے "اشتہار یا دلچسپی" کے لیے بھی نہیں لکھے گئے۔ ان کا انداز ایسا ہے کہ ایک زندہ شخصیت کو مرکزی کردار بنا کر اس کے حالات اور واقعات سے ایک افسانے کی تکمیل کی گئی ہو۔ موضوع بھی یہ نہیں کہ صرف ادیب اور شاعر ہی ہوں۔ ان میں لیڈر (جناح)، شاعر (اختر شیرانی)، افسانہ نگار (عصمت)، اداکار (شیام)، اداکارہ (نسیم)، اور صحافی (ریاض، آغا شورش) بھی شامل ہیں۔

منٹو ایک افسانہ نگار تھا۔ اس کے پاس "خیالات" کی کمی نہیں تھی۔ ان کی افسانوی ترتیب کے فن سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا۔ حسب موقع اور حسب ضرورت تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت بھی اس میں تھی۔ پھر اس نے ایسی ہی شخصیات کا انتخاب بھی کیا جن میں وہ ندرت و انفرادیت کے ساتھ کچھ "طلسماتی جھلکیاں" بھی دیکھ سکے اور دکھا سکے۔ اس لیے یہ خاکے ایک افسانے کی طرح آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔ قاری کے ذہن میں تحیر اور کبھی "نتیجہ" پیدا کرتے ہیں۔ کبھی اشاریت اور ابہام سے ان میں "سکتہ" پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر یہ ایسی منزل پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں جہاں پڑھنے والے کے ذہن میں کوئی واضح تصور تو نہیں ہوتا لیکن مختلف انداز کے بہت سے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یہ "غیر" خوبصورت، خوش وضع اور گڈمڈ ——— وہ اقلیم اپنے ذہن میں ایک ترتیب سے بنانا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ پوری تصویر تیار ہو جاتی ہے۔ اس کے تمام خطوط و خال روشن ہو جاتے ہیں اور وہ جو کچھ کسی شخصیت میں دیکھنا چاہتا تھا دیکھ لیتا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال "تین گولے"

---

[1] پوٹین / ۱۴۷

——— میراجی کا خاکہ ہے جس میں ہوبہو اشاریت اور ابہام ہے جو میراجی کی شخصیت اور شاعری میں تھا۔

کتابی صورت میں آنے سے پہلے منٹو کے یہ خاکے جب مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے تو ان پر کچھ لے دے بھی ہوئی۔ اس پر کتاب کے آخر میں منٹو نے بڑا دلچسپ محاکمہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"میں ایسی دنیا پر ایسے مہذب ملک پر اور ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ رسول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور شخصی لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔

میرے اصلاح خانے میں کوئی دھلائی نہیں، کوئی گھما گھما کر پھیلا کر سکھانے والی مشین نہیں ——— میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا ——— آخرت کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اس کے منہ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑ سکتا۔ میراجی کی صفات مجھ سے منسوب نہیں ہو سکتیں اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے ——— اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور ہم نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔"[1]

یہی ان خاکوں پر سب سے اچھا تبصرہ ہے۔ یوں تو منٹو نے بہتے فرشتوں کا "مونڈن" کیا ہے اس میں فنکارانہ سلیقہ دکھایا ہے لیکن میراجی، عصمت، شیام اور بابو راؤ پٹیل کے سچے قدر داتوں کی جھلکیاں ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جو خاکے لکھے گئے اور کتابی صورت میں شائع ہوئے ان میں "نقوش" کا "شخصیات نمبر" کئی حیثیت رکھتا ہے جو رسالہ سائز کے ڈیڑھ ہزار سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اور بے حد کامیاب کوشش ہے اور "نقوش" کے مرتب محمد طفیل کا ایسا کارنامہ ہے جو انہیں دنیائے ادب میں آبرومند رکھنے اور عاقبت میں بخشوانے کے لیے کافی ہے۔ "نقوش" کا آٹھواں شخصیات نمبر نکال کر انھوں نے اردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ کو پچاس برس آگے بڑھا دیا ہے اور اس صنف ادب سے اردو کا دامن مالا مال کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض شخصیات جو ہر لحاظ سے اہم تھیں اس میں شامل نہ ہو سکیں اور بعض جو زیادہ اہم نہ تھیں داخل ہو گئیں لیکن مرتب کا قصور نہ قابل صورت میں ہے نہ دوسری حالت میں ——— اس نمبر میں سینکڑوں خاکے شامل ہیں جو اردو کی مشہور شخصیتوں پر مشہور ہی شخصیتوں نے لکھے ہیں۔ ان میں اکثریت ایسے خاکوں کی ہے جو ہر لحاظ سے اعلیٰ درجے کے ہیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں اپنے محل پر آچکا ہے اور بعض اچھے خاکے یہ ہیں۔ مہدی افادی پر عبدالماجد دریابادی، سرکیفی دہلوی پر رحمت یلملی، رشید احمد صدیقی پر آل احمد سرور، نواب عماد الملک پر ڈاکٹر عبدالحق، حبیب الرحمٰن شروانی اور صائل دہلوی پر مالک رام اور مالک رام پر مختار الدین آرزو۔ یہ سب کسی نہ کسی اعتبار سے معتبر ہیں اور ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ آنے والی نسلیں ان صفحات پر اپنی سینکڑوں محبوب شخصیتوں کی سیرت اور کردار کے جلوے دیکھیں گی یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جو اشتہار زمانہ کے ساتھ اپنی قدر و قیمت میں گراں

---

[1] گنجے فرشتے / ۳۴۸ (جنوری ۱۹۵۵ء۔ لاہور)

ہوتی چلی جائے گی۔ اُردو سے محبت کرنے والوں کو ادارۂ نقوش کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے سستی اور جاسوسی بازاری "ادب" کی ترویج کے زمانے میں ادب کی بہترین سنجیدہ قدروں کو فروغ دینے کا عزم کیا ہے اور بڑی جواں مردی و ثابت قدمی سے اس عہد کو پورا کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علمی و ادبی ادارے نے دس سال کی مختصر سی مدت میں ادب اردو کی جتنی خدمت انجام دی ہے درس پانچ اداروں نے مل کر بیس پچیس برس کی مسلسل تگ و دو کے بعد اس کا دسواں حصہ بھی انجام نہ دی ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ خاکہ نگاری سے "نقوش" کے مرتب محمد طفیل کو خصوصی دلچسپی ہے جس کا عملی ثبوت یہ شخصیات نمبر ہے جو ان کے لکھے ہوئے کئی سات خاکے "صاحب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان خاکوں پر نہایت جامع اور مختصر تبصرہ نیاز فتح پوری نے یوں کیا ہے:

"یہ صرف چہرہ نمائی نہیں بلکہ گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی ہے جس میں ہلکے سے مزاح کا نشتر، انگریزی کا (PARADOX) اور جملہ کی چٹکیاں بھی کچھ شامل ہیں۔"

یہ تبصرہ محض "برائے تبصرہ" نہیں بلکہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ میں اس میں اضافہ تو کیا کر سکتا ہوں ہاں تشریح و تفسیر کے طور پر چند الفاظ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

محمد طفیل بول چال کی زبان لکھتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے لکھتے نہیں باتیں کرتے ہیں۔ عام گفتگو کا انداز انھیں اتنا پسند ہے کہ بقول شخصے "الہیاء" یعنی وہ "مجھ ناک" "حتیٰ پڑوسیت" وغیرہ الفاظ بھی نہایت سلیقے سے استعمال کر جاتے ہیں (جن میں با جماعت شخصیت ہوتی ہے) زبان کی اسی بے تکلفی نے ان کا اسٹائل دلنشیں اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ الفاظ تو جان نہیں اس کی جلد ہوتے ہیں اگر کسی ملک کی زبان اور قوت اظہار و ابلاغ اس کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی تو خ بیانی اور دلچسپ گفتاری ایک ایک ملک کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ محمد طفیل کی تحریریں اتنی بھلی ہوتی ہیں کہ ان میں لکھنے والے کا ذہن صاف نظر آتا ہے۔ وہ جہاں سے چاہتے ہیں بات کو شروع کر دیتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں ختم کر دیتے۔ خاکے (ادب لطیف (فوٹ لٹریچر) کے ذیل میں آتے ہیں اور ان کے دامن کا ایک کونا مزاح سے بھی بندھا ہوا ہے۔ ان میں فلسفیانہ موشگافیوں اور "قاموسی عبارت آرائیوں" کے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی۔ خاکے کا بنیادی مقصد شخصیت کا اظہار اور تاثر کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے صاف، سہل، سلیس اور سادہ زبان ہی موزوں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اللہ بیگ نے چند کامیاب خاکے لکھے ہیں سب سے کہ آج ڈاکٹر عبدالحق کے لکھے ہوئے اسکیچ اُردو کا سرمایۂ نازش ہیں اور یہی باعث ہے کہ رشید احمد صدیقی کا ہر اسکیچ "ایوب جاسی" کو نہیں پہنچتا۔ محمد طفیل نے اسکیچ کی تکنیک "ترتیب یا بناوٹ" کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ اس میں وہ فلم کی طرح واقعات کی ترتیب کرتے ہیں اور شوکت تھانوی کے انداز میں بیانیہ (NARRATIVE) اسلوب استعمال کرتے ہیں، حضرت اللہ کی طرح صرف زبان و بیان ہی سے نہیں بلکہ واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ رشید صدیقی اور عبدالحق کی جیسی انسانی شرافت و عظمت کی قدروں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ان کے اسکیچ نہ "احتساب" ہیں نہ "قصیدہ" ــــ وہ محض اسکیچ ہیں اور اسی حیثیت میں کامیاب ہیں۔

یہ تو فن اور اسلوب کا حال ہے۔ اب ان کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھیں اپنے خاکے کی بنیادی صفات کا علم ہے۔ اسی لیے وہ ٹیکمیرے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور ہر کمزوری کو لا تماشائے نہیں لاتے۔ خاکہ بھی ایک طرح کا "فوٹو" ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کارٹون چند خطوط اور رنگوں سے بنتا ہے اور خاکہ چند واقعات اور الفاظ سے۔ "کارٹون" میں اگر بنیادی

خط و خال مسخ کر دیے جائیں تو شکل و صورت کی شناخت باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح خاکے میں اگر شخصیت کی انفرادیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ خاکہ نہیں رہ جاتا۔

محمد طفیل نے سات خاکے لکھے ہیں اور یہ سب مشہور شخصیتوں پر ہیں۔ ان کرداروں میں رنگا رنگی اور تنوع ہے۔ ان شخصیات میں بہت نکھری ہوئی انفرادیت ہے اور ان کی کمزوریاں بھی بڑی "توانا" قسم کی ہیں۔ محمد طفیل نے ان شخصیتوں کے مزاج اور ان کی نفسیات میں ڈوب کر لکھا ہے اور اس طرح پیش کیا ہے کہ ہم شگفتگی محسوس نہیں کرتے۔ منٹو اردو کا منفرد افسانہ نگار ہے۔ اس کی "انسانیت" میں شخصی کردار کی صلابت کچھ سطحیت آگئی تھی۔ انسان کو کبھی اپنے کمال کا احساس بھی لے ڈوبتا ہے۔

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی
ما را خراب کردی و خود مبتلا شدی

یہی معاملہ منٹو کے ساتھ تھا۔ اپنے کمال کے احساس کے ساتھ اسے یہ بھی تکلیف دہ اندازہ تھا کہ اپنے زمانے میں وہ ایک اجنبی کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ خصوصاً جب وہ بعض نا اہلوں کو بیش و عشرت سے ہمکنار دیکھتا تھا تو اسے اپنی محرومی کا اور بھی کرب انگیز احساس ہوتا تھا۔ عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

وَمَا قَتَلَ الْاَحْرَارَ کَالْجَهْلِ بِالْفَتٰی
وَاَحْیَا الْفَتٰی لُبٌّ اِلَی الْمَالِ وَاقِعُ

یعنی احساس رکھنے والا ذی عقل انسان نعمتوں میں رہ کر بھی ایک طرح کی محرومی اور تشنگی پاتا ہے جب کہ جاہل لوگ بدبختی و شقاوت میں بھی مگن رہتے ہیں۔ یہی مضمون فارسی کے ایک جدید شاعر امیر فیروز کوہی نے کیا جو اردو نظم کیا ہے ؎

چگونہ مردم آگاہ شاداں باشند
کہ شادمانی ہر کس بقدر غفلت اوست

بہر حال یہ انسانیت یہ احساس کمال، یہ تشنگی، یہ محرومی اور یہ گمراہی مل کر منٹو کی شخصیت کو بناتے ہیں (اور یہی اس کی تخریب کے ذمہ دار بھی ہیں) محمد طفیل نے منٹو کا مطالعہ بہت ہی نگری نظر سے کیا ہے اور میری رائے میں اس مجموعے کا سب سے اچھا خاکہ یہی ہے۔ منٹو کی شخصیت اور اس کی بعض کمزوریاں جن لوگوں کی نظر میں ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ "عالم بالا سے منٹو کا خط" محمد طفیل کا گہرا نفسیاتی مشاہدہ ظاہر کرتا ہے۔

"اب منٹو میں یہ کمزوری راہ پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انھوں نے میرے افسانے کی بڑی تعریف کی ..... ایک دن ایک صاحب نے مکتبہ جدید میں انجن کھال ٹاکر بلا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے قے کرانے کے لیے کوئی دوا تجویز کی مگر اس نے دوائی پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں مرنا چاہتا ہوں۔ منٹو جو بھی تو میں بھی یہی سمجھا۔ میں نے کہا بھئی دوا پی لو۔ اس نے کہا "تم کون ہو؟" میں نے کہا "میں منٹو ہوں۔" اس نے اسی حالت میں کہا "بڑا اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا میں آپ کو بہت بڑا رائٹر سمجھتا ہوں۔" چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ انھیں دوائی پینا ہوگی۔ چنانچہ اس نے

دعا فی لی۔[1]

ان فاکوں میں نفسیاتی ژرف بینی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شخصیت کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے شخصیت کے آرٹ کی باریکیاں بھی واضح ہوتی ہیں۔ مثلاً منٹو کے افسانہ "موذیل" کا ذکر کیا گیا ہے جس سے افسانے کی "شانِ نزول" معلوم ہوتی ہے اور اس سے منٹو نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ افسانے کے کردار کس طرح گڑھا کرتا تھا۔

"ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے "موذیل" کی بات چھیڑی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے:

"وہ افسانہ میں نے تفریحاً ہی لکھا ہے۔ وہ بھی موذیل نے کہلوایا تھا۔ ورنہ مجھے افسانہ لکھتے وقت کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ قلم دوات سنبھالتا ہوں تو کاغذ کے اوپر ۸۹ لکھ دیتا ہوں پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے۔ افسانہ لکھنا ہے۔ افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں۔ کیا لکھوں۔ کیا لکھوں ——— تو ایک بات کچھ میں آتی ہے مثلاً "وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی"۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں۔ سگرٹ پیتا ہوں یا پیشاب کرنے چلا جاتا ہوں یا پان کھانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ واپس آکر وہ سے پوچھتا ہوں بتاؤ تو کیا کہتی ہے؟ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے میں لکھتا جاتا ہوں۔ وہ بدھو جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ البتہ میں اسے کنکھیوں سے دیکھتا جاتا ہوں کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے کیسی ہے۔ اس میں قابلِ غور کون کون سی باتیں ہیں۔ اس کے سینے کا ابھار کیسا ہے۔ وہ جب ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں یا نہیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اس کا انداز کیا ہوتا ہے۔ وہ جب مسکراتی ہے تو کہیں بائیں طرف کے تو نہیں سے جاتی؟ ——— یہ مرحلہ میرے لیے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل لوٹنے پر آتی ہے تو لوٹ گئی بھی ہے یا نہیں؟ بس اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصہ آتا ہے تو ان تمام کرداروں سے پوچھتا ہوں کہ بھئی اب بتاؤ تمہاری کیا کیا مرضی ہے؟ تم میں سے کس کس کو مار دیا جائے یا تم میں سے کس کس کو کیا کر دیا جائے۔ بعض کردار مرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جاؤ تمہیں زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر صاد کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لیے راضی ہوتا ہے اسے مار دیتا ہوں یا وہ سالا اور سالی جو کچھ بھی کرنا چاہے میں اسے مطلق نہیں روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موذیل کا پہلا فقرہ "نزو جس نے پہلی بار ——— بار برسوں میں پہلی بار رات کو آسمان دیکھا تھا" میرا ہے اور پھر آخری فقرہ "لے جاؤ اسے اس مذہب کہ "میرا ہے" باقی سب کچھ موذیل کا ہے۔"[2]

---

[1] صاحب / ۲۳-۲۴ [2] صاحب / ۲۵-۲۶

صاحب" میں بیشتر خاکے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ خاکہ نگار اپنے ہیرو سے محبت کرتا ہے یا نفرت، یا کسی دوسرے کے تاثرات و شہادات پڑھ رہے ہیں۔ یہ آخری کمال ہے جو کسی آرٹسٹ میں ڈھونڈھا جا سکتا ہے اور جو شاذ ہی ملتا ہے۔ محمد طفیل نے ہلکے پھلکے اسکیچ اور رنگین اسٹائل کے ساتھ شخصیت کے نقوش ابھارے ہیں اور شخصیت کے ساتھ اس کے فن کو بھی اہمیت دیا ہے۔ یہ ان کی ذہنی اور تخلیقی سوجھ بوجھ کا دوسرا ثبوت ہے۔ کسی فن کار کو اس کے فن سے علیحدہ کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔ اردو کے بہت سے خاکے اسی لیے ناکام ہو گئے کہ ان میں فن اور شخصیت کا امتزاج نہیں تھا اور امتزاج تھا تو سب منتشر تھا۔

پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو میں خاکوں کے جو مجموعے چھپے ہیں ان میں "گنجے فرشتے"، "صاحب" اور "یاران کہن" اسی ترتیب کے ساتھ بہتر ہیں کہ انہیں اور ان میں طرز نگارش کے اعتبار سے "صاحب" سب سے افضل ہے۔ اسے ایک بار شروع کرنے کے بعد ہاتھ سے رکھنا مشکل ہے اور ختم کرنے کے بعد طبیعت میں نشاط و انبساط و بالیدگی محسوس ہوتی ہے۔

خاکوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ "جلوے" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مصنف معین الدین دردائی صوبہ بہار کے رہنے والے اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ مذکورہ کتاب اوارۂ فروغ اردو لکھنؤ نے اور سطح سے بلند کر دیے پر چھاپی ہے۔ اس پر کوئی اسکیچ اعلیٰ درجے کا نہیں۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ مصنف کے لب و لہجہ میں کچھ تلخی اور عصبیت کارفرما ہے۔ گہری نظر سے دیکھنے پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مسئلے میں مجبور ہے۔ جس شخصیت پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اس کی کمزوریاں تلاش کی ہیں۔ یہ تلاش قابل اعتراض نہیں لیکن ان کمزوریوں کے پیش کرنے کا انداز "فن کارانہ" نہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں جو تلخی و تلخی ہے وہ ان کے پندار اور احساس کمتری کا پیدا کیا ہے۔ ان کی نظر میں وسعت اور ذہن میں کشادگی نہیں۔ وہ رواداری اور فراخ دلی سے واقعات پر تبصرہ نہیں کر سکتے، تنقید کرتے ہیں۔ خاکہ نگار کو یہ بتانے کا حق نہیں ہے کہ "کیا ہونا چاہیے"۔ اس کا فرض صرف "کیا ہے" کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے۔ "جلوے" میں ایک خاکہ "ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا بھی ہے جو پہلے رسالہ الحمراء (لاہور) کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کچھ لے دے ہوئی تو فاضل مصنف نے بعد میں کتر بیونت کر کے کتاب میں شامل کیا ہے۔ پہلے یہ دلچسپ تھا (واقعات سے بحث نہیں کہ صحیح تھے یا غلط) لیکن اب اس کی دلچسپی بھی جاتی رہی ہے۔

ابوالکلام صدیقی کے ساتھ دردائی نے بہت وقت گزارا ہے اور ان سے دوستی و یگانگی کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ ان شخصیات کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سب سے زیادہ ابوالکلام کے شخصی مطالعے کا موقع ملا ہے لیکن اتنی قربت کے باوجود ان کا جو خاکہ لکھا گیا ہے وہ سخت ناکام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس ناکامی اور ناکامی کا سبب مشاہدہ نہ ہو، شاہد و مشہود ہی ہو۔

اگر میری رائے اور شعور سے فاضل مصنف برا نہ مانیں تو انھیں آئندہ کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس کا معروضی مطالعہ کرنا چاہیے اور ہر قدم کی چھوٹی بڑی شعوری و لاشعوری حیثیت سے بلند ہو کر نرم و شیریں لہجے میں لکھنا چاہیے۔ لطافت و بیان ہو اچھے خاکے کا دو بنیادی اصول ہے ان سطروں میں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتی۔

آخر میں ایک مجموعے کا تذکرہ اور رہ گیا ہے جسے "عمدہ خیال صاحب" کے نام سے غالباً ۱۹۵۰ء میں محمد زکوٰۃ نسوی نے شائع کیا تھا۔

لہ۔ مجھے سب سے پہلا اعتراض تو عمدہ خیال کی ترکیب پر ہے جو غالباً حضرت بیخود موہانی کا تصرف ہے دوسرا (بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس میں ایک ان کا اپنا خاکہ اپنا ہی لکھا ہوا شامل ہے۔ آٹھ خاکے انھوں نے خود لکھے ہیں اور باقی دوسروں سے لکھوائے ہیں۔ لیکن ان میں ایک خاکہ بھی اس قابل نہیں کہ اسے "خاکہ" کہا جا سکے۔ سب لکھنے والوں نے "حق دوستی" ادا کیا ہے یا "فرض سنہ" کے طور پر لکھا ہے۔ یا ان کی حد سے بڑھی ہوئی انسانیت، فضول بزرگیات کی طوالت، شخصی مطالعے کا فقدان، بے کیف عبارت آرائی، قدم قدم پر بیرونی مداخلت اور "ٹرانسلیشن" کی بو، ہیں اور خاکہ لکھنے کے اصولوں سے ناواقفیت ہر سطر میں نمایاں ہے۔ بعض شخصیات کا انتخاب بھی شخصیت کی انفرادیت یا اہمیت کے پیش نظر نہیں بلکہ "صیاد و دوستی" سے یا پبلیسٹی سے کی خاطر کیا گیا ہے۔ کتاب کے یہی نقائص تھے جنھوں نے اسے مقبول عام نہ ہونے دیا ورنہ اور کیا سبب ہو سکتا ہے کہ رائی، خاکی، کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی جیسی شخصیتیں ہوں اور نکلا تو نسوی، کنہیا لال کپور، جوگندر سنگھ اور نکی الور جیسے لکھنے والے، پھر بھی کتاب کامیاب نہ ہو؟

یہ مجموعہ "سنہ دخال" جس زمانے میں لکھا اور چھاپا گیا تھا وہ سنی سنہ تحریک میں افراط و تفریط کا دور تھا۔ اب ذہنوں میں تھما و ٹھہراؤ پیدا ہو چکا ہے۔ خیالات کی پرچھائیاں اس انداز کی نہیں رہی ہیں۔ "پروگریسیو ایلمنٹ" قسم کی کتابیں بھی شائع ہونا بند ہو چکی ہیں۔ آج اگر نکلا تو نسوی اسکیچ لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں تو اب وہ زیادہ سلجھے ہوئے انداز میں لکھ سکتے ہیں لیکن انھیں اخباری صحافت کی تھکا دینے والی زندگی نے اپنا لیا ہے اور وہ اپنی پہچان سے غائب ہو کر صحافتی بزم میں نظر آنے لگے ہیں۔

میرا ارادہ تھا کہ اس مضمون کے آخر میں اردو کے ان تمام خاکوں کا بھی سرسری جائزہ لوں گا جو متفرق رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں یا جن میں کوئی ندرت و انفرادیت ہے۔ مایوس ہوا سرمایہ بہت ہے اور انصاف کا تقاضا بھی ہے کہ اسے نظر انداز نہ کیا جائے ——— لیکن یہ مضمون پہلے ہی خاصہ طویل ہو چکا ہے۔ اگر مزید جائزہ "دیا گیا تو تبصرہ کے نام سے کی طرح "سوئی دفتر" ہو جائے گا پھر یہ کام وقت کے ساتھ وقت طلب بھی ہے۔

(حاشیہ صفحہ سابق) اسانذہ کے کلام میں اس کی ستہ نہیں مل سکتی۔ صحیح ترکیب "خطہ خال" ہے اور خط کے اجزا سے ترکیبی اور ترک جنگ کا انداز اس ترکیب سے بھی طرح ہوتا ہے "نہ رنگال، گہر کہ ایک دم خال" اگر کہا آسانی شہرت سے لہریے دہنیں ہوتا "خطہ خال" کا تصور رکھتے ہیں کہ غزل کی قدیم روایات سے انحراف کرتے ہوئے "سنہ" سے اعراض کیا ہو جو محبوب کی تذکیر کا غماز ہے) بہر حال غالب نے یوں بھی باندھا ہے ؎

بلی فروش وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خطِ خال کہاں

اور واقعہ کہتا ہے ؎ بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت حسن زیبا را

(ن - ا - ف)

داغ دہلوی

تمکین کاظمی

اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں بخارا سے ایک خاندان ترک وطن کر کے سمرقند پہنچا۔ قاسم جان، عارف جان اور عالم جان نامی تین بھائی اس خاندان میں شامل تھے۔ سمرقند میں ان کی خاصی پذیرائی ہوئی اور ایک بھائی کو مزار الٰہی مل گئی مگر جب حاکم سمرقند کا انتقال ہوا تو ان لوگوں کو سمرقند چھوڑنا پڑا۔ اس نے وہاں سے نکل کر اٹک پہنچے جہاں مرزا محمد بیگ صوبہ دار نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی بیٹی عارف جان سے بیاہ دی جنھیں چار بیٹے نبی بخش خاں۔ احمد بخش خاں۔ الٰہی بخش خاں اور محمد حسین تولد ہوئے۔

مرزا محمد بیگ صوبہ دار اٹک کے انتقال کے بعد یہ خاندان دہلی پہنچا۔ اس وقت یہ لوگ خاصے متمول تھے۔ علاوہ مال اسباب کے خرچ نقد تیرہ ہزار اشرفیاں پاس تھیں۔ چنانچہ دہلی پہنچ کر قطب صاحب کے پاس ان لوگوں نے قیام کیا۔ جن کی یادگار قاسم جان کی گلی اب تک موجود ہے۔

احمد بخش خاں نے ابتداً ریاست گئی اور پھر نوکری کر لی اور پھر نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ اسی تجارت کے سلسلہ میں راجہ بانی بختاور سنگھ سے بھی مراسم ہو گئے اور انھوں نے اپنی ریاست الور کا وکیل بنا لیا۔

انھیں دنوں ریاست بھرت پور سے انگریزوں کی ٹھن گئی اور انھوں نے قلعہ ڈیگ پر چڑھائی کر دی تو راجہ بختاور سنگھ نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا اور اپنے سواروں کا ایک دستہ مدد کے لئے روانہ کیا۔ اس دستہ کے ساتھ احمد بخش خاں بھی تھے۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ انگریز پر سالار گولی لگنے سے قتل ہو گیا اور جب وہ گھوڑے سے گرنے لگا تو احمد بخش خاں نے اپنے آپ کو اس کے گھوڑے کی پیٹھ پر پہنچایا اور اسے سنبھال کر بڑی حفاظت سے میدان جنگ سے نکال لائے۔ اس پر سالار نے مرتے مرتے ایک تحریر لکھ دی کہ احمد بخش نے بڑی بہادری سے میری حفاظت کی ہے لہٰذا انھیں اس کا مناسب صلہ دیا جائے۔

جب فتح کا صلہ ملا تو لارڈ لیگ نے احمد بخش خاں کو فیروز پور جھرکہ۔ لوہارو پھوڑ اور سانگر میں کے اضلاع بطور جاگیر عطا کئے اور فخر الدولہ والا الملک امیر جنگ خطاب کے ساتھ سند دی۔

لارڈ لیگ کی اس سخاوت کو دیکھ کر راجہ بختاور سنگھ کو بھی جوش آیا اور انھوں نے اسی دربار میں پرگنہ لوہارو اپنی طرف سے عنایت کر کے کامگار کر دیا۔ اس طرح احمد بخش خاں نہ صرف جاگیر اور خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بلکہ والی ریاست بھی بن گئے۔

الور کے قیام کے زمانہ میں احمد بخش خاں نے قدسی نامی ایک میراثن کو گھر ڈال لیا جس کے بطن سے دو لڑکے شمس الدین خاں (ولادت ۱۸۰۴ء) ابراہیم خاں اور دو لڑکیاں نواب بیگم و جہانگیر بیگم[1] متولد ہوئیں۔ خطاب پانے اور جاگیر پانے کے بعد احمد بخش خاں نے نیاز محمد بیگ

---

[1] نواب بیگم دہلی میں زین العابدین خاں عارف سے اور جہانگیر بیگم آگرے میں اعظم خاں سے بیاہی گئیں۔

خاں برادس کی بیٹی بیگم جان سے شادی کی جن کے بطن سے دو بیٹے امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں اور دو بیٹیاں ۱۔ دختر بیگم اور ۲۔ شاہ بیگم تولد ہوئیں ۱۔ دختر کے لڑکے شمس الدین خاں ریاست کے وارث نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ وہ بیوی کے بطن سے نہ تھے اس لئے احمد بخش خاں نے انھیں فیروز پور جھرکہ دیا طے کر کے بیگم جان کے بیٹوں کو لوہارو وغیرہ دے دیا اور ۱۸۳۳ء میں حکومت انگریزی اور ریاست اللہ سے بھی اس کی منظوری لے لی اور ۱۸۳۵ء میں شمس الدین خاں سے بھی ایک دستاویز لکھوالی گویا لوہارو امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں ہی کے قبضے میں رہے گا۔ اس پر جنرل اختر لونی اور سر جان مکالف کے دستخط بھی بطور گواہ لے گئے۔

اس انتظام کے بعد ۱۸۲۳ء میں احمد بخش خاں جانشین ہو گئے اور دو سال تک اس کے تصفیہ پر عمل ہوتا رہا کہ ۱۸۲۶ء میں انتقال کیا اس وقت شمس الدین خاں کی عمر ۱۸ سال تھی امین الدین خاں گیارہ بارہ سال کے اور ضیاء الدین احمد خاں ۷ سال کے تھے۔

احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد ہی شمس الدین خاں نے اپنے دونوں علاتی بھائیوں کو محروم کر دینا چاہا اور سرکار انگریزی سے خواہش کی کہ لوہارو وغیرہ بھی ان کے سپرد کر دیئے جائیں اور چھوٹے بھائیوں کو صرف حصہ دلایا جائے۔ ان دنوں سر ولیم فریزر دہلی میں ریذیڈنٹ تھا اس نے شمس الدین خاں کی مخالفت کی۔ مگر اتفاق سے چند ہی روز کے بعد وہ معزول ہو گیا اور فرانسس پاکس اس کی جگہ آیا جو شمس الدین خاں کا دوست تھا اس نے ان کی طرفداری کی اور درخواست منظور کرلی جس کے نتیجہ میں لوہارو اور دوسرے علاقے بھی شمس الدین خاں کو مل گئے۔[1]

احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد شمس الدین خاں خود مختار تھے۔ جوانی کا نشہ تو تھا اس پر بارہ دولت اور حکومت کا نشہ بھی ہو گیا اور وہ اس دو آتشہ سے مدہوش ہو کر کھل کھیلنے لگے۔

دلی میں ایک سادہ کار محمد یوسف کشمیری فن کار تھے جو بڑی عمدگی سے اپنا کاروبار چلاتے اور شرافت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی تین لڑکیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ انگریز دلی نے جب دلی پر قبضہ کیا تو اس گھرانے کو برباد کیا اور لڑکیاں انگریزوں کی ہوس ناکی کا شکار ہو گئیں۔ ان محمد یوسف کا کارخانہ "یوسف حالیوں کا ڈیرہ" بن گیا۔ چند روز تک بیدوٹ کر انگریز تو انجان ہو گئے۔ مگر ڈیرے والیاں دلی کے شوقینوں کے ہتھے چڑھ گئیں بڑی لڑکی کا حال تو معلوم نہ ہو سکا مگر یہی فانی حقیقت ہے کہ وہ بھی پھر کسی کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ منجھلی لڑکی حمدہ خانم نے یوسف علی خاں پر جدکوانی ریاست ہونے سے تعلقات پیدا کر لئے اور چھوٹی لڑکی عزیز بیگم کو شمس الدین خاں نے گھر ڈال لیا۔[2]

شمس الدین خاں اور چھوٹی بیگم کے اس تعلق کا نتیجہ ۲۴ جمادی الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۸۲۷ء بروز چہار شنبہ عصر گھڑی ۲ پل (۲ بجکر ۵ منٹ دن) کو عالم شہود میں جلوہ گر ہوا جس کا زائچہ یہ ہے[3]

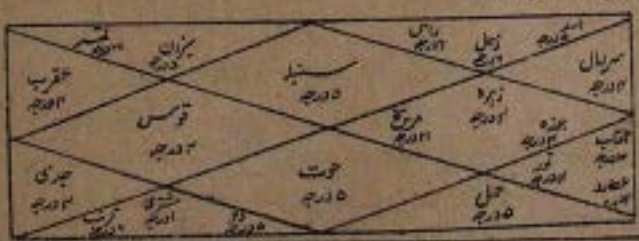

---

[1] غالب حوالہ مہر، صفحہ ۵۲، ماہنامہ جمیل دہلی فروری ۱۹۶۱ء، نوشتہ جات خاندانی فولاد لوہارو تحلی مگی مرزا معصوم احمد خاں برادس حیدرآباد دکن [2] ماہنامہ نگار لکھنؤ اگست ۱۹۵۳ء ص ۳۰ [3] جلوۂ داغ صفحہ ۱۰ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۱ء

اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس دعوے کا نام کیا رکھا گیا۔ اعجاز سوانح نگار شمس علی شہرت وغیرہ نے لکھا ہے کہ ابراہیم نام رکھا گیا مگر اس روایت کی توثیق نہ ہو سکی۔ اسد اللہ خاں آج زندہ ہوتے تو کچھ بتا سکتے۔ ان کے والد شمس الدین خاں نے ابراہیم نام رکھا ہو مگر شہرت نواب مرزا کے نام سے ہوئی تو یقیناً والدہ کا رکھا ہوا ہے۔

۱۸۳۳ء میں کمشنر کا عہدہ درج ہو گیا اور سرویر فریزر ریزیڈنٹ مقرر ہوا۔ اس نے شمس الدین خاں کو گرفتار کرا دینا چاہا مگر شمس الدین خاں تیار ہو گئے۔ اس لئے اس نے واقعات کی رپورٹ سلیمان کر دی۔ الدین خاں اور ضیاء الدین خاں گھلکتہ گئے۔ اور ۱۸۳۴ء میں پرگنہ لوہارو دونوں بھائیوں کے نام بحال ہو گیا۔

گھلکتہ سے اس فیصلہ کی اطلاع ملی تو شمس الدین خاں کو بہت رنج ہوا۔ انھیں شاید دیکھ کر ان کے ایک عزیز حسب کرم خاں نے قسم کھائی کہ قدیم فریزر کو قتل کر دے گا چنانچہ احمد بیگ نے اپنے عزیز کو ساتھ لے کر دہلی کا رخ کیا۔ اور شمس الدین خاں کی نرسٹی (چھوٹی) بندوق لیکر چھپ گئے اور وہیں بیٹھ کر موقع کی تاک میں رہا۔ اور ۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو فریزر کسی دعوت سے واپس آ رہا تھا کہ گولی مار دی۔

فریزر کے قتل کے بعد مرزا غالب اور انھیں کے ایک عزیز نواب اللہ بیگ خاں نے صاف صاف لفظوں میں جا سٹیفن شمس الدین خاں پر ظاہر کر دیا کہ تحقیقات شروع ہوئی۔ مقدمہ چلا قتل ثابت ہو گیا۔ کریم خاں کو ۸ اگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی اور مجسٹریٹ نے لکھا کہ یہ قتل شمس الدین خاں کی انگیخت اور اعانت سے ہوا ہے جو ایک ریاست کا والی ہے۔ اس کے لئے سزا تجویز کرنا میرے اختیار سے باہر ہے جب یہ رسل گھلکتہ پہنچی تو اس کا حکم ہوا کہ شمس الدین خاں کو بھی پھانسی دی جائے۔ چنانچہ انھیں دہلی لا کر گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں۔

"غدر کے بعد یہ دوسری پھانسی تھی جو ایک ریاستی رئیس کے لئے انگریزی قانون کو وضع کرنا پڑی ہو۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا تھا اس لئے حکومت کو غیر معمولی احتیاطوں سے کام لینا پڑا۔ گھلکتہ سے ایجنٹ کو لکھ گیا کہ اس بارے میں شاہی سے ایک فرمان حاصل کرنا چاہیئے۔ نیز علماء و اتقیاء شہر کا ایک گروہ تیار کرانا چاہیئے کہ احکام شرع کی رو سے بھی فریزر کا قتل ضروری ہے اور اس لئے اب یہ تحریر کہ فیصلہ شرع کے خلاف نہیں۔"[1]

مولوی رشید الدین کے مکاتیب کا جو قلمی مجموعہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے اس کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایجنسی کے دفتر انشاء نے ایک تحریر تیار کی تھی اس میں کتب فقہ کی وہ تعبیرات نقل کر دی تھیں جو ذبح کے قتل میں کے بارے میں ہیں اور صورت یہ بتائی تھی کہ فریزر شتروں میں داخل تھے ان کے مسلم قاتل اور بھرک قتل سے قتل میں لینا واجب ہے۔ بادشاہ بڑی کاوشوں کے بعد بعض علماء کو جو قلعہ سے وابستہ تھے اس پر آمادہ کیا کہ اس تحریر پر دستخط کر دیں۔ اور اس محضر کی اپنا پر خود بھی ایک شقہ لکھ کر ایجنسی کے حوالے کر دیا۔ یہ شقہ اور محضر تمام ملک میں شائع کیا گیا اور بعض مقامات پر ایجنسیوں کے ذریعہ تمام ریاستوں کے دربار میں پہنچایا گیا۔[2]

۸ دسمبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازے کے باہر اسی جگہ پر جہاں فریزر کی قبر ہے شمس الدین خاں کو پھانسی دی گئی اور ان کی میت ان کے خسر مرزا مغل بیگ خاں کے حوالے کی گئی۔ نماز جنازہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے حضرت شاہ اسمٰعیل نے پڑھائی۔ اسمٰعیل بڑا مجمع تھا۔ ہزاروں آدمیوں نے نماز میں شرکت کی اور قدم شریف میں دفنایا گیا۔ مدتوں تک دہلی کے عوام شمس الدین خاں کے مزار پر پھول چڑھاتے رہے اور انھیں شہید سمجھا جاتا تھا۔

نواب مرزا کی عمر چار سال چار مہینے کی ہوئی تھی کہ عین جوانی (۳۸ سال) کے زمانہ میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس طرح گویا ہم اللہ

---

[1] غالب مولانا ابو الکلام آزاد حاشیہ ص ۵۲ مطبوعہ لاہور طبع سوم

ہی غلط ہوئی۔ مگر قدرت مہربان تھی اس لئے ان کی خالہ عمدہ خانم نے اپنے پاس جالیا اور وہیں پرورش و پرداخت کرنے لگی۔ چنانچہ تیرہ چار سال اسی طرح دلی میں گزرے اور ۱۸۴۷ء کو نواب محمد سعید خان تخت نشین رامپور ہوئے تو یوسف علی خاں بھی دلی سے رامپور روانہ ہوئے جن کے ساتھ مع اہم بھی نواب مرزا کو اپنے ہمراہ لے گئی۔ رام پور پہنچ کر مولوی غیاث الدین صاحب غیاث اللغات کی شاگردی کی اور خود یوسف علی خاں سے بھی کچھ پڑھا۔

شمس الدین خاں نے جو وصیت نامہ چھوڑا تھا اس میں کوئی جائداد چھوٹی بیگم کے نام تھی اور نہ نواب مرزا کے نام، اس لئے یہ دونوں مترو کہ سے محروم رہے صرف ایک مکان جو چاندنی چوک میں تھا جس میں شمس الدین خاں کی زندگی میں چھوٹی بیگم رہتی تھیں ان دونوں کو ملا۔

واقعۂ قیام حیدر آباد کے زمانے میں اپنے احباب سے کہا کرتے تھے کہ دشمنوں نے میرے والد کا وصیت نامہ حاصل کر کے ضائع کر دیا اور ایک جعلی وصیت نامہ پیش کر کے مجھے محروم کیا ہے۔ بظاہر واقعہ کا بیان جھوٹ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ شمس الدین خاں کی ایک بہن بیوی اور دوسری چھوٹی بیگم تھیں۔ ان دونوں میں صرف یہی ایک لڑکا نواب مرزا تھا اس لئے یقین ہے کہ انھوں نے کچھ نہ کچھ ان دونوں کے لئے چھوڑا ہی ہوگا یا مقدم رقم کی وصیت کی ہوگی۔

بہر حال شمس الدین خاں کے بعد چھوٹی بیگم بالکل بے سہارا ہو گئیں اور انھیں بھوکا کسی جگہ پڑا رہنا پڑی، چنانچہ دلی کے ایک تاجر شخص نواب علی کے گھر بیٹھ گئیں اور ۱۸۵۱ء میں غلام رسول علی آلہ جو ۱۲۶۷ھ نواب علی سے کچھ ناچاقی ہوئی اور چھوٹی بیگم نے مرزا فاضل کو وہیں چھوڑ کر نواب علی سے منہ موڑ کر مرزا فخرو دلی عہد دہلی سے رشتہ جوڑا اور ۱۸۵۲ء ۱۲۶۸ھ میں قلعہ معلی میں جا رہیں۔

داغ نے اپنی سوانح عمری میں جسے انھوں نے آغا محمد باقر مہر دی سے مرتب کرایا ہے اس واقعہ کی تفصیل یوں لکھوائی ہے۔

"مرزا داغ کی والدہ ماجدہ نے صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کے دامن عاطفت میں پناہ لی اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ محل شاہی میں گذارا اور نواب شرکت محل خطاب پایا۔"[1]

قلعہ میں پہنچنے کے بعد چھوٹی بیگم نے نواب مرزا کو بھی بلا لیا اور پھر ۱۸۵۳ء میں مرزا خضر سلطان عالم کو جنم دیا۔ قلعہ میں نواب مرزا کی تعلیم و تربیت جس طرح ہوئی، اس کی تفصیل جلوۂ داغ میں یوں لکھی گئی ہے

"مرزا صاحب بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ شاہی میں پہنچے اور گویا وہیں آپ کی تعلیم کی بسم اللہ ہوئی۔ اگرچہ تعلیم کا سلسلہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور رامپور میں مولوی غیاث الدین صاحب غیاث اللغات سے فارسی کی درسی کتابیں پڑھی تھیں مگر قلعہ معلی میں آکر مستقل طور پر مولوی سید احمد حسین صاحب والد مرزا غلام حسین صاحب متخلص بہ شکیبا جو میر تقی میر کے شاگرد تھے آپ کے معلم مقرر ہوئے۔ فارسی کی کتابیں مرزا نے انھیں سے تمام کیں۔ کتاب کا سبق لینے کے بعد خط کی مشق بھی ہوتی تھی چنانچہ پہلے مشہور خوش نویس سید امیر علی کسمی دہلوی کے شاگرد ہوئے پھر مولوی وقات میں مرزا عبداللہ بیگ صاحب سے جو امیر صاحب کے شاگرد تھے اصلاح لیا کئے۔ فن سپہ گری کے اصول اور تمام باتیں قلعہ معلی میں رہ کر آپ نے سیکھیں چنانچہ عندالذکر ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ مرزا عبداللہ بیگ سے جن سے میں نے لکھنے کی مشق کی تھی انھیں سے بانک سیکھی، اور مرزا سنگی بیگ سے جو خاندان میر حلقہ علی میں مشہور سپکیتی باز تھے سپکیتی، علم اور سیکھی اور گھوڑے کی سواری کا طریقہ جن خاں اور بندو خاں چابک سواران شاہی سے حاصل کیا اور سب سے بڑا صاحب عالم فتح الملک سے سیکھا۔"[2]

داغ نے اپنی شاعری کے متعلق جلوۂ داغ میں لکھوایا ہے۔

---

[1] جلوۂ داغ صفحہ [2] جلوۂ داغ صفحہ ۱۲

"تلوس پہونچ کر ابتدائے شعر سے جہاں اور بہت سی باتیں دیکھیں وہاں سب سے زیادہ شاعری کی گرم بازاری بھی پائی۔ آپ کی خداداد اور بہت طبیعت کا رجحان اسی طرف زیادہ رہا۔ اس آتش شوق کو بھڑکانے کے لئے سامان بہت کچھ جمع ہو گئے۔ خاقانی ہند سلطان الشعراء جناب شیخ محمد ابراہیم حضرت ذوق علیہ الرحمۃ کا زمانہ تھا اور بادشاہ اور ولی عہد کے استاد ہونے کی وجہ سے اکثر تلوس میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی ذہانت اور خداداد تیزی دیکھ کر صاحب عالم مرزا ولی عہد بہادر نے آپ کو حضرت ذوق کا شاگرد کیا۔ جب آپ کو خاقانی ہند کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا اس وقت آپ کا سن گیارہ بارہ برس کا تھا۔"[1]

اپنے تخلص کے متعلق اور شاگردی کی تفصیل خود داغ نے یوں بیان کی ہے۔

"مرزا صاحب نے فرمایا سب سے پہلے فتح الملک بہادر مرزا فخرو کا میں شاگرد ہوا۔ دو چار غزلیں انھیں دکھائیں خود ولی عہد بہادر نے مجھ سے فرمایا تم حضرت ذوق کے شاگرد ہو جاؤ۔ اور انھوں نے داغ تخلص قرار دیا۔ میں نے حضرت ذوق کی شاگردی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں اختیار کی۔ جہاں بادشاہ اور فتح الملک بہادر نے میری طرف سے حضرت ذوق کی خدمت میں ایک دوشالہ اور چند اشرفیاں پیش کیں اور استاد نے اسی وقت ایک غزل پر اصلاح فرمائی۔ اس روز سے معمول ہو گیا کہ ہر پیر کے روز استاد کے دولت پر حاضر ہوتا۔ مغرب کے بعد وہاں سے مکان کو واپسی ہوتی۔ بادشاہ کی غزل اور میری غزل خود اپنے دست مبارک سے اصلاح فرمایا کرتے تھے باقی شاگردوں کی غزلیں ایک شخص پڑھتا جاتا اور استاد اصلاح دیتے جاتے لیکن کوئی موجود نہ ہوتا تو خود ملاحظہ فرما کر بھی اصلاح عنایت فرمایا کرتے تھے۔"[2]

اس طرح داغ کی شاعری کی نشوونما ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی شاعروں سے بھری پڑی تھی خصوصاً قلعہ ارض نمونہ بنا ہوا تھا اور ہر طرف شعر و سخن کا چرچا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ہاں اکثر مشاعرہ ہوتا تھا۔ پہلی غزل داغ نے شیفتہ ہی کے مشاعرے میں پڑھی جس کا مطلع یہ تھا۔

شربت وصل نہیں شہد و شکر ہیں نہیں　　کس لئے پھر یہ لبِ لعل و گہر ہیں نہیں

اس مشاعرے میں وہ واہ واہی کہ ساری دلی داغ کے نام سے واقف ہو گئی۔ دوسرا مشاعرہ جس میں داغ نے شرکت کی زینت بازی کا مشہور مشاعرہ تھا جس میں اپنا، جاوداں اور ذوق و غالب میں مصرع طرح کہا گیا تھا۔ داغ نے جب مقطع سنایا ؎

لگ گئی چپ مجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی　　مجھ کو کچھ حال تو کہہ بخت بتا تو اپنا

تو مولانا صہبائی نے بڑی تعریف کی اور داغ کو گلے سے لگا لیا۔

غالب نے قلعے کے دم نکلے زمین میں بڑی اچھی غزل کہی تھی یہ زمین اتنی پسند آئی کہ قلعہ معلی کے شاہی مشاعرے میں بھی غالب ہی کا مصرع طرح کر دیا گیا۔ داغ کو دیر سے طرح پہنچی تھی مگر انھوں نے غزل کہہ لی اور مشاعرے ہی کے وقت ذوق کو کھڑے کھڑے سنا دی۔ اور جب مشاعرہ شروع ہوا تو اپنے نمبر پر غزل پڑھی جب یہ شعر پڑھا ؎

ہم سے خود رفتہ جب آ ہو میری بے تہ دیکھی　　کہی کا اس طرح یاب نہ دنیا میں پھرم نکلے

تو شاہ ظفر نے داغ کو اپنے پاس بلا کر پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

نواب اصغر علی خاں نسیم کے پاس بھی برابر مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک مشاعرے میں داغ بھی پہنچے اور جو طرحی غزل سنائی اس کا مطلع یہ تھا۔

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا　　کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

---

[1] جلوۂ داغ ص ۱۳۔ [2] روزنامچۂ داغ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۱۹ء

مطلع سے مقطع تک پوری غزل پر داخلی اور خارجی اثر میں ایک خاص کیفیت رہی۔

ظاہر ہے کہ جب حزن، غالب، مہجانی، آزردہ، شیفتہ جیسے استاد داد دیں اور ذوق جیسا استاد جی لگا کر شاگرد کی طبیعت بنائے تو پھر کیا حال ہوگا۔ دل گزوں اڑنے لگا اور طبیعت نکھرتی گئی۔ داغ شعر و شاعری کے ہو گئے۔

اسی زمانے میں داغ کی والدہ مرحومہ ان کی شادی بھی کر دی۔ مجموعۂ داغ میں انھوں نے لکھا ہے کہ داغ کی شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی۔ مگر انھوں نے اور نہ ہی کسی اور نے داغ کی بیوی اور خسر کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ بعض دلی والوں سے تحقیق کرنے پر مرحیل صاحب سے جو خاندان خواجہ میر درد کی آخری یادگار رہ گئے ہیں، اتنا معلوم ہوا کہ مرزا محسن شاہ، مرزا سبحان شاہ، مرزا فیروز شاہ اور مرزا فرزند شاہ چار بھائی شہزادگان تیموریہ میں سے تھے۔ اول الذکر محسن شاہ کی لڑکی داغ سے بیاہی گئی تھی۔ محبی مالک رام نے مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ ان کی بہن پر انھوں نے داغ کی بیوی کا نام فاطمہ بیگم تحریر فرمایا ہے جن کی دو بہنیں اولیا بیگم اور عزیز بیگم بھی تھیں۔ والدہ مرحوم (حضرت تجلی) بھی بڑے کہا کرتے تھے کہ استانی حیدی بیگم داغ خاندان مغلیہ سے تھیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے خود داغ یا مرزا امیر الدین ضیاء گورگانی سے سنا ہو مگر تفصیل انھوں نے نہیں بتائی۔

ان خانگی امور سے داغ کو ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جو شیر خوارگی ہی میں مر گیا[1] اس کے لئے داغ عمر بھر روتے رہے۔ چنانچہ اکثر غزلوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔

احمد کے غم میں دیدۂ دل کیوں نہ ہوں تباہ — دل کا سرور تھا میری آنکھوں کا نور تھا
مرا احمد مرے محشر میں کہہ دے کیا مچلتا ہے — گریباں چاک دامن چاک داماں چاک دل چاک

اپنے شاگردوں اور دوستوں سے داغ مرحوم نے تنگ اس بچے کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس کی آہ بھی ساتھ ہی رہتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ بچے کا انتقال دہلی میں ہوا۔ یہ لوگ بچے کے مرنے کے بعد داغ نے اپنی ساس اولیا بیگم کی نواسی فاطمہ بیگم کو جو میرے حصہ قسمت میں آئی تھیں گود لے لیا اور انھیں بیٹی بنا کر پالا۔

داغ سنہ ۱۸۸۵ء تک ذوق سے استفادہ کرتے رہے اور ذوق نے بھی بڑی توجہ سے داغ کی طبیعت بنائی۔ چونکہ ذوق کے شاگردوں میں کوئی اتنا ذہین اور شاعر نہ تھا اس لئے وہ داغ کو چاہتے تھے اور ان کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرتے تھے اس طرح ذوق نے داغ کو سنوار کیا۔ ذوق کے انتقال کے بعد ان کے بیشتر شاگردوں نے غالب کی شاگردی اختیار کی مگر داغ نے غالب کی شاگردی اختیار نہیں کی البتہ ان سے فیض بہت پایا۔

یہ عجب بات ہے کہ مرزا غالب داغ کے والد شمس الدین خاں کے دشمن تھے انھوں نے ہی مخبری کر کے چھاپہ ڈلوایا تھا مگر داغ پر وہ بہت مہربان تھے۔ چنانچہ داغ کو اپنی غزلوں پر غزلیں کہنے پر مجبور کرتے اور داغ ان کی غزل پر غزل کہہ کر سناتے تو بہت خوش ہوتے۔ چنانچہ کثیر ایسے واقعات داغ نے سنائے ہیں جو ان کے دوستوں میں نقل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تصدیق خواجہ حالی نے یادگار غالب میں بھی کی ہے کہ ۱۰ ایک صحبت میں مرزا نے داغ کی اس غزل کو بار بار پڑھا تھا اور جھوم رہے تھے[2]

داغ دل دشمن کے ہے تیغ نگہ کردہ یہ کہتے ہیں — ادھر جاتا ہے دیکھو یا ادھر پروانہ آتا ہے

---

[1] اس مضمون کی تحریر کے بعد اطلاع ملی کہ داغ نے احمدی نہیں لڑکے کو گود لیا تھا۔ وہ جوان ہو کر کسی سفر میں انتقال کر گئے تھے۔ داغ کے حقیقی بھائی امیر مرزا کا لڑکا تھا۔
[2] یادگار غالب حواشی ص ۱۰۳۔ طبع چہارم۔

مولانا علی شہرت دہلوی نے تذکرہ کی سوانح لکھی ہے لکھتے ہیں کہ ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ ایک خطی رسالہ سامنے رکھے کچھ پڑھ رہے تھے میں نے پوچھا آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟ تو کہا، اس میں فارسی الفاظ بہت غلط لکھ دیئے گئے ہیں انھیں اصل یا ہوں۔ اور الفاظ ڈال رہا ہوں۔ میں نے پوچھا داغ کی اردو کیسی ہے؟ فرمانے لگے۔

"ایسی عمدہ ہے کہ کیسی ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا داغ اس کو بدست پال، پاپے بلکہ تعلیم دے رہا ہے"[1]

قیام دہلی کے زمانے میں ۱۸۵۷ء تک داغ مرزا غالب سے ملتے پایا ہے۔ غدر کے بعد جو نگر داغ نے دہلی چھوڑ دی تھی۔ اس لئے غالب سے دور ہو گئے تھے۔ اس عرصہ میں داغ نے جو فیض غالب سے پایا ہے وہی ان کی کامیابی کا راز تھا ہے۔

مولوی عبدالرزاق کانپوری صاحب اثر لکھتے ہیں کہ سرسید کا ایک واقعہ نقل کرتا ہے کہ ایک دفعہ سرسید کی محفل میں ہوا بیٹھتی نے داغ کا ایک شعر پڑھا جس پر سامعین کی جملہ سامعین آن تھی اس پر کسی نے مصنف (یعنی سرسید) سے فرمایا۔

"سلطان کی جیح عالی میں سلامتی ہے لیکن اس شعر میں سلامتی ہے محفل کی اصطلاح کے مطابق دوسرے معنی مراد ہیں جب مولانا شبلی نے تفضیل فرمائی تو سرسید نے کہا دو ایک کے علاوہ جس قدر تیوری شہر ہے تھے معلی میں تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا لقب سلامتی تھا اور یہ جیح بھی مفرد ہیں مستعمل تھا۔ اس سبب سے سلامتی کی جیح سلامتیوں آتی ہے داغ نے تحفہ مسلی یہ اچھا طنز سے جانی تک تیور تربیت پائی ہے۔ بنا اس کا کلام مستند ہے"[2]

مولانا شبلی داغ کے بڑے مداح تھے۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں اکثر بعد میں بھی جب کبھی حیدرآباد آتے گھنٹوں داغ کی صحبت میں بیٹھ کر تے تھے چنانچہ ایک جلسے میں انھوں نے ایک غزل نظم سنائی تو مقطع میں اپنے ساتھ داغ کا نام اس طرح لیا ہے۔

ہاں تو دعویٰ کن و مانیز مسلم داریم　　شبلی گر فن و داغ خن خواں ما نرست

خواجہ حالی گو داغ کے مداح نہ تھے مگر مروت ضرور تھے چنانچہ ایک غزل میں کہا ہے۔

داغ و جرأت کو سن و کہ پھر اس گلشن میں　　سنتے ہیں کوئی بلبل کا ترانہ ہم سنگ

مرکاتی ۱۸۸۴ء میں مرزا فخرو ولی عہد دہلی نے انتقال کیا۔ داغ نے اس واقعہ کی تاریخ کہی۔

خلد آخ ملک سلطاں بہ جائے جان و دل شد　　ز دل مقام جنت تو کرم کریم غفار

چو ز داغ سال رحلت دل دردمند پرسید　　بگشید آہ حسرت دو صد و نود و ہ بار[3]

مرزا فخرو کے بعد داغ کو قلعہ میں رہنے کا کوئی حق نہیں رہا اور انھیں قلعہ سے نکلنا پڑا۔ خانہ قلعہ سے نکل کر داغ نے اپنے سسرال بلاقی کے گھر قیام کیا ہوگا۔ ان کے قلعہ سے نکلنے کے سوا تین مہینے ہی ہیں ضد ہو گیا اور داغ کو بھی لشکر کیام پور کی طرف بھاگنا پڑا۔ دہلی کی بربادی داغ کا شہر آشوب بنا ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں بھی اہل نگر ہے۔ داغ نے اپنی بیاری دلی کی اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتے ہوئے دیکھا تھا اس مصیبت کو انھوں نے اپنے آنسو شعر میں بیان کیا ہے جو بڑے اثر انگیز ہیں۔

طالب آوارہ، شیفتہ، نیر و رخشاں اور حالی بھی دلی کی بربادی دیکھی مگر اس کا مرثیہ کہنے کی کسی نے ہمت نہیں کی۔ یہ داغ ہی تھے جنہوں

---

[1] آئینہ داغ طبع اول ص ۳۳

[2] یادایام مجموعہ مضامین عبدالرزاق کانپوری ص ۱۵۵ طبع اول مطبوعہ حیدرآباد دکن

نے مرثیہ لکھ کر اپنی دلی دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ مرثیہ ابن بطوطہ کے مرثیہ اندلس اور سعدی کے مرثیہ بغداد کی ٹکر کا ہے۔ اس کے علاوہ داغ نے گیارہ شعر کی ایک غزل بھی کہی ہے جس کا مطلع ہے ؎

یوں مٹا دہلی سے جیسے کرشنا و بلی ۔۔۔ تھا رام و لچھمن و سیتا نام و نشان دہلی

حال میں انجمن اردوئے ہند کی سوسالہ یادگار منانے کے لئے جو جلسے ہوئے اور مضامین لکھے گئے نوشتری دشو بھر ناتھ پانڈے نے رسالہ نیا ہند الہ آباد کے جولائی ۱۹۵۷ء کے پرچہ میں ان مضامین اور جلسوں پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں سوائے داغ کے کسی اردو شاعر کی کوئی نظم پیش نہیں کی گئی۔ اسی الم کو سہلاتے ہوئے پانڈے جی نے داغ کو "بھاکوی" سے مخاطب کیا ہے۔ ماتھ پیٹنے کو داغ ہی اردو کا ایسا شاعر ہے جس کا کلام ہندی داں بھی پڑھ سکتے ہیں اور کسی شاعر میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔

ہنگامۂ غدر میں داغ دہلی سے نکل کر رام پور پہنچ گئے۔ کیونکہ رام پور سے ان کے چچا تعلقات تھے۔ چنانچہ غدر کے بعد جب ظہیر دہلوی رامپور پہنچے تو داغ نے انھیں نواب رضا علی خاں کی سرکار میں نوکر رکھا دیا۔

پہلا مشاعرہ جس میں رامپور میں داغ نے شرکت کی صاحبزادہ رضا علی خاں کا مشاعرہ تھا۔ اس میں داغ نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع تھا۔

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں ۔۔۔ اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں

داغ کے رام پور پہنچنے کے بعد نواب صاحب رام پور نے داغ کو اپنے دربار میں جگہ دی اور اپنے اسٹاف میں شریک کر کے اُن سے خاص خاص کام لینے لگے اسلئے داغ کبھی رام پور اور کبھی دہلی میں رہنے لگے۔ ان کا خرچ نواب صاحب ہی اٹھاتے تھے۔ اس طرح ۱۸۷۴ء سال گنگنے کے بعد رامپور میں ۱۸۸۸ء کو ان کا مستقل تقرر بحیثیت استاد دربار و کارخانہ جات کی نگرانی پر ہوا۔ داغ کے تقرر کے بعد کسی نے یہ شعر کہہ کر محفل کی دیوار پر لگا دیا تھا ؎

ٹھہرو ذرا سے آیا مشکی خر ۔۔۔ لے ہی گیا محفل میں داغ ہرا

رام پور میں علاوہ کارخانہ جات کی نگرانی کے سرکاری مشاعروں کا اہتمام بھی داغ ہی کے تفویض تھا اور باہر کے شاعروں کا انتظام داغ ہی کیا کرتے تھے نواب رام پور کو داغ سے بڑی محبت تھی سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء کو کلکتہ گئے تو داغ ہمرہ رکاب تھے اور پھر ۱۸۹۶ء میں حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تو بھی داغ کو ساتھ رکھا۔ چنانچہ کعبۃ اللہ میں بیٹھ کر داغ نے اپنی مشہور حمد کہی ہے جس کا مطلع ہے ؎

سن لیا پڑھا دیا تو نے ۔۔۔ دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

غدر کے بعد رام پور نے دہلی کی جگہ لے لی تھی اور سارے اساتذہ اور فنا کار وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں امیر، تیز، تیز، جلال، بحر، گھنشیام سکول کے مشہور اساتذہ تھے۔ دلی اسکول کے چند شاعر مثلاً حیا وغیرہ بھی وہاں تھے مگر ان کی تحریر کا کوئی شاعرہ تھا۔ لفظاً لفظاً داغ تھے جو ان سب کے ساتھ بیٹھ کر رہتے تھے۔ شاگردوں میں امیر اور تیز کو شش کرتے رہتے تھے کہ ان کا کلام مشاعرے سے باہر نکلے مگر یہ بات کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ داغ کا کلام پڑھتے ہوئے لوگ محفل مشاعرہ سے نکلتے تھے۔ یہی وجہ داغ کی شہرت کا تھا اور انھیں شاعروں میں داغ سمجھ گئے۔

ابتدائے شعر گوئی سے غدر تک کا کلام داغ نے دیوان کی صورت میں مرتب کر کے رکھ تھا جو غدر میں تلف ہو گیا۔ رامپور پہنچ کر جہاں تک حافظے نے مدد کی پچھلا غزلیں کیں اور بعد کا کلام شریک کر کے پہلا دیوان گلزار داغ مرتب کر کے ۱۸۷۷ء میں داغ نے شائع کیا۔

۱۸۸۰ء میں داغ کی والدہ نے انتقال کیا اور اسی سال بے تعلقی کے سلسلے میں ان کی جان پہچان کمگشتہ دالی منی بائی حجاب سے ہوئی اور جب وہ سلسلے کے ختم پر کلکتہ چلی گئی تو داغ نے بڑی منت خوشامد کے بعد ۱۸۸۳ء کے سلسلے میں بھی اسے رام پور بلایا اور دو چھینے تک بھی رہی۔ اس کے

بعد وہ کلکتے چلی گئی (۱۸۸۲ء) میں خود داغ نے کلکتہ کا قصد کیا۔ دلی، لکھنؤ، کانپور، الٰہ آباد ہوتے ہوئے رام پور پہنچے جہاں چند مشاعروں میں شرکت کی اور پھر کلکتہ پہنچ کر جواب کے جہاز سے اور چند روز کلکتے میں گزار کر ۲۰ جولائی ۱۸۸۳ء کو رام پور واپس ہوئے اور رام پور پہنچ کر مثنوی فریاد داغ لکھی جو تقریباً ساڑھے تین سو شعر کی بڑی ہی نفیس مثنوی ہے جس کے متعلق داغ کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ مثنوی دو دن میں لکھی ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۸۳ء میں طبع ہوئی ہے۔ اس پر ایک تفصیلی مقدمہ لکھ کر راقم الحروف نے ۱۹۵۸ء میں حیدر آباد میں چھپوا دیا ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن اسی سال لاہور سے شائع ہوا ہے۔

۱۸۸۴ء میں داغ نے اپنا دوسرا دیوان آفتاب داغ شائع کیا جس میں ۱۸۸۳ء کے بعد سے ۱۸۸۴ء تک کا کلام ہے۔

۱۸۸۵ء میں نواب کلب علی خاں نے انتقال کیا جس کی وجہ سے رام پور کے حالات بدل گئے اور داغ کو مجبوراً مستعفی ہو کر ۲۰ دسمبر ۱۸۸۵ء کو رام پور چھوڑنا پڑا۔ اندور، ناسک، اجمیر، گنٹور، حیدر آباد، آگرہ، علی گڑھ، منصور، بھوپال، بدایوں، مراد آباد، مرزا پور ہوتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ چونکہ داغ شروع ہی سے کم حوصلہ تھے۔ تنخواہ کے نام سے سالانہ سترہ سو روپے جو انھیں ملتا تھا ناکافی تھا۔ لہٰذا یہاں رام پور کی داد و دہش یہاں کی عیش گذرانی تھی یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو بالکل مفلس ہو گئے اور تنگ دستی سے پریشان ہو کر ؎

دلی سے چلو داغ کہ سیر دکن کی ۔۔۔ گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر

کہتے ہوئے حیدر آباد دکن کا رخ کیا۔ راستہ ہی میں قصیدہ شروع کر دیا۔ مطلع تھا ؎

میں جا بادیہ پیما طرف مکسب دکن ۔۔۔ مرے چشم تحیر الاں ہوئی گرد دامن

۱۰ اپریل ۱۸۸۷ء (۲۴ رجب ۱۳۰۴ھ) کو حیدر آباد پہنچے اور سیف الحق آرزو کے مہمان ہوئے۔ حاجی محمد ابراہیم خانساماں حضور نظام، راجہ گردھاری پرشاد جاگیردار نے بڑی مدد کی۔ شاہ دکن کے ملاحظے میں قصیدہ پیش ہوا اور مدارالمہام سر آسمان جاہ کے بھی حضور سے سفارش کی۔

حیدر آباد کی بنیاد ہی میں شعر و سخن رہا ہے بنا ہے حیدر آباد کے بعد سے عالمگیر کے گئے تک حیدر آباد شعر و سخن سے گونجتا رہا۔ تاشاہ کی معزولی کے بعد سے آصف جاہ کے ہوتے تک ایسا شعر و سخن کا شور نہیں رہا۔ گو نواب علم اور مرثیہ اس سے بالکل مفر نہ تھا۔ آصف جاہ کے بعد سے پھر شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ بعد نظام علی خاں میں سکندر جاہ مدارالمہام کن کے سپرد ہیں تین سو شعراء پیشہ یا دربار پلتے تھے۔ ان کے بعد میر عالم اور چندو لال کے بھی شعر و ادب کی کافی تعمیر و تشیع حفیظ وغیرہ آئے اور میں آئے اور مشاعروں کی گرم بازاری شروع ہوئی جو داغ کا عہد ہے۔ داغ جس دن حیدر آباد پہنچے ہیں اسی مشاعرہ کا اعلان ہو چکا تھا۔ چنانچہ ان کے پہنچتے ہی مشاعرہ ہوا اور داغ نے طویل زمین میں غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

لے چلا جان ہری دل کے جانا تیرا ۔۔۔ ایسے آنے سے تو مر رہتے نہ آنا تیرا

یہ طرحی غزل تھی پھر ایک غزل داغ نے مسنائی میں کہی قافیے میں واؤ نون دیا تھا جس کا مطلع اور مقطع یہ تھا ؎

داغ ہر لفظ زباں پر ہے فسانہ تیرا ۔۔۔ وہ دل آتے ہیں وہ آتے ہیں زمانہ تیرا

میرزا داغ ہیں شاہد کی طرح دلکش ۔۔۔ اور زمانے ہے تبسم شہانہ تیرا

سات سال تک حیدر آباد میں رہ کر داغ نے سارے حیدر آباد سے مراسم پیدا کر لئے مگر حضور نظام نے اس اثنا میں توجہ نہیں کی۔ اس لئے مجبور ہو کر ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء کو حیدر آباد سے واپس ہو گئے۔

حضور نظام کو داغ کے واپس ہو کر واپس جانے کی اطلاع ملی تو حکم ہوا انھیں بلواؤ۔ چنانچہ داغ بلوائے گئے اور ۲۹ مارچ ۱۸۹۲ء کو دہلی سے چلے اور حیدر آباد پہنچ کر محل فضل گنج میں قیام کیا۔ ۲۰ فروری ۱۸۹۳ء کو حضور کی غزل اصلاح کے لئے آئی اور دو سرے روز بلوا کر داغ نے سات دی کی غزل

پیشکش کی اور تاریخ کہی ؎

تدبوس حضرت کا حاصل ہوا — بڑے شوق سے، واہ رے بخت سے
حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر — یہ کہدے داغ سلطان سے

۱۵ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو داغ کے نام چار سو پچاس روپیہ ماہوار تاریخ ورود حیدرآباد سے تنخواہ جاری ہوئی۔ اور سنہ ۱۳۰۰ھ ہزار چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ کی ادائی کے بعد داغ نے دیوان متصل کے کرنل وزیر سے ہر سنہ کیلئے گھوڑے خریدے اور متعلقین کو دہلی سے بلالیا۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں جلیل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ امیر الدولہ نصیح الملک فاتح مرزا خان بہادر خطاب صفدر جنگ ہوا اور پھر ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۹۲ء کو سالانہ ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار کا اضافہ کرکے ایک ہزار روپیہ تنخواہ مقرر فرمائی گئی۔ اس اضافہ کا بقیا بھی تاریخ ورود حیدرآباد سے بیالیس ہزار آٹھ سو روپیہ نقد ملا۔ اس کی تاریخ داغ نے کہی ہے ؎

ہو گیا میرا اضافہ آدھ دونے سے سوا — یہ کرم اللہ کا ہے یہ عنایت شاہ کی
اس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم — ابتدا سے اپنی ساڑھے پانچ لاکھ کا بھی

حیدرآباد پہنچنے کے بعد سنہ ۱۸۸۳ء سے سنہ ۱۸۹۳ء تک کا کلام مرتب کرکے داغ نے اپنا پہلا دیوان مہتاب داغ دسمبر سنہ ۱۸۹۳ء میں شائع کیا۔

اسی سال داغ کی آخری بیٹی لاڈلی بیگم کے شوہر مرزا امتیاز الدین احمد خاں کے ایک کم سن لڑکا ناصر الدین احمد چھوڑ کر انتقال کیا۔ داغ نے بچی اور نواسے کو اپنے پاس بلایا اور بیٹی کا عقد ثانی سراج الدین احمد خاں سائل سے کردیا اور حضور نظام سے عرض کرکے نواسے کے نام چار سو روپیہ اور بیٹی کے نام تین سو روپیہ منصب جاری کرادیا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں داغ کی بیوی نے انتقال کیا جس کا صدمہ داغ کو بہت ہوا۔ اسی زمانے میں مرزا وحید عالم کو بھی داغ نے حیدرآباد بلالیا اور حضور نظام سے عرض کرکے مارچ سنہ ۱۸۹۹ء میں انھیں دو سو روپے منصب جاری کرادی۔

دسمبر سنہ ۱۸۹۹ء میں حضور نظام نے مکلکہ کا سفر فرمایا تو داغ بھی ہمراہ رکاب تھے۔ کلکتہ پہنچ کر داغ نے پرانے دوستوں سے ملاقات کی مگر بانی مہتاب سے ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ وہ کسی سے عقد کرکے گھر بیٹھ گئی تھی۔ کلکتہ سے واپسی کے وقت بنارس میں امیر مینائی کو داغ نے حضور میں باریاب کیا۔ امیر کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ امیر ۲۵ ستمبر سنہ ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد پہنچے اور داغ کے مہمان ہوئے۔ مگر آتے ہی بیمار ہوئے اور ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء کو انتقال کرگئے۔

داغ کے ٹھاٹھ باٹھ کلکتہ والوں نے دیکھے اور بانی مہتاب کو تفصیل معلوم ہوئی تو اس نے پھر دوڑے ڈالے اور جن صاحب کے یہاں بی تھی ان سے طلاق لے کر حیدرآباد پہنچی اور تیں سال ہوئے عمر کا جو حصہ سرد ہو چکا تھا اسے پھر گرمانا چاہا مگر یہاں کیا رکھا تھا۔ داغ حضرت اپنی امارت اور دولت و ثروت کا رعب جمانا چاہتے تھے اور مہتاب اللہ سے عقد کرکے استادشاہ کی ہوگئی تاکہ حضور نظام سے معقول پنشن حاصل کرسکے۔ ادھر داغ کی بیٹی، داماد، بھائی سب اس کے مخالف تھے۔ بالآخر لڑکے دو سال رہ کر مہتاب کلکتہ واپس ہوگئی۔ اور یہ عاشقی جس سحر اشوری سے شروع ہوئی تھی اسی بے رنگی سے ختم ہوگئی۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں آفتاب عالم مارہروی اور احسن مارہروی نے حیدرآباد پہنچ کر داغ کے پاس قیام کیا۔ احسن نے داغ کی ایک سو اسی غزلوں کا مجموعہ "جلوۂ داغ" اور آفتاب عالم نے ایک روزنامچہ مرتب کیا۔ جلوۂ داغ اسی سال حیدرآباد سے شائع ہوئی اور روزنامچہ ۱۳۲۰ھ میں رفیق مارہروی کے نام سے نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے چھپوایا ہے۔ احسن مارہروی نے فصیح اللغات کی ترتیب بھی شروع کی تھی مگر وہ مکمل نہ ہوسکی۔

۱۹۱۰ء میں ایڈورڈ ہشتم کی تاجپوشی کا دربار دہلی میں ہوا تو حضور نظام نے بھی شرکت کی۔ داغ بھی ہمرکاب تھے۔

داغ بارہا مختلف امراض میں گرفتار ہونے کے بڑی جرأت سے جنگ کرکے بچ جاتے۔ انھیں خون کے دباؤ کا عارضہ تھا۔ ذیابیطس بھی تھا۔ ۱۹۰۵ء خوب تھا۔ ایک مرتبہ ان پر فالج کا حملہ بھی ہو چکا تھا مگر وہ بچ گئے۔ بڑے تھے۔ اس نے انھوں نے اس حملہ کو بڑی جرأت سے برداشت کر لیا۔ مگر دوسرا حملہ بہت شدید ہوا۔ اطباء نے دوسرا حملہ بھی نیز خوب سے ٹل گیا مگر صحت ہونے کے بعد ہی تیسرا حملہ بھی ہوا۔ اور ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء ۱۳۲۳ھ ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو جلیل ہندوستان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

داغ کی عمر انتقال کے وقت بحساب قمری (۷۶) سال اور بحساب شمسی (۷۴) سال تھی۔ حضور نظام نے اپنی جیب خاص سے تجہیز و تکفین کے مصارف ادا فرمائے۔ اور نماز جنازہ بقر عید کی نماز کے بعد مکہ مسجد میں پڑھی گئی اور داغ کا جنازہ درگاہ یوسفین میں لے جا کر دفنایا گیا۔

داغ تجھ کو باغ جنت ہو نصیب!

داغ تھے تو ذوق کے شاگرد مگر ان کی طبیعت کا رنگ جرأت کا تھا اور انھوں نے غیر شعوری طور پر جرأت اور مومن کی تتبع کی ہے۔ ذوق کی سلاست زبان صاف بندی سادگی پر کاری کو جرأت کی معاملہ بندی اور مومن کی عزیز ادا اور ابہام گوئی نے تزویج کر کے ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے جسے غالب بھی بہت پسند کرتے تھے۔

ذوق کے انتقال کے بعد داغ کی آمد و رفت غالب کے پاس ہونے لگی اور غالب کی نسبت مائل پان کی غزلوں پر غزلیں تھیں تو حقیقی تغزل کا دھارا بہنے لگا۔ داغ نے غالب کی تتبع کھلے طور پر شروع کر دی۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ اسی طرز تغزل کے شوق میں مومن کی غزلوں پر غزلیں بھی کہنی شروع کر دیں اور بڑی کامیاب تتبع و تضمین کی کرنے لگے۔ چنانچہ یہی رنگ داغ کا اپنا رنگ ہو گیا جسے سب پسند کرنے لگے۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہو گیا کہ امیر مینائی تک نے داغ کا رنگ اپنانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ آخر کے شاگردوں میں سے تیاش خیر آبادی اور جلیل (نصاحت جنگ) نے بڑی کامیابی سے داغ کی اتباع کی۔

داغ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچی کیونکہ ایک شاگرد کی شاگردی کی مہر دوسری کی طرح ہو گئی تھی خط لکھے اور شاگرد بن گئے۔ گویا میں سے ہزار بلکہ سوا تین شاگرد تھے۔ چنانچہ سراج الدین، مولانا ظفر علی خاں، سیماب اکبر آبادی، نجم الدولہ دبیر، نوح ناروی، آغا شاعر قزلباش، امیر مینائی، جوش ملیح آبادی وغیرہ جیسے مشہور ہوئے جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

حیدرآباد میں کچھ تو صدر شاعر داغ کے شاگرد ہونے کا سلسلہ چلا، بلکہ چنانچہ کیفی، ناظم، تجلی، واسطی نادم، ضیاء وغیرہ کے سلسلہ کے شاگرد اب تک موجود ہیں۔ کیفی کے ایک شاگرد صفی اورنگ آبادی تھے جو بدقسمتی سے داغ ہی داغ تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں جوہر، تصدق وغیرہ اچھے شاعر ہیں۔

داغ کے چاروں دواوین میں نے تقابلی اگر کے تیم بک ڈپو لکھنؤ کو دیئے ہیں جن کی طباعت ہو رہی ہے اور ایک مجموعہ مراسلہ داغ بھی میں نے مرتب کیا ہے جو شائع ہو رہی ہے چند شعر بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں۔

کرتا ہوں جو نصیبوں کو تو کہتا ہے وہ شوخ
پھر محبت نہ کرے گا اگر انساں جاگا

ہائے مجبوریاں محبت کی
حال کہنا پڑا ہے دشمن سے

دل کو اس طاہری سے دیتا ہوں
کوئی جانے سوال کرتا ہے

جس خط پہ لگائی اسی کا جلا جواب
اک پُرزہ میرے پاس ہے دشمن کے نام کی

دل کو کیا ہو گیا خدا جانے
کیوں ہے ایسا اداس کیا جانے

حیرت ہے اس زمانے کو مجھ سے
باتیں جو کی تھیں بات کو اسکے خیال سے

یہ بات کیا ہے کہ جس بات کا ہو اندیشہ
وہی زباں سے بیاں ناگہاں نکلتی ہے

یہ سبب کیا ہے جدھر جاتا ہوں
سامنے تیری گلی آتی ہے

شروع عشق میں گستاخ تھے اب ہیں خوشامد گو
سلیقہ بات کرنے کا نہ جب آیا نہ اب آیا

کبھی زمانے میں گستاخ ہم بھی تھے اب تو
زباں ہے ہر تماشہ دل التجا کے لئے

مسکرا اے نظم اس نے یہ کہا
ہو جائے جھوٹ سچ ایسی چوٹی بیاں لگا کو

لذت سیر دگر چشم تماشا نہ گئی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹانے گی

زندگی، اور اس زمانے کی؟
ایسے جینے میں کچھ مزا بھی ہے؟

۵۸ء کی اُردو شاعری

ڈاکٹر وزیر آغا

یہ حقیقت تاریخی ہے کہ اس میں ہم اور غیر اہم بھی شعرا آگے ہیں جو شہرت کے بھنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتا رہا ہے اس لئے یہ مضمون محض نقطہ پیش کیا جا رہا ہے ——— (مدیر)

نقد و احیا سال گذشتہ کی اردو شاعری کا خوش گوار ترین پہلو ہے تقسیم اور اس کے بعد جب انسان کو خارجی انتشار اور تصادم سے بڑا سامنا پڑا اور دل بھی کلوروفارم جیسا تھا تک سکوت اور خاموشی کی فضا کا طالب ہے عقل سیماب صفت واردات سے مجروح ہوا تو غزل ہی شاید وہ واحد صنف سخن تھی جو کہ عارضی اجتماعیت مبتلا موکر انکھا ماندان کا نمونہ پیش کرنے لگی چنانچہ نقاد غیر شعوری طور پر شعرا نے غزل کا سہارا لیا اور چونکہ غزل جمہوری طریق کار کی نسبتاً زیادہ گرویدہ ہے اور چونکہ اجتماعی محاکمہ اس کا بنیادی وصف ہے اس لئے تمدنی کلچر پر عالمہ گر بیداری، تصادم اور عوامی تحرک کے اس دور میں غزل کو رواج بھی حاصل ہو گیا۔ غزل ہمیشہ سے عوام کی نمائندہ رہی ہے اور ہر دور میں کسی نہ کسی رجحانات کی عکاسی کی ہے شاعر کی غزل عوام کی شکست خوردگی اور ذہنی پسپائی کی غماز ہے اور داغ کی غزل عوام کی تعیش پسندی اور فراری کی عکاسی کرتی ہے اسی طرح اقبال کی غزل کا مطالعہ کریں تو ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کی ذہنی اور عقلی اور جمہوری کا سریع عکاسی ہے تقسیم کے فوراً بعد حالات و واقعات کی یلغاروں اور تحرک، تشویش اور انتشار سے عوام کچھ اس درجہ متاثر ہوئے کہ عوامی جذبات کی ہر ہر ان کو براہ راست متاثر کرنے لگیں تمیز یا دوان شعرا میں بھی انفرادی نقطہ نظر اور داخلی تاثر کا رجحان، اجتماعی تحریکات کی تندی اور سرگرمی کے سامنے اپنی آب و تاب کو تاکر رکھ سکا تقسیم کے بعد ۵۱ء کے فوراً بعد ایک بات یہ بھی تھی

لیکن آزادی کے تصورات ادھر بڑھنے لگی کچھ عرصے کے بعد پرستی خود غرضی اور اقربا نوازی کے رجحانات کے تحت ماند پڑنے لگی۔ قومی شعور زنگ آلود ہونے لگا اور قوم پروری نے دیسی کے دھندلکے چھانے لگے اور سکوت اور خاموشی محسوس ہونے لگی جو اگرچہ فارغ البالی اور عافیت کی علامت نہیں تھی تاہم جو ایک حد تک تصادم کے نقصان پر قدرتی تھی لیکن ۵۸ء میں ملک کے رجحان کو از سر نو تحریک ملی اور بہت سے شعرا اپنی ذات کے خول میں دبا رہنے لگے۔ نظر کے فروغ کے سلسلے میں اس صورت حال نے ایک حد تک میدان صاف کر دیا اور شخصیت ذات کا جذبہ تندیکی اجتماعی میلان پر غالب آنے لگا۔ دوسرے تحرک اور تصادم کے فقدان اور اس کے تحرک کے طور پر جذباتی ابال کی کمی نے مطالعہ سوچ بچار اور فکر کی تحریک دی اور یہ باتیں مل جل کر نظم کے احیا اور فروغ میں معاون ہوئے ——— بہرحال اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ نظم کے احیا کے اس پس منظر کو قبول کیا جائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ محض اس بات کو نظم کے احیا کا واحد سبب قرار دیا جائے (کیونکہ پس منظر کی داستان تمام طرح سے مجھی ہوئی تھی ہے اور محرکات کا سلسلہ کبھی پیچیدگی کا حامل ہوتا ہے) تاہم یہ بات طے ہے اور وہ یہ کہ گذشتہ برس کی شاعری نے نظم میں ایک بار پھر نئی قوت، استحکام اور زندگی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور اس صنف شعر

کی ترقی کے امکانات از سر نو روشن ہو گئے ہیں۔

نظم میں قوت اور استحکام کے مذکورہ سے اس بات کا اظہار ہرگز مقصود نہیں کہ گذشتہ سال کے دوران میں غزل لکھنے والے کی نظمیں کی گئی ہیں اور دوسرے یا تیسرے درجے کی نظمیں معرض وجود میں نہیں آئیں۔ اس ملک میں جہاں شعر سمجھنے کی حس اس قدر زائل ہے، ایسی صورت حال کیسے ممکن ہے؟ یوں بھی جب یہ کہا جائے کہ کسی سال میں نظم نے ترقی کی ہے تو اس کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اس سال میں دوسرے سالوں کی بہ نسبت بہتر نظمیں لکھی گئیں بلکہ بہتر نظموں کی تعداد بھی بتائی جائے۔ ورنہ اگر سارے سال کی نظم کو ملا کر ایک نظم بنا لیا جائے تو پھر کوئی سال بھی اپنے سے پہلے سال سے کم اہم نہیں ہوتا۔ بہرحال میری رائے میں گذشتہ برس نظم کا سال تھا۔ ان میں سے قبل کی میں ان نظموں کا ذکر کروں گا جن سے میں متاثر ہوا ہوں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ برس کی نظم کے عام رجحانات کے بارے میں کچھ بحث کر لی جائے تاکہ سال بھر کی نظموں کی مجموعی حیثیت کو جانچنے میں آسانی ہو سکے۔

گذشتہ سال کی منتخب نظموں کا مطالعہ یہ بات بتاتا ہے کہ اپنی تصورات، تشبیہات اور تجسیمات مختلف کلاسیکی اور غزل کے مستعمل الفاظ کو اردو نظم میں سمونے کے ایک اہم رجحان کے مقابلے میں، روزمرہ کے آسان الفاظ اور ہندی کے سبک اور مترنم لہجے کو اپنانے اور اس کی مدد سے خالص نئی تصورات اور شاہدات کو اردو نظم میں منتقل کرنے کی ایک اہم کوشش معرض وجود میں آئی ہے۔ اب کے لئے بالعموم لیکن شاعری کے لئے بالخصوص یہ ضروری ہے کہ شاعر اپنے مخصوص تجربات کو بیان کرے، اپنے ذاتی مشاہدات کو ذکر کرے اور اپنے فن میں اپنی ذات کی سوندھی بو کو شامل کرے۔ دوسرے لفظوں میں فن کو کچھ ہونا چاہئے۔ اسی میں اس کی انفرادیت ہے اور یہی چیز فن کے خصوص داخلی استحکام کی ضامن ہے۔ اس بنیادی اصلاحت کے سلسلے میں اگر ایک کلاسیکی قول نقل ہو تو میں کہوں گا کہ فن کی مثال ایک پودے کی ہے۔ اس کی جڑیں جس قدر زمین کے اندر دھنسی ہوں گی یہ اسی قدر بلند اور روپہلی بن جائے گا۔ پچھلے برس کی بعض نظموں میں جن کی سرزمین اور اس کے کلچر سے، ایک ایسی گہری وابستگی کا احساس ہوتا ہے کہ میں اس تحریک کو نظم میں "سوداسی تحریک" کا نام دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ فیض احمد فیض کی نظم "شام" اس کی بڑی اچھی مثال ہے۔ فیض نے اس نظم میں شام کے بیان میں خالص "ہندی" تصورات کو پیش کیا ہے اور اسی لئے یہ نظم ہمارے نظم گو ایک ایسا جانا پہچانا مظہر بن گئی ہے۔ اسی طرح "پس رد" میں مجید امجد نے تقریباً غیر شعوری طور پر بعض خالص ملکی تصورات سے اثر قبول کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم "آنچل کی چھاؤں میں" بہت کی نرم و نازک کیفیات کو بیان کرنے کی ایک ایسی کاوش ہے جس میں شاعر نے ہندی کے مترنم الفاظ کی مدد سے اپنے لہجے کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ کچھ اسی قبیل کی دو تخلیقیں ہیں جنہیں شاعر نے "نظم" کا نام دیا ہے اور جن میں ہندی کا لوچ واضح کشش رکھتا ہے۔ ان نظموں کی "نظم" اپنا پرچار "مگر یہ کس دیس کے" ہم ترین واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اگرچہ اصل میں یہ ایک بے لچک سی کہانی ہے۔ "آتے ہیں اس طرح" اور "نظمیں بھی بیچتی ہیں" لکھی گئی ہیں لیکن میں ان نظموں کو شاعر کے دوسرے رجحان کا ذکر کروں گا۔

گذشتہ برس کی نظموں کے مطالعے سے اور آثار یہ تب ہوتا ہے کہ نظم گو شاعر نے غیر ملکی اور مغربی نظموں کی بہ نسبت مشاہدہ فطرت کو زیادہ توجہ دی ہے۔ مشاہدات کے اظہار میں لہجہ کو بھی لچکیلا پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سارا جدید اردو نظم میں فطرت کی طرف شاعری پیش قدمی ایک اہم رجحان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا ہر حقیقت ہے کہ تقسیم اور اس سے پیدا شدہ انتشار و تضاد کے دور میں یہ رجحان ایک بڑی جنگ مجروح ہو گیا تھا اور اب نظم کے احیا کے ساتھ یہ دوبارہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ مظاہر فطرت کی طرف شاعر کی پیش قدمی اس کے محسوسات کو روح سے متاثر کرتی ہے۔ ایک تو اس طرح کہ فطرت کی کشادگی اور وسعت خوش ہونے کے محسوسات میں کشادگی اور اس کی نظم میں وسعت پیدا کرتی ہے اور شاعر اس گھٹے گھٹے ماحول سے باہر نکل آتا ہے جو ہمارے اکثر شہروں کا ماحول ہے۔ دوسرے فطرت کی ایک مخصوص رفتار ہے جسے فطرت بابیگی اور عدت کو کی رفتار کہنا چاہئے اور جس کا مطالعہ روح سے نکل کر ایک عبادت آمیز تنگی کے ساتھ زندگی کے مشترکہ عمل کے ساتھ دوبارہ ایک ہیچ میں خود کو منتقل کر دیتا ہے یہ رفتار ایک پائدار

فرق سے شاعر کی تیز رو اور جذباتی وابستگی کی رفتار میں اضافہ پیدا کرتی ہے اور شاعر کے تدبر میں کو فطرت کے تدبر میں سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ چنانچہ جب شاعر مظاہر فطرت سے تاثرات قبول کرتا ہے تو اس کی برجستہ اور مرکب کے دل جذباتی کیفیت میں از خود اعتدال آ جاتا ہے اور سبک روی کے فناعر شامل ہو جاتے ہیں پس فطرت نظم کی کشادگی اور سبک روی کی وہ دونوں خصوصیات تخلیق کرتی ہے جو فنی بالیدگی کے لئے ناگزیر ہیں یہ آسانی کہی جا سکتا کہ پچھلے برس کی نظم نے فطرت کی ان خصوصیات کو تمام و کمال قبول کر لیا ہے لیکن اخذ و قبول کا وہ جہان یقیناً معرض وجود میں آ گیا ہے اور یہ چیز نظم کے مستقبل کے لئے ایک فال کی حیثیت رکھتی ہے۔

گذشتہ برس کی نظموں میں مظاہر فطرت سے متاثر ہونے کا رجحان یوں تو بہت عام ہے لیکن اس سلسلے میں بعض نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں مثلاً فیض کی نظم "شام" جس میں فطرت سے گہری وابستگی کا پتا چلتا ہے۔ پھر جذبات کی نظم "سمندر اور انسان" ہے جس میں شاعر نے سمندر اور انسان میں ایک گہرا رشتہ دریافت کیا ہے اسی طرح احمد ندیم قاسمی کی نظم "ایک منظر" ہے جس میں شاعر نے فطرت کی نہایت خوب صورت عکاسی کی ہے۔ قیوم نظر نے "نواح مرغزار میں" اگرچہ ایک پختہ نگاری شعور کو بھی مظاہر کیا ہے لیکن دراصل اس نظم کا تخلیقی محرک فطرت سے گہری وابستگی میں ہی پنہاں ہے پھر مجید امجد کی نظم "چاند" ہے جس میں شاعر نے ایک سچ حقیقت کے بیان میں فطرت کے ایک واقعہ کو بطور تمثیل پیش کیا ہے ان کے علاوہ "خضر" نظم کی نظم "دیار دل اور شام" اور "شیر کی نظم" زخمی شیر" اور "جاج کوں کی" جھیل" بھی کچھ سے شاعر کی فطرت کی نہایت کامیاب شاعری ہیں۔

تیسرا رجحان پچھلے سال کی نظموں میں بڑھتے بڑھتے سرت کا برس پر چھا گیا ہے اور ماضی یا مستقبل کے مقابلے میں "حال" کو اہمیت دینے کا رجحان ہے۔ مشرق کی شاعری اور اس کی روایات میں غالب عنصر روحانی تجربہ زندگی اور اس کے لازمات کی نفی اور ایک ماورائی شے کی نیازی کا ہے اور اسی مخصوص نقطۂ نظر نے غزل کے مزاج کی تشکیل بھی کی ہے لیکن کہیں کہیں یہ بات مثبتیات کے ساتھ بھی ہے مثلاً فارسی میں خیام نے گزرتے ہوئے کی اہمیت دی ہے اور اردو میں غالب کی شاعری اس نقطۂ نظر کی تکمیل پیش کرتی ہے۔ غالب کا شعر ع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اردو شاعری میں ایک تدریجی عمل ہے۔ مشرقی شاعری کے برعکس مغرب کی شاعری میں زندگی اور اس کی کیفیات و مظاہر سے شدید وابستگی اور اس کا احساس ملتا ہے اور غالباً مغرب میں کوچیا حرکی معلومات کا زور بھی یہی ہے اب شاید مغربی ادب کے مطالعے کے باعث یا شاید اس لئے کہ خود ہماری زندگی مغرب کے اثر سے بہت متاثر ہونے لگی ہے۔ یہ نظم میں حال کے کو اہمیت دینے اور سرت اور ماضی کے تجربات سے پرہیز اختیار کرنے کا رجحان بھی دکھائی دینے لگا ہے۔ یہ رجحان بھی پہلے سے موجود تھا مگر گذشتہ برس کی نظموں میں اس کے بہت سے نمونے ملتے ہیں اور اسی لئے اس کا تذکرہ ضروری ہو گیا ہے اس سلسلے میں میرزادی کی نظم "مشورہ" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے مشورہ نظم Dramatic کا خیال ضرور آتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک بالکل مختلف قسم کی نظم پیش کرتی ہے۔ نذیر احمد ناجی کی نظم "اقرار" بھی اسی قسم کی نظم ہے اور اگرچہ نظم میں خود رحمانی کی گفتگو ہے تاہم یہ نظم پچھلے برس کی نظم "نظر اقبال کی نظم" دریں سرائے کہن" کا موضوع بھی ہے اور مجید امجد کی نظم "برسبیل" بھی خود رحمانی کی طرح مجید امجد بھی ماضی سے شدید وابستگی کی ایک خیال انگیز کوشش ہے۔ اسی لئے نظم کے اس رجحان کی نمائندہ بھی ہے۔

پچھلے برس کی جن نظموں سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ان میں سے بعض کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے مثلاً حیات علی شاہ کی نظم "سمندر

ہوا ہے۔ مجید شاہد کی نظم "پیکار" فیض کی نظم "شام" "ظہیر نظر کی" "یادوں اور شام" اور مجید امجد کی نظم "پیش رو" "رفیقہ" ان کے علاوہ مجھے محمد صفدر کی نظم موت کا بھی ذکر کرنا ہے کہ اسے سال گذشتہ کی نظموں میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس نظم میں شاعر نے روح کو طائر سے تشبیہ دی ہے اور روح کے قفس سے پرواز کرنے کے عمل کو پرندے کی پرواز کے عمل سے واضح کیا ہے اس سے قبل موت کے موضوع پر اردو میں ایسی خوب صورت نظم شاید ہی لکھی گئی ہو اسی طرح محمد صدیق کی نظم "طاء" بھی ایک قابل قدر تخلیق ہے اس نظم کی اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ محمد صدیق کے ہاں یہ نظم ایک نئے موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جوڑیوں کی چہک اور پھولوں کی مہک کے بعد گہرے نظریاتی شعور جو اس نظم کا امتیازی وصف ہے خود شاعر کے فکری ارتقاء کا ایک بین ثبوت ہے۔ منیر نیازی کی نظم صدا بصحرا اگرچہ زندگی کے ایک چھوٹے سے واقعہ کو بیان کرتی ہے اس نظم میں خاص کی تندی اور تیزی کو جذبے کی گرمی اور حدت کے لیے اس منظر کے طویل پیش کے جمالیاتی حظ کا سامان سمجھ لیا ہے ان نظموں کے علاوہ گذشتہ برس کی دوسری اچھی تخلیقات کے نام یہ ہیں گواہی از مصطفےٰ زیدی، بھی کھلتا نہ کتل شناسی، بھوری از یوسف ظفر، تنہائی از فارغ بخاری، بیمار اور از تیوم نظر، دست تہہ سنگ آمدہ از فیض، ملاقات از ظہیر نظر، فن از شان الحق حقی، نے ننگ نام ارتقاء تکمت، کھیا از شہزاد احمد، یادوں سے از شاد امرت سری، انجام از سلیم الرحمٰن، سوچ از کلے خان، سوداز جمیل ملک، افسانہ دانوں از جعفر طاہر، دھڑکن از اوز مظفر، گیا سال از افتخار جالب، مشرق و مغرب از احمد ندیم قاسمی اور سنگ دل از اجاز حسین صوفی۔ ان کے علاوہ پچھلے سال کے مجموعوں میں شہر ان کھارو دھا، ساقی فاروقی، پیر پیر دار تنی، غالب احمد، سجاد ترمذی، وصیت تبسم، مآ ورمی، جمیل نقوی، شائستہ یزدانی، الو، علی الو اور دیوان یتیم کے نام بھی قابل ذکر ہیں ان سب کی نظموں کے جو بتا رہے ہیں کہ آگے چل کر یہ رنگ اردو نظم کی قابل قدر خدمت سرانجام دے سکیں گے۔

پچھلے سال کے دوران میں بہت سے نوجوان شعراء نے طویل نظم میں بھی ہیئت آزمائی کی ہے یا شاید یوں کہنا بہتر ہوگا کہ نظم کے اٹھاؤ کی تعمیر میں دیکھا دیکھی کی بجائے طول کلام کا طریق اختیار کیا ہے۔ جس سے نظم کا ہاتھ بڑی طرح مجروح ہوا ہے بعض شعراء نے کہانی اور فلسفہ اور دیومالا کو اسی طرح کے بڑے بڑے موضوعات کو طویل نظم میں ٹھونسنے کی کوشش کی ہے اور اپنے دل کی واردات اور اپنے تاثرات و مشاہدات کے فنکارانہ اظہار کی بجائے کارنگ (MONOTONE) طویل نظم کا اختیار کیا ہے۔ جدید نظم نگاری کے اس دور میں طویل نظم کا رواج آج سے کچھ عرصہ پہلے شروع ہوا تھا لیکن اب اسے آغاز فراغ حاصل ہوا ہے کہ ایک حد تک اس پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دراصل جس طرح ایک زمانے میں فلسفہ کی حدود اس قدر پھیلی ہوئی تھیں کہ اس میں طبیعیات، حیاتیات، سائنس اور طب ۔۔۔ سبھی علوم سمٹے ہوئے تھے لیکن اب ان علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی حدود کا از سر نو تعین عمل میں آگیا ہے۔ اسی طرح نظم جو کسی زمانے میں کہانی، فلسفہ، دیومالا اور نظریاتی تبلیغ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اب نثر کی ترقی کے ساتھ اپنا دامن سمیٹنے پر مجبور ہو گئی ہے یوں بھی ہر زبان کے ادب کا مطالعہ یہ بات سمجھاتا ہے کہ نثر سے کہیں پہلے شاعری نے ترقی کی اور اسی لئے آغاز کار میں شعر نے داستان، قصہ، نظم، نجاد دیے جو بعد ازاں نثر کے حصے میں آئے جب نثر نظم سے وہ کام لینا جس کے لئے نثر موزوں ہے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اصل نظم یا یوں کہئے کہ شاعری کا منصب تو نثر کی ترقی کے بعد ہی پوری طرح واضح ہوا ہے شعر کا جو زور اب صرف یہ ہے کہ اپنے داخلی آہنگ اور ایقاع کے باعث قلبی واردات کو انعکاس کے عمل میں گرفتار کرنے کی صلاحیت شعر میں نثر پارے کی نسبت کہیں زیادہ ہے اور اسی لئے اس کا تاثر بڑی حد تک، خواصی کے عمل کے تابع ہے چنانچہ ادب میں شاعری کی یہ دیرینہ صنف دوسری اصناف کے مقابلے میں کہیں بڑے تخلیقی عمل سے گزرتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر اس کا تاثر بھی شدید اور دیرپا ہوتا ہے۔ طویل نظم میں تسلسل واردات و تاثرات نظریات و واقعات کے بیان سے ٹوٹ ہوتی ہیں اور وہ وحدت زمان و مکاں اور نتیجۃً وہ وحدت تاثر مجروح ہوتی ہے جو شعر سے لازمی ہے پس طویل نظم کو ایک وسیع اظہار کے طور پر اختیار کرنے سے پہلے ایک لمحہ کے لئے رکنے اور سوچنے کی

شدہ عزت ہے۔

گزشتہ سال کے دوران میں جہاں نظم نے ایک قدم آگے بڑھایا وہاں غزل کے بارے میں اگر یہ کہیں کہ اس نے اپنے مقام سے کوئی جنبش نہیں کی تو شاید زیادہ غلط نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غزل انحطاط پذیر ہو گئی بلکہ عرض اس قدر ہے کہ کئی برس کی مسلسل ترقی کے بعد پہلی بار اس میں کچھ ٹھہراؤ نمودار ہوا ہے جس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ غزل کو اب کیفیت کی "رد عمل" کا سامنا ہے اور یا یہ کہ "آگے بڑھیں گے دم لے کر" کے تحت غزل بھی ایک کروٹ لینے کے لئے رک سی گئی ہے۔ سال گذشتہ کی غزل کے مطالعے سے غزل کی اس رکی رکی کیفیت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ شاذ کچھ ہو دیں غزل کے موضوعات ایک "مشترکہ میراث" کی حیثیت رکھتے ہیں اور بیانیہ کی تصورات میں مماثلت اور ایک رنگی ہوتی ہے اور پچھلے برس کی مماثلت اور ایک رنگی کا احساس کچھ زیادہ ہی شدید ہے۔ روایت کا ارتکاسی سپرد تکرار اور تقلید کے باعث ایک حد تک کند ہو گیا ہے مثلاً پچھلے برس کی غزل کا ایک مجموعہ تصور ہیرو اور ہیروئن سے متعلق ہے۔ اس کی ایک بات کو لے کر سارے شعراء نے ذاتی، اخلاقی، قومی، اجتماعی کو قربان کیا۔ غزل کے کان گفت شنید میں مشغول بنا دیا گیا ہے حتیٰ کہ قریب قریب غزل کا ایک آدھ شعر اس تصور کے لئے وقف نظر آتا ہے۔ چند اور سوا کا موضوع ہے جو یوں تو شاید ہر دور کے زیادہ تر شعراء کا محبوب رہا ہے لیکن جب سے اب ہر طبقہ خیال نے اپنا لیا ہے اور اس شدت سے اپنایا ہے کہ بیشتر غزلوں میں کوئی نہ کوئی شعر "واعظ" کا منظر پیش کرتا ہے یا "نے والی" کی کسی کیفیت کو بیان کرتا ہے ——— غزل میں ان دونوں تصورات کے ساتھ ساتھ دوسرے تصورات بھی ہیں لیکن ان کا حال تو اور بھی برا ہے۔ ان کا تو شعری روایت کا ایک حصہ بن چکے ہیں ان میں سے ایک تو جنون اور آوارگی کا۔ جنون ہر جس کے تحت شاعر نے خود تو اعتدال و ضوابط اور بندشوں اور حد بندیوں سے سنڈیے نیازی کا اظہار کیا ہے۔ اس خاص رجحان کے تحت صوفی اور زاہد کو بھی بہت طنز بنایا گیا ہے کیوں کہ یہ لوگ تو اعتدال و ضوابط اور بندشوں اور حد بندیوں کے حمایتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کی مخصوص روایت نے بے نیازی اور دردمندی اسی رجحان کا نتیجہ ہے اور اسی سے غزل کا مخصوص مزاج بھی تشکیل پذیر ہوا ہے۔ بہر حال آج کی اردو غزل میں اس رجحان کے شواہد کی فراوانی ہے۔ دوسرا تصور حسن کے عالمگیر جذبے سے متعلق ہے۔ آج کی غزل کو بہت بڑا حصہ اس تصور کے مزار پیشاں کی نقاب کشائی کے لئے وقف ہے۔ عجیب بات ہے کہ پچھلے برس کی غزل میں جہاں پہلے دو تصورات تکرار اور تقلید کے باعث اپنے آخری پیمانے پر ایک حد تک گر بیٹھے ہیں وہاں موخر الذکر رجحانات تازگی اور غنائی کے حامل ہیں۔ پچھلے برس کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے مندرجہ ذیل اشعار چنے ہیں جن میں ان تمام رجحانات کی عکاسی موجود ہے ان اشعار میں سے کچھ قدغنیں پانے کے ہیں اور ان کے انتخاب کا دائرہ بھی وسیع ہے لیکن بعض اشعار محض رجحانات کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں بہر حال ان کے مطالعے سے سال گذشتہ کی غزل کا ایک خاکہ سامنے آتا ہے۔

کون سی یہ منزل ہے یارب — پاؤں نہیں جمتے رہبر کے — (عبا بھیم تیرت)
اب کہاں جائیں کدھر کا رخ کریں — رہزنوں نے بھی اٹھائے میں چراغ — (خلیل حشمتی)
کیا پوچھتے ہو رہبر و منزل کی سرگذشت — کچھ راہزن کی بات ہے کچھ راہبر کی بات — (تبسم)
نہ منزلوں کی خبر ہے نہ راستوں کا پتہ — بجھے بجھے ہیں کف دست راہبر کے چراغ — (عظیم کاشمیری)
ہم نے ہر سو جلا دیئے ہیں چراغ — فاصلے بے خطر گذر جائیں — (رضا ہمدانی)
منزل پاک ستارے ہیں سفر آباد — راہ صفر بھی راہبر ہے سفر آباد — (حفیظ صدیقی پاکستان)

نشانِ منزلِ مقصود پا ہی جائے ہم — شریکِ گامِ زمانے جو ہر بشر کے قدم — (نسیم شاہ کوی)
تجھے خدا جب کس سے بات کریں — اب کہیں اگر ہار بھی تو نہیں — (احسان دانش)
حیاتِ ابد آشنا ہے یہاں — سرِ دار آئے صدا کر چلے — (عارف عبدالمتین)
کہیں سرخروں ہو جادۂ دار و رسن میں ہم — یارو تمہارے دم سے ہے زنداں کا بھرم — (جلیل حشمی)
جس کو رس کے غم سا غم دنیا مشفق — وہی تربیت، وہ بزمِ حسن و دار بھی ہے — (مشفق خواجہ)
ذرا کو دیر جینے ہی گزری فرض ہی پر سمجھ — جنوں کو نیند آئی اور اکثر دار پر آئی! — (آغا نعمانی ثمّا)
یہ صدا سنتے ہی جاتے ہیں گریباں سب پھٹے — کوئی دن تا بہ گریباں سحر پہنچے گا — (شباب جعفری)
کوئی الزام نسیم سحری پر نہ گیا — پھل جنے پہ خطا دار اکیلا ٹھہرا — (وحید اختر)
درستو! اب سحر کو دو آواز — شب کی اک انتہا بھی ہوتی ہے — (مظہر امام)

—●—

اب یہ اشعار دیکھئے جن میں غم کے مقابلے میں رعنائی اور دلآویزی کا رجحان نمایاں ہے۔

احسان بہاروں کا اٹھائے نہ خزاں سے — دامن سے دامن چاک گریباں سے ہیں! — (قتیل شفائی)
رعنائی حیات ہمیں لوگ ہیں کہ ہم — پہنچا دیا کی جستجو میں بیاباں تک آئے ہیں — (ضمیر جعفری)
ہیں سخت جاں یہ شوق جنوں ہیں نکل چلیں — ہر ذرہ ہم کو چلتے ہے ہر گز ارادت — (جعفر ضیر ازکی)
ہم مسافر ہیں تھکن راہوں کی — چھاؤں دیکھی ہے تو آ بیٹھے ہیں — (افضل پرویز)
کیوں ہے دامانے پہ داغِ بے طلبی کا الزام — دشت میں سایہ دیوار کہاں ہوتا ہے — (صبا اکبر آبادی)
ہر خارِ دامنِ غم سے گنتے ہیں اہلِ غم — پرزے مری خرامِ نسیم چمن کے — (عزیز بلخی)
پہنچے فیضِ دشت نوردی کوئی ہم سے — جو خار کف پا تھا وہ تارہ رگِ جاں ہے — (کرم حیدری)
اہلِ خرد شاید ابھی آئے نہیں ہوں تو ہوں — اہلِ جنوں کا منتظر آج بھی کل بھی تھا — (آغا صادق)
دیکھو کہاں تک آشفتہ کرے دیدہ ور کو — وہی مسئلہ صاحبِ تکوان کی ہے — (ماجد)

آخری رجحان محبت کے کیف و کم یا دل کی واردات سے متعلق ہے اس رجحان کے تحت سال گذشتہ کے دوران میں بعض شعرائے نہایت خوب صورت اشعار کہے ہیں۔

میں تیری آرزو میں جہاں سے گذر گیا — اے دوست تو نے میری محبت کا کیا کیا — (یوسف ظفر)
ترے وصل و فراق کی کچھ پروا نہیں — سلسلۂ خیالِ یار جیسے اترتی آستیں — (فراق)
یہ کتنی ہوئی شامیں یہ کھنڈیا دل کے — دوستو بہت میں یاد تیری کہاں ہوتی ہے — (اختر ہوشیارپوری)
نثار ہم تیری اس طرزِ سپردگی کے مگر — جہاں دوست ہمارے تحت ہوئے تھی — (احمد فراز)
پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی — کوئی کانٹا سا چبھا ہے دل میں — (ناصر کاظمی)

خورشید جو تپکے گر سیری حرّہ پر — اٹھوے کوئی قطرہ مشہر تو نہیں ہے (حمید الماس)
یک بی شکل ہے سو رنگ گل ین باد — ایک ہی کلس کے سو کلس کے نیچے ہیں (حیدر علیم)
کبھی مسلسل ہو اور کبھی محون نیاز — اوے سادگی دست تیری عمر دراز (جمیل الدین عالی)
دل ہے مصروف گریۂ خاموش — آنکھ ہے عادت کی محتاج (جوہر نظامی)
تم زمانے کی راہ سے آئے — ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا (باقی صدیقی)
کل تھا آباد یہ دل صورت شہر — آج ہے کس پہ گماں جنگل کا (دولت سلطان)
آپ تشریف کا سر کا تکلف نہ کریں — میں تو بیٹھا جاؤں گا خود بات کی گرانی سے (عدم)
جنھیں دل کے اپنی خبر بھی نہیں — انھیں سے بہت دیر میں ہم ملے (محسن طاہر)
میں نے ہر شام یہی سوچا ہے — عمر گذری ہے کہ دن گذرا ہے (صادق نسیم)
اک تم ہو کہ پل بھر کو بھلائے نہیں جاتے — اک ہم ہیں کہ خود کو بھی نہیں آتے کبھی یاد (شہرت بخاری)
مژدہ ہم کو ہے نئے غم آشناؤں کا — جھک گئی شاخ اپنے ہی بار گراں سے (عبدالعزیز نزہت)
تو نے کس کو پیار کیا اور پردیسی محبوب — پگلی پتے پانی میں تنکے گاتے چھلاوا (نور بجنوری)
دل نے کیا کیا نہ پیرہن بدلے — ایک چھوٹی سی اتپ کے لئے (جمیل ملک)
ایک لمحے کی جسیں اور ہمیشہ کا سکوں — یاد اپنوں کی تکلیف ہی کیا ہوتی ہے (عدم)

غزل کے ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے غزل گو شعراء کے ہاں بعض موضوعات مشترک ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ غزل اپنے دور کے اجتماعی رجحانات کی عکاس ہوتی ہے اور اسی لئے ایک سی احساس یا کیفیت، لہجے اور انداز بیان کے فرق کے ساتھ مختلف شعرا کے ہاں ابھرتی ہوئی ملتی ہے۔ دوسرے غزل قافیہ اور ردیف کی پابند ہے اور بالعموم ایک قافیہ مختلف شعراء کے ہاں ملتے جلتے حیاتی تصورات کو مجسم دے دیتا ہے بے شک ایک رچے ہوئے غزل گو شاعر کے ہاں فکر و وجدان میں ہم آہنگی اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے (جیسا کہ مندرجہ بالا مستند اشعار سے ثابت ہوتا ہے) تاہم بالعموم جب مجموعۂ ایک باقاعدہ رجحان کی صورت اختیار کر جائے تو اس کی تازگی اور نئے پن کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اور اس کا تاثر لمحاتی پذیر ہو جاتا ہے چنانچہ آج کی غزل کے بعض اشعار میں جو "سپاٹ پن" نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ "کہنے کی بات" اور اس سے متعلقہ استعدادات اس درجہ عام ہو چکے ہوتے ہیں کہ اسے حیرت و استعجاب کی وہ قسم کی کیفیت حاصل ہی نہیں ہوتی جو شعر کے تاثر کی ضامن ہے۔ دراصل غزل کی اکائی شعر ہے اور یہ شعر بظاہر شدید مماثلت رکھتا ہے پھر جس طرح ایک کامیاب لطیفہ نوعات کو ضبع کے تاری کو ایک جھٹکے میں ہتک کر دیتا ہے اسی طرح غزل کا شعر جس وقت بھی کامیاب ہوتا ہے جب یہ تاری کو تجربہ اور اس کے تجربے کے مابین ایک جمالیاتی حظ بہم پہنچاتا ہے چنانچہ غزل کے ایک اچھے شعر کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس میں مختلف کیفیات، نشاۃ، تجربات اساسات کے مابین ایک ربط تناسب ہوتا ہے ـــــ یہی ربط جو تشبیہ کی جان ہے اور جو ناظر کو ایک قسم کی حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس کے بغیر اگر شعر بھی ایک بیان (Statement) تک محدود ہو تو یقیناً سپاٹ اور بے اثر ہوتا ہے آج کے بعض غزل گو شعراء کے ہاں غزل کے شعر کے فنی تقاضوں کو غزل کے عام مزاج پر قربان کر دینے کی جو رجحان معرض وجود میں آئی ہے اس سے غزل کو ایک بہت بڑا خطرہ درپیش ہے اور غالباً یہ ایک رجحان بھی شعر کے سپاٹ پن کا باعث ہے۔

نظم اور غزل کے علاوہ گذشتہ سال کے دوران میں سلیم سیتہ، اکرم انگار، ڈاکٹر مسعود حسین، سجاد ترمذی، اور تاج سعید نے اچھے گیت لکھے ہیں اختر انصاری نے قطعات کے لئے شہرت پائی لیکن پچھلے برس عارف عبدالمتین نے بھی کچھ اچھے قطعات پیش کئے ہیں ان قطعات میں سوچ کا تیکھا عنصر ہے ان کے علاوہ رفیق فاروقی نے غالب کے "ساقی نامہ" کو بڑی محنت سے اردو کا لباس پہنایا ہے۔

بس یہ ہے شعر کی شاعری کی مختصر سی روداد !!

○

جگر مراد آبادی

یہ میخانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

شکستِ دل شکستِ غم نہیں ہے
مجھے اتنا سہارا کم نہیں ہے

ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے
اسی میں کون سا عالم نہیں ہے

یقینِ عشق اگر محکم نہیں ہے
کوئی عالم پہ عالم نہیں ہے

ابھی ناکام ہے وردِ محبت
ابھی تک دم بدم پیہم نہیں ہے

تو پھر کیا ہے اگر یہ حسنِ فطرت
مآلِ لغزشِ آدم نہیں ہے

کہاں کا حسن اگر اٹھ جائے پردہ
حقیقت کیا اگر مبہم نہیں ہے

ارے او شکوہ سنجِ عمرِ فانی
یہ فانی زندگی بھی کم نہیں ہے

زباں سے کوئی کچھ کہہ لے پرائے دوست
ہر تسلیم کس کا خم نہیں ہے

تعاقب

(فرانسس جامس کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ)

آثر لکھنوی

میں اُس سے بھاگتا رہا دن رات متصل
محراب ماہ و سال میں ایوانِ وقت میں
پُرپیچ راستوں میں خود اپنے ضمیر کے
چادر کا آنسوؤں کی کبھی پردہ کر لیا
جھوٹی ہنسی کی آڑ میں چھپتا پھرا کبھی
زیرِ قدم کبھی تھے امیدوں کے مرغزار
کھاتا تھا ٹھوکریں کبھی خاروں میں خوف کے
پھنکاریں مارتی تھیں جہاں بھیڑی خلقتیں
مل جائے تاکہ چاپ سے اُن قدموں کی نجات
پیچھا جو کر رہے تھے مرا بے تھکے ہوئے
لیکن بغیر عجلت و اندیشۂ گریز
جیسے ہو سورما کوئی آمادۂ ستیز
رفتار جو تھی عزمِ مصمم کی ترجماں
مقدور بے پناہ کا دیتی تھی جو نشاں
قدموں کی آرہی تھی صدا اور ساتھ ساتھ
آواز جس میں ایک تحکم کی شان تھی
ہر شئی دغا کرے گی یونہی کہہ سے یاد رکھ
مجھ سے دغا پہ تو ہے کمربستہ جبر سب

ناکردہ جرم جیسے گنہ گار ہو کوئی
چاہا حریمِ دل میں کہیں اب پناہ لوں
ہاتھوں سے اپنے جس کو سجایا ہے امید نے
حرمِ اکرم کے جس میں جھروکے ہیں جا بجا
(واقف تھا لاکہ اُس کی مدت کے سوز سے
جو آرہا تھا میرے تعاقب میں سرگراں
تاہم یہ ڈر لگا تھا مبادا جو وہ ملے
اُس کے سوا پھر اور نہ کچھ مجھ کو مل سکے)
لیکن جہاں بھی کوئی جھروکا ذرا کھلا
کھلتے ہی کھلتے خوف سے اس کے وہ بند تھا
آمد تھی اُس کی یا کوئی جھونکا ہوا کا تھا
طاقت کہاں ہراس میں جو پیش پا سکے
یا اُس کی تُرکتاز سے دامن بچا سکے

سرگرم رم ہوا میں فضائے بسیط میں

دستک دی جا کے در پہ سنہری نجوم کے
پے در پے اُن کی بجتی سلاخوں پہ ضرب دی
دروازہ زرد چاند کا بھی کھٹکھٹا دیا
پیدا ہوئی رسیلی سی جھنکار خوشگوار
اور آس پاس بجتی تھیں چاندی کی گھنٹیاں
پھر یوں سپیدۂ سحری سے کیا خطاب
للہ جلد شام کا تبدیل کر لباس
انبار تازہ نیلوفری پھولوں کے لگا
یوں مجھ کو ڈھانک دے کہ محبت نہ پا سکے
بیباک و بے دریغ و خطیر و عظیم ہے
میں اس کی تاب لا نہیں سکتا کسی طرح
اپنی خفی نقاب میں مجھ کو لپیٹ لے
منت کی سب کی خادم الفت ہر ایک تھا
اُس سے وفا کی، یعنی وفا میرے ساتھ کی
ان کی تھی استواری تلون مرے لئے
پیمان مہر اُس سے مرے حق میں تھا فریب

تیزی طلب کی اُن سے جو چیزیں ہیں تیز گام
پٹسا ہوا کی سیٹی بجاتی ایال سے
فراٹے بھرتی بہتی تھی وحشت بھری پون
پہنائی سپہر کے سنسان دشت میں
اُس رتھ سے آسمان پہ تھرائی ناگہاں
جس میں تھے برق و رعد کے گھوڑے جتے ہوئے
چنگاریاں سی پہیوں سے اڑ کر چھٹک گئیں
پھینکوں سے جن کی گھوڑوں کے سم جھلجھلا اٹھے

طاقت کہاں سراس میں جو تاب لا سکے
الفت کی ترکتاز سے دامن بچا سکے
پیہم بغیر عجلت و اندیشہ گریز،
جیسے ہو سورما کوئی آمادۂ ستیز
رفتار جو تھی عزم مصمم کی ترجماں
مقدور بے پناہ کا دیتی تھی جو نشاں
قدموں کی آ رہی تھی صدا اور ساتھ ساتھ
آواز جس میں ایک تحکم کی شان تھی
کس کی ہے یہ مجال کہ اُس کو پناہ دے
مجکو قبول کرنے میں ہے پیش و پس جسے

توبہ کی میں نے اونچی اڑانوں سے چرخ کی
دوشیزہ اور مرد کے بھی حسن سے پھرا
البتہ چھوٹے بچوں کی آنکھوں میں تھی وہ چیز
جس سے سکوں پذیر ہوں بیتابیاں مری
یہ تو مرے لئے ہیں۔ یقیناً مرے لئے
کھڑوں کو اُن کے اپنی طرف پھیرا پیار سے
لیکن جہاں طلوع ہوئی اُن میں وہ چمک
جو میری دھڑکنوں کا حقیقت میں تھی جواب
اُن کے نہ تھے چھین کے بچوں کو لے گئے
اچھا اب آئیں دوسرے اطفال خرد سال
زائیدگان فطرت آزاد و بے نقاب
اب میں ہوں اور تمہاری نزاکت کی دلکشی
ہونٹوں سے ہونٹ مل کے تمہیں دوں نوید نو
آؤ میں تم کو پیار کروں لے کے گود میں

اور مادرِ زمیں کی بھی زلفیں سنوار دوں،
معروفِ عیش اُس کے محل میں ہوں اس کے ساتھ
(دیواریں جس محل کی ہوا نے اُٹھائی ہیں)
اور رنگِ لاجورد کے سائے میں بیٹھ کر
بے فکر ہو کے خوب لنڈھاؤں شرابِ ناب
ایسے قدح سے جس کو بنایا ہے دلفروز
الماس اشک و نور سحر سے تراش کر

مشکور میری سعی ہوئی قصہ مختصر
اب میں تھا اور صحبتیں کیا کیا مزے کی تھیں
فطرت کا راز وار تھا میں وہ مری جلیس
آئینہ مجھ پہ سارے تغیرِ فلک کے تھے
کیونکر زمانہ رنگ بدلتا ہے، علم تھا
اٹھتا ہے ابر بحر خروشاں سے کس طرح
خرّم خرے اُس کی جھاگ میں ہو ہو کے مضمحل
ہر زندگی نے مجھ میں نئی روح پھونک دی
ہر مرگ نامراد نے افسردہ کر دیا
بنتا تھا یوں مجسمہ بدلتے مزاج کا:
فریاد تھی لبوں پہ، کبھی نغمہائے قدس
کوئی جو غوش ہوا تو مجھے بھی خوشی ہوئی
کوئی ہوا ملول تو آنسو ٹپک پڑے
ہوتا تھا میں بھی شام کے ہمراہ سوگوار
جب وہ دیئے جلاتی تھی دن کے مزار پر
جس میں تھیں دفن دن کی جوانگ حسرتیں
ہنستا تھا روئے صبح شگفتہ کو دیکھ کر

سمجھتی تھی اپنے رنگ محل کو وہ جس گھڑی
نمگیں کہ شاد کرتی تھیں موسم کی حالتیں
میں اور آسمان تھے اک ساتھ گریہ ناک
میٹھے تھے اُس کے اشک سلونے تھے میرے اشک
غالب بے ساختوں پہ تھیں میری ملاحتیں
تپتا تھا دل سپہر کا جب شکل مہر میں
(وہ دل جو فرطِ شوق سے آٹھ کو خوں ہوا)
رکھ دیتا تھا میں اپنا بھی دل اُس کے پاس ہی
اور یوں کہ ایک ساتھ دھڑکتے تھے دونوں دل
تاہم جو میرے دل کی خلش تھی نہ مٹ سکی
رخسار زرد صبح کا بیکار تر کیا
افسوس گو مگو ہی گفتار رہ گئی
اُن کی زبان اور ہے میری زبان اور
میں بولتا ہوں لفظوں میں اور اُن کی گفتگو
اک جنبشِ لطیف کہ گہرا سکوت ہے
سوتیلی ماں کی طرح یہ فطرت ہے ناشناس
اس کے بجھائے بجھ نہ سکی میری تشنگی
دنیا جو چاہتی ہے مجھے خلعت قبول
تو چھینک دے اتار کے یہ نیلگوں نقاب
پھٹی ہوئی ہے سینہ دلسر سے جو تہ بہ تہ
لبریز مہر سینہ شفاف دیکھ لوں
اب تک نہ اس سے شیر میسر ہوا مجھے
کانٹے پڑے ہوئے ہیں مرے خشک حلق میں
دنبالہ گرد جو تھا وہ آیا قریب تر
لیکن بغیر عجلت و اندیشہ گریز

جیسے ہو سورما کوئی آمادۂ ستیز
رفتار جو تھی عزم مصمم کی ترجماں
مقدور ہے پناہ کا دیتی تھی جو نشاں
قدموں کی آرہی تھی صدا اور ساتھ ساتھ
آواز جس میں شانِ تحکم کی تیزی تھی
خوشنود ہو کسی سے یہ امکان ہی نہیں
خوشنود جو مجھے نہ کسی طرح کر سکا

عریاں و یکسانہ یہاں منتظر ہوں میں
کھائے کو دستِ عشق سے اب سامنے کی چوٹ
ایک ایک کر کے چھین لیے میرے اسلحہ
اور پاش پاش کر دیا میرے غرور کو
طاقت ہے بھاگنے کی نہ ہمت ہے جنگ کی
قدموں میں تیرے سر کو جھکائے پڑا ہوں میں
ناگاہ ایک نیستد کا جھونکا سا آگیا
کھولی جو آنکھ زیست تھی داغ رہ سنگی،
اُس وقت اپنی اندھی جوانی کے زور میں
میں نے ستون وقت کے گویا ہلا دیئے
جس زندگی پہ ناز تھا خود اُس کو ڈھا دیا
کھنڈروں میں عہد رفتہ کے اب ایستادہ ہوں
آلودۂ غبار بانداز نقش پا۔
کچلا ہوا شباب بھی مدفون ہے یہیں
آکش زدہ حیات دھواں بن کے اڑ گئی
جیسے حباب کرنوں کو لے کے گود میں
ابھریں، اُبھر کے پھوٹ بہیں سطح آب پر

دنیا خیال و خواب کی افسانہ ہو گئی
مطرب ہے اور نغمہ نہ مضراب و ساز ہے
وہ گلفشانیاں ہیں نہ شیوا بیانیاں
جو کھینچے ذہن کی ملتا ہیں کہاں وہ فکر
بارِ الم نے خاک سے ہموار کر دیا

کیا واقعی ہے تیری محبت اَمَر وہ بیل
دائم ہے جس کی گود گلوں سے بھری ہوئی
لیکن ہے ناگوار کہ گل اور بھی کھلیں
جھومیں بھی اور سر بھی اٹھائیں تری طرح
اے تو کہ تیری صنعتوں کی کوئی حد نہیں
مانند چوب خشک اُسے پھونکتا ہے کیوں
خالی ہے بیل بوٹوں سے اب تک جو زندگی
کیا نذر خاک ہونے کو تھی میری زندگی
ہلکی سی اک پھوار میں جو ختم ہو گئی
فوارۂ شکستہ ہے اب میرا دل کہیں
جس میں فسردہ اشک بھرے میں بجائے آب
اور اشکوں کا خزانہ ہیں نمناک کچھ خیال
سردی سے جو ٹھٹھر گئے ہیں نخل روح پر
اور روح سے نکلتی ہیں گھٹ گھٹ کے سسکیاں
یہ جس کی ابتدا ہے تو انجام کار کیا
جب مغز اتنا تلخ ہے کیا پوست کی خبر
اندازہ ہے خفیف سا اُس کا نماں جو ہے
دُھندلاہٹوں میں وقت کی ہے جس کا شائبہ
پرچھائیں لرزے سرمئی پڑے پہ جس طرح

یونہی ہفتہ شہر پناہ دوام سے
ہوتی ہے گاہ گاہ ندا ایک گوشۂ
دم بھر کو جس سے چھٹتی ہے تاریکی فضا
برج و فصیل کی نظر آتی ہے اک جھلک
چھایا ہوا تھا آہ وہی کہر بعد ازاں
دوران میں اسی کے نظر وہ بھی آگیا
ملبوس سوگواروں کا تھا جس کے زیب تن
اور اک دھنک کے رنگ کا تھا تاج فرق پر
واقف ترے پیام سے ہوں جانتا ہوں ہم
انسان کا دل ہو یا کہ ہو انسان کی زندگی
جس سے کہ جمع ہوتا ہے خرمن ترے لیے
کیا یہ بھی ہے ضرور کہ اس کشت زار میں
اس موت کی بھی گھاس ہو جو ہے سڑی ہوئی

آخر ہوا طویل تعاقب کا اختتام
اب میں تھا اور گرد و عزیو اس صدا کا تھا
(جیسے ہو تختہ پارہ پتھیروں میں موج کے)
کانوں میں آرہی تھی یہ آواز متصل
کیا ہے تری نما دہاں تک زبوں سرشت
کیا اس قدر شکست کی آماجگاہ ہے
فرزانگی ہے یہ کہ سفاہت ہزار حیف
ہر سٹے کو اجتناب نہ ہو تجھ سے کس طرح
جب مجھ سے احتراز ہے پندار کو ترے
قابل نہ کیوں ہو رحم کے پھر تیرا حال زار
ناکارہ و عجیب ہے اے بدنصیب تو

کس کو غرض ہے تجھ پہ محبت کرے نثار
وہ اک نہیں ہوں قدر جسے تا کسی کی ہے
انساں کا اُنس تو ہے فقط اس پہ منحصر
دل اُس کو دیجئے کہ جو ہو آشنائے دل
تبلا کہ عشق اس کا سزاوار کس طرح
اے تو کہ گیلی مٹی میں ہے کثیف ہے
بیگانہ اس قدر ہے کہ یہ حس نہیں رہی
تو ہے بھی یا نہیں ہے محبت کا مستحق
وہ کون ہے جو چاہے گا تجھ سے ذلیل کو
لاوہ ایک میں ہوں نہیں کوئی دوسرا
جو کچھ بھی میں نے تجھ سے لیا اس لئے لیا
میری اماں میں آئے تو اُس کی تلاش میں
مقصود تیرا نفع تھا منشا زیاں نہ تھا
سمجھا ہے رائگاں جسے تیری دیت وہ ہے
اٹھ میرا ہاتھ تھام کہ تجھ کو ملے پناہ

قدموں کی چاپ ختم ہوئی چھائی خامشی
کیا سایہ اُس کے ہاتھ کا تھا تیرگی نہ تھی
وہ ہاتھ جو دراز تھا تسکین کو مری.....
ناگاہ آئی کان میں جاں بخش یہ صدا
مشتاق و کور دیدہ و نا فہم و ناتواں
جس کی تجھے تلاش تھی وہ میں ہوں اے گماں
کھاتا تھا خوف آتے جو میرے حضور تو
اپنے سے کر رہا تھا محبت کو دور تو

○

احمد ندیم قاسمی

تیری محفل بھی مداوا نہیں تنہائی کا
کتنا چرچا تھا تری انجمن آرائی کا

داغ دل نقش ہے اک لالۂ صحرائی کا
یہ اثاثہ ہے مری بادیہ پیمائی کا

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

وہ تصور ہم کی قوسیں ہوں کہ محرابِ حرم
ہر عقیدت میں ملا حسن تری انگڑائی کا

افقِ ذہن پہ چمکا ترا پیمانِ وصال
چاند نکلا ہے مرے حالتِ تنہائی کا

بھری دنیا میں فقط مجھ سے نگاہیں نہ چرا
عشق پر بس نہ چلے گا تری دانائی کا

ہر نئی بزم تری یاد کا ماحول بنی
میں نے یہ رنگ بھی دیکھا تری یکتائی کا

ہوک اٹھتی ہے جو دل میں تو غزل کہتا ہوں
میرے غم پر بھی ہے پرتو تری رعنائی کا

○

احمد ندیم قاسمی

فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو
جتنے دور جاتے ہو، اُتنے پاس آتے ہو

رات ٹوٹ پڑتی ہے جب سکوتِ زنداں پر
تم مرے خیالوں میں چھپ کے گنگناتے ہو

جب تنی سلاخوں سے جھانکتی ہے تنہائی
دل کی طرح پہلو سے لگ کے بیٹھ جاتے ہو

میرے کوئے غم کے آہنی دریچوں پر
اپنی مسکراہٹ کی مشعلیں جلاتے ہو

تم مرے ارادوں کے ٹوٹتے ستاروں کو
یاس کی خلاؤں میں راستہ دکھاتے ہو

کتنے یاد آتے ہو، میں تمھیں بتاؤں کیا
جتنے یاد کرتے ہو، اُتنے یاد آتے ہو

○

اختر انصاری

یہ صنم روایت و نقل کے ہبل و منات سے کم نہیں
ترا فکر و اعظِ حق نوا کسی سومنات سے کم نہیں

کہیں برق چمکے ہیں جل اٹھے کوئی تار ٹوٹے ہیں رو پڑے
یہ دلِ ستم زدہ ہم نشیں! دلِ کائنات سے کم نہیں

کہیں رنگ و نورِ جمال ہے کہیں بیم و فکرِ مآل ہے
کبھی شامِ عیشِ صبیح ہے کبھی دن بھی رات سے کم نہیں

جسے کہئے رقصِ شرارِ غم، وہ اگر ہو شاملِ غم تو پھر
غمِ دل ہو یا غمِ زندگی، غمِ کائنات سے کم نہیں

یہ سرودِ اخترِ دل زدہ، رہِ عزم بادہ و شباب ہے
یہ بلند ہوتی ہوئی فغاں علمِ حیات سے کم نہیں

قطعات

اختر انصاری

اندوہِ جمیل

برقِ ضبطِ فغاں کی زمزمہ باری تو دیکھ
اشکِ پنہاں کی نظر افروز گل کاری تو دیکھ
پیار آجائے تجھے بھی اے مشیت تو سہی
میرے اندوہِ تمنا کی طرح داری تو دیکھ

انتہائے بے کسی

حسرتیں ہی حسرتیں ہیں، ولولہ کوئی نہیں
آرزوئیں ان گنت ہیں، آسرا کوئی نہیں
داد دے بارِ خدا! اس بیکسی کی داد دے
دل ہے لبریزِ فغاں، اپنا خدا کوئی نہیں

چند لمحے

مدتوں برسیں گے اختر میری آنکھوں سے خمار
آہ! میرے زخمِ دل برسوں لہو ٹپکائیں گے
چند لمحے خوں نشاں بھی اور خوں آلود بھی
عمر بھر یاد آئیں گے ہاں عمر بھر یاد آئیں گے

گریۂ خندہ نما

اپنے ناسوروں میں یوں نشتر چبھونا چھوڑ دے
زہرِ غم کو یوں رگِ جاں میں سمونا چھوڑ دے
آبشارِ اشکِ خوں میں صاف تیرے قہقہے
آہ! اختر میری جاں! اس طرح رونا چھوڑ دے

حلاوتِ غم

گردشِ گردوں گرداں آچکی ہو جس کو راس
خونِ دل کے ساغروں سے بھر چکی ہوں جس کی پیاس
اُس کے احساسِ حزیں کی عہدہ آگہی نہ پوچھ
جس نے غم کے سمِ قاتل سے نچوڑی ہو مٹھاس

تہی دلانی

درد آگیں ناکسی کی بات ہی کچھ اور ہے
پُر الم بے مائگی کی بات ہی کچھ اور ہے
ایک بے پایاں خلا ہے تو بھی گو اے آسماں!
میرے داماں تہی کی بات ہی کچھ اور ہے

اندیشہ ہائے دُور و دراز

قتیل شفائی

یہ جھومتی ہوئی ترے خلوت کدے کی شام
میں تیرے سامنے ہوں مرے سامنے ہے جام
وہ جام جس کی لوح پہ لکھا ہے تیرا نام
کچھ سوچنے لگا ہوں میں یہ جام دیکھ کر

یہ جام جس میں تو نے بھری ہے شرابِ ناب
کیوں آج بن رہا ہے مری روح پر عذاب
لے کر یہی تیرے ہاتھ سے نذرانۂ شباب
تھرا رہا ہوں روح میں کہرام دیکھ کر

یہ جام مجھ پہ قہقہہ زن ہے کچھ اس طرح
میں بھی کسی فریب کی زد میں ہوں جس طرح
حیران ہوں کہ اب اسے جھٹلاؤں کس طرح
میں اپنے پیشروؤں کا انجام دیکھ کر

وہ میرے پیشرو، وہ ترے طالبِ جمال
کرتے رہے ادا جو تری قیمتِ وصال
یہ جام بھی انھیں کی نوازش کا ہے کمال
جو ہنس رہا ہے مجھ کو تہِ دام دیکھ کر

میں سوچتا ہوں وہ مرا مجموعۂ کلام
منسوب کر چکا ہوں جسے میں بھی تیرے نام
کیا جانے میرے بعد سنائے گا کس کی شام
مجھ کو اسیرِ گردشِ ایام دیکھ کر

اِس بستی کے اِک کُوچے میں

ابنِ انشا

اِس بستی کے اک کوچے میں اک انشا نام کا دیوانا
اِک نار پہ جان کو ہار گیا، مشہور ہے اُس کا افسانا

اُس نار میں ایسا رُوپ نہ تھا، جس روپ سے دن کی دھوپ دبے
اس شہر میں کیا کیا گوری ہے، مہتاب رُخے، گلنار لبے،
کچھ بات تھی اُس کی باتوں میں کچھ بھید تھے اُس کی چتون میں
وہی بھید کہ جوت جگاتے ہیں کسی چاہنے والے کے من میں
اُسے اپنا بنانے کی دُھن میں، ہوا آپ ہی آپ سے بیگانا
اس بستی کے اک کوچے میں، اک انشا نام تھا دیوانا

ناچنچل کھیل جوانی کے، ناپیار کی اٹھکھیلیاں تھیں
بس راہ میں ان کا ملنا تھا، بس فون پہ ان کی باتیں تھیں
اس عشق پہ ہم بھی ہنستے تھے، بے حاصل سا بے حاصل تھا

اک زور بھرے ساگر میں، نے کشتی تھی، نے ساحل تھا
جو بات تھی ان کے جی میں تھی، جو بھید تھا یکسر انجانا
اس بستی کے اک کوچے میں، اک انشا نام تھا دیوانا

اک روز مگر برکھا رُت میں، وہ بھادوں تھی یا ساون تھا
دیوار پہ بیچ سمندر کے، یہ دیکھنے والوں نے دیکھا
مستانہ ہاتھ میں ہاتھ دیے، یہ ایک کگر پر بیٹھے تھے
جب شام ڈھلی، جب چاند چڑھا، جب سیلانی گھر لوٹ گئے
کیا رات تھی وہ — جی چاہتا ہے اُسی رات پہ لکھیں افسانا
اس بستی کے اک کوچے میں اک انشا نام تھا دیوانا

وہیں عمر کا ساتھ نبھانے کے تھے عہد بہت، پیمان بہت
پر ان پہ بھروسا کرنے میں کچھ سُود بھی ہے؟ نقصان بہت
وہ نار یہ کہہ کر دُور ہوئی — 'مجبوری سی مجبوری'
یہ وحشت سے رنجور ہوئے، اور رنجوری سی رنجوری؟
اُس روز ہمیں معلوم ہوا، اس شخص کا مشکل سمجھانا
اِس بستی کے اک کوچے میں، اک انشا نام تھا دیوانا

گو آگ سے چھاتی جلتی تھی، گو آنکھ سے دریا بہتا تھا
ہر ایک سے دُکھ نہیں کہتا تھا، چپ رہتا تھا غم سہتا تھا

نادان ہیں وہ جو چھیڑتے ہیں، اس عالم میں نادانوں کو
اس شخص سے ایک جواب ملا، سب اپنوں کو، بیگانوں کو
کچھ اور کہو تو سنتا ہوں، اس باب میں کچھ مت فرمانا
اس بستی کے اک کوچے میں اک انشا نام تھا دیوانا

اب آگے کا تحقیق نہیں، گو سننے کو ہم سنتے تھے
اُس نار کی جو جو باتیں تھیں، اُس نار کے جو جو قصے تھے
اِک شام کو اُس کو بلوایا، کچھ سمجھایا بیچارے نے
اُس رات یہ قصہ پاک کیا، کچھ کھا لیا اُس دکھیارے نے
کیا بات ہوئی، کس طور ہوئی، اخبار سے لوگوں نے جانا
اس بستی کے اک کوچے میں، اک انشا نام تھا دیوانا

ہر بات کی کھوج تو ٹھیک نہیں تم ہم کو کہانی کہنے دو
اُس نار کا نام مقام ہے کیا، اس بات پہ پردا رہنے دو
ہم سے بھی تو سودا ممکن ہے تم سے بھی جفا ہو سکتی ہے
یہ اپنا بیاں ہو سکتا ہے، یہ اپنی کتھا ہو سکتی ہے
وہ نار بھی آخر پچھتائی، کس کام کا ایسا پچھتانا
اس بستی کے اک کوچے میں اک انشا نام تھا دیوانا

کوئٹے تک

مجید امجد

صدیوں سے راہ تکتی ہوئی گھاٹیوں میں تم
اک لمحہ آکے ہنس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا!

ان وادیوں میں برف کے چشموں کے ساتھ ساتھ
پگ پگ شرر برس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا

راتیں ترائیوں کی تہوں میں لڑھک گئیں
دن دلدلوں میں دھنس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا

راہیں دھوئیں سے بھر گئیں، میں منتظر رہا
قرنوں کے رُخ جھلس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا

تم پھر نہ آسکو گے، بتانا تو تھا مجھے
تم دور جا کے بس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا

(۲)

برس گیا بہ خرابات آرزو، ترا غم
قدح قدح تری یادیں، سبو سبو ترا غم

ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
اِک رہا تھا زمانے میں سُو بہ سُو ترا غم
غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈھتی کرن تری لَو!
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبجو ترا غم!
ندی پہ چاند کا پرتو، ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو، ترا غم!
ہیں جس کی رَو میں شگوفے، وہ فصلِ غم، ترا دھیان
ہے جس کے لمس میں ٹھنڈک، وہ گرم لَو، ترا غم
نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نے بہ لب تری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جو، ترا غم!
طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیِ شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم!
نگہ اٹھی، تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی، تو مرے دل کے رُوبرو ترا غم

جمہور نامہ

جگن ناتھ آزاد

جمہور نامہ کے عنوان سے آزاد ایک مستقل تصنیف کہہ رہے ہیں۔ ایک باب پہلے بھی نقوش میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ دو باب بھی اس کتاب کے غیر مطبوعہ حصے ہیں۔ حرف اول اس کتاب کا دیباچہ اور "بنام ابن آدم" انتساب ——!

حرفِ اوّل

نظریۂ ارتقا

"عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے"
(اقبال)

یہ مانا ابتدائے آفرینش راز ہے اب تک
صدا جس سے نہیں نکلی ہے ایسا ساز ہے اب تک
مگر تاویلِ خاموشی ازل کے دن سے جاری ہے
کبھی ذہنوں پہ طاری ہے کبھی روحوں پہ طاری ہے
کلام اللہ کی، انجیل کی، ویدوں کی تفسیریں
دکھاتی ہیں سب اپنے رنگ سے ظلمت میں تنویریں
یہ لیکن آج اک دانشورِ افرنگ کہتا ہے
کہ عالم ایک موجِ ارتقا کی روپہ بہتا ہے[1]
علومِ امروز کے جتنے بھی جسمی یا حیاتی ہیں
یہ وہ شمعیں ہیں جو اس ارتقا سے نور پاتی ہیں

---

[1] چارلس رابرٹ ڈارون (۱۸۰۹ء-۱۸۸۲ء) انگریز ماہر فطرت و ماہر نباتات و حیوانات ہیں جنہوں نے نباتات و حیوانات کے متعلق نظریۂ ارتقا پیش کر کے علمی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا اور سائنس دانوں کے لیے سوچ بچار کی نئی راہیں کھول دیں۔ انواع (عرض مواليد كاملة ۱۸۵۹ء) اور نسبِ آدم (۱۸۷۱ء) انکی مشہور تصانیف ہیں۔
[2] ارتقاء وہ ہے جس کے نظریۂ ارتقا کی طرف جسے آکسفورڈ ڈکشنری کے الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جسمی کیفیت بار آور کرنے کے فعل کی خارج میں بلکہ ہر جسمانی کیفیت اپنی بقا کی خاطر ارتقائی عمل ہے۔ ڈارون کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان حیوان کی ایک ارتقائی صورت ہے۔ حیوانی زندگی جدید تنازع للبقا میں مصروف رہتی ہے۔ اس تنازع للبقا کی بدولت حیوانوں میں خود بخود وہ خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو حیات کی بقا اور تسلسل کے لیے ضروری ہیں۔ اس نظریہ کو اس نے بقائے بہتر کا نام دیا ہے۔ نظریۂ ارتقا جس کے مطابق انسان حیوان ہی کی ارتقا پذیر صورت ہے۔ حتیٰ کہ نظریۂ بقائے بہتر بھی کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ جتنے فلسفے ارضی ہیں تاریخی کہ اخلاقی
خرد کی بزم کے یہ ساغر و یہ مے باقی
جمودِ مادہ کی بحثیں جسم و روح کی باتیں
ریاضت کے یہ دن یہ اتقاد و نہد کی راتیں
جو کہتا ہے یہ دانشور اثر انداز ہے سب پر
یہ ایسا گلستاں ہے جو ثمر انداز ہے سب پر

نہ جانے کتنی صدیوں کی پرانی یہ حقیقت ہے
کہ یہ عالم یہ دنیا ارتقا ہی سے عبارت ہے
کبھی وہ دن بھی تھے یہ مادۂ بے جان تھا گویا
دلِ گیتی میں اک سویا ہوا ارمان تھا گویا
اسی ارمان سے حالات میں حرکت ہوئی پیدا
اسی حرکت کے باعث خاک میں برکت ہوئی پیدا
کچھ اس انداز سے پیدا ہوئیں تبدیلیاں طبعی
ابھر آیا جمودِ مادہ سے اک جسمِ حسیں طبعی
حیاتِ مادہ نے ارتقا کی رمز پہچانی
تو پھوٹیں اس سے دو شاخیں نباتی و حیوانی
یہ شاخیں ارتقا کا راز سمجھاتی رہیں دونوں
الگ اک دوسرے سے زندگی پاتی رہیں دونوں
بقولِ علم نو دونوں میں تھی جو شاخِ حیوانی
اُسی کے ارتقا کا روپ ہے یہ شکلِ انسانی

ادھر تو ارتقا جاری تھا طبعی بھی حیاتی بھی
ادھر طے ہو رہی تھیں منزلیں اخلاقیاتی بھی
کہوں کیا داستانِ ارتقائے بزمِ انسانی
اشاروں ہی میں اب کہہ دوں کہ یہ قصہ ہے طولانی
ادھر طبعی ادھر اُس کی معاشی زندگی بدلی
بالآخر رفتہ رفتہ کائناتِ آدمی بدلی
یہ جتنا ارتقا ہے خیر مبہم ایک نقشہ ہے
کہ روزِ ابتدا سے اک تسلسل کارفرما ہے
بشر جب اک سماجی دور کی حد پار کرتا ہے
تو اتنا ہی وہ ذہنی طور پر اونچا ابھرتا ہے
بشر کا ہر سماجی دور اک دورِ عبوری ہے
تغیرِ علم میں قانون میں فن میں ضروری ہے

اسی تغیر پر علم و ہنر ہی کا نتیجہ ہے
مذاقِ جستجو کے اس سفر ہی کا نتیجہ ہے
خرد بار یک سے باریک تر ہوتی گئی آخر
یہ دنیا مختصر سے مختصر ہوتی گئی آخر
سیاسی یا سماجی کش مکش ہو غرب میں پیدا
تو اس سے دور رہ سکتی نہیں ہے شرق کی دنیا
ہمیں اب دیکھنا یہ ہے مسائل آج کے کیا ہیں
تقاضے آج کے کیسے ہیں ساحل آج کے کیا ہیں
سکھائے عقل کے چھوڑیں جنوں کے تند دھاروں پر
کہ انسانی عزائم ایک دن پہنچیں کناروں پر
مٹا دیں یہ جو انسانوں میں ہے تفریقِ طبقاتی
ستاروں کی بلندی کو چھوئے تنویرِ ذرّاتی
نجاتِ واقعی جنگوں سے پائے یہ جہاں کیونکر
فضا میں پرفشاں ہر چشم امن و اماں کیونکر
یہ مایوسی کے طوفانوں میں امیدوں کی تحریریں
یہ ہیں دیروز کی امروز کی، فردا کی تصویریں،

یہ سب کس نہج پر کس طرح ہو اور کیونکر ہو
دماغ آدمی کی کس طرح سائنس رہبر ہو
خرد کہتی ہے اُٹھنے ہی کو ہے اب بُعد کا پردا
چمکنے کو ہے نورِ علم سے اب چہرۂ فردا
اندھیرا حال کا ہے ضامنِ تنویرِ مستقبل
اٹھانے ہی کو ہے اب آدمی تعمیرِ مستقبل

بہ نامِ ابنِ آدم

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد در زوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ خوں پُر خوں شود روزے

بشر کے نام سے آغاز ہے جمہور نامے کا
بشر کی عظمتوں کا ذکر ہے مقصور خامے کا
بشر کیا ہے یہ جانے گا کہاں آیا کہاں سے ہے
یہ بطنِ خاک سے ہے یا فرازِ آسماں سے ہے
یہ خاکی ہے کہ افلاکی ہے نوری ہے کہ ناری ہے
یہ کس مقناش کے ذہنِ رسا کی پختہ کاری ہے
یہ آب و خاک و باد و نار کا پیکر بھی کیا شے ہے
کہ خود ساقی ہے خود میکش ہے خود ساغر ہے خود مے ہے
سفینہ بھی سفینہ راں بھی ہے طوفاں بھی ساحل بھی
ہے خود عزمِ سفر بھی جادۂ منزل بھی منزل بھی
یہ دریا کا تلاطم بھی ہے دریا کا کنارا بھی
خدف بھی کہنے یہ سیرا بھی ہے نورہ بھی ہے تارا بھی
شرارے کا تبسم بھی فروغِ جاودانی بھی
یہ تنویرِ زمینی بھی ہے نورِ آسمانی بھی
یہ خود ہی کارواں خود ہی امیرِ کارواں بھی ہے
یہ بزمِ کُن کا افسانہ بھی ہے افسانہ خواں بھی ہے
امنگوں کا عزائم کا ممکنا گلستاں بھی ہے
گلستاں کے لیے خود ہی بہارِ جاوداں بھی ہے
قلم کا خد بھی ہے تیشہ بھی ہے یہ میتوں بھی ہے
خود آرا کو رکھ کر بھی ہے یہ جوشِ جنوں بھی ہے
عمل کے ذوق کا پیکر ہے ناخ بحر و بر کا ہے
چمن آرائے آبِ گل ہے نافہ خشک و تر کا ہے
اسی کے نور سے ہے عالمِ امکاں کی تابانی
یہی انسان یہی آدم یہی حسنا کی یہی خانی
اسی کے ذکر سے آغاز ہے جمہور نامے کا
یہی ہمدم یہی دمساز ہے جمہور نامے کا

○

عبدالمجید حیرت

اور تو کیا اب امکاں ہوگا
وہ ہی دل کا درماں ہوگا
اُن کی طرف سے پُرسشِ غم کا
ہوگا جس کو ارماں ہوگا
ہم کو ہمارے حال پہ چھوڑیں
چارہ گروں کا احساں ہوگا
موسمِ گل ہی شرط نہیں ہے
یوں بھی چاک گریباں ہوگا
ہوگا ناصح ناداں، لیکن
ایسا بھی کیا ناداں ہوگا
کارِ محبت، اِتنا مشکل!
ہم سمجھے تھے آساں ہوگا
کشتی ہوگی اور تلاطم
ہم ہوں گے اور طوفاں ہوگا
اب تو عدم الزامِ تمنا
صرف لبوں پر چسپاں ہوگا
ہنس و نوا بے مصرف ٹھہری
اب دل کس پر نازاں ہوگا
چھوڑ بھی دیں اُن کو، تو بتاؤ
اس میں کس کا نقصاں ہوگا
کیا معلوم، ابھی دل، حیرت
کتنا اور پریشاں ہوگا

○

میکش اکبرآبادی

حسن ہی حسن ہے ہستی میں رعنائی ہی رعنائی
یکساں ہے اک پھول کھلایا ایک کلی مرجھائی

بادل جھومے سبزے لہکے اور مہکے گلزار
دل سے میرے لہر اُٹھی یا زلف تری لہرائی

سوئی ہوئی موجوں کو تم تو چھیڑ کے راہ لگے اپنی
اب یہ تم سے کون کہے کیا موجوں پر بن آئی

باغ سنے اور سن لے مالی پھول سنے اور ڈالی
سارا گلشن سوکھے گا گر ایک کلی کمھلائی

دُنیا کو گلزار بنا دوں چاہے آگ لگا دوں
سب ہیں میرے دل کی زد میں کیا پربت کیا رائی

راتیں چھوٹی لاکھ افسانے جن کا اور نہ چھور
کہنے والا کس سے کہتا نیند سبھی کو آئی

بت خانے سے کیا نسبت کعبے سے بھی رو موڑ آئے
کس کس پر الزام رکھیں ہم خود ہی تھے ہرجائی

○

غلام ربانی تاباںؔ

لب پہ ہنسی جو آئی حیا اور بڑھ گئی
اللہ رے درگزر کہ سزا اور بڑھ گئی

رب بہار رکھ لے میری وحشتوں کی شرم
آوارگی باد صبا اور بڑھ گئی

اہلِ وفا سے رنجشِ بیجا کے ساتھ ساتھ
اہلِ ہوس کی مدح و ثنا اور بڑھ گئی

جو لانگہ بشر ہے سوادِ مہ و نجوم
ٹکرنے کو سر کچھ تو فضا اور بڑھ گئی

کچھ اعتبارِ دیدہ وری اور بڑھ گیا
کچھ آبروئے نکتہ وری اور بڑھ گئی

شاہد ہے وقت ہر ستم ناروا کے بعد
ہمت جنوں کی نام خدا اور بڑھ گئی

تاباںؔ دل خراب ہے اب اور ہجوم یاس
ترک جفا سے اُن کی جفا اور بڑھ گئی

۔ میرے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی (غالب)

○

منظور حسین شور

تری سخی کرم بھی رائیگاں معلوم ہوتی ہے
کہ اب کچھ تیز تر عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

وہ کہتے ہیں سرِ منزل فریبِ کارواں میں نے
کہ گردِ رہگزر بھی کارواں معلوم ہوتی ہے

قدم اُس راہ میں رکھا ہے بادِ محبت نے
جہاں کی سرزمیں بھی آسماں معلوم ہوتی ہے

نظر پڑتی ہے جا کر جب تہِ دامن رنگیں پر
کلی کھلنے سے پہلے خونچکاں معلوم ہوتی ہے

لرز جاتا تھا جس کو دیکھ کر اپنے نشیمن پر
وہی بجلی چراغِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

مرے حساس دل میں درد ہے سارے گلستاں کا
مجھے ہر شاخ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

قیامت ہے تلاطم شورِ دریائے محبت کا
جو موج اٹھتی ہے وہ ساحل نشاں معلوم ہوتی ہے

خواب

سلام (مچھلی شہری)

نسیم صبح! بہ ایں موج گلفشاں تو بھی
خطا معاف، کہ تعبیرِ حسنِ خواب نہیں

وہ خواب یہ تھا کہ پھولوں کی ایک وادی ہیں
بڑی اداؤں سے اترتی ہے اپسرا کوئی
کوئی گلاب سلامی کو جھک گیا مچل کر
شریر بھونروں میں دیوانہ ہو گیا کوئی
خوشی امید میں ساری فضا مہک اٹھی
نشانِ آدمِ خاکی مگر نہ تھا کوئی
بڑی اداؤں سے اترتی تھی آسمان سے حور
مچل سکا نہ مگر دل کا حوصلہ کوئی
جوابِ شوق نہ پا کر وہ جانے والی تھی
کہ مسکراتا ہوا پاس آ گیا کوئی

وہ ایک حور کا دل جس نے رکھ لیا آ کر
وہ شاہزادۂ وادیٔ گلفشاں میں تھا
وہ جس نے پھول کو نغمہ، فضا کو ساز دیا
وہ رنگ و کلاہ و بار دلِ جواں میں تھا
وہ جس کا نور تھا مسجودِ بنتِ ماہ و نجوم
وہ ایک ذرہ بہ اندازۂ آسماں میں تھا

پر اب تو پھر وہی میں اور وہی وسیع کھنڈر
خیال میں بھی کوئی ریشمیں نقاب نہیں
عجیب بات تو یہ ہے کہ ایسے عالم میں
بس ایک بوجھ سا دل پر ہے اضطراب نہیں
نسیم صبح! بہ ایں موج گل فشاں تو بھی
خطا معاف، کہ تعبیرِ حسنِ خواب نہیں

سوال یہ ہے کہ ہم خواب دیکھتے کیوں ہیں
جنازۂ دلِ بے تاب دیکھتے کیوں ہیں

○

اقبال صفی پوری

ہم چل تو پڑے ہیں جذبۂ دل جاتا ہے کدھر معلوم نہیں
آغازِ سفر پر نازاں ہیں، انجامِ سفر معلوم نہیں

کب جام بھرے کب دور چلے کب آئے ادھر معلوم نہیں
اُٹھی بھی اگر، ٹھہرے گی کہاں ساقی کی نظر معلوم نہیں

ہم مکتبِ گیسو کی اب تک اُمید لگائے بیٹھے ہیں
آتی ہے کدھر سے بادِ صبا، جاتی ہے کدھر معلوم نہیں

ممکن ہو تو اک لمحے کو ذرا تکلیفِ تبسم کر لیجے
ہم میں سے ابھی تک کتنوں کو مفہومِ سحر معلوم نہیں

ہے شامِ غروبِ صبحِ جنوں، ہے ترکِ طلب یا حسنِ طلب
بیٹھے ہیں جہاں ہم منزل ہے یا راہگذر معلوم نہیں

جذبات کے سو عالم گذرے، احساس کی صدیاں بیت گئیں
آنکھوں سے ابھی اُن آنکھوں تک کتنا ہے سفر معلوم نہیں

یہ اپنی نظر کی محویت یہ بیخودیِ دل کا عالم
دیا ہے جنوں اقبال کہاں محرا ہے کہ گھر معلوم نہیں

○

خلیل الرحمٰن اعظمی

اب کے آئی جو مری رہ میں تو پامال رہی
گھات میں یوں تو بہت گردِ مہ و سال رہی

خاک ہو کر ہی رہے ہم درِ میخانہ کی
سُرخیٔ مے ہی سرِ نامۂ اعمال رہی

نہ ہوا یہ کہ تہِ دام کبھی سو رہتے
زندگی اپنی تو رسوائے پر و بال رہی

قفسِ رنگ سے نکلی تو ٹھکانا نہ ملا
بوئے گل جب سے اُڑی اور بھی بے حال رہی

کاسۂ چشم کو دے دو کوئی آنسو، کوئی خواب
ورنہ سمجھوں گا کہ دنیا مری کنگال رہی

یوں کبھی ہم کو نہ تھا دعویٔ شمشیر زنی
ہاں حریفوں سے مگر پرسشِ احوال رہی

○

خالد میناؤی

کیا کہیں، کیا، دیکھ کر صحنِ چمن یاد آگیا
ابتدائے عشق کا دیوانہ پن یاد آگیا

کتنی کیف آگیں تھی کلیوں کے چٹکنے کی صدا
ایک مستِ ناز کا طرزِ سخن یاد آگیا

دیکھ کر آہو، ہمیں ہمدم ختن آیا نہ یاد
ابروئے جاناں کا یکسر بانکپن یاد آگیا

اے محبت! کوئی بھی عالم ہو لیکن بزم پر
رنگ جب آیا وہ شمعِ انجمن یاد آگیا

دل کو داغ کے لیتا تھا تازہ طرزِ کلام
یک بیک ہم کو زمانے کا چلن یاد آگیا

اہلِ عالم جاگ اٹھے میری صدائے شوق پر
دہر کو ہنگامۂ دار و رسن یاد آگیا

بڑھ گیا جوشِ محبت اُمڈ گیا طوفانِ غم
اضطرابِ قیس و عزمِ کوہکن یاد آگیا

شعر سن کر میرے خالد لوگ سر دھننے لگے
اور مجھے وہ رونقِ بزمِ سخن یاد آگیا

○

نور بجنوری

زخموں کا اک باغ ہے جس میں رونے کی تنہائی ہے
نگری نگری گھوم کے ہم نے بس یہ دولت پائی ہے

انگاروں کی سیج پہ لیٹی رات کی رانی جلتی ہے
سرد ہوا کے جھونکو تم نے کیسی آگ لگائی ہے

سرخ لبوں کی شمعیں جب بھی دل کے افق پر چمکی ہیں
فتنوں کے آکاش پہ اس دم بجلی سی لہرائی ہے

تجھ سے چھپ کر جا نکلا ہے ایک پرائی بستی میں
تو کیا جانے بھولے پنچھی چاند بڑا ہرجائی ہے

ترکِ محبت کرنے سے کب پیار کے بندھن ٹوٹتے ہیں
سنبھل سنبھل کر چلنے والی تو نے ٹھوکر کھائی ہے

بات تو جب ہے تیرا آنچل پرچم بن کر لہرائے
چپکے چپکے رو لینے میں دیکھ بہت رسوائی ہے

○

حمایت علی شاعر

متاعِ دردِ دلی، سوزِ جاودانہ ملا
بفیضِ عشق ہمیں زندگی میں کیا نہ ملا

تمہارے غم میں بھی رکھتے ہیں ہم قرینۂ زیست
تمہارے غم سے شعورِ غمِ زمانہ ملا

بھٹکتے پھرتے ہیں دشتِ جنوں میں مثلِ غبار
وہ لوگ جن کو محبت کا آستانہ ملا

ہمیں صنم میں نہاں تھے ہمیں حرم سے عیاں
ہماری ذات سے باہر ہمیں خدا نہ ملا

انھیں کے دم سے ہے آباد کنجِ دیر و حرم
جنھیں بفضلِ خدا سایۂ خدا نہ ملا

بنا نہ دیں کسی دیوار ہی میں در اسیر
اگر قفس سے رہائی کا راستہ نہ ملا

○

رفعت سلطان

اگرچہ سایہ فگن دشت کے ببول رہے
مری نگاہ میں لیکن ہمیشہ پھول رہے

گدا و شاہ کے رتبے میں کوئی فرق نہ ہو
یہ میکدہ ہے، یہاں ایک ہی اصول رہے

تمام عمر رہی آرزو مسرت کی
تمام عمر مگر ہم بہت ملول رہے

نہ جانے اہلِ جنوں کا ہے کون سا مذہب
ہمیشہ سوچتے یہ وقت کے رسول رہے

افق پہ قوسِ قزح جھومتی ہے نشے میں
حسین آنچلوں والے ہیں جھولا جھول رہے

ہمارے دل میں رہے بے قرار ذوقِ سفر
ہمارے سر پہ رہِ زندگی کی دھول رہے

گلہ نہیں ہے تمہارے دشمناں سے مجھے
کہ دوستوں کے بھی رفعت یہی اُصول رہے

○

رفعت سلطان

اُن سے ملنے کی کوئی آس نہیں
پھر بھی دل ہے کہ وقفِ یاس نہیں

ہے وہی ایک پھول تنگِ چمن
جس میں تیرے بدن کی باس نہیں

حسن ہر رنگ میں ہے جلوہ حسن
حُسن کا کوئی اک لباس نہیں

جانے کیا ہو گیا ہے لوگوں کو
لوگ کہتے ہیں میں اُداس نہیں

ہائے تو بھی ہے بے وفا اے دوست
ہائے تو بھی وفا شناس نہیں

اب یہاں کیوں نہ بیٹھ کر روئیں
اب یہاں کوئی آس پاس نہیں

یوں تو دل ہے بہت اُداس مگر
آپ سے کوئی التماس نہیں

اک دلِ درد آشنا کے سوا
دوست اب کچھ بھی میرے پاس نہیں

موت کا کیا گلہ کریں رفعت
زندگی بھی تو ہم کو راس نہیں

ایک نظم

شاذ تمکنت

چاندنی راتوں میں پیڑوں کا گھنیرا سایہ
پو پھٹے دور سے مسجد کی اذاں کا لہرا
ڈوبتی شام چراغوں کا جل اٹھنا کم کم
بھیگے بھیگے ہوئے برسات کے گہرے بادل
نیم خوابی میں برستے ہوئے پانی کی صدا
دور میدانوں میں گم ہوتی ہوئی پگڈنڈی
لوٹتے پنچھی ہوئی ویران کوئی راہگذر
سوکھے سوکھے ہوئے بھرتے ہوئے پتوں کی کراہ
گھر کی دیوار پہ بیٹھی ہوئی چڑیوں کی چہک

یہ وہ منظر ہیں جنہیں تجھ سے علاقہ تو نہیں
میں نے ان میں بھی تری یاد کی خوشبو بھر دی

عشق و ہوس

فارغ بخاری

دو لکیریں متوازی ہی چلی جاتی ہیں
جانے کب سے ہیں رواں
یہ لکیریں یہ خطوط
آئنے سامنے یوں پھیلے ہیں تا حدِ نظر
جیسے سیلاب کا دھارا
جیسے سورج کی کرن
جیسے گردوں کو لپکتی ہوئی شاخِ کہسار
جیسے بہکی ہوئی دوشیزہ کے محرومی ابھار

یہ ہمہ گیر خطوط
اس طرح پھیلتے جاتے ہیں کہ گویا اک دن
وسعتِ کون و مکاں پھاند کے بڑھ جائیں گے
ان کی معصوم رفاقت پہ گماں ہوتا ہے۔
برق بن کر یہ کسی طور پہ لہرائیں گے

فاصلہ ان میں ہے پر کچھ بھی نہیں
یہی دوری سے حضوری ان کی
بعد سے جذب و کشش
بعد سے دل کی لگن
حسن کو اس سے بقا
عشق کو اس سے دوام

اور جہاں چاہا کسی نے کہ یہ دوری نہ رہے
فاصلہ پاٹ کے آپس میں یہ مل جائیں
وہیں اک زلزلہ آیا، وہیں طوفان اُٹھا
ایک جھنکار سے ہی ٹوٹ گیا
یہ لکیروں کا طلسم

○

خاطر غزنوی

رازِ دل جو تری محفل میں بھی افشا نہ ہوا
یا سرِ دار رہا یا سرِ میخانہ ہوا

ایک ہم ہیں کہ تصور کی طرح ساتھ رہے
ایک تو ہے کہ جو خلوت میں بھی تنہا نہ ہوا

کیا بھروسہ ہے ترے لطف و کرم کا اے دوست
جس طرح سایۂ دیوار، ہوا یا نہ ہوا

شبستاں میں اتر آئی تھی سورج کی کرن
آئینہ خانہ گل تھا کہ صنم خانہ ہوا

اس قدر رنج سہے دل نے وفا میں خاطرؔ
آج وہ ہم سے جو بچھڑے بھی تو صدمہ نہ ہوا

بھوتوں کی بستی

منیر نیازی

پیلے منہ اور وحشی آنکھیں
گلے میں زہری ناگ
لب پر سرخ لہو کے دھبے
سر پر جلتی آگ

دل ہے ان بھوتوں کا،
یا کوئی بے آباد مکاں
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا
اک لمبا قبرستان

○

کوثر نیازی

گرتے ہوئے جب میں نے ترا نام لیا ہے
منزل نے مرا بڑھ کے مجھے تھام لیا ہے

مے خوار تو ہے محتسبِ شہر زیادہ
رندوں نے یونہی صفت میں الزام لیا ہے

اے شیخ! دلِ صاف یونہی تو نہیں ملتا
ہم نے اثرِ روئے دلآرام لیا ہے

تجھ سا کوئی رہبر نہیں اے دورئ منزل
احسان ترا ہم نے بہر گام لیا ہے

وہ مل نہ سکے یاد تو ہے اُن کی سلامت
اس یاد سے بھی ہم نے بڑا کام لیا ہے

ہر مرحلۂ غم میں بلی اس سے تسلی
ہر موڑ پہ گھبرا کے ترا نام لیا ہے

سجدوں میں وہ پہلی سی حلاوت نہیں باقی
جب سے اثرِ گردشِ ایام لیا ہے

مانا کہ غمِ جاں، غمِ جاناں ہے بڑی چیز
کوثر نے تو چن کر غمِ انجام لیا ہے

○

جمیل ملک

بہت قریب سے بھی فاصلے نظر آئے
ذرا سی ٹیس لگی، کب کے زخم اُبھر آئے

تری نگاہ کے کانٹوں نے، پھر بھی اُلجھایا
سنبھل سنبھل کے چلے، سوچ سوچ کر آئے

اُبھرنے والے سرِ راہگزار بیٹھے ہیں
عروسِ حسن سے کہہ دو، ذرا سنور آئے

اس آرزوئے طلب میں کہاں کہاں نہ گئے!
کہیں خلوص ملے، کوئی دل نظر آئے

یہ کس نے چھیڑ دیا قصۂ فریبِ وفا
سہاگ رات کی آنکھوں میں اشک بھر آئے

ہزار منزلیں آئیں، گزر گئیں لیکن
جو ہمسفر تھے ہمارے، نہ لوٹ کر آئے

جو کم عیار تھے، وہ اپنی قدر کھو بیٹھے
دیارِ نازمیں اب کوئی معتبر آئے

نظر کے ہم بھی ہیں قائل، مگر خدائے جمال
وہ عشق کیا کہ نہ اپنی خبر آئے

جمیلؔ ہم نے پکارا، تو حسن والے بھی
فرازِ عرش سے اُترے زمیں پر آئے

رنجِ رائیگاں

جلیل حشمی

جو لوگ مرے پھولوں سے مہکے ہیں چمن میں
بخشی ہے زباں میں نے جنھیں طبعِ سخن میں

وہ کم نظراں، رنگ دکھائے جنھیں ساتوں
ابھرے اُترتی ہوئی ایک ایک کرن میں

چلنے کی ادا — سر کو اُٹھا کر جنھیں دی ہے
پیدا کئے انداز صبا جن کے چلن میں

پھولوں کا تبسم جنھیں آندھی میں سکھایا
شمعیں جنھیں دیتا رہا میں تیز پون میں

روشن کئے ہیں جن کے چراغ دل و دیدہ
الفاظ کے موتی بھرے ہیں جن کے دہن میں

ڈالا جنھیں آفاق کی راہوں پہ، جگا کر
خوابیدہ تھے جو بسترِ ہجراں کی شکن میں

ذرّوں کے اُجالوں سے کیا جن کو شناسا
جو لوگ مگن رہتے تھے تاروں کی لگن میں

زخموں میں جنھیں نقشِ بہاراں کے دکھائے
دی بے جگری معرکۂ دار و رسن میں

لایا ہوں لبِ چشمۂ خورشید جنھیں میں
چاند آگ لگا سکتا نہ تھا جن کے بدن میں

میں قافِ تصور سے جنھیں کھینچ کے لایا
جلتوں سے بسایا جنھیں اُدم کے وطن میں

وہ آج لگاتے ہیں مجھے پھول سے چوٹیں
پتھر تو میں کھا سکتا ہوں اس بانکپن میں

یہ زخم مگر سہہ نہ سکوں گا کسی صورت
— ان باتوں کی بھی تاب و تواں ہے مرے فن میں

لیکن مرے دامن سے لپٹ جاتی ہے یہ شرم
تھے وہ کبھی حشمی مرے یارانِ کہن میں!

○

جلیل حشمی

جوت کی کلیاں چٹکا دیتا ہے دل کے مدھوبن میں چاند
جیسے اُڑ آئے چپکے سے برہن کے آنگن میں چاند
تم سے کہیں تو پتھر مارو، گلی گلی رسوا کر دو!
ایسی ایسی بات بجھائے پیار کے پاگل پن میں چاند
پھوٹتی ہیں ہر تار سے خوشبو میں ڈوبی ہوئی کرنیں سی
اُن کے بدن کی بات نہ پوچھو! پھول کے پیراہن میں چاند
جیسے پنکھڑیوں کا عکس پڑے شبنم میں پھولوں پر
جیسے جھلکیں انگ انگ کے روپ بھرے درپن میں چاند
اُن آنکھوں میں مانسروور، اُن بالوں میں چندن بن
رکھے روپ میں رنگیں کیاری، اُٹھتے ہوئے جوبن میں چاند
کیسے کیسے یاد نہ آیا دُور کا دیس راتوں کو
اُبھرا، چمکا، ڈال گیا نت ایک نئی اُلجھن میں چاند
رات گئے تک ہم دیوانے یونہی تکتے رہتے ہیں
جانے کیا سمجھے گا حشمی ہم کو اپنے من میں چاند

○

بشیر احمد بشیر

تو بھی خاموش ہے اے شمعِ سبستاں ہم بھی
ایک تو رات ہے کس درجہ ہیں ناداں ہم بھی

مشعلِ زیست وہی آپ ضیا ہیں جس کی
اُسی مشعل کے تو ہیں دودِ پریشاں ہم بھی

گردِ آوردہ ہیں جس راہِ طلب کی اس پر
لے کے نکلے تھے کبھی زادِ دل و جاں ہم بھی

تم بھی وقفِ ستمِ ایام ہو اک مدت سے
اک زمانے سے ہیں صیدِ خمِ دوراں ہم بھی

جن ستاروں سے ہے وابستہ ہماری تقدیر
دیکھتے ہیں وہ سرِ مطلعِ مژگاں ہم بھی

نگہِ لطف کے محتاج ہیں اے شیشہ گرو
صفتِ شیشہ شکستہ دل و حیراں ہم بھی

کٹ گئے عشرتِ امید میں دن ورنہ بشیر
تھامتے حشر کے دن دامنِ یزداں ہم بھی

خالی ہاتھ

ابوالفضل صدیقی

سنہرے جال

چوں ہی ناک دم آتھ کے دھندلے دیوان سے پرے پرہمتساں کی جبل کی طرح نمودار ہوئی۔ فراں رسیہ و شوریں بہار کی رعنائیاں تڑپ اٹھیں۔ سوکھے پڑے کھلے سے حقوق کی ادھ بڑی ہوئی کچھی بھی آنکھیں حیرت اور شوق کے ملے جلے جذبات میں گھل رہ گئیں۔ جمہوریں دار چہرے پر ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا۔ کنوتاں پڑ گئیں۔ ہلکی حیرت دھول سے کھلے ہوئے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ٹیالہ ٹیالا نقشہ اس شہر جیسے آتشیں گلابی ہو گیا۔ اور سارا کہ بے نوسی تیوں سے یک دم پھلجھڑیوں سی پھٹ گئیں اور نجمی مناروں حسن و شباب کی تمام رعنائیوں سے آراستہ جیسے روزقہ جانے آ گھڑی ہوئی۔

ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے کالی خاں صبح ہی صبح کل کی ڈراؤنی خبر سنانے آیا کرتے آج ایک پتلی میں مسلوں کا بستہ دبا ہوا تھا۔ اور ہری جانب جاپانی گڑیا کی سی تازہ دمی جھلی ہوئی۔ اور یہ تو کل ہی کی بات تھی۔ البتہ تین چار سال کی کہ کبھی کبھی اجلاس میں کھیلنے چل جاتی اور اجلاس شروع ہونے سے قبل ڈائس پر رنگین قالین کی طرح ادھر سے ادھر تک آتی۔ رجسٹر کی میز پر قلم، دوات، جانب میز، ویٹ اور کاغذوں کی ترتیب جب تک پیش کار خاں کے ٹیبل اور بستوں کا جائزہ نہ لیتی کبھی ڈائس کے اوپر بچھے ہوئے قالین پر رنگین گڑیاں سجاتی ۔۔۔ اور تقریر ہائے ہندار اور فاضل فرحباری کی آوازوں میں گونجنے لگتی تو کبھی ہنستی کبھی روٹھتی کبھی معصوم چہرہ پٹ اور غلطہ آنسوؤں سے بھر جاتا ۔۔۔ اور جب اجلاس شروع ہو جاتا تو پیش گی کے ساتھ ایک جانب بیٹھ جاتی۔ اگر پہلے پہ اس اور میز پوش جھکڑیوں میں لے لیتے تو دھوں سا تماشہ دیکھتی رہتی اور دیکھتے دیکھتے نہ معلوم کس وقت آنا کر پکے سے اندر چلی جاتی۔ اور جب سرکار دوپہر کو اجلاس برخاست کر کے اندر چلی جاتے تو اکثر چھوٹی بیگم کی گود میں بھی ہوتی۔ علاوہ ٹھائی، پھل کوئی چیز کھانی ہوتی یا چھوٹی بیگم اس کے لئے گڑیا بنا رہی ہوتیں اور وہ کرسی سے ٹکا ٹکے ٹکے پر پر اشتیاق نظریں جمائے کڑھنے والی گڑیا کی خوب صورت شکل کے تصور میں گم ہوتی۔ کبھی خانم کی نوسی کے ساتھ بیٹھی ہوتی اور کبھی غسلخانے کے قریب دالان کے سنگ سنگ بیٹھے اٹھتی ہوتی۔ اور جب شام کو پیش کار خاں کام ختم کر کے جانے لگتے اور اجلاس برخاست کرنے کے ڈھول بھی بج بج کے تھک جاتے اور کبھی کبھی خانم کے ساتھ بیٹھے ہوئے کڑھائی جاری ہوتی اور کبھی گڑیوں کی پوشاکیں یا چھوٹی بیگم کے غلاف کے موزے تھے اپ کو بڑی خوشی کے ساتھ دکھاتی اور پیش کار ڈیوڑھی سے دیوان خانہ کی جانب سر کار سے رخصت ہونے جاتے۔ باہر سرکار عصر کی نماز سے فارغ ہو کر چند مریدوں کے درمیان تشریف فرما ہوتے اور پیش کار صاحب رخصت طلب کرتے ہوئے سلام کرنے کے بعد ہمیشہ سے کہتے "نماز ہمیشہ سرکار کو اب کرو" اور وہ شہد کا گھونٹ ناشتہ

پیشانی پر گدوتی اور معصوم ادا کے ساتھ باپ کے دامن میں منہ چھپا لیتی اور پوچھنے پر کہتی "موتی ہوتی ہے" اور پیش کار نساں خاں ناز کی انگلی پکڑے اس کے ننھے ننھے قدموں کا ساتھ دیتے ہوئے رخصت ہو کر چل دیتے اور سر اپنی نشست پر بیٹھ کر سیع محن میں بچھائے تک ان کے جانے کا تماشہ دیکھتے رہتے۔

اور آج کچہری میں آئی، اور سال بھر سے سر پر چڑھے پروگرام کے پیش کار کی بیٹی ہی کسی چیز خیال کر رہے تھے اور پیش کار نساں خاں نے کی بھی ٹیبل صاف صاف کھل کر ان پہلے تو اس کے باوجود بھی سر کار کو دیکھنے میں تکلف سا ہوا اور ایک دم کچہری سناٹا میں ایسی عجیب سی، پر کچھ سہمی سہمی پیش کار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو وہ بدستور بالکل اسی طرح کی تھیں جیسی دیوان خانے میں بچے ہوئے تبندوے کے مصنوعی سر میں جڑی تھیں اور آنکھیں چار کرتے ہی سر کار نے سمجھ لیا کہ پیش کار صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی نہ سمجھ رہے ہیں، حیرت پر نہایت چابک نگاہی کے ساتھ قابو پا کر سنبھلا اور ایک دم بھرے بھرے سے ننھے ننھے تیوروں میں ہرن کی سی شوخی پھڑک گئی، ایک ادائی تلوار کی سی کھانی اور عتاب میں غلور کی سی تندی تڑپ اٹھی جیسے بڑھاپے کی آخیر منزل سے پٹ کر یکایک خلقان شباب کی آغوش دنیا میں پڑے اور پیش کار نساں کی بات ہی ایسی تھی، کچھ سن شباب اور قسم کی "بڑھے گرجان اور جان کو نوجوان بنا دیتی ہے" اور نوجوانی نے شعلہ کی طرح لپک کر بڑھاپے کو ٹوٹے ہوئے پتے لیا ..... جیسے ایک بھرپور بوسہ ..... خنک تازہ کی بوندوں کی گرم گرم خوشبو دار سسکی ..... اور سر کار نے جیسے ہونٹوں پر لگا شہد چاٹا اور پہلے ہی جیسے باریک سی مسکراہٹ کے ساتھ ذرا سر اٹھا کر پھر کیسہ بدا اور مخصوص ادا کے ساتھ ذرا اوپر پنڈلی چڑھا کر ترچھے ترچھے ہو کر ان کے مونڈھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور آج ہی تو سر کار کو ڈائرکٹ جنرل آف آنریری مجسٹریٹی کے کام سے ریٹائرمنٹ ملا تھا۔ ۴۵ سالہ اعزازی خدمات سے ٹکر لگا کر ریٹائر ہونے کے بعد جارج ششم تک سب کی جوبلی سے تمغے کے ساتھ باعزت سبک دوشی ..... پیش کار نساں کے باپ سر کار کے بچپن کے کھیلے ہوئے ساتھی اور ہم مکتب تھے اور ان کی تعلقات کی بنا پر ازراہ دوست پروری سر کار نے اسپیشل مجسٹریٹی دے دی تو اول کے عنایات آتے ہی کلکٹر صاحب بہادر سے خاص طور پر سفارش کر کے اپنی پیشکاری پر ان کا تقرر کرا کے تیس سال قبل لایا تھا اور خلعت اللہ خاں کے بجائے پیادہ میں پیش کار نساں کے نقب سے چلا تھا جس سے آج تک وہ عزت عام میں منسوب تھے اور اپنی عزت کی پوری مدت تیس کے تیسوں سال سر کاری کے حلاس میں پیشکاری کر کے ریٹائر ہو رہے تھے۔

اب تو پیش کار نساں سر کار سے ستر و اٹھاسی سال کے قریب عمر میں چھوٹے تھے مگر کبھی آج آنکھ کے جو وہ پندرہ سال نے مل کر ایسی پوری کی تھی کہ پیش کار کر کے سوا ستر سال بڑھا دیا تھا، عمر اور عہدوں کی ہی رشتہ میں باپ بن رہے تھے۔

جب یہ کلکٹر پچاس بیالیس سال آنریری مجسٹریٹی کر کے ریٹائر ہوئے تھے اور نساں نے تیس سال پیش کاری کر کے پنشن پائی تھی سر کار نوعمری میں آنریری مجسٹریٹی اور خان صاحبی کے خطاب سے سرفراز ہوئے تھے اور جب بڑے سر کار خان بہادر صاحب (سر کار کے والد مرحوم) کا انتقال ہوا تو دو لاکھ سالانہ کی زمینداری کی وراثت میں پہنچی، اور خان بہادری کے خطاب و دربار کی کرسی اور آنریری اسپیشل مجسٹریٹ و ڈویژن کے عوض سے گورنمنٹ نے سال اندر سرفراز کیا اور اب پہلے بڑے سر کار خان بہادر صاحب کے جانشین ہوئے اور برسر اقتدار آنے کے بعد سر کار نے جو اصلاحات کیں ان کا سلسلہ دیوان خانے کے دالان خانے سے شروع کیا اور انہیں اصلاحات کی بدولت ہی آج ناز دلی تھی۔

بڑی دلہن جب سے مرحوم کی خاندانی صاحبزادی تھیں ان کے ساتھ بڑے خان بہادر مرحوم کی پندرہ برس ہوئے اس میں قدم دھرتے ہی سر کار کا بخت جاگا تھا، مرحوم کی زندگی بھر سر کار ہاتھ پھیلا پھیلا کر جو کچھ لے آئے ہیں گھر کر انہیں کا ہاتھ پکڑ کر بڑے سر کار کی زندگی بھر کی آٹھوں سال جو تیوں مال ٹوٹتی رہی مگر سر کار بڑے سر کار کے خوف میں اور بڑی دلہن جو گوں کی گڑی کی لاج اور زبان کے قول کو شہ دنیا سمجھتی ہیں گھر بھر بڑے خان بہادر صاحب کی سکھیں ہوں اور سر کار نے خود تار ہوتے ہی دوسری شادی چھپا لی، بڑی دلہن لاکھ شرم شریف اور بڑا سہی گھرانہ کی لڑکی بھلا سوکن کی پرچھائیں کیسے برداشت کر سکتی تھی

دیدے میں اتنا نسان میں کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی تنے تنے ٹوٹ گئی۔ شادی کے ذکر پر ہی چھوٹا چھا ذیکے جا پہنچیں اور انہوں نے شادی رچائی اور ان کی جانب سے ایک لاکھ گیارہ ہزار مہر بیان ہوا۔ دو ہزار روپیہ ماہانہ نان نفقہ کا مطالبہ شروع ہوا۔ مہر کیلئے، پیر سٹرل تک پہنچ گیا اور عدالت کی ڈگری تک نوبت آتے آتے شبہ کے عمادین اور دیان کے رشتہ دار بیچ میں پڑ گئے۔ فریقین کی رضامندی سے معاملہ ثالثوں کے سپرد کر دیا گیا۔ شریف گھرانوں میں طلاق ضبط کا نام جلیلہ کا فال اور عورت کے لئے نکاح ثانی حرام ہوتا ہے۔ ثالثین سے ہر چند نے اختیاری شرط کے ساتھ ثالثوں نے فیصلہ سنا دیا کہ ذیبے ایک ہزار روپیہ ماہانہ نان نفقہ اور پچاس ہزار روپے کی مالیتی زمینداری مطالبہ مہر میں تاحیات بڑی بیگم کو عادی اور بھر زبانی طلاق کے سب کچھ ہو گیا اور سرکار کا چھوٹی بیگم سے اور بڑی بیگم کا آسرا سرکار سے کٹ گیا اور عدت کی عمل ہو گئی۔

بھلی بیگم ایک شریف گھرانہ چھوڑنے کی سیدھی سادی دبلی پتلی لڑکی تھیں ناک نقشہ سے درست اچھی ظاہری قبول صورت سی اور پھر سرکار کا اپنا انتخاب۔ سال بھر تو گھر کے اندر خوب سینہ تان کر چلیں اور سال ڈیڑھ سال اور سر تو نہ دکھائی پڑیں پھر نہ معلوم کہاں سے جھجکی سی نظر آئیں اور تیسرے سال جیسے چلتا پرزا کہتے والوں نے کہا شاید انتا جانا گھر مضم نہ کر سکیں اور سرکار جیسے آپ انتخاب پر کچھ نادم سے ہوئے اور پھر تو اچھی بھلی پلنے پر چھوٹیاں جھنجھلانے لگے ۔۔۔ یہ سرکار کو بھی دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ اصل ذلیلوں کے سدھارنے کی کوشش کرتے تھکتے نہیں چنے کھلیے، مٹھیاں بھر بھر کر نذرانے دیتے ایک ٹانگ پر ساری رات کھڑے ہو کر دیکھتے کے سیاں، الگا، شاہ کی دھونی کی چلمی ٹھاکر بان میں ڈال کر کھلاتے، بیتا شاہ دلی کا پڑا ہوا سر ماتھے میں لگا کر سر کا سے لگا لاتے، توان زعفران اور سیر ہا سیر تلکہ مرکا کے سرکار کو پلاتے اور جب بھی شے سے سی نہ ہوئے تو تسلی کیلئے پرانا تھیں سرکار کو اگر کا ٹرشت تک کھلا دیا چوٹا دل کی پیٹ تک مترجم پھونک کے چھاڑ پھونک کے گزارا ہو گئے اور پانچویں سال میں جن تاریخ سے سرکار اس عورتیں جا پہنچے جس عورتیں ان کے باپ دادا پردادا کی پشتوں سے رنج بیت اللہ کو جانے کی خاندانی روایت چلی آرہی تھی اور گویا ان کے یہاں حج اس طرح فرض نصف ہوتا چلا آیا تھا جیسے ساتویں برس نماز اور روزے تیرھویں برس ۔۔۔ اس مدت میں جہاں اور بہت سے ترقی خوالف سامنے آئے ان میں دو بڑی بات نہایت شوق و اہتمام کے ساتھ حل کرنے لائے ایک کہ مستقل لاکھ روپیہ نقد اور دوسرا کالبرک ۔۔۔ دو خوش خبر عقیدتیاں پاک تعزیق رکھائی تحت ڈاکے کے اور اس شرعی سکہ پر پورے طمطراق عمل کیا جو کیزیوں سے متعلق ہے ۔ اب جو بھلی بیگم نے دیکھا کہ نہ شد و شد بھی نہیں بلکہ سرشد آفندیانی تدبیر الٰہی ۔۔۔ اور معلوم ہوا کہ علمی اور عملی دونوں عمل الٹے پڑے۔ بڑی بیگم والا استخیار کرنے کی سکت تھی، اور انہی کی باتھی سے ترکی، یہاں عیاشیاں اور شیرکی کیا لالچی ۔۔۔ تین تین سوکنوں کے جلاپے کی تاب نہ لا سکیں، نوٹوں کے گنے کے بعد پھپھک پھپھک کر رات ہو گئی اور سال اندر گھس گھس کر چل بسیں۔

پچھلے سال میں دولت و عیش کے بعد بھلے بستر سے سرک کر ادھی لحاف اور کھاٹ منجی گودام تک جا پہنچیں ایک تو جیسے جھوٹوں کے ساتھ وصل وہجر کا نال میں پرکھا جاں میں پہنچ گئی۔ انہیں دنوں ادھی خلے میں ایک اڈیا خشکی ہرقی ہوا تھا گوا چنا بادام اور چٹ پٹا، کابلیاں اور چلیاں چاٹ چاٹ کر بھی بھلا چنگا تڑپ کر اٹھا پڑتے لگا۔ ایسے لڑکے سال میں برق سالے کے کام پر پورے تلے ہوتے ہی جاتے تھے اور روٹیاں بلتے "جی اڈایا" کہتے تھے اور جاتے وقت ادھی فاختہ کا ایک آدھ ٹوٹا چھوڑ جاتے باورچی کے پھٹے پرانے کپڑے، روپیہ یا تھوڑی بہت نس وغیرہ قسم کی شیرینی لے کر فرار ہو جانے کی وارات جھپا کرتی تھی یہ رنگ کے اڈے لڑکے کے اس طرح ایک رم خاب ہو جاتے پر تبرہ ہوا لوگوں میں اشاروں اشاروں میں چہ میگوئیاں ہوتیں باورچی ایسی اچھی شریک کار کے اچھے بھلے جلے پر دل کھا کر رہ گیا اور محاورہ کو اطلاع گذاری ۔۔۔ اس تو سرکار کے کان تک یہ بات پہنچی مشکل تھی اور سن کر ہو کر گاؤ اور حقیقت سے دل چسپی بھی کیا ہو سکتی تھی کہیں جائے باورچی کے بچے ہوا کے ساتھ چل جائے، نہیں آرہا تو آنا کے کالو اب اے ہی گئی۔

دوسری نیا بچہ تھی، اچھی پڑھائے تو آ بھی ہوئی تھی ہے خلوت سے اڈھا کر تنہا ہو جاتا اور کوٹھا میں پہنچ کر فرض کے اوپر کئے، ہی اشکی چپکی

ہوائی چٹائی سی بن کر چپٹ گئی اور کٹاری کی چٹائی کروٹ لیتے وقت سرکار کے کٹاری تو کبھی بھولوں بھی یہ خیال نہ آتا کہ کسی زمانے میں یہ سرکار کے بستر کا نگین پلنگ پوش تھی ——— اور سرکار ——— سرکار تو سمجھتے تھے کہ بدن کی تان ڈر چادروں کو حق ہوتی ہے یا جامہ تحسیس شیروانی جوتا ٹوپی ——— ایک چٹائی پر تو پلنگ پوش بھی سہی، کیا بات ہے ۔۔۔۔

اور سرکار کے پھول پری شگفتگی سے کھلے ہوئے تھے، مغرب کی نماز سے ذرا قبل یوں لگ گذرا پائیں باغ میں نکل گئے ——— شاید شام بڑی شوخ تھی۔ شفق گوں اور عطر بیز سی یا کچھ سرکار کی آنکھوں میں مست بہار انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ان بانکے پھولوں کے قلموں پر مرتے جن کی لاک کی باڑھ کے قریب پہنچے باڑھ کی آڑ میں سے ایک دم تازہ تازہ پھول جیتی جان آہٹ پاکر کھڑی ہوگئی، جیسے تہ آم شعلہ سا بلند ہوگیا اپنے پشتینی مالی کی کھوٹی لڑکی، سیتا، سیتا یہیں باغ کی کوٹھری میں پیدا ہوئی اور اسی باغیں باغ کی پھلواریں گلاب جیلے چمیلی جوئی کے بیل بوٹوں کے ساتھ پل بڑھی۔ یہیں نیند میں ہمالہ شادی کے جدا پنے باپ مالی کی کوٹھری میں گھر جوائی شوہر کے ساتھ یہیں بس گئی بچپن سے جب شام گھرے مندی کے کوٹھری میں آئی جاتی۔ مذکر کی بھی بھائی، ہمیشہ کی جانی پہچانی ان کی بڑی حسین طرح دار تازہ تھی یہیں ایسی ہی تھی جیسی مالی تھوڑی گندھی کی ڈلیاں مہکاتی ہیں۔ ناک نقشہ سے درست، سانولی سلونی جوانی جوانی سی، بس جیسے آدمی کا بچہ کہ بکیں، ابھی جوانی تھی، گرجوانی بھی جیسے شام تک ادھ کھلی ادھ کھلی ہو، حواس ہوش شگفتہ اور چہرہ نمایاں اور معطر رہتا تھا۔ گرو بھی سرکار اور بیگم صاحب کی خاطر تھے تھے کو شادی اور پھول پھول کی رکھوالی کی ذمہ دار تھی۔ غرض کچھ بھی نہ تھا لیکن سرکار کے حسن نگاہ کو کیا کیا جائے۔ وقت کی بات کہ اس گھڑی سیتا مالن سرکار کو اکیلا نو جوان دیکھ کر اکیلا گانی کر مسا رہی تھی اور جیسے اس کے لمس سے سرکار کی آنکھوں میں دو کنول سے کھل پڑے۔ اور آنکھوں کے ساتھ ساتھ شانہ میں بھی گدگدی ہونے لگی۔ جیسے ہوتے ہوتے مالی کو سات گانوں کی سندی، اسی طرح بالآخر کے عہدہ پر فائز کر کے حلقہ تعینات دیا گیا اور مالن کی تقدیر کے پھول تو شام ہی کو کھل گئے تھے اور سیتا مالن ——— سہیلی بیگم کے لقب سے سرفراز ہو کر حویلی کے اندر منتقل ہوئیں اور باغیں باغ کی ساری بہاریں سمیٹ کر حویلی میں لے آئیں۔

سہیلی بیگم کے ہر پھول کی ایک ایک پنکھڑی تنی ہوئی تھی اور سرکار کی آنکھوں میں بھرپور بہار کر رہی تھی کہ ایک دم بے شان سہیلی بیگم کو بخار چڑھا تیز اور بغلوں کے غدود متورم ہوگئے۔ سب لوگ بوکھلا گئے اور شدید حرکت تشخیص کیا جیسے اور دوسرے دباکی خبریں سنتے ہی آری تھیں گو بتی یہ بیماری تھی تھا بہتیری معالجوں کے سپرد کر دیا گیا مگر ہوا بے سود ہوگئے اور ڈاکٹروں نے یہ تجویز پیش کی کہ آپریشن کے ذریعہ دی جائیں آپریشن کے نام سے تو سرکار نے آپریشن کا نام سن کر بہت پس و پیش کیا مگر مرتا کیا نہ کرتا ہو کر کرانا ہی پڑا مگر بری طرح سے آپریشن کیا اندر آپریشن ہو رہا تھا اور سرکار باہر دالانہ دار ٹہل رہے تھے سٹ سٹ کی خبر پہنچ رہی تھی اور جب سرکار کے کان میں اطلاع پہنچی کہ سہیلی بیگم پر آپریشن ٹیبل پر ہی ختم ہوگئیں۔ زمانہ بھر مقدم ہوا اور زندگی دلدوز، نابکار لگانی، نکمی پڑے چھڑے نہ ہاں لوٹ، لوٹ کر وہاں پہنچے، آزمایا تاؤ خوشنی کے لئے ہٹ سے وہی دونوں گلیاں جو آپریشن کے لگائی تھیں پیالیں سے اٹھا کر اٹ سے نکل گئے اور بڑے ڈھالی انداز میں بولے "لو پیاری ہم بھی آتے ہیں" ڈاکٹر حال حوالی سب کے سب پریشان اور پریشان سے زیادہ متحیر ہو کر رہ گئے کچھ علاج الٹا سوچنے لگے مگر سرکار جیسے مصمم ارادہ کئے ہوئے تھے نکل گئے، لیکن بیگ بوجھا موت آتا تو کنار سرکار کا سر بھی نہ دکھا بس ایک ہوا سی تھی جو گئی اور بقیہ سرکار بھی کچھ مضمحل کر گئے، ہم غم، ہم عشق، ہم کاون ۔۔۔۔

سراب

انداز خوشی اور پھر وہ بھی ایسے نامانوس شوخ انداز کے ساتھ اور تو فیروز تنی غم کا عادی تھا مگر تنی بیگم کی ناگہانی موت پر سرکار کو ایسا دھچکا

کر تہجد کی نماز شروع کر دی۔ بھی بیٹھے سیر ہو گیا اور تبرکاً یا ادائی میں بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ عشاء تیسرے سے ہو گئے اور بیٹھ رہے۔ ہاں باغ کی سی سرمئی چھوٹی پرانی قمقمے کے پاس بیٹھ کر دور و نزدیک میں مشغول رہتے تھے۔ بھی بھی وہ جھل گزند ہنسنے کے لئے بیٹھا کرتی تھی اور وہ آنسو بہا کر اٹھ جاتی تھی۔ اور ایسے شگین و جاں ہلاک نمازیں خوشی کے اقسام کے بعد تک ادا ہوتے تھے۔ تیسرا چہلم اور آنکھی کی ہمت نہ پڑی مگر چہلم بعد ناصح نسل کے بھی خواہ دوستوں نے بھی نے کھانے کا سلسلہ شروع کیا لیکن سرکار کے غائب پڑنے کے نوش ہنسنے والے تھے۔ کہ ایسے پیش نہ گئی تو پھر کھانے والوں نے فاتحہ نہ ہاں منتشر پڑھا کر ترک دیا جاتا ہے اور سرکار کا عمل ہدایت کی خشک سپنج ہے اور ہدایت شروع ہوا ہے پھر بھی جب سرکار کی سے بس رہنے تو وہ ست احباب کو احساس ہوا کہ یہ دل کا معاملہ ہے اور یہاں شروع نہ ہو سب مسلہ مسائل کی نہیں چلا کرتی اور سب بیٹھ رہے تھے کہ ایک مزاج داں دوست کو سوجھی اور خوب ہی سوجھی ——— سرکار کے رجحان کے مطابق محفل سماع کا انتظام اور سرکار کے ہی پسند کے کلام کا۔ لہٰذا احباب کے چیدہ چیدہ تجربہ کار لوگ اپنے مکان پر جمع کئے اور سب نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ تمیں دن تک سرکار کی آخری رسم کے لئے تیار کیا۔

محفل سماع شروع آراستہ ہوئے تھے قوال نے کی اور جب پہلی دو چار چیزوں پر وجد کا عالم طاری ہو کر سرکار کی آنکھوں سے جاری آنسو بہ گئے اور غائب اس نکل کر مال بلا ہو گیا۔ محفل یک دم ٹھنڈے سرد ہو گئی اور جیسے سناٹے آ گئے کے نماز میں تھوکنے کی پوری کے کھانے پکنے کے لئے بیٹھ رہے تو فوراً چھوٹ گیا اور نصف شب کے بعد بستر کے لئے گئے۔ خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کی ایک غزل سن کر سرکار کی طبیعت ہمیشہ کے لئے اٹھ گئی۔ آخری وقت پر محفل کا خلیہ ہوتے لگا۔ رات ڈھلے آٹھ سے حقیقت کے پردے ہٹنے لگے اور حقیقت کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور آنکھوں کی کیفیت میں آنکھ کر سرکار بڑے زور سے پھسلے اور جب جانے کے لئے تین پردے بچے دیکھے اور حقیقت و مجاز سر محفل کی دست درکیاں ہوتے لگوائی دیئے تو اس وقت میں چپکے سے محفل اٹھ گئی اور صبح کا جب کے ظہور کے وقت حقیقت و مجاز عشق و وقت میں لپٹ کر گویا ایسے غٹ پٹ ہوئے کہ کسی کو پتہ نہ چلا۔ یہ ہیں من و تیرا تو تیری.....

احباب نے کچھ ایسی ہی تھی ایک ذات کی بات اپنی پیر جمعت سے خلعت میں پہنچیں اور حضرت کی جو جیسی نکلی تو ایک ہی جست میں وہ تو بہ کی ساتوں سیڑھیاں چڑھ کر اٹھنے کے بجائے جو لی میں بیٹھیں۔ بعد عشرہ آ چکے چکے چلے۔ ادھر محفل اور ادھر چلے میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور ہر خاص و عام کی زبان پر یہی تھا کہ ایسی نیاز مندی و چار روز اظہار تعارف کے لئے ہے ایک ناتمام جوئیں پیس کر چلے میں محبوس ہو گیا۔ بالکل احتیاط کے سر میں دھول جھونک کر رہ گئے اور جانے والے وہ جس نے خطبہ پڑھا اور شکر گھر آ کے لوٹے جہاں گرہاں سے واں تک سب میں ارے آ گئے ہو گئی کہ بدیر سرکار کے نواح میں بند ہو گئیں..... دوستوں نے کہا۔ ارے واہ سبحان اللہ! سرکار کو دو سعادتیں غیب ہوئیں۔ طائف کی توبہ اور نکاح ——— کیا کہنے ہیں دونوں کی آگ حرام ہو گئی!

اور خواجہ بیل کہاں رکھے۔ گرنڈی اور چھپک تو نکل ہی کے رہتی ہے۔ لیکن دشمنوں کے منہ میں خاک اور دوست مرحوم کی بیوہ بیٹی چھوٹی بیگم کا انتظام کر گئے ہیں بڑی بیگم کی آن بان کے ساتھ بڑی دھوم سے اپنی بن کر سرکار کے دولت کدہ میں آ گئیں یہاں تک کہ خاتمین بھی بڑی بیگم کو کھل گئے اور یہاں سے وہاں تک سب کو چھوٹی بیگم ہی چھوٹی بیگم یاد رہ گئیں۔

گرو بے چاری کرتیں بھی تو کیا کرتیں وہ غریب آگے بڑھنے کو تھی ہیں اور اصل اپنی جان بچانے کو بھاگتی رہی لیکن پھر جو ہونی ہے مجبور ہو کر پٹنا ہی پڑا..... تین ہنس تو فرنٹ ٹھیک ٹھیک کاٹ گئیں مگر جب بات کی پگڑنے لگی تو وہی اصل پر پلٹنے والی مست سامنے آ گئی تو وہی خوب صورتی سے پلٹیں اور نہایت چابک دستی کے ساتھ ایک حسین پھری سی لے کر پھر پانچوں جملے وہ کان اپنی گردن کے پیچھے پرانی گردن ڈال دیا کہ ہے لیکن سوچیں کہ جب سارا بلاتے دیکھے تو آ دھا دیکھے باٹ آئے وقت میں بس نے بس کی جانب ہاتھ بڑھایا اور چھوٹی بیگم کے شرک عمل سے اصل میں وہ بس نہ کہنے کو تو چھوٹی بیگم ہی ہو گئیں اور میری تو کیل تھی کے حلقے میں پڑے ہوئے سوتوں پر خادموں کی قوم بری جوش تڑپنے لگی تھیں اور سرکار تو ماں بھرے ان کرنوں کے احساس کو مستہری

منھی کے سوئی ہوتوں میں چھوٹی چھوٹی نگاہوں سے بچاتے ہوئے اور وہ آنچل تھے رشتہ ہی کم بخت ایسا ہے کہ کانٹا پھول والا ہو..... جب کبھی ماہ میر آیا کرتی آدھ کچھ نہیں تو اپنے مخصوص سنہری سالے والے، ایالی خلاق اور نگینی چھلوں کا ہاتھ سے نہیں تو زبان سے ہی پرماتما تو سنا لیا کرتے۔ ویسے تو کبھی کبھی گھڑی دو گھڑی کے لئے یا صبح سے شام تک کے لئے حویلی میں آیا کرتی۔ مگر چھوٹی بیگم نے اپنی ایک سہیلی کی علالت کے دوران میں ہفتہ عشرہ کے لئے مہمان داخل اپنی تیمارداری کے لئے بلوائی اور اسی مہمانی کے دوران میں میزبان مہمان بن گئے اور مہمان میزبان بن کر رہ گئے۔ سرکار پر جائیداد راسخ تر کرنے کے خیال سے گھر کے اندر کچھ ڈال اپنی اچھی منھی ناک کے سماج میں ڈلوائی مگر جب سرکار بدر ماہ میر اور سب کی خود فریبی عین الیقین بن گئی اور حقیقت کا راز دار و رہنما کی حقیقت ہو گیا، تو ایک دن سرکار اور چھوٹی بیگم دونوں ہی نے منھی بڑھا کر ناک کے سماج میں بیرے کی نوکر پہنا دی اور اس خاموش اور شوخ گھونگھٹ کے بعد چھوٹی بیگم کی بیگماتی دلوا دیں گئے کے پھر کھڑی ہو گئیں ــــ پانچ سال اور بیت گئے مگر اب وہ وقت آگیا کہ ڈالے کے نہ بانٹے بنے ــــ سرکار کا سر ہلنا سلنا ہوا، ہل آنا ہی سرخ ڈلا گیا سارے دانتوں نے مل کر میز کی لیپ پوت کی، بال بال پر نگاہ رکھی گئی مگر سرکار کی نظر کیا کیا جائے سوئی ہی ہوتی چلی گئی، ماہ میز پر سرکار کی نگاہ اپنے دیکھ کر چھوٹی بیگم کی نظر بھی اپنے ہاتھ کے ایک تپ کے پڑ پڑی۔ بڑے بھائی کی ننھی یاد برق میز عقریب صبح کی شام میں جوانی کی سرحدیں قدم رکھنے والی تھی اور چھوٹی بیگم خفا تھیں کہ ادھر گھر نہ آنا ہو اور وہ سرکار کے لئے نیا ٹال اسپوٹ کریں "اوہ مردم شناس" چھوٹی بیگم برق میز پر سرکار کی نگاہ کا اندازہ تو دو تین سال سے کر رہی تھی جب وہ بمشکل سات آٹھ ہی برس کی تھی۔ کبھی کبھی مہینہ میں دو مہینے حویلی میں گھسے آجایا کرتی آسرکار بڑے ماموں کے ساتھ گودیوں اٹھایا کرتے بھینچ بھینچ کر پیار کرتے پیاری پیاری معصوم، بولی اور بھولی باتوں میں بھرپور لطف لے لیا کرتے۔ پھول سے، منا، اچ اچ کر دیتے، پٹاپٹ پیم پاسوں کا آزمانہ دیتے اور اوپر بٹھا کر بچھ بچھ کھیتی کا پاک رشتہ بڑے، اور سے پیار کرتے اور اس کی لبا طاہر پت کے مطابق نوازتے بھی، انعام اکرام کھلونا پلانا، کپڑا لتا، غرض دلجوئی اور عملی ہر قسم کی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے۔ ابھی ٹوک پلک سے پہلی طرح درست بھی نہ ہونے پائی تھی، کہ چھوٹی بیگم نے جیسے گل کے اندر سرخی کی پہلی رمق جھلکتے ہی سرکار کے گلے میں گلاب کا ہوا سا ہار بنا کر پہنا دی اور سرکار باغ باغ ہو گئے، دنگے، دنگے پر بہار پھوٹ چلی، ایک انتی تلا بازی کھا گیا جیسے کہ ان سالوں میں جا پڑے جب آنکھوں کے سامنے رنگ و نور کی پھلجھڑیاں چھوٹتیں اور نامعلوم رگوں میں کیا چیز مستیا کرتی ہے، کانوں میں نظر بھر کر عجب سی بجتی ہے اور میٹھی گدگدائے بغل میں کوئی انگڑائیاں لیا کرتا ہے موسم کے بھیگتے ہوئے آپ معطر ہو جاتے ہیں.....

برق میز کے دماغ میں یہ کیڑا بنا جائے تھا چھوٹی بیگم کی خوب ہی بنی حویلی میں بچی تو جال کی طرح منھی کو مگر سرکار کی نگاہ میں زہر اگلنے لگیں پھل کے بچے کو تو کاس نے سکھایا یاں بھی مٹی کی ننھیا یاں کے بیٹ ہی سے آنی تھی مگر کے سب گن نے کر پیدا ہوئی تھی، اور اس پر طرفہ یہ ہے کہ صنف نازک چھوٹی بیگم کی تربیت اور اہل کے مطابق دھوئی گئی تھی نے پرساد گن کر ڈھونگی، ذرا سی بھوگی جسے کل تک روپیٹا یا کی، اور منھی نہ آتی تھی ہنسی سر چڑھ کر ناچی کہ دیکھنے والے دنگ بدحواس رہ گئے، دھوئیں اور چیخیں سرکار کی جماتی اور گالیاں اور صلواتیں، دھمال دھپے اور گالی گلوچ کے مشغلے میں سرکار کو ایسا مشغول بڑھا کر بڑی بیگم تک سب کچھ لپیٹ کر پس انداز کی طرح گم ہو کر رہ گئیں ــــ وہ تو جیسے دیکھ کر بھتے ہوئے سونگھ کر سانس لیتے اور گردہ چاستی تر بانوس دھو دھو کر پتے کی شکل میں طرپ رچ کھاتے دیے اس کے منہ کا گال تو کبھی اگا ہی نہ دیتے اور رکھتے ہی میں ٹپ سے گر لیتے اور کچھ کے بچے کی طرح چبا کر نکل جاتے اور پہلوں آگے اپنی تو زیادہ بچھا کوتے پیار سے دیا ہتی ہو گی جس مت سے ساتھ سرکار پاؤں کی چٹکی سے سر کے بال تک برق میز کے اوپر بان سے دست شفقت پھیرا کرتے اور ہتھیلی سے اس طرح مزہ لیا کرتے جیسے دودھ ملائی کی تھنی کھا رہے ہیں۔

چھوٹی بیگم کھانی تکمیل آری کرتی تو ڈیا چھپا تو کھی تھیں، اس سال کے تمام نشیب و فراز کی محرم اور بانار کے نامعلوم کھنے آمد پڑھا دیکھے ہوئے ــــ آتے دست ڈنڈی پر گہری نگاہ رکھنے والی ــــ جب کبھی ڈنڈی کا جھکاؤ اپنی جانب زیادہ دیکھا، اسی سودے سے نہایت خوشنودی کے ساتھ

اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی کو اس کے والد اور میزبان پر نظر رکھنے کا حکم دے کر خود عراقی لڑکیوں اور نرملی اور کنول بیگم اپنا چھوٹا ایک چھوٹی بہن اور کنتی بیگی کو آگے پیچھے ساتھ لئے ہوئے کاشانہ ناز پر پہنچ گئیں اور ابھی تو خیر سے پتا پڑا کہ کتنی بنی ہوئی تھی اٹھتے بیٹھتے ہیں بھتیجیں ہیں خود بھی انہیں میں مل کی جاتیں اس دوڑ بھاگ پر پہنچنے کی نہ بھی ان کی عمر تھی اور نہ کبھی ایسی آزادی تھیں جو حالات کے ہاتھوں بچپن جھیل بھر کر عراقی مالکہ کا روپ دھارے بیٹھی تھیں ۔۔۔ جب سرکار کی جانب سے برتن میز کے ساتھ بھی رتبہ میں کچھ فرق سی محسوس ہوتی اور محل رہنے کے محل میں سرکار کے اندر وہ جھجھاہٹ جو شروع ہو کر تی تھی کم ہوتی معلوم ہوئی تو سرجیں کہ اپنے کسی کے متعین یہ بھی نہیں کہ ایک لاکھ کیا ان ہزار چھوڑ کیا ان پیسے کی بھی ڈگی ہو کے لہذا پیشتر اس کے کہ یہاں پا بجتے لگے دست بستے لگے کی نوبت کئے اور ان ایسے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کنارہ کرو ۔۔۔ کہا "پیو اور پیسے جاؤ" غیر اور روایات کے اندر روایت تھا ہی ۔۔۔ اور جی کڑا کر خاصی تک کہ کھول چکے تھے اور سرکار ہی کو یاد تھا۔ مگر بدتمیز، نابکار، بے تمیز، "موتیا گرا" "الفاظ" اور "گھسا" "نیں تھیکیں" نکل کر رہیں اور سب کی سب یک دم اور سارا کر تیرہ سال پیٹ میں کھوکھا چھوڑ گئیں اور شاید بچتے بچتے سرکار کے چہرے پر کچھ ہلکے گہرے نشانات بھی چھوڑ گئیں۔ مگر ایسے نشان کس شمار قطار میں تھے بڑے بڑے گہرے گھاؤ سرکار کے چہرے پر ایک زمانہ چھوڑ چکے تھے۔ رہا تھا ہی ہے۔ ال چوٹ کا سوال، سو نہ کا وہ اب کچھ تھا۔ آدمی کی سنہری زنجیلی گلابی جیتی زندگی تھی اور وہ بھی کے بجائے پر ہر پر ہیز کی کن کھجور کھلا ڈالیں توڑنے سے نکل ہو جاتا ہے۔ سرکار کے متعلق بھی خود اور خواص ندیم اس نکیں ادا کی حیات کے سلسلے میں کچھ ٹوٹنے سے آئے۔ وہ ایک لے دل زبان سے چرکا یا کر ڈھائی سیر ہونے کا تیز اور چڑا ہر خانہ جاہرات کے نکلنے کے کر فرد ہوئی میں معاملہ پر اس میں سے ایک کے تو سرکار نے ماحول پڑھی اور خصوص انداز میں فرمایا "یک لخت وہ شد اللہ! یعنی اپ میں تھتیاں سے مقدمہ بازی کر آپھر ہوں اور ڈنڈی عطیوں کو جاگر عدالت میں مقابلے پر کھڑا کر کے باپ دادا کے نام کر بٹہ لگا اس تو بہ آتو بہ! ۔۔۔ لے گئیں سایا اپنے مقدمہ کا ۔۔۔ میری قدیر تو نہیں لے گئیں۔"

تحفہ

اس آج تیرہ کی عمر سے شروع ہو کر تیسویں سال تھا کہ سرکار کے حکومت میں دلی نہ ہوئی تھی یوں تو یہ غلش بھی کبھی کبھی ابھرتی تھی لیکن بھابت بھابت کی دلآشتہ اور سرآشتہ شرابوں کے نشہ میں دب جایا کرتی تھی۔ گران تنہائیوں میں رات کے سناٹے کے اندھیرے کی تمام تر توجہ اپنی زندگی کے اس حصہ کی جانب مبذول ہوتی گئی۔ وہ جوں جوں وقت گذرتا یہ احساس شدت پکڑتا گیا۔ وراثت اور تعلیم کے تمام ورثہ میں کی ملکیت کا جو فی اس کا ساتھ دے رہی بیگم اور کنول بیگ کے بعد یہ احساس ان کے اندر زیادہ ہو گیا تھا اور چھوٹی بیگم ایڈ کھنی کے زمانے میں یہ شاید تحت الشعور کی گہرائیوں میں کہیں جا چھپا تھا مگر اس کمپنی کے ٹھنڈے ہی بڑے زور سے ابھرا اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کرتے ہیں۔ وہ بچ مچ ہوا ہے اور واقعی پاؤں تلے سے زمین سرک رہی ہے اور کچھ تو جوں گذرا یہ چیز ان کے لئے ایک بے نام زہر کی طرح سنسنانے لگی۔ خواب گاہ کا ہر تحفہ مکروہ باطنی سایوں کے ناگ کی طرح پھنکارنے لگا۔ انہیں اپنے پاؤں تلے ایک گہری خلیج کی تلاش ہونے لگی جس پر تھم ریزی کر کے وہ بلندی کر سکیں اس جوں وقت گذارنے کے لئے باغ لگوایا گیا اور جب یہ بھی موت تھم کر بے رنگ نامرتب شکل میں سامنے آگیا تو سرکار کے خاص باشوں میں خانخانان میں کا ایک ایسا نیا نقاش تھا جو ان کالپٹر ہاتھ کی انگلیوں کا حال بھاپ لیا کرتے تھے سرکار کے رجحان کا اندازہ کر کے انہوں نے یہ احساس تیز تر کرنا شروع کیا آہستہ آہستہ گول گول لفظوں میں تحریک شروع کر دی اور آج تو یک کی انہوں نے خوب صورت ترین صورت میں پیش کیا تھا۔ سرکار ہنسی، خیال کے پردہ اٹھے لہذا شروع تو انہوں نے شرع شریف سے کیا تھا جا بجا آہستہ آہستہ سرکار کے شعور

پڑا زیادہ اثر قبول کیا تو انہوں نے سرکار کو شرعی حکم سنایا کہ ایسی عورتوں سے شادی کرو جن کی ہیں بیٹیں کچھ پھیلیں خلائیں زیادہ تمنائیں کنیز اولاد ہوں پھر ہوتا تو قدرتی سیدھی بات تھی کہ سنت سیقہ کے ساتھ ایسی ایسوں نے زندہ مردہ لڑکیوں لڑکوں کے نام اور تاریخ پیدائش گنوائی۔ پھر ان اور خوش دامن کی زبردست آنکھوں کا شعبہ ملک کھینچ کر کھلایا۔ اپنی پھپھیوں سالیوں اور سالیوں بہنوں کے بچوں کی گنتی کی۔ اور ایک ایک کے ہاں تو فراوان گیا وہ بچوں کی پیدائش کا تذکرہ کیا اور کچھ بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی دونوں جڑواں بیٹیوں کی پیدائش کو ذکر کیا جنہوں نے شادی کے بعد پہلوٹھی میں ہی دو دو چاند سے بچے بنے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ ان کی جڑواں بیٹیوں کو پیدا ہوئے ان کو کھلانے کی نانی سے دادا تک میں بھی بے بھی جب سرکار مدینہ ہوئے تو اپنی اپنی پوتوں نواسی نواسوں کا نام بتا کر ایک ایک کی معصوم ادائیں اور بھولی بھالی باتوں کا لڑکپنی انداز میں نقل کر کے بتایا کیا۔ یہاں تو یہ سب کچھ فرصت اور تنہائی کے اتفاق میں سیدھی سادی گپ شپ ہو کر ہی تھا اس کے بعد سرکار کے دل میں حصول اور دل کی خواہش ہوگی ہیں کہ اٹھا کر لی اور وہ تو سرکار آج بھی نہ سمجھتے اور سمجھے بھی کیا۔ اگر سمجھے کی بات ہوتی تو ایک بات بھی سمجھائی لگے میں بند ہو کر لگ کر جانے والی بات آپ دھلے کے نکلے ہوئے اونٹ غریب کی بھوپ میں آنکھی کس طرح جاتی ــــ بھلا وہ اور نازو! ــــ نازو کی! ــــ گراج بیٹا فسانوں نے بیٹیاری کا چارج چھوڑ کر ریٹائرمنٹ کے بعد اور سرکار نے لائف ممبرشپ کا پروانہ پا کر عوامی عہدے سے سبکدوش ہو کر تو اتفاقات میں وقت گذاری کا منصہ بنایا ہر طرح کی رکھ رکھاؤ کی بات ہوتی اور پھیل پھیلا کر گفتگو جب یہاں پر پہنچ گئی کہ کچھ شرع میں کیا شرم کچھ تو ہیں ہو رہا خان نے کھل کر بات کی ..... اور سرکار غلام کی تو ساری عمر ڈھاکہ پر ٹنگ گھاٹے تک گئی۔ حالانکہ گواہ ہے سرکار بڑی اچھی تھی اچھے بچوں سے اچھی ــــ ہر سرکار دس روپے ماہوار سے شروع کر کے پچھتر پر پنشن پانے کی اتفاقات کیا ہا ــــ مگر سرکار کی جوتیوں کے طفیل اس زمانے میں وہ برکت تھی کہ اٹھنے اور بیٹھنے چلنے پھرنے دوڑنے بھاگنے سے چھوٹی بیٹیاں پارٹیں اور سرکار کی دعائے اپنے اپنے گھر کی ہوئیں اپنا مکان بنا اور ساری عمر سرکار کی خدمت سے بڑی اچھی نباہی بھی اور آرام و عزت کے ساتھ گذری۔ بھتیلاروں اور تھانہ داروں جیسی بہ ہوئی۔ اور سرکار بند کس قابل ہے کہ جیل اسے کے دیکھے اتنا عاشق ہوں مجھے آپ کی ذہنی کوفت کا بھی خوب اندازہ ہے اور تکلیف کا بھی اچھی طرح احساس ہے اور یہ بھی علم ہے کہ سرکار کے خاص دوست اور ندیم اس سلسلے میں تنگ دور کر بھی رہے ہوں گے یوں بھی میں نے کچھ صاف صاف بات اس موقعہ پر سرکار سے کرنی مناسب نہ سمجھی اور ہر سرکاری ملازمت کے نام کا رم چلا لگا تھا شاید کچھ آمٹ خانی ہو جاتی، اس نے بھی چھپا تا تھا اب میں بھی آزاد ہوں اور بفضلہ آپ تو مختار ہی ہیں، بھلا سرکاری خدمت کے لئے میرے پاس کیا ہو سکتا تھا گاب ــــ ہاں آں ــــ ایں وہ اب تو خیر سے وہ اٹ شٹ ــــ آپ کی کنیز بھی سیانی ہے خیر سے پندرہویں ہیں ــــ ہوں ــــ یہی اسی کنیز کو خدمت میں پیش کر سکتا ہوں اور شاید پیش کار رضا خان نے کچھ اور بھی کہا مگر سرکار نے یہ آخیر جملہ سن کر اور داخلی و خارجی تمام واردات پر قابو پا کر پرانے پٹے بند کی طرح لمبے تیور بتانے گویا پیش کار رضا خان کی بات ہر پہلو سے مناسب ہے جیسے پیش کار صاحب پندرہ سال لڑکی کا جوڑا تھانہ سال لڑکے والے کی تجویز پیش کرتے ہیں اور سال بھر کی سنی ہوئی آج سمجھ میں آئی۔ رضا خان کے ہاں فرمے کے غمان بھر کے لڑکے لڑکی کا نقشہ مردمردہ کا حد دار بعد عورت عورت کے کچھ کی لمبائی چوڑائی سب کچھ سٹ سٹا کر تذکرے میں زبان پر پھیل ہو کر رہ گیا اور سال بھر کی لمبی چوڑی گفتگو کا مزین تذکرے کے پھل سے ہونٹوں پر لگ گیا۔ بھن سے ایک مکھی شعلہ سا ہو کر اٹھا اور سرکار کے سب کچھ بھلا گیا اور سرکار نے پیش کار رضا خان کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اس جرم کی جانب دیکھا کرتے تھے جو ہوس کے زور اقبال جرم کرنے والے دو شخص میں ان کے پوچھے ایک مقدمہ کی سماعت کے عاشق کام کر رہا کرتا تھا۔

نہ کچھ کہا نہ سنا گئے نے کا موقع ہی تھا اور نہ ضرورت ہی، اور سرکار نے آج سال پیش کار رضا خان کی ہی بھی ہوئی تجویزوں اور زیادہ اصلاح یا کچھ بیچ کر دستخط کئے تھے اور یہ تجویز آرڈی جانچ اور مثل تھی اور بڑی خوش خطی جیسے سنہرے روپہلے حرفوں میں لکھی ہوئی پچھلے سے ہاتھ کے نقشے پڑتا پاتے گیا دستخط دیئے رخصت ابھی زد چوری پچھے گئی تھی اور سرکار چوری آج چوری دیر بھری کے بھی سب داؤ بھول چکے تھے لیکن آج پیش کار رضا خان سے کچھ ایسی

ذہنی خوبصورتی سے یا دولت کی چمک دمک سے کی سب وار دیتیں یا واقعیں۔ اور آمرانہ پن ہوگیا اور زبان سے زیادہ اشاروں ہی اشاروں میں سب چیز طے ہوگئی۔

یوں تو سال بھر سے نیلوں اور ناخوشیوں میں سرکار کا گھر بسانے کے لئے رسہ کشی چل رہی تھی۔ مگر جب کیا سرکار کے یا کسی اور کے وہم و گمان میں بھی اس زبردست قوت کی طرف سے ایسی بات کی جائے گی اور سرکار کی ذات کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیا جائے گا۔ ان پہلے تو خود سرکار کے واسطے میں بھی قدرے حق کی بھی ہوتی تو ہو رہی، لیکن یہ ناخاں تو معلوم کب کی سٹ کے پیچھے تھے۔ بھاسر کا ایسے ارادے میں انکار کی کیا ہمت تھی۔ تین دن تو بس سناٹا اور پیش و رفت کے بعد میاں میں ہی دل کے اندر ہی اور چھٹے روز پھلا عجیب پڑا اور بس اسی روز سید کو اشارہ میاں چند خواص اور بے توث دوستوں کو کے کر اچھا عمامہ اور نیچا جامہ پہنا پہنا کے میر کلاب کے پھولوں کے گجرے ڈال کر پیش کار فتحاں کے دروازے پر پہنچ گئے اور خاوند مغرب کے درمیان کی نیک اور بابرکت ساعت میں قاضی نے دولہا دلہن کو سکھ سالہ دولہا میاں کو پھر ساز خسکی فرزندی میں دے دیا اور فاتحہ اور رسم کے بعد ہی چودہ سالہ دولہن کو بنے گھوڑوں والی جوڑی کی فٹن میں بٹھا کر مسال گیاں جیت لئے" سوئی جو لی بس گئی اور گھر گھاٹ سینہ بھر گیا۔

تاج بہ تاجدار

اور شہزادہ سلیم کو یہ محسوس ہونے لگی تھی کہ کبھی کبھی پیشہ چھوٹی بیگم کی گود میں "تا زمین چڑھی چڑھی پوتی تھی۔ چہرہ چہرہ گھومتا ہوا کوئی جانا پہچانا۔ اور تو کوئی چیز نہیں رہی تھی مگر کلاونی تھی جو طبیعت کا شعور بھی جنتی برس پیشہ گایوں سے کھوئے سے نکل کر اپنے چند جوانے بچوں کے ایک چھوٹے سے نبس تک پہنچ پایا تھا۔ دن رات انگیٹھی میں جلیا گیا اور عالی شان بھری پری حویلی کے اندر لمبے چوڑے دالانوں اور صحنچیوں میں تھرکنے لگا اور سیج و ایوان خانہ اور انگیٹھی میں قیامتیں کھانے لگا۔ وہ نگاہ جوان کے ایک اکھڑے سے باپ کی ہیبت تک کو لرا کر رکھ دیا کرتی تھی اور کبھی کبھی حویلیوں تک جرات کرنے لگی اور لپٹ پڑیاں بادام اور اخروٹ پر اترنے جب نیچے آئی تو جاری گھر گھرانی تالیوں اور لاتی صوفوں میں دھنس جاتی اور کرسیوں میزوں سے نیچے اور خم میں اٹھا کچھ جاتی اور پھر ایک زبردست قہقہہ کی رنگین تابناک جھاڑ فانوس کی جھلملاہٹ میں جھلملا جاتی۔ تو پوسی کے لئے سونا جھوٹا پڑا پہننے والے سیم پر گھومی گھڑی میں ریشم و گلہ خواب کا ایک بیل دار جس خوبصورتی ڈوب کر آتا اور اترتا یا کس کے سرخ جواہرات سے مزین طلائی زیورات نکلی سے کمر کے بال تک چمکا کرتے اور بڑھتے بڑھتے سینہ کے غنچہ بھی کا اور وہ ایک وقت جسے کا گوشت اور دوسرے وقت پتلی دال کرنے والے اس دور میں کے اندر اس نعمت کی کفایت جہات کی اندیش صبیح سے شب تک قطعی پیش بردے کے اک ذرا سے اشارے پر دھول فراش اور پیش دستی جھک کر حرکت میں آجاتیں ۔۔۔ اور چند ہی روز کے اندر شہزادہ سلیم کو یاد ہی نہ رہا کہ وہ بادشاہ کے نورتنے کی کوٹھری میں سے ٹھاٹھ سے اترا تھا۔ کہ اور اوا بھر ترن تاج کر تریج کی گھسی ہوئی پر کو اور سر پہر کی ٹھنی ذات کو نکالا کرتی تھی۔ تازہ سے شہزادہ سلیم اور پھر تازہ میں ہوئیں۔ مگھم سے مگھیں اور بے زبان سے بات والی ۔۔۔ اور زندگی ریہاڑ پر آگئی اور نہ زندگی جو ہر سی حیات کا عنوان بکیت ہوا ۔۔۔ بلکہ پڑ کو محمد اکبر کھڑ قول کے خال نہ دت گا۔ اور خاص کنیزوں کی مگر اپنے علاقہ دار شوہر کی لگ ۔۔۔ تکھے پیچھے، دائیں بائیں اوپر نیچے بکیت ہی بکیت، ہاتھ کی بکیت۔

گرچہ ہی لڑکی شہزادہ سلیم کو بھیے کسی معلوم شے کی تلاش سی ہونے لگی اور تلاش نے آشنا کی صورت اختیار کر لی اور جب اس کو اس معلوم چیز کا علم ہوا تو اندر سے کرا ہا تک بھر رہے گھر میں خالی ہاتھ تھی اور دیکھتے دیکھتے نئے زیر و جواہر مرصع معلوم ہوا اور پکتے دکتے مجاہرات کا پیچ کے گچھے لٹکانے اور پھر تو پت ریشمیں لباس بھیے مجرا چھوٹے ہر گچھ کی طرح رکھ کر لٹکانے سنانی دینے لگے اور جب ایک نیا بڑھ کر نگاہ اٹھائی تو اندھے

ٹیکا ہتک سب کچھ زمین دھرا رہا تب نظر آیا اور ناز و ادا سے کہا خطاب بڑھیا کی بھرمٹ گالی سنائی پڑی اور پھر جب نگاہ بھر کی آ جیسے خشک مٹی کے تودے پر جم کر رہ گئی....

بڑا شوہر اور بڑا شوہر بھی وہ شوہر جو اب ہوٹل کا مسلم ثبوت کہ رسمہ کا اگل کھانے کی عورت سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا جیسے پھر بھی ایک لذت کی ضرورت تھی جو سماج کی نگاہ میں ذلت کر اس کے نام کے سکے کی صورت میں چل سکے اور ملکیت اراضی میں ایک خانہ بھر سکے اور اس نے اسی امید میں شہناز بیگم کو تھام لیا تھا جس کے لئے وہ حتی الوسع ہاتھ پاؤں بھی مارتا رہا تھا مگر اس کی ساری جد و جہد کے باوجود شہناز بیگم مرجھی سپی کی طرح کھڑی تھیں اور ایسے بے نیاز کھڑی تھیں وہ ریت کا اجارہ تھا ــــ اور سرکار بغیر ہی جڑ کے ٹہری کرد و پیش سرگرداں تھے اور شہناز بیگم خود اور زندگی کی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود شوہر اور دوسرے مین کا تلقہ تھی بیوی و بیان اور سینہ بھی سنان اور پیٹ کو کھ اور زم آغوش سب کچھ خالی....

اور سرکار اس طبقے سے متعلق تھے جس کے اندر جو فرد زیادہ سے زیادہ خلاؤں کو کم سے کم موقع زندہ رہنے کے سپرد کیا رہتا ہے وہ کی زیادہ سے زیادہ زندگی کا الم ہو کر آئے اور باپ کے فرزند اکبر جملے کے اتفاقی سبب کے طفیل دو لاکھ روپیہ سالانہ کی مدنی کتاب تقدیر سے اپنی قسمت میں لکھا کر لائے تھے اور اسی کاتب نے روایات اور قانون کی آشیانے کر سرکار کے چھوٹے بھائی کی تقدیر کے لیکھے میں دو ہزار سالانہ لکھ کر بھیجا تھا اور سرکار کے بھائی خود ان کی نصف سے بھی کم پر اپنی عمر بھوگ کر ایک بیوہ اور ایک خورد سال یتیم چھوڑ کر چل بسے تھے۔ اور اب بھی دو ہزار روپیہ سالانہ کنبہ آدا کے دو لاکھ سالانہ کے علاقہ میں سے باپ کی توریث میں تاج میاں تھا جو حضرت سرکار ہی کے ہاتھ سے پالے تھے اور محل کے چھوٹے اصطبلوں کی تھاریں چھوٹے سے بانی مکان کے اندر سنگ بست کے خوان سے بیوہ ماں کے ساتھ گذار رہے تھے اور اپنے باپ کی اس خطا کی پاداش بھگت رہے تھے جو انہوں نے اپنے بڑے بھائی سرکار سے دو سال بعد پیدا ہونے کی شکل میں کی تھی۔ مگر جب شہناز بیگم کی شادی کو دو سال یوں ہی گذر گئے اور سرکار کی ساگرہ کے سوت کے پنڈلے میں قرمی حساب سے مع سود اصل کی گرہ خیر سے اکہتر میں گانٹھ لگ گئی تو کچھ مدتوں سے لوگوں کے دل کے اندر جو خاکہ ذہن اور ہونٹوں پر سسکنے لگا اور محتاج عام کا زندان اور کاشتکاروں کے دماغ میں تاج میاں کا نقشہ جیسے کچھ دوسرے عنوان سے آنے لگا اور اس مرتبہ تاج میاں فریاد کا گذرا لیئے کھڑے میں کئے تو ان کے اوپر سب کی نظریں کچھ عجیب زاویے سے پڑیں حتی کہ محتاج عام تک کی نگاہیں چوری چوری چھپی چھپی کیں اور کارندوں اور مقدموں کو جیسے یک بیک معلوم ہوا کہ دیکھے کس کل اونٹ بیٹھے۔ رات کو جب ٹاگر پیٹے میں ذکر کی چلکاری تھی تو اس مخصوص تذکرہ میں سے اس مرتبہ تاج میاں کا نام بھی حذف ہو گیا جیسے لوگ جائداد کی نالی کھلوانے وغیرہ وغیرہ کے مقدمات میں پانے داروں کی فہرست میں بیان کرنے کے تعفیف کیا کرتے تھے یہاں سے وہاں تک سب کو آج میاں جیسے کوئی غیر معمولی وجود سا محسوس ہونے لگے ایسا لفظ اس کے معنی شاید کبھی بہت اہم ہوں ــــ اور جس جس وقت گذدان کی پیشانی میں جیسے کوئی بڑی شکن تحریری منظر آنے لگی اور ان کے خیال ہاتھوں میں مقبض کی جبادی اور دنانی کی باگ روڑیں لپٹی کھال دیں اور وہ اس تاریخ کا نوحہ معلوم ہونے لگے جس کے سایہ میں بیٹھ کر سب کھیل کھیلا کرتے تھے۔

جیسے محل خود پرخواہ کا لکھا آپ ہی آپ مگر جیسے اس جملہ میں بھی کہلا بیٹھتا ہے اور بادلخواہ اور غم معظم میں روشناسی ہوتی ہے لیکن جب آبائی ملکیت میں ہر زیادتی کی جانب سے یہ اندیشہ ہو کہ یہ میراسولہ آنے کا وارث ہے تو حیات بعد از مرگ کی ناکامی کے خیال سے صحیح کا خیال کر کے ہی غم معظم کے خون میں جاگ اٹھنے لگتے ہیں اور سرکار کو یہ کھانا نہیں پڑا تھا کہ شرعی اور قانونی وارث تاج میاں ہی ہیں۔ اور سب کو نظر آنے لگا تھا کہ بس ایک بچی کی دیر ہے اور یہی چیز ہر سرکار کی آنکھ کی تھی تاج میاں کو بھی کھٹکنی پڑتی تھی ابتدا انہیں غم معظم سے جیسے کچھ غیر معمولی ڈھیبی کیفیت محسوس ہوتی تھی اور اس چیز کو ذکر کا تو درکنار رہی بلکہ تفصیل کے ساتھ تو اب اپنے دل میں خیال بھی نہ لا سکتا تھا کیوں کہ گذارہ خوشامد کے لیے سوچا بھی تک حرامی تھا لیکن زبان خلق کو کون روکتا۔ خود سرکار

کے حاشیہ خیال اور اہل کاروں میں ایک گروہ ایسے کارخانوں کے خلاف چلا آرہا تھا جنہ لوگ تاج میاں کے بھی خواہ بھی تھے پھر یہ کوئی ایسی ولی چیز تو نہ سمجھی جاتی تھی سلا تعصب اکل حلال کے پابند سمجھے جاتے تھا اور جس جس وقت گذرا جاتا تھا یہ چیز باسمجھ تر ہوتی جاتی تھی۔ پہلے لوگوں نے تاج میاں کو مکمل کر سمجھا اور پھر کھلم کھلا کہنا یا کہ تاج میاں سنبھلنے کی راہ نہیں ڈالیں۔ گروہ آپسے لڑنے لگے۔ دولت کے سکنڈے نیروں کے ہاتھوں بیایا کی بھیک کے پلے پندرہ سولہ سال نوکریں، رسوئی ہدایات کے طاب تھے چلے جارہے تھے کیا تھی۔ احساس کمتری کے مارے عمر میں کبھی بیایا سے دو بدو بات کرنے کی بھی نوبت نہ آئی تھی سال کے سال عید سلام کر جاتا تو اتنا ہو جاتا۔ خوابِ دریچ ہوگیا تو مختار عام کے دفتر کی کوٹھڑی سے ہی پلٹ آتا اور مختار عام کے ہاتھ سے اس طاح لے کر چپکے سے چلا آتا کہ دوسرے ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو۔ مگر اس مرتبہ ربیع کی تم گذارہ دینے کے بہانے مختار عام نے جیسے کچھ پیش سی کی اور مخصوص تنظیم کا اعلان بتایا۔ سرکار کے چند معتمد خاص کے چند معتمد لوگ، وہ ایک تاج میاں کے بھی خواہ سب مختار عام کے دفتر میں جمع ہو گئے اور اب نئے دل کر سمت بندھائی ترجمہ بھوانے کے خیال سے تاج میاں نے کہا کہ آخر اس وقت آپ لوگ مجھے کس اقدام پر آمادہ کرانا چاہتے ہیں آپ لے یہ لے دی کر اس مرتبہ تم گذارہ لے کر بلکہ ارتکاب میں تایا حضرت کے سلام کو دیوان خانہ میں چلنے کی نئی ریت ڈالو تاکہ سال کے سال عید بقرعید کے علاوہ سال میں دو مہینے تو ہر یالی کے اور ہوں۔ اس پر تاج میاں نے پھر گرجنا کیا اور کہا کہ جو کچھ ہوگا وہ ہوئے گا اگر شرعی اور قانونی طور پر ان کی وفات کے بعد زمینداری مجھ کو پہنچتی ہے تو پہنچے گی آخر اس بار یابی اور رونمائی کی کیا ضرورت ہے۔

ان لوگوں نے کہا یا کہ سنا کہ قانونی رواج شرع اور قانون کی رو سے ان کی وفات پر تمام ملکیت آپ ہی تمہارے حق میں منتقل ہو جائے گی مگر روایات صنعت نسانوں نگاہ جلب اور سرکار اپنی زندگی میں مختار ہیں خواہ اپنی ملکیت کو کچھ کریں اندیشہ ہے کہ شہزادہ بیگم سرکار کو شیشے میں آتار کر ان کی زندگی میں کل علاقہ اپنے حق میں وقف کرا لے گی یا اپنے حق مہر کی رقم بڑھا چڑھا کر سرکار سے بلا عوض حق مہر اپنے نام سپرد بیع وغیرہ کوئی قانونی شکل کر لے گی لہٰذا حضرت اس امر کی ہم کو تہ تایا کے سامنے جگر اپنی صورت رکھتے رہو تاکہ انہیں یہ احساس رہے کہ جائز اور اصل وارث تم ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ تایا کی آنکھ بچتے ہی اس دو منزلہ حالاً کی ذکوٰۃ و زکوٰۃ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے ——— سب نے بہت بندھائی اور تم گذارہ لینے کے بعد سلام کے لئے دیوان خانے میں پہنچ گئے۔

سرکار کی کتاب جیسی آنکھوں پر چشمہ مدتوں سے مکتک رہا تھا اور اسی سے بچنے کے لئے انہوں نے کئی برس سے بند جیسی عطاری کی شیشی شروع کر دی تھی اور طب اللہ کے بعض میں آدھن کھو بیٹھے تھے مگر اس وقت شاید کچھ نیک فرشتہ تھا یا معلوم کیوں بھیجو کو ڑے چاہے کے ساتھ لیا دیئے گفتگو کا موضوع تو کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ یہ کچھ دیر خاموش اب کے ساتھ نظر جھکائے بیٹھے رہے اور جب رخصت ہونے لگے تو آداب کیا تو خلاف امید سرکار نے فرمایا۔

"میاں تمہیں کچھ آیا کرو" اداس پر ذہانت بندگی اور تیسرے چوتھے روز دیوان خانے کی جانب چل کھڑے ہوئے اور اسی مرتبہ تک گھنٹہ اخلاص کے ساتھ رہے اور دوسری بار یابی بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ ہوئی ایک دو بار دو سرکا سوال بھی کیا جس کا جواب انہوں نے ٹکا سا جھٹکے ہی جھٹکے سے نہایت مختصر دے دیا۔ پھیری حاضری میں بھیک بالکل کھل گئی۔ بات کرتے میں ایک دو مرتبہ تمہارے تکلف کے طور پر منہ سے تایا حضرت بھی نکلا اور کچھ تو پاؤں کھل گیا۔ حاضری روزانہ معمول ہو گئی اور جیسے جیسے گھر کے اندر باہر سب مجھے لڑکے لگے جیسے لونڈیاں بچہ جنتے ہے اور جب ایک مرتبہ بخار آگیا تو تین چار روز حاضر نہ ہو سکا تو جواب طلب ہوا۔ بخار کی اطلاع بھیجنے پر مخلص نہ اشتیاق ہوئی اور شفقت آمیز تشویش کا اظہار کیا گیا اور تندرستی کا پیغام۔ لکھنے کی پیمانہ فصیح ہوئی اور لالہ ملکیہ صاحب کو طلب کر کے نبض دکھائی گئی اور تیسرے تیسرے ہی تاج میاں کو یہ سب کچھ ناخوش آمد محسوس ہوا باپ کی شفقت کا مزہ تو پچھلا ہی نہ تھا بیایا کے ساتھ تعلقات اگرچہ خالص سیاسی جذبے کے تحت قائم کئے تھے۔ مگر چند ہی ماہ میں دوران کے بہت ہی قریب پہنچ گیا اور اندازہ ہوا شفقت پدری شاید کچھ اسی قسم کی ہوتی ہوگی۔

ہر چھ مہینے کے اندر اندر فخر عالم کے دفتر کی کوٹھری کا چھاتا مع میاں ایوان خانہ سے ہوتا زنان خانہ میں جا پہنچا عید کے روز سر کار بڑے پیار کے ساتھ اندر لے گئے اور بڑی خوشی کے انداز میں مختصر سا تعارف کرتے ہوئے تاندومن کے سامنے تحفہ سا پیش کیا اور نوجوان تاتی نے تاج میاں کو شوہر کی زبانی ان اور بیٹے سے کچھ عجیب سے تعارف میں پہچانا اور سر بار تو خوبصورت انداز بتائے بیٹے اپنی کوئی نادر چیز نازو دمن کے سامنے پیش کرتے ہے اور انہوں نے بھی کیف و مسرت اور عزت کے احساس سے اپنی دو سال کی بچی ہوئی بھینی آنکھوں سے دیکھا اور مرے مرے گلابی ڈورے چھل گئے۔ گلاب کی پنکھڑی پر جیسے اوس کے قطرے چمک اٹھے اور ہونٹ نم نم سے ہو گئے اور پھر دبا دبا سینہ ایک گہری سانس کے ساتھ اوپر آپ تن گیا۔ ذرا اور پٹہ سنبھالا اور پھر جیسے فخر کے احساس سے گلابی رخسار قوس ہی ہو گئے اور پھر جیسا جیسا سا گھا زمین اور تھا کا سا دوا تھا دوپٹے کے اندر سے خود بخود نمایاں ہو گیا۔ یہ کچھ کہنے بن پڑنے اور لجانی لجانی لگاوٹوں سے کچھ استقبال سا کرکے وہ تو جیسے بہت سی ہو کر گئیں۔ اور جب ذرا چہرے پر کچھ اطمینان اور خاصہ سلامت پیدا کرکے کوشش کے ساتھ تاج میاں نے اپنی جھکی ہوئی آنکھیں اٹھائیں تو شہناز بیگم کے اندر سے یا دفعتہً جیسی کوئی چیز سنبھل کر حجاب آمیز تحیر میں ڈوب گئیں۔ اور تاج میاں کا یہ نمدار انداز اور گہرا ہو گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔ اور شہناز بیگم نے رخ پھیر کر کچھ اس طرح جیسے اپنا آپ سنبھالا اور تاج میاں کا پوچھا جانا لے کر سراپا حیرت بن گئیں۔

"واہ ایسے بھی ہوتے ہیں!" چار دیواری کی بیٹھنے والی بیگم اور گھونگھٹ کی پلی لڑکی نے آج عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا یہ آدمی ہے یا کوئی اور مخلوق اور ہر کا تخیل تو شہناز بیگم کے دماغ میں پیش کار خانساماں تھا یا پھر سرکار ـــــ جب سفید لمبے لمبے فرغیرہ، کھانسا، کھنکھارنا، بلغم کی پوٹ اور انجنوں کا ڈھیر اور زندگی کی جھڑیاں ـــــ اور جیسے اس کے دماغ کی کھلی پر سرکار کے چہرے پر تھی بھریاں اور پیشانی کی تہی شکیل نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ تاج میاں کی آئینہ سی پیشانی اور آنکھ سے رخساروں پر ایک نگاہ پڑتے ہی کنکھی گلاب کی سچ مچ جیسا نگ مرانہ خط و خال، انھنی گھنی پلکوں سے چھائی ہوئی شوخ آنکھیں جن کے اندر سے کنکھیوں کی میں شہد کے دھارے سے چھوٹ رہے تھے ترچھی ترچھی گردن اور گہرے سیاہ چمکدار بالوں سے مزین گول سر بلند چاند کا کوئی سی پیشانی، بھرے بھرے بازوؤں کا چمکے ہونے کے باوجود بھی تیکھا تیکھا بانکا بانکا انداز اور خاموش جوتوں سے جیسے بولتا ہوا بانکپن کی چغلیاں کھا رہی تھیں۔ اور وہ جیسے پہلوانے سنگ مرمر کی چٹان سا سینہ خیرہ کن کے اندر سے پھٹا پڑتا تھا اور سات کھڑے ہونے کے باوجود جسم انگڑائیاں سی لے رہا تھا۔ عید کے ستمے لباس میں تاج میاں تاتی بی کے سامنے ادب کے ساتھ کھڑے تھے اور شہناز بیگم ساری کوئی آبائی مفلسی کے مذاق جانی نے شاہانہ انداز اور وارفتگی کے ظاہری بانکپن کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ شاید علیک سلیک کے بعد دونوں میں ایک دوسرے کے آغاز کلام کے منتظر تھے کہ کمرے پر مہر سکوت تو ڈی کچھ دیر یہی بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا کہ باہر سے عید ملنے والوں کی آمد کی اطلاع آگئی اور یہ دونوں اٹھ کر چل دیئے۔

رسم نکھس ہی گیا تھا۔ مہینا ہی بھر میں چند مرتبہ کے جانے کے بعد تاج میاں کی بھی جھکی گردن ترچھی ترچھی باتیں ہو کر بند ہو گئی اور چار چھ مہینے کے اندر کار نے محسوس کیا کہ ان کی بھی آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی ہے اور انہیں تعلقات اور رتبہ سے ایسا اندازہ ہوا کہ شاید بغیر کسی جتنے شہناز بیگم کی گود بھر جائے گی۔ اور یہاں اندازہ اگر دقیہ اور خلوص میں کمی بیشی رہی تو سوا سال شہناز بیگم اطمینان سا بیٹے کی ماں بن جائیں گی۔ اور اس چیز کو محسوس کر کے سرکار کے خون نے آزمایا جوش لہٰذا کر وہ واقعی اپنے دلکش جوان بیٹا کو محسوس کرنے لگے۔

گھر میں کار رخصت کا ماتھا تو پہلے ہی روز ٹھنک گیا تھا مگر شہناز بیگم کی شادی کے دن ہی سے انہیں یہ مستقل کا نقشہ نظر آتا تھا اور گھر کسی بہانے سے اپنا سا بن جانے کا اندیشہ تھا تو تاج میاں تھا۔ بہلاوات تو تھا ہی پچھلے کے گریٹی کے اندازہ ہوتی تھی اور جو وقت گذرتا تھا یہ ختم ہو رہی تھی اب دوسری لباس تھا اور دو لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا میزان نواسوں کی بجائے پوتوں کے حق میں لگانے کی راہیں سوچ رہے تھے اور اس رسمی کلب

سے بڑا، بڑا بھائی سہارا تھا جس کی وجہ سے ہی وہ بڑی کی حیثیت کی تھی کہ باپ کا سایہ سر پر نہیں تھا اسے دیوان خانہ میں بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے دیکھ کر کھٹکا کہ تھا یہ ہوئی میں نوابوں بہت خلوت سے اور تجربے کار باپ کی بیٹی خود ہی کچے گھڑے کی طرح سے تن کچھ تیب سی بات ہو گئی ۔۔۔ جیسے اس کا بس نہ رہا۔ حالانکہ باپ کی تحریک پر پہلی کے بعد دوچار آدمیوں میں تبیہ کر لیا تھا اب تو عرضی میں کے گا تو سرد مہری کا انداز بر قرار رکھی گی۔ اور بس ایک ہی دو دھ کے طرز عمل سے اس کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور پھر عرضی کی جاب رخ بھی نہ کرے گا۔ مگر جیسے اس کے آنے پر تو اس سے کچھ بن نہ پڑی اور دستر خوان لگانا ہی پڑا۔ اور جب وہ کھانا کھا کر چلا گیا تو اس نے سوچا کہ اس لاڈ جانا کسی پیسے کی قرین مصلحت نہیں اور پھر یہاں تک خیال کیا کہ وہ اس کا بیٹا بھیجو تو نہیں شوہر کا پیار زندہ ہے اور خیر اس میں کوئی بات نہیں ہے جب تک شوہر زندہ ہے وہ اس کا حق ہے۔ وہ پھر رکھ ہو کر تحریہ کر لیتی کہ بس آج آئے گا تو ظہر عمل بتلا جائے گا مگر تانے کے وقت تو جیسے وہ کچھ الٹی منتر سی ہو جاتی اور جب وہ دوپہر کے دستر خوان پر ہاتھ بڑھا کر بے تکلفی کے ساتھ کھانا ہوتا تو سوچتی اس کے دال کا مال ہے حق دار ہے ۔۔۔ اور پھر ایک روز تو میں کا رفتاخاں کی تنبیہ پر وہ بالکل تیار ہو کر بھی گئی کہ بس آج صاحبزادہ کو عرضی کے لئے آمادہ کر کے ہی آئے گی مگر ان عرضی اور شاید دوپہر کے وقت اسی لئے کچھ زیادہ فشار سی رہی کہ بھری بھی تھی اگر وہ تو ڈرتی ہی سے اس کی چاپ سن کر اس دھکے سے ہو گئی اور مظہر پر ول زور زور سے دھڑک اٹھا اور جب وہ سامنے آیا تو اس کی پڑ گئی۔ دل تو ٹھہر گیا گھبرا سے بچل پڑی آپ ڈھنگ پڑا سنبھلے ہوئے پر سکوت کھیل گئی سینہ کے اندر سے گلے تک ہٹ سی ناتی پڑنے لگی۔ لاحول ولا قوۃ ۔ ماں کو پوتا نہیں جا رہا ہے۔ گھر کا مالک! بھلا میں کیسے ڈک سکتی ہوں؟ یا جان تو کن کر اس لگتے ہیں! اور بھلا پھر جب وہ گھر میں مہمان کے طور پر آتا ہے تو وہ کیسے تو امتح اور استقبال نہ کرے۔ ایک ہم عمر ساتھی ۔۔۔ دل چسپ دوست ۔۔۔۔۔۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

اور بیگم رفتاخاں نے پھر ناچیز کا مادر خاصت اندیشہ بیٹی کو سمجھایا اور پان دان کھینچ ہوئی مہر کے پاؤں کی نکلی جوتیوں کو ہاتھ رکھا اور کہا کہ اگر اس کو خوش کر لیا تو تم بھی اس دھرتی پر چل گئی اور یہ بات بالکل سچی ہوئی تھی۔ خلوص دل کے ساتھ خلوص تدبیر کرنا اور اب کی مرتبہ آدھی کر کے ملیہ تو ہر بھی گئی تو تاج یہاں تو زاہد سنبھلا ہوا تھا پشیانی کے پھول اور ہونٹوں کے تبسم کھلے ہی رہتے تھے پھر وہ جیسے نہ رہتے بے تکلف ہی ہو گئی تھا اور شہناز بیگم نے اندازہ کیا کہ اس کی عدم موجودگی تو سوہان روح ہو سکتی ہے مگر موجودگی تو مسلسل تبسم ہے اور اس سے ملیحدگی تو ناممکن ہے۔ بیوقوفی سے کسی ہو کر شاہ کے تعلقات اور بہتر تو نہ شکار ہو جائیں اور شہناز بیگم نے بھتی تاج یہاں سے کھنچنے کی سوچی اور اتنی ہی قریب ہوتی گئیں۔ اور جیسے اس کا وجود ان کے اندر خلش محسوس اور پھر آگ سا بنتا گیا۔ شادی کے بعد چھ ہی مہینے کے اندر شہناز بیگم میں پہت ہوا اور بیٹی کی سی پیدا ہو گئی تھی اور سال بیتتے بیتتے تو سولہ سترہ سال کی ایک چاند سی بیٹی سی بن گئی تھی مگر تاج یہاں کے مرتبہ سے اونچی مہینے کی قبیل مت میں یہاں سے چلی گئیں جیسے دیس پہنچ گئیں۔ شروع شروع میں تو ایک ہم عمر کی کھیل ہو گئی تھی آگیا۔ کھلنڈرے کی کھل کھلاتی ہوئی ہنسی سے ہنستا ہوا گھر کے کمروں سے باہر تک نکلی ہوئی ٹہلیا اور وہیں ہوا ہوا کا فرق فاصلہ و آغاز ہوا سہیل اور سہیلا ۔۔۔ اور پھر تو ہوئی کے اندر آنے کی چھاپ لگانی پڑی۔ اور حصول اولاد کے سلسلے میں جو طبی علاج کرتے رہے تھے اس کا ذکر نکل آیا اور جیسے یہ گفتگو کسی نہیں ہاتھ سے اپنے آپ ہو گئی اور ہم کار کی خوشی اور اطمینان کو بھلا اس روز کیا اٹھانا تھا جس روز خود کار زمین نے اپنی تابانی سے تحریک کی کہ تاج میاں کی رہائش اور آجانے کی اعلان کر دیا جائے ۔۔۔ ہوں اندیشا! ماں اور بیٹا! باپ اور بیٹا! بھلا کون سی چیز تھی جس کی جوڑی سہر کے پاس نہ تھی۔ اور نہ زمین کی تجویز جیسے سہر کے ان کی آواز بھی کیا خوان کے اپنے بیٹے کو کر خوانوں میں تسمیاں سی بچے کیس بلی جوڑی زمین پر پھیلی ہوئی لگیت کا نہ وہ زندہ انگوریاں جیسے لگا چہ چہ تاکیاں بچانے لگا۔ بوٹے جیتی جوان بلا بلایا کہیجو کہو یا بیٹا! بیٹا! بلا یا بھیجو ایک ہی بات ۔۔۔ اور سہ کھلا وہ نازنین زمین دوں کے ندھ محصول اور کی کمی خواہش پوری ہو گئی۔ سکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ شادابی سرسبز میں پھل آتا یا۔ موسم انقلاب بدلا۔ آمد و کامگاری بلند۔

اور تاج میاں نے اقتدار کی تربیت میں جتنی تحصیل پائی اس کے مطابق عرضی کے اندر کی زندگی میں پاؤں پھیلانے اور باہر جتنی تابانی کے طرز عمل میں

گہما گہمی دیکھی رسم و انتظام میں سرگرمی دیکھی۔ اور سال بھر کے اندر حویلی میں تو جان سے بیزار بیٹھے ہوگئے اور باہر انتظام ریاست میں تایا کے ہست بات کے بجائے اک سے بن گئے اور خیر تائی کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھے ہی تایا کی چھوٹی آنکھ کا تل بن گئے اور چھوٹے بھائی کے لئے سر تاج ہو گئے۔

تائی کا قہر گہری جراحت میں تبدیل ہو گیا اور یہاں تک کہ سترہ سالہ شہناز بیگم اٹھارہ سالہ بیٹے کی ماں بنی لیکن آپنے تئیں اور سرکار حویلی کے اندر پیدا فرمان امیر بن دیکھ کر بھی سوائے دل مسوسنے کے اور کچھ نہ کر سکیں۔ ہر وقت باغ باغ نظر آتے۔ صبح سویرے کے دشتے پر آٹھ لیکے حویلی کے اندر آجاتا اور دادت کے گیارہ بجے جب سرکار دیوان خانے کی محبت بڑھا حویلی میں سونے کے لئے آتے تو باہر اپنی خواب گاہ میں چلا کرتے۔ دن کے گھنٹوں میں اگر باہر کسی کام کے سلسلہ میں ضرورت پڑتی تو محتار عام یا سرکار خاندان سے ہو جاتے اس کے باوجود ہفتہ کے ہفتہ ایک دن باہر گذارا کرتا۔ تمام نوکروں کی پیشی کا تمام تر حکم کے ساتھ حتیٰ کہ اصطبل خانہ تک پر حیرت کی پڑتال کرتا۔ کاغذات پڑھا کرتا۔ محتار عام و کارندوں کے بہی کھاتے اور حساب جمع خرچ دیکھتا۔ ذرا سی فروگذاشت پر کڑا محاسبہ ہوتا۔ آئندہ ہفتہ تک کی مہلت دی جاتی اور ایک ڈائری یادداشت ہو جاتا۔ گذشتہ ہفتہ کی جانچ اور دیکھ بھال سے پہلے ڈائری کے اندراجات پڑھے جاتے اور اس سے کام کی شروعات ہوتی۔ بعلاء کار تو کار سرکار کے باپ دادا پردادا کے دور طفولیت میں بھی حسن انتظام آیا ہوگا۔ ہر ہی فصل میں کتنی ہی دری ہوئی فرشیں زندہ ہو گئیں کتنے مستقل فرش بدلے جاتے رک گئیں نظر کو یہ عالم ہوا کہ محتار عام سے لے کر ادنیٰ پیادہ تک سب کے ایک ایک ذرے پر چلتے تھے ہفتہ کے سب دن حویلی کے اندر گذرتے اور تمام وقت تو شہناز سالہ "بیٹا" سورہتہ سالہ "بال" لے کر سے لگا چمٹا رہتا اور "ماں" اور "بھیجے" کا دیوانہ پردہ جس کی آدمی بڑی مصروفیت کے ساتھ "بیٹا" "پیاری" "ماں" کے نالوں سے دل بہلاتے لڑکیوں اور چھوکریوں کی موجودگی میں لیٹا رہتا ــــ اور شہناز بیگم بات بات پر سرکار کے اور سب کے سامنے اس پاک اور تقدس رشتے کی پیشی کیا کرتیں ــــ اور باہر انتظامات ریاست کی اصلاحیں دیکھ دیکھ کر سرکار سرد تھے "بھنا رہتے" کا پرہیز کیا کرتے۔

عرصے کے بعد جانقلب آتے جاتے میاں کی آدمے روٹھا ہوا دیکھا تو شہناز بیگم کے من پر نظر آیا۔ آخر انہیں جیسے لگنا تھا ہوا ہی ہوئی اور جس ایک اڑان کے لئے بھلا اور شہناز بیگم تو "بیٹا" "پاگل" "ماں" "بھیجے" کو اپنی سی بن گئیں اور بہار کی تتلی کی طرح تھرک تھیں الماریوں اور بکسوں میں کھنے پڑے ملبوس پھر سے باہر کئے گئے اور ڈبوں میں بند زیوروں کی تقدیر دوبارہ چمک اٹھی اور شادی کے بعد تو شہناز بیگم کا چندی ماہ کے اندر اڑھنے پہننے سے جی بھر گیا تھا اور بناؤ سنگھار کی طرف سے طبیعت سی ہو گئی تھی مگر اب پرانے تو پرانے نئے نئے ملبوس تیار ہونے لگے کانوں کی چوڑیاں بنا سنوار کے لگیں سینے کے ہار اور گلوبند بنا بنا کے پہنے گئے مچھلی اور کانوں کے گوشوارے نہ معلوم کیا سرگرشیاں کرتے تھے حویلی کی فضا میں بھانت بھانت کی خوشبوئیں تیرتیں اور شہناز بیگم کے کمرے سے مسلسل قہقہوں کی لہریں اور ہنسی کے دھارے سنائی پڑتے اور صبح سے شام تک بدن پر قوس قزح کے سات رنگ ایک ایک کے نظر آتے۔ چودہ گھنٹے کی قربت میں شہناز بیگم سات لباس تو تبدیل کر ہی لیتیں اور شاید سات ہی مرتبہ حمام بھی کر لیتیں ــــ زندگی رنگ لا رہی تھی ــــ زندگی سرور و قہقہہ بن گئی اور زندگی بڑے تابناک عنوان سے جینے کا حق ادا کرتی ہوئی محو رقص میں آئی اور نازو ادا بن بن کر پیچ پیچ ناز و ادا میں سرتاج سے نظر لڑنے لگے۔

ایک روز جب اندر والان والی چھتی میں دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹی ہی لیٹی اونگھ رہی تھی کہ سرکار بچے کی آہٹ سے سامنے آ کھڑے ہوئے اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور چہرے پر رنگ آگیا اور مچھلی اور بڑھاپا کا اقدام لے کر انداز بنایا۔ شہناز بیگم نے ایک نامعلوم سے جھجکے کے ساتھ جہاں کا تہاں دبا دیا اور خود بھی ٹس سے مس نہ ہوئی اور آج میاں جوں کے توں تائی کے کانوں پر سر دھرے مسہری پر اداس بیٹھے رہے اور یہ ادا انداز دیکھ کر سرکار تو جیسے کھل گئے اور ماں کی آغوش بیٹے سے بھری ہوئی اور بیٹا آغوش مادر کی سلطنت میں تخت نشین ہو تو ماں اور بیٹا دونوں باپ کی تعلیم کے رسوم و قیود سے بتا ہوتے ہیں بیوی کی گرہستی سے بھری دیکھ کر دور سے کاہلی نظارا کر کے سرکار کے منہ سے بے اختیار اللہم بارک علیہ نکلا۔ ماں کی تحقیر اور مستقبل کے خواب سب سے

سرکار جان کی اس بات پر، جو تو نے سرا سر کی بھری ہوئی توہین کی صورت میں محسوس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے تھی، دلدار بیگم سے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، اور شوہر کے جذبات کا اندازہ کر کے بڑی چابک دستی سے شہناز بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بیوی کی نگاہیں چار ہوتے ہی سرکار کی آنکھوں میں شرارت اور کامیابی کی چمک تڑپ اٹھی اور خوشی کے اسے نوٹے پھوٹے بے آپ ہو گئے۔ اور شہناز بیگم نے تاج میاں کے ناخنوں پر ہوئے گئے سرخ نشین گہرے گلوں کے اندر اپنی مخروطی انگلیاں اور گہری کر دیں اور معصوم ادا سے بگڑ کے شوہر کی جانب دیکھ کر گویا اپنے انداز سے کہا دیکھو میں بیٹے والی ہوں دو چھوٹی آنکھوں میں سے ایک بھی نہ جھکی۔ تمہارے خاندان کی عارف کی امین اور تمہاری نسل کی محافظ، اپنے ناٹوے تاج میاں کی آتی ہوئی ماں، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں شوہر کے جذبات کا اندازہ کر کے شہناز بیگم کے چہرے پر گمرن لہرا لہرا کے شوہر اور بزرگانہ کینہ کا بھری ہوئی آگ بڑی بیگم زندہ ہوتیں اور ان کے جوتوں پیٹا ہوتا تو اس وقت شوہر کے سامنے آجاتی اور جب سرکار سہری کے باہر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے تو بھی تاج میاں بستر لیٹا رہا، اور شہناز بیگم ویسے ہی بالوں سے کھیلتی رہیں اور سرکار نے مختصر انداز میں کہا۔ "سنتی ہو بی تاج دلہن، بی تمہارے بیٹے نے تو ہمیں سرکار سے بڑے سرکار بنا دیا۔"

"چھوڑیے بھی، دیکھیے! ابا ہم بھی ہنس پڑیں۔" شہناز بیگم جھجھا سی پڑیں اور خود کے ساتھ ایک گہری سانس لے کر ذرا سنبھلا ہوا اور شوہر کی جانب پر اشتیاق استفسارانہ انداز میں دیکھنے لگیں۔

"بی وہ ایسے کہ جب انہیں چھوٹے سرکار کا خطاب دیا گیا تو پھر ہم آپ بڑے سرکار پکارے جانے لگے۔" سرکار نے خوشی سے بھری ہوئی بھیگی بھینی آواز میں کہا۔

"خوب!" شہناز بیگم خوشی کے مارے نال ہو گئیں اور ادا نازیبا کے ساتھ تاج میاں کا رخسار نچلتے ہوئے کہنے لگیں "چھوٹے سرکار ــــ چھوٹے سرکار!" اور آہستہ آہستہ اپنے ناخنوں کو حرکت دے کر لوری کے انداز میں تاج میاں کا سر ہلانے لگیں۔

اور یہ ڈھلا انداز دیکھ کر سرکار پھولے نہ سمائے۔ خوشی اور فرحت سنبھالے نہ سنبھلتی تھی، دبی دبی سی آواز کو اطمینان میں ٹھال کر بولے "مگن زادلن، تم بھی سمجھ لو کہ تم بھی اس دن تک نازدلن ہو جب تک اس کی دلہن نہیں آتی اور جس دن اس کی دلہن بیاہ لائیں اس دن تم بڑی بیگم ہو جاؤ گی اور وہ تمہاری تاج دلہن بنے گی۔ ہاں جب اس کے چاند سا بیٹا ہو گا تو بڑی بیگم سے بھی بڑھ کر بڑی بی بی "ہوں" واہی اماں" نہ معلوم کتنی بڑی بن جاؤ گی۔ ابھی تو تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔" اور اپنے تاج میاں کے چاند سے بیٹے اور تاج دلہن کے حسین تصور میں سرکار کے پھٹے ہوئے سینے سے موٹا سا قہقہہ ابل پڑا اور شہناز بیگم کی گلگونہ سی ہنسی بے تاب آگیا اور تاج میاں جیسے کچھ دلہن اور بیٹے کے ذکر پر شرمائے گئے اور تاج دلہا سر سرکار کی جانب سے زور سے ہلا گیا اور چہرہ ناٹوے کے گھٹنے میں دھنس گیا۔ آنی نازیبا کے بعد سرکار ذرا سنجیدہ ہو کر مخاطب ہوئے اور کہا "وہ ہاں، اس وقت ذرا سنو تو میاں" اور یک دم تاج میاں سنجیدہ ہو کر آنے والے لمحے کے لئے ٹھٹک گیا اور ہمہ تن توجہ ہو کر بابا کی بات سننے لگا اور سرکار نے مسلسل کلام جاری رکھا "کل چھوٹے منشی نے مراقبہ کا پرچہ گذرانا ہے جو اسی میرے دربار میں ہوا کرتے ہیں۔ چھوٹے سرکار نے دربار کی حیثیت پر جو چوٹ لگائی ہے اس کے اخفاء کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اس سلسلہ مزاحمین کے اندر بے چینی پھیل گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انکار کرتے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ بات ہاتھا پائی تک نوبت پہنچے گا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے۔ ذرا وضاحت کرو تو میں کچھ سمجھوں۔ ہاں؟"

"ہاں" چھوٹے منشی نے مراقبہ گذار دیا۔ خیر قبلہ قصہ یہ ہے کہ میں نے یہ اقدام بہت کچھ چھان پھٹک کرنے کے بعد کیا ہے حکم میں نے پتہ لگایا ہے کہ یہ اختلاف چھوٹے منشی اور متقدم دونوں نے ہمارے ہم اپنے طور پر اس سال کر لیے ہیں۔ اس سال دیالے یا۔ اس چھوڑی تھی اور اپنے طور پر اصول کر کے مقسم کرنے چلے آئے ہیں میں نے سب اخذ کیا ہے اور اخذ کا سارا لگا کر دعوی کے احکام جاری کئے ہیں۔" تاج میاں نے معاملے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مگر بیٹا بہت سے کاشتکار بھی حاضر ہوئے ہیں اور مختار عام کی معرفت کہلا کر بھیجا ہے کہ باریابی چاہتے ہیں۔"

"اچھا خیر، چھوٹا منشی بھی ساتھ آیا ہے؟"

"نہیں، نہ چھوٹا منشی اور نہ قدم بوسی کے مدعی!"

"ہوں۔ تو پھر خیال فرمایئے سب سازش، اور یہ کاشتکاروں کی عذداری چھوٹے منشی اور مقدم کا سازباز کوئی مہ افضل نہیں ان مزارعین کے پرچہ مراضعہ پر تحریر فرما دیجئے کہ چھوٹا منشی اور مقدم حاضر ہوا اور اطمینان دہی کر کے بھی ساتھ میں طلب کر لیجئے مع نقشہ خسرہ کے۔"

"مگر پھر؟"

"میں پھر یہ تبلا کر چھوٹے منشی نے یہ غول اپنے زیر اثر مزارعین کا شاید کچھ آئندہ لاپچ کا سبز باغ دکھا کر چھوٹی عذداری کے لئے بھیجا ہے اور میں اپنی تائید میں بلا ایک گروہ انہیں غرائی کے مزارعین کا ایسا پیش کروں گا جو قدم اٹھاتے ہی قدم اٹھوا کر آئے گا اور حساب کر کے یہ بھی بتائے گا کہ کب سے اور کتنی رقم چھوٹا منشی اور مقدم اور پٹواری ہضم کر رہے ہیں۔ میں نے تو پھول رقم پر خاک ڈالتے ہوئے میٹھم پاشی کے انداز کا حکم دیا تھا اور یہ نمک حرام تو ہمیں بالکل ہی اصل سمجھے ہیں۔ آج مرد و دولہ نے یہ مزارعین بھیجے ہیں کل اگر میرے آگے دم بھریں تو چھوٹا منشی اور زدہ پٹواری مقدم شک حرام۔"

اور جب سر کا دبانا ختم کر کے چلے گئے تو پھر جوں کا توں اقبال پر سرور کا مسہری پر دراز ہو گیا۔ پاؤں پر پاؤں دھرا آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ ٹک بھر اوپر شہناز بیگم کی پیاری پیاری انگلیوں سے نکلتی چار ہوئیں تو بھی کے ڈورے کی کاپیاں پر پروانوں کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور پھر بے ساختہ دونوں کے قہقہے نکل گئے اور جب اک ذرا ہنسی کا فوارہ تھما تو مشیلی "تاج جہاں" کے ہونٹوں سے ہنسی سی نکلی اور شہناز بیگم کا دوپٹہ ڈھلک کر نیچے آ رہا اور اس سے زیادہ مرمریں اسکی سی ناتائی پڑی "آہیں؟" ۔۔۔ اور شہناز بیگم کے جھٹ اوپر سے جھکے اور ذرا نوا پر گرا تھا اور تاج جہاں کے ہونٹ آپس آپ اوپر پہنچ گئے اور پھر مرمریں بانہیں اور سنگین بازو دل گئے ۔۔۔ گم گم کاموں میں گذر ہو گئے ..... مشک اور عنبر میں بسی ہوئی مرغش سانسیں ضم ہو گئیں اور سلگتے ہوئے شعلے بجھ کر چپک گئے۔

رسا کشی

مظہر، جناب اشل سے کہ حال بیگم بیگم دانہ، مگر یہاں حال بیگم صاحب دانہ اور حال صاحب بیگم دانہ کا مضمون تھا۔ سکا اور نازو دونوں ہی آرزوؤں کے مطابق رزداروں سے طوت میں ساتھ ساتھ سیاہ کئے تھے مگر نازو دلن نے شروع سے غوث جیسے کچھ دبا دبا سی بھی تھی اور بے ماز سی جیسے غوث اور جلت میں کوئی فرق ہی نہ تھا مگر یہ غوث کا عدم ماز ہی دلن کر چوٹ چلا۔ شہناز بیگم کے خنارک دم انگارہ کی طرح دمک اٹھے اور سینے کے کٹوروں میں جلترنگ سی کھنک پڑی نتھنوں کی آرم سانس جیسے رخساروں کو چھونے لگی اور رخساروں کی تمتماہٹ لمبی ناک کے سوے کو چھونے لگی اور جب آئینے کے سامنے جا کر دیکھا تو محسوس ہوئیں تو بجز بھوئیں کے کچھ اور ہی خمار ناری تھیں اور کانوں میں بھنبھنا کر ایک عجیب سی مری مری آواز آتی تھی پہلا معاملہ تھا جس پر چوٹ کھائی تھی اور دوسرا سینہ ۔۔۔ شہ نشین سے بہا آغوش ہو گیا اور یقین ہونے کے بعد آنے والی صورت کو فوراً ہی شکل دینے کے لئے سر کا کے زیر استعمال کوشش کی، اور اس کوشش میں یہاں تک ہاتھ پاؤں مارے کہ مخصوص نسائی ناز اور نظری حیائی بھی حد درجہ اچانک گئیں مگر سوئے محبوب کے خلاف کتنا ہی کھلا اگا ذہن نہیں ہو سکتی پیہم جد و جہد میں دو سا سینہ اتنے ہوچ کر دل کو مطمئن کر لیا کہ سر کا کا لحاظ بہت کر چکا ہو گیا ہے تو جینے کے انداز دکا ایر پھیر اور بھول ڈال دینا

کی مشکل بات نہیں گراس بار کی علاج کا سرکار نے سے ہی بھلے ہوئے تھے اور شہناز بیگم کو نویں مہینے کھیل ہی کھیل نظر آتے تھے اور انہیں نامزد دلہن بنا کر لیا دا تیں دو تو شاید اپنے آپ کو بھی یاد نہ رہے تھے۔ اور بڑے بڑے عجیب و غریب ٹوٹکے بتائے تھے تیرہویں مہینے شہناز بیگم نے جیسے ہی شہناز بیگم نے جیسے ہی پھونکیں مار کر ایک خدا جھوٹا کی آزمائش کی چھوڑوں ہی چھوڑ کل جائیں گی وہاں بچے سے کہنے بھی نہیں ٹھنڈی راکھ تھی اور ٹھنڈی راکھ پر پھونکیں مارنے سے اپنی ہی آنکھوں میں دھول جھک سکتی ہے اور پھر اس طب لاعلاج سے بھی گئیں۔ قدرت کی ستم ظریفی وہ چھوٹی موٹی علت بھی دہم دہم ہوگئی جس کے اندر وہ علت کا منہ سا چڑایا کرتی تھی اور اب جس کے سہارے اپنے چھوٹ کر سچ بنانے کی کوشش کیا کرتی تھیں تیسرے ہی مہینے میں سرکار بیمار پڑ گئے اور شہناز بیگم کے ہاتھوں سے نکل کر باہر دیوان خانہ میں حکیم ڈاکٹروں کی نگرانی میں پہنچ گئے اور دن آدھی تیزی سے گذر رہے تھے مگر کبھی نہ ملتے اور ہفتہ پورا ہو کر چار تندوں میں مہینہ بھر جاتا اور تیسرا مہینہ بھرتے ہی جیسے پٹ میں کچھ تاپ تڑپ کے ٹوک چھانے لگا۔ اور لوجوان دنا پہنت تاج میاں شروع سے ہی بالکل ہی اس باختہ ہو گئے تھے شہناز بیگم جب تک سرکار کا تھیں رہے کچھ بات بنانے کی ترکیب کرتی رہیں جب اور ہر سے بالکل نا امیدی ہو گئی اور شہناز بیگم نے کہیں رہیں پھر تو دوسرا مصرعہ بلیار کیا اس کی تکمیل میں سرکار کی علامات موجب آسانی نظر آئی اور سرکار کو حویلی سے دیوان خانہ میں منتقل ہو جانا بڑا غنیمت ثابت ہوا۔ الگ قدرت ستے تو حویلی کے اندر راستہ کا لڑ اتے رہتے اب اندر میدان صاف تھا اور اس صاف میدان میں مقابلہ کرنا نسبتاً آسان تھا بنے منصوبہ کر لگی دیوار بنانے میں شہناز بیگم نے بڑی دقیانوسی سے کام لیا۔ ماؤں کو انہیں چھوکریوں سے بھر مگر جیسے انہیں دیوار و در میں کان اور چکے میں آنکھ لگی معلوم ہوتی تھی بہت سوچ سمجھ کر ڈاکٹروں کے جھوٹ سے ایک تیر لگی اور تین سی لڑکیاں لاانتخاب کیا جو گھریلو کھوسے تو بالکل کری تھی مگر کام خدمت میں بڑی چلبلی تھی اور اس کے ساتھ ہی کسی سبب کا اظہار کئے ایک گول مل کے ابلاغ پر متفق ہو گئیں جو جاڑے کے اختتام سے حویلی کی بالائی منزل کا ایک حصہ بھلے ہوئے بھی کچھ ایسا تھا کہ اگر وہاں رہ کر بھی کیا جاتا تو حویلی میں سنائی نہ پڑتا اور نہ حویلی ہی کی آواز وہاں پہنچنے کا کوئی امکان تھا اور اس غلط میں بڑے سرکار بھی تو کچھ نے سرکار بھر روز روزگار مرحوم ہی تھے۔ اور یہ تو شہر کے کوتے کونے سے واقف تھے اور ہر طرح آدمی کے شناسا تھے ایک مخصوص دوست سے آئیں بائیں شائیں باتیں بنا کر ایک خاص شعبہ پولیس والی کا پتہ معلوم کیا جو قتل خشکی وغیرہ قسم کے کاموں کے لئے مشہور تھی اور اسے دعوت دے آئے تھا کہ اگر چٹان پر بھی انگلی پھر آئے تو مکمل کھیل ہو جائے ایک شام کو جب مغرب چلنے سے گرمش محل والے کچھ ایسے کے زینہ سے چڑھا لائے۔ والی نے پورا ہفتہ دھما چوکڑی میں معلوم کیے جو شانے چلے انگلی چھوانے سے بڑھا کر پنجہ اور سینک دیا مگر شق ہونا تو درکنار چٹان میں کہیں اونے سا بال بھی نہ آیا جب والی عاجز ہو گئی تو اس نے ایک لیڈی ڈاکٹر تجویز کی جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ڈاکٹر اعلیٰ کی آپریشن ہے اس کا کام بلا بھی اس خوب صورتی سے انجام دیتی رہتی ہے کہ ان تک نوبت پہنچتی تو نہ اندر انہیں کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ گرے کیا کیا جائے کہ وہ تو کچھ اور ہی چوک بن کر چھا تھا نہ چھانے چھے۔ ٹوٹے ٹوٹے اب والی کے آہنی پنجہ اور زوری کلائی کے مشت و مال کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کی ڈائنامیٹ جیسی دھماکہ شامل ہو گئیں مگر کچھ بھی ہو تا نہ ہو تا آپریشن کل جاتا وہ آزمودہ معلوم کیا ہوا تھا ہفتہ بھر میں ترکش کے سب تیر چھو ڈر لیڈی ڈاکٹر بھی ناکام واپس گئی۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ میں امید کی گردن میں سرکار آدمی صدی سے مر رہے تھے آج اسی امید سے ہوتے ہوئے بھی ان کی امید اپنی زندگی کی سب سے بڑی ناامیدی سے دوچار تھیں۔

مشہور بات ہے کہ کسنے والی روح تو دینا میں آکر ہی رہتی ہے ہفتہ عشرہ کے سنگ خلاصہ والی اور لیڈی ڈاکٹر کی سر غلیب ناکام رہی اور ساری تدبیریں تمہید ہوئیں والی اور خارجی ہر صورت سے کر دی ہی کر دی حتیٰ کہ تمہ مشق ستم کے علاج میں بے چاری سیلی پڑ کر پگھل گئی جیسے مہینوں کی بیمار اور علاج ہی علاج میں ایک مہینہ اور گھسیٹ گیا اور رذائل سی ہوا دو ہفتہ سرکار کی عیادت کو بھی نہ آسکیں علالت کی خبر بابر تک پہنچی اور الٹی سرکار نے مزاج پرسی کرائی۔

گونجنے لگی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ اندر والے دالان کا ایک حصہ محفل کی آرائش کے لئے منتخب کر لیا اور وہیں خاص ملازم ساتھ رکھا۔ باہر بالکل نہ نکلتیں، دوسرے تیسرے روز پردہ کرا کر سرکار کی عیادت کے لئے زنان خانہ میں کھڑے کھڑے جاتیں اور رسمی مزاج پرسی کر کے الٹے پاؤں پلٹ آتیں اور بس اسی وقت صحن اور حویلی میں آتے جاتے اک ذرا جھلک سی نظر آتی خوب اچھی طرح شمال میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوتیں۔ بھیگی بھیگی بلی چراغے ہی کمرے سے نکلتیں اور واپس آ جاتیں کمرے میں کسی اور ملازم یا لونڈے کو آنے کا حکم نہ تھا ــــ اور چھٹا مہینہ آ شہناز بیگم کو بڑے مکروہ خواب کا باعث بن گیا اور جوانی کا نشہ خمار ہو گیا آدھی رات بستر سے ترنگ لگا دیتیں پیٹ کی گہرائیوں سے ٹھنڈی سانس اٹھتی جو ہونٹوں سے ہائے سی بن کر نکلتی اور زبان سے بے اختیار نکل جاتا "ہائے اب کیا ہوگا!!" اور سرگوں سوالیہ نشان کی صورت کھڑی رہ جاتیں اور بڑے زور سے ہاتھ ملنے لگتیں، ملازمہ کی ہمدرد نگاہیں پریشانی کا طواف سا کرکے جیسے چکرا کر بڑھے بستر پر گر پڑتیں اور اب تو ہم بخت متلی بھی سیدھ ہو گئی تھی جس میں وہ یہ کوشش کیا کرتیں کہ پیٹ کی انتڑیاں تک منہ کی راہ سونت کر نکال پھینکیں اور پیٹ میں تو کچھ سے ٹنگ مارتے اساپ سا مار رہا ہو جیسے بگ پڑ رہا ہو ــــ مفرور مجرم کی نیند آخیرات خدا جھکی سی آتی اور پہلی ہی غنودگی میں وہ بستر پر ہاتھ بھر اچھل جاتیں بے خودی اور بے قراری میں ایک ہاتھ کچھ ہوئے بال کھسوٹنے لگتا اور دوسرا پیٹ نوچ ڈالتا اور اس طرح اچھل کود میں چیخ نکل آتی تمام رات تکیہ پر سر پٹختے، سسکیوں میں توبہ استغفار پڑھتے۔ صبح سے شام ہو جاتی اور دن تو پورا ہو کر ہفتہ بن جاتا اور چار ہفتوں میں ہفتہ مہینہ ہو جاتا ..... اور مہینہ تو سب آنکھ مچولی رہاں میں ایک روز شام کو سرکار کی مزاج پرسی کر کے باہر سے واپس آئیں تو قدم زمانہ اور طرح کے پڑ رہے تھے اور جیسے چال کی علامت بھی جاتی رہی تھی اور کمر کا خم بھی نکل گیا چہرہ پر انتشار کا نور تھا گویا جیسے کچھ اور تسمہ کا بستر میں گہری سوچ اور آنکھوں میں ثبت منتی چمک تھی اور مستقل طور جو ایک قسم کی مرعوبانہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ غائب تھی، اپنے کمرے میں پہنچ کر جیسے انہوں نے آج کچھ اطمینان کا سانس لیا اور نہ معلوم کتنے دنوں بعد آج کی رات وہ پاؤں پھیلا کر سوئیں۔

اور جب صبح نو کے تاج میاں نے آکر حال کی بات کی مزید وضاحت کی جو ڈاکٹر شہناز بیگم کے کان میں پڑی تھی تو بات کہتے وقت آج میاں کی آنکھیں نم ہو گئیں اور آواز گھگھیا سی گئی ہونٹ بات ایسے نکالتے رہے جیسے پھول جھڑتے ہیں اور پوری بات سن کر شہناز بیگم کا چہرہ آئینہ کی طرح دمک اٹھا اور پھر جیسے اس آئینہ میں تاج میاں کے چہرے کا پرتو عکس گیا وہی پرنم آنکھیں، نگاہوں میں امید کی ہلکی چمک آدھی ادھوری اور موت کھوب کی گلی کی طرح کھلے سے پڑتے تھے۔

معالجین نے باتفاق رائے جواب دیا تھا کہ سرکار دو ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے امکان دواؤں میں بھی کسی وقت شفاء ہو سکتا ہے شہناز بیگم کو امید کی نئی کرن نظر آئی تھی خیر بات تو انہوں نے رسمی انداز میں تاج میاں کے منہ سے بھی اسی طرح سنی جس طرح ایک بیوی شوہر کے متعلق اس قسم کی بات سنتی اور وہ کیا تھیں تاج میاں بے چارے نے بھی اسی انداز میں بیان کی جس طرح ایک بیٹا باپ کے متعلق ایسی بات بیان کرتا اور تنہائی اور بے خودی میں بھی انہوں نے آداب و روایات کو تہی و برقرار رکھا مگر دونوں کی آنکھوں کے آنسو سارے کھچک پڑے ..... اور بات ختم ہوتے ہی نہ صرف آنکھوں میں بلکہ جیسے دونوں کے رونگٹے رونگٹے پر ایک دم آطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔ اور اب امید کی اس نئی کرن کی روشنی میں شہناز بیگم نے جائزہ لیا تو انہیں بس سرکار کی سانسوں پر جا ٹکیں اور ان معالجین کے لفظ لفظ پر مرکوز ہو گئے اور بان گیا گھڑیاں گننے لگیں۔ اور عزرائیل کی دستگیری پر سہارا ہو گیا مگر عزرائیل نہ شہناز بیگم کے جانے پر آتے ہیں، نہ معالجین کے کہہ دینے پر ٹلتے ہیں ان کا آنا بالذات مقدر ہے ــــ تاہم دنیا یا امید قائم شہناز بیگم کو تھوڑی بہت غنیمہ آنے لگی دو چار ملنے جلنے سے اترنے لگے۔ اور اب وہ تمام دن مصروف پڑھتیں منہ ڈھانکے جیسے کچھ حساب کتاب میں زیر زبر ہو انگلیوں پر گن گن کر تسبیحیں اٹھاروں اور فون کا ارجنٹ سا لگا تھا جیسے ہر بار یہی سوال حل کے کاٹا کرتیں اور کاٹا کرکے حل کرتیں پھر بھی جواب تسلی بخش نہ آتا۔ مہینوں سے تاج میاں ہی سے منہ زبانی سنتی رہی تھیں اور جوں جوں مہینے گذرتے تھے، دوا بخش کی کیفیت شدید تر ہوتی گئی تھی ویسے دن میں ایک آدھ مرتبہ بات تو ہو جاتی مگر مرحوم معالجہ والی دوڑ بھاگ آنے کے قائل نہ رہے، دوا علاج ایلوپیتھی ڈاکٹر، طبابت بس تحریر ہی تحریر اور عمل سے متعلق اور تاج میاں کے وجود سے جیسے تمام رات بے نوشی کے بعد خمار کی حالت

میں شرابی کو قال ہوں سے ——— اور تاج میاں سے تو خیر بات ہوا کرتی تھی "تاجیں" سے تو چھت اڑنے لگتا تھا اور جیسے اندر سے الذر کی آواز ان کے کان میں آتی، اور تاج میاں مستقل طور پر گنہگار سے کرکے کرکے تاہم سلام سے رہتے بات بھی کرتے تو جیسے خود مجرم کا اقبالی بیان ——— لیڈی ڈاکٹر کے حجاب کے بعد حرمی میں بھی آتے تو جب سے اہر معائنین کے منہ سے یہ خبر سنی تھی کہ شفق تایا دوا دو کے اندر رخصت ہونے والے ہیں سعید بھتیجہ اور بہتیجہ داری اور علاج میں سرگرمی دکھا رہا تھا اور ہر دن رات میں دو چار مرتبہ بنتی ہوئی حالت کی خبر اندر تائی اماں کو سنا جایا کرتا اور سن سن کر شہناز بیگم کی آنکھوں سے شراب سی چھلک پڑتی اور اب تنہائی میں جب تاج میاں پاس بیٹھے تو پہلے کی طرح رحمت کے ساتھ اور کرنہ کمسکیں بیماری کے جدید انکشاف اور معائنین کی رائیں فوراً قریب کو پہلو بدل کر احتیاط کے ساتھ سنا کریں اور سنتے سنتے شرم میں جھل سم ٹیالی اور رازداری کھو کر آتی۔

اور آج تو خبر شدید امید افزا تھی شہناز بیگم کی تھکی تھکی ڈری ڈری آنکھڑیوں میں پھر سے کچھ سرور سا انگڑائیاں لینے لگا۔ اب تک تو خیر امید ہی جھلا کرتی تھی انہوں نے بہت قریب آکر اور تاج میاں کے ہونٹوں کے بالکل قریب لاکر کل بات بتائی معائنین کی چند روز قبل کی پیشین گوئی کی علامات سرکار پر ظاہر ہو رہے تھے تفاصیل سنتے ہی سنتے نظریں جیسے کچھ اور سرگوشیاں کرنے لگیں اور آنکھیں نہ معلوم کیا کہنے لگیں ..... دیکھتے دیکھتے مہینوں کی کھوئی بھی بھاوج شہناز بیگم پیچھے چلی گئیں اور "شہنی" "ذرا ناکرنے کو بڑھا گئی ..... تاج میاں نہ معلوم کدھر جا چھپے اور "دنوں کا کچھ" "تاجیں" بیٹھا رہ گیا... بہت دنوں بعد آج "تاجیں" کا سر شہنی کے نرم دگداز زانو پر اونگھنے لگا ..... اور مہینوں کے سوکھے سہمے تاج میاں نرم نرم گداز ہو گئے پاؤں آہستہ آہستہ چلنے لگے اور پھیلے پھیلے گویا ایک سال پیچھے کھسک گئے اور ہاتھ دراز ہو کر وہاں تک پہنچ گئے جہاں سے حرکت میں آئے تھے .....

اور انہوں نے گویا بھولا ہوا سبق دہرایا ..... "شہنی" ..... "تاجیں" ..... "تاجیں پیارے" ..... "شہنی ڈیر" "اوں ؟ اوں ؟ آں ! جیسے نئے سرے سے تعارف ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے کو کہنے ہی دنوں بعد آج پھر سے پہچانا ——— "شہنی ڈیر" ——— "تاجیں پیارے" گئی ماہ بعد آج کمرے کی جیسی فضا میں یہ ترنم ابھرا تھا ہم نفسوں کا تبادلہ ہوا اور ہر لگا جانے تم نہ استان میں لپٹ گئی۔ ماضی حال اور مستقبل کے تابناک اسکرین سامنے تھے لگنے لگی ..... اور جیسے تاج میاں نے مردانہ وار ایک ہاتھ بڑھا کر اپنے اوپر جھکے کھلے ہوئے اپنے مستقبل کو سہارا دے کر روک دیا اور دوسرا بازو پھیلا کر اپنی کو پہلو میں لپیٹ لیا ..... تاجیں کا سر شہنی کے سینے میں دھنسا تھا۔ اور آج آنچل اور بھی زیادہ نرم و گداز تھا۔ اور بازو ملا کر تم کو حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ ریشم کی ڈوری سی کمر، ماضی کی سرمستیوں کی حال اور مستقبل کی امیدوں کی امین ——— حال کا سرمستانہ ..... اور عمر کی خاموشی میں بہ مہم ہم فکر ساتھ تھا یا، حول میں بھینی بھینی خوشبو سی تیرنے لگی ——— خیالوں نے مرغولے سے ناپ اٹھے ——— چٹ چٹ پٹاپٹ ..... اور جیسے چھپڑیاں پٹ پٹ اٹھیں۔ گرگیوں اور گلوں کے ریشمی تار میں رہ یاں تاج میاں تجربہ ہو گئے انہوں نے واضح محسوس کیا کہ شہناز بیگم نہیں کانچ کی چکی بے صندل کی مورتی اور جیسے انہیں یک دم اس کے جاندار سلنے میں نجم نے لگا گویا وہ پتھر کی ہو گئی پانی سی سرد تن گرانت کے باوجود سنگ مرمر کا مجسمہ سادہ گئی تھا انہیں پوری طاقت سے بھینچے ہوئے کے باوجود پہلے زور سے ہچکیاں سا بھرنے اور تمام تر عضو گرانتوں میں جیسے سب کچھ بکھرا سا جا رہا ہے ——— آہنی تنکچوا ٹھنڈا ہلے جان ——— اداس گہرائی متبدیل پر تعجب سا ہو کر انہوں نے شہناز بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تعجب بہ نسبت تھی شہناز بیگم کی رنگین آنکھڑیاں میں اس وقت جیسے تلپلوں میں کچھ خوف کی دھاریں سی ابل رہی تھیں گرگابھوں میں نگاہیں پڑتے ہی جیسے بجلی کے سہایت اونچی طاقت کے دو کنڈ کر سامنے آگئے تاج میاں کی نگاہوں کی لپٹیں آنکھوں میں ہوئی گویاں میں اتر گئیں اور رگ رگ میں لغزاکنیں متضاد کیفیات کے سیلاب میں ٹکراؤ سا ہوا اور دردی ڈھارس اور ہمت بندھانے والی مخصوص نگاہوں سے نگاہیں چار ہوتے ہی شہناز بیگم کی بھڑکی ہوئی مرغی جیسی آنکھوں میں جھیل کا سا سکون ابھر آیا۔ پھر جیسی گرانت میں کشش سی ابھری آہستہ آہستہ شرابیں تراپیں اعصاب میں تنہ گی رینگی اور رفتہ رفتہ تین میں مخصوص ریشم کا لوچ انگڑائیاں لینے لگا ——— اور وہ پھر گلاب کے گجرے کی مانند ہو گئی رنگین، شاداب، خوشبودار

اور اس داخلی انتشار کے عود ہونے کا اندازہ کر کے کہ تاج سیاں نے مخصوص مردانہ انداز کے ساتھ پکارتی سی آواز میں کہا "گھبراؤ مت پیاری" اور نہ معلوم کیا جادو تھا اس دور کی عفتوں میں کہ اس کا دل ٹھہر گیا اور جب چلتے چلتے ایک ٹھوکر والی تو شہناز بیگم نے محسوس کیا کہ آدمیوں کی پرسکون نگاہیں پوری گہرائی تک اس کے اندر ہیوت ہو گئیں جیسے رگ رگ میں اطمینان کا سرور دوڑ گیا ..... رنگین ماضی، پُر اطمینان حال اور تابناک مستقبل کی سب تصویروں میں گھنے ہوئے قہقہہ کی آواز بلند ہوئی اور باز گشت میں پرسنی قہقہے ہی قہقہے گونج اٹھے ..... پھر دفعتاً سناٹا چھا گیا "تاجیہ، میرے تاجیہ، ایں ؟!"

"شہنی، پیاری شہنی، اوں ـــ ڈی یر"

اور اس کے ساتھ خجستی نگاہوں کا تبادلہ ہوا اور عہد و پیمان کی تجدید ہو گئی۔ تاج سیاں بنس کی طرح اٹھ گئے اور مرمریں فرش پر چلنے کی بجائے ایک سی کرتے ہوئے آستر بیٹی بجاتے باہر نکل گئے اور شہناز بیگم گنوں کی طرح کھلی ہوئی سہمی ہوئی پریمی، کپڑے اور شکل میں بستر کی سلوٹیں درست کرنے لگیں۔

اور اٹھنے کو تو شہناز بیگم تھپے لگاتی رہیں اور کچھ عرصہ سے جو ایک قسم کی دور باش کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ جاتی رہی تو بہت کم ہو گئی۔ تاج سیاں کے وقتی انتشار اور جھینپ پر بھی اُن کا ناز اور ادا کی بے ساختہ لوچ آ گئی اور سبھی کچھ ہونے لگا مگر خلوت میں جیسے کسی کے آ پڑنے کا کھٹکا سا محسوس ہوتا ہو اور ایک ہڑبڑاہٹ کے زہر کی طرح شہناز بیگم کے خون میں ایک عجیب سی بے اطمینانی بھی ساتھ ساتھ گردش کرتی رہی اور جوں جوں وقت گذرتا یہ زہر تلخی پکڑتا گیا، اور شہناز بیگم عورت تھی اور عورت کی نگاہ نزاکتوں کی لہروں میں بہتے بہتے بھی اپنے مستقبل کے بارے میں بڑی تاکاک اور دور بیں رہتی ہے اور یہاں تو قریب اور بعید دونوں ہی الجھے ہوئے تھے۔ پہلے تو وہ خود ہی کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کرتی رہی، اس کے اندر سوالات در سوالات کا ایک سا تھ اٹھنے والا گروہ بے چین عورت ذات ـــ غیر یقینی صورت حال میں تو بڑے بڑے مدبرین بھی کسی نتیجہ پر پہنچنے سے عاجز ہوتے ہیں اور وہ غریب پوچھتی بھی تو کس سے اور سوچتی بھی تو کہاں، اب تک تو ایک ہی راز پیٹ میں چھپائے بیٹھی تھی۔ اور اب سوتی سوچی کچھ دور تک جاتی تو پھر یہی راز اس راز داں سے بھی مخفی رہ جاتا جس کا یہ راز تھا۔ لہٰذا پلے سرکار اور چھوٹے سرکار (تاج سیاں) اس کے تو دونوں ایک ہی زمرہ میں آتے تھے اور وہ غیر کسی مشورے کے جواب کی تلاش میں زیر و زبر رہتی ..... پھیلے کھل کر دل کی بات کہنے کے لئے کوئی تھا ہی نہیں۔

پہلے تو موت اور ولادت میں دوڑ اور مقابلہ تھا کہ جو پہلے جائے وہی جیت جائے، اور موت و پیدائش کا وقت آ ٹالا ہی جائے اور موت کا وقت پہلے آ جاتا تھا تو ولادت کا گھنٹا ڈنکا نماز دفن ہو جاتا تھا ورنہ ؟ ..... پھر کون جانے ؟ ..... اگر خدانخواستہ ولادت کا وقت پہلے آ گیا تو پھر ؟ ..... وہ دھک سے ہو جاتی ..... اور پھر اسے تو بہت دور کی سوجھ رہی تھی بڑے سرکار سے اس کا رشتہ صرف ازدواجی نہ تھا، بڑے سرکار والا کھ روپے سالانہ کی آمدنی کے بھی مالک تھے اور پیش کار خاص کی بیٹی شہناز بیگم کو تو ان وراثت اور تاوان ولایت کی ایک ایک مدرلی پڑی تھی اور تاج سیاں ؟ ـــ تاج سیاں کیا چیز تھا پیارا ..... اس کا دل، اس کی جان، اس کا تاج میں، ایسے دو لاکھ اس کے سر پر سے وار کر پھینکا دے تھے اور جب کبھی وہ دونوں پہلو پہلو بیٹھے آئینہ کے سامنے کھڑے ہوتے آئینے میں سے ارغنوں سے بج اٹھتے، چاند اور سورج ایک وقت منعکس ہو جاتے اور آئینہ کی سطح کملا کر دیوار وار چاند ہار چھوڑ پیچھے بھاگتی۔ اور شہناز بیگم کی نظریں خیرہ ہو جاتیں مگر شہناز بیگم نو عمر لڑکی تھی، نظیں آجز کا باپ کی بیٹی اور وہ باپ جس نے ہاری ہوا سی ڈیوڑھی کے تجربہ میں بتائی تھی اور وہ اس نسل کی جبلت کا عوام تھا اور یہ ساٹھ سالہ مطابقہ تاج ستر و سال کی عمر میں شہناز بیگم کے خون کے اندر باپ کے آدمی صدی کے تجربے سے پہنچا تھا انہیں اپنی تمام تر ظاہری چمک دمک اور رعنائیوں کا مزدور علم تھا مگر وہ ستر سالہ کھیتو دونوں کے خمیر کی بھی پوری محرم تھیں اور عورت کی جوانی اور مرد کے جذبات دونوں کا تجزیہ معلوم تھا اور آئینہ میں سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی انہیں لگ گوشہ میں چھپی ذات نظر آتی جو تیوں کا ڈھیر بھی نظر آتا جو بڑے سرکار چھوڑتے سرکار اور سب سرکاروں کے بڑھتے آتے قرن کا تقاضا تھا ..... آئینہ کے سامنے وہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر

گرمی ہوتی پھر بھی انہیں اپنے اور تاج میاں کے درمیان ایک سنگین دیوار کا عکس نظر آجاتا۔

اور تاج میاں بھی اب کوئی ٹھنڈے لقمے نہ تھے۔ دور کی انہیں بھی دکھائی دے رہی تھی تو اتنی دور کی نہیں اور بھی کوئی پاخانہ وہی بڑا الجھا ہوا تھا اس سے سلجھ کر نہ یاد انہیں بھی اور دور کی سوجھتی لیکن آج تو شہناز بیگم کے رخنہ کی چمک دمک میں ان کی نگاہیں اتنی خیرہ تھیں کہ شاید ان کو تنے دور کی نہ سوجھ پاتی جتنی شہناز بیگم کو دکھائی دے رہی تھی اگرچہ بڑے سرکار کی صحبت اور گرگ باراں دیدہ کارندوں کی معیت میں انتظام ریاست نے انہیں بھی بہت طاق کر دیا تھا۔ تو یہاں اس پیش بینانہ دور میں ہی ان کی جواں نگری اور معاملہ فہمی چپ تھی۔ اور انہیں مشورے کے لئے دور دور کوئی نظر نہ آتا اور شہناز بیگم بے چاری عورت ذات چاندماری کی بھٹکنے والی پہلے تو کس مشورے کے قابل تھیں پھر اور کچھ دنوں سے سرکار کے معالجین کی رائے کے سہارے امید بندھی تھی اور مٹھے کی گھنڈی کھلی تھی دو تو پھیپھڑے سے اتر رہی تھیں سوچتے کہ اس بے چاری کے سامنے ایسی بے تکی بات ڈال کر مفت میں اس کا عیش کیوں منغص کروں گرمی میں دبا دینے سے نام سب ہو آئیں جایا کرتا اور تو رات پر پھٹ کر ہی رہتے اور بات تو جوں جوں دن گذر رہے تھے سانپ کے منہ چھپکلی جاری تھی اور مستقبل تو آدمی کی طرح چڑھتا چلا آرہا تھا اور دنوں کی نظائر سرکار کی سانسوں پر لگی ہوئی تھیں سانویں کے بعد آٹھواں مہینہ آگا سرکار کے معالجین کے محاکمہ کی رو میں ایک بچ مہینہ ہو گیا اور معالجین تو اب بھی اپنی رائے پر ڈٹے تھے تو معالجین کا محاکمہ کوئی خدا کا حکم تو تھا اور جیسے شہناز بیگم کی کھنٹی پر سرکار کی ہر سانس گولی سی سنسناتی سناتی پڑتی اور شہناز بیگم ہی کیا دونوں ہی نظریں بڑے سرکار کی سانسیں گن رہی تھیں۔

اور نویں مہینہ کے پہلے ہفتہ میں ایک روز شہناز بیگم کی طبیعت ذرا مضمحل ہوئی، پہلوٹھی کا معاملہ کوئی تجربہ تو تھا ہی نہیں اور مشورہ کا دور دورہ ہو گیا گھبرا گئیں، اور دور کی سوجھی ہوئیں پٹ پٹا کر اب کی سب ایک دم جیسے چھاتی کے اوپر لد گئیں اور وہ کراہتے ہوئے دکھی بھی لہروں میں لوٹ پوٹ سے گھنٹوں تک بہنے گئیں۔ اور گھنٹوں سے اکثر رات تک چڑھتے گئیں اور آنے والے خطرے کا دھواں سکرین آنکھوں کے سامنے ذات جانی اور موت کا ڈراما دکھانے لگا۔ مردوں کی بلکاہٹ سے زیادہ آنے والی عورت کی شوخی جیسے پانا چھوٹ کر یکم اور پہلے نوم بجنے والا ہے..... لفیف متعلقین پیپ کی دھار ــــ گھبراہٹ میں تاج میاں کو دستگیری کے لئے طلب کیا اور شہناز بیگم نے تاج میاں کی کانپتی انگلیوں میں گویا کچے ہوئے سوت کا گچھا تھما دیا اور کچے ہوئے سوت کے گچھے کا دھاگا دھاگا جوں کا توں اس کی کھڑکی میں ہمچنے لگا اور ہمچتے ہمچتے اوجھل ہو گیا شہناز بیگم کی دور کی اور تاج میاں کی قریب کی سب کی سب سوچی ہوئی اس گچھے میں جمع ہو گئیں، اور انگلیوں سے چڑھ کر کپکپاہٹ زبانوں کی نوک تک پہنچ گئی جیسے اس کے اضطراب نے بھی جواب سا دے دیا ــــ اور ستر قریب تھا کہ زندگی کی کشتی اپنے کنارے جا لگی تھی اور گنتی کے سانس باقی رہ گئے تھے مگر سرکار کا مزاج دقیقہ رسی کے ساتھ کام کرتا تھا اور بالائے ستر یہ تھا کہ یہ بھی نہیں کہ کسی کم بخت جواب دے گئی ہوتی زبان بھی نہایت شائستگی کے ساتھ چل رہی تھی اور ملاقات کا راز آپریشن سے نکل کر بند قبا کی آواز کے ساتھ چھوٹا کہنے اور خلوت میں دستکار ہونے والا تھا، تاکہ یہ راز اول ــــ تا آخر سب اپنی دست پروری کر چکا تھا۔

تو تاج میاں تو رہے، اماں کچھ سہی پھر بھی، اور پھر شہناز بیگم کے پیٹ میں ہوا کے سر میں قدرتہ تھا، مردانہ وار سنبھلے اور چھٹ کا اپنی ہم راز لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچے اور لیڈی ڈاکٹر سنہ ہم میں تھی اگر پٹ تھی اس سے کم کا بار گراں وزیر اعظم لینے میں بھی نہ تھی اور اس کی انگلیوں پر تو ایک ایک دن گنا ہوا تھا، یوں تو نویں مہینے میں کوئی بھی دن ہو سکتا تھا مگر قاعدہ کی رو سے نویں مہینہ کو اوسط مدت حمل کے حساب سے تین ہفتے اور نو دن باقی تھے شہناز بیگم کے رونگٹے رونگٹے کی محرم تھی باؤ گرافی کا اور نشیں کیا ایک دلاوری میں سے طبیعت سکون پا گئی جیسے عورتیں کہا کرتی ہیں "مجھ لے رہا تھا" اور سچ مچ ہفتہ بن کر آج کی جا تو ٹل گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک اور مستقل استمہال کے لئے دے دی جس سے کہ ارکم بقیہ پورے دنوں تک رہنے کا امکان تھا، تاج میاں کو پاؤں دھرنے کو بالشت بھر زمین ملی شہناز بیگم کی سانس پیٹ میں پڑی اور جو بلی کے اندر شہناز بیگم کے سامنے رکس، نذر، دیرانی، جٹھانی قسم کا کوئی حرافیہ نہ تھا اور نہ اتنی آسانی سے یہ باؤ گرافی

ستم نہ ہو جاتا۔ میں نوکریاں ابھی شروع سے ہی آتا علیحدہ کر دیا تھا کہ کھانا پکانے یا شیر پر لجانے کو کوئی احسان دھتا اور علاج معالجہ کو یہ ہے کہ ان کبھی کبھی پر چلے چلتے رہتے میں اور شہر ہر امیروں کی خواہ مخواہ لیڈی ڈاکٹروں اور دائیوں کو دکھانے کی بات ہوتی ہے اور شاید جہاں زیادہ بڑھی مسلمانی کر کچھ شبہ پڑا بھی اور وہ فوجت کر کے مزاج پرسی کرنے بھی پہنچ گئیں آپ کچھ شہناز بیگم کے بیزار اور سرد رویہ سے گو منگیں پر گئیں اور اس کے بعد ادھر جانے کی ہمت نہ پڑی ایک مرتبہ بہت ہی احتیاط کے ساتھ بچے کے لفظوں میں شہناز بیگم کی خاص ملازمہ سے استفسار بھی کرنا چاہا مگر اس نے نہایت کھرے پن سے جواب دیا کہ سرکار کی بیماری کے سبب کھانا پینا، چھوٹ گیا ہے نیند حرام ہو گئی ہے خالی پیٹ باد گولہ کا درد اٹھ کھڑا ہوا اور باد گولے ہی کا درد تمام جوانی میں اور باہر یوان خانہ تک مشہور رہا اور مسلمانی نے بھی یہی سمجھ لیا۔

نقشِ فریادی ہے ...؟

سخی کا مہینہ تھا۔ گرمی پورے شباب پر تھی اور تازہ دلہن بے چاری کی تو شش خانوں اور پنکھوں میں بھی بے حال ہوئی جاتی تھیں کچھ خوف سے سرکار کی عیادت کو بھی باہر نہ جا سکی تھیں۔ گھر کے اندر لوگ سمجھ رہے تھے کہ سرکار کی بیماری کے سبب اندر والی ٹھٹھولی ٹلے پڑی ہیں مگر ایک مخلص ذرائی کے کسی کان کے گھر میں جانے کا حکم نہ تھا لہٰذا بالکل ترک تھی اور مرنے بھروں پر گذر تھی باہر گھر، روز سے سرکار کی ان کی مسلسل علالت کی اطلاع پہنچائی جا رہی تھی اور جب لیڈی ڈاکٹر کے زیر علاج تھیں مرنے کے بعد ہم تبدیل آب و ہوا کی تجویز پیش کی۔ موسم کو دیکھتے ہوئے تجویز بالکل مناسب ہی تھی۔ اگرچہ علالت اور سرکار کی شدید علالت پر نظر کرتے ہوئے ان کا جانا اس وقت قرین مصلحت نہ تھا اور سرکار کے صاحبین کا جو خیال تھا اس کا اظہار آنحضرت تاج میاں تک۔ کیا تھا لیکن بہ ظاہر یہ جانا ہی ٹھہرا۔ رہنے والے کے حواس اور نفس سمجھ رہتا ہے اسے تو لوگ آخر وقت تک نہیں سمجھ پاتے ہیں۔

ادھر شیر اس کے کہ باد گولے کا درد بڑھا کر سیر پر گڑ پھٹے شہناز بیگم نے سفر کا ارادہ کر لیا۔ جلدی "آیا آیا" ہو رہا تھا مگر پردہ داریاں تھیں۔ فضل بیچ کا وقت تھا مگر تاج میاں کے ہمراہ کوئی "تاتی اماں" کے ساتھ جانے والا بھی نہ تھا ٹھہرا جانا پڑا اور مسعودی بیچ کر تاج میاں ایک جتھا لے کر پہلے کو ہو گئے، اور شہناز بیگم کو ایک اچھے ترنگ ہوم میں داخل کرا دیا جس کے لئے ان کی خاص لیڈی ڈاکٹر نے ایک تعارفی خط بھی دے دیا تھا اور اچھے لوگوں کی عورتیں گرمیوں میں یہیں آ کر جا کرتی تھیں۔

دوسری بیچ کر جیسے خطرے سے کچھ باہر ہو گئے لوگوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ایک اطمینان کا سانس لیا۔ شہناز بیگم تو خیر بالکل ہاتھ سے ہی میٹر تھی کشتی بھیجی گئیں اور ترنگ ہوم کے نرسوں نے تاج میاں کے سامنے سب سے اہم سوال ڈال دیا جس کو نہایت خاموشی کے ساتھ تاج میاں نے ایک جنبش قلم سے دفع الوقتی میں حل دیا۔ "رجسٹر داخلی خانہ پُری!" اور مریضہ کے نام کے بعد دوسرا خانہ شوہر کے نام کا تھا اس میں انہوں نے نہایت خوشخط اپنا نام لکھ دیا۔ جیسے اس مسئلے پر ان کے اور شہناز بیگم کے درمیان کبھی منہ در منہ تو بات آئی ہی نہ تھی اور بلکہ تاج میاں کے ہی دماغ میں نہ اس وقت اس کا خیال تھا کہ نہ بعد میں کبھی آئے گا اور شہناز بیگم بے چاری یوں تو بہت دور تک پہنچ جایا کرتی تھیں اور ان کے دماغ میں بہت دنوں سے یہ نزاکت اور ادبیت والا سوال ایسا اٹھا تھا کہ غریب عصمت ذات چاردیواری کی بیٹھنے والی اور تو وہ اس کی ماں تائی نے بھی کبھی ترنگ ہوم یا میٹرنٹی وارڈ کی شکل نہ دیکھی تھی اپنی ہی جگہ پر سب کچھ سمجھنے کے بعد بھی وہ اور تاج میاں آپس میں اسکیم بنا کر چلے تھے کہ بچے کی پرورش کے لئے ترنگ ہوم میں چھوڑ کر ہفتہ بھر بعد لوٹ آئیں گے۔ غریب گھری کہ شہناز بیگم کے سامنے یہ چیز پیش نہ ہوئی اور تاج میاں نے خاموشی کے ساتھ طرفہ اندراج کر دیا اور میٹرنٹی سیکشن میں شہناز بیگم مسز خان کے

تب سے چاری جانے لگیں۔

اور وہ شہناز بیگم کو اسپتال میں خیریت سے کئے احسان دوران میں ملاقات کے گھنٹوں میں آج میاں پھیپھے اور آموں کے مستقبل کے متعلق طرفین کے دماغ میں سوالات پیدا کر بہت زیادہ آگے نہ بڑھے تھے کہ آنی ہی دردناک سوچ کر وہ گئے کہ رنگ روم میں پرورش کے لئے کچھ نکر عمل دیں گے۔ اور اب شہناز بیگم کی تو ساری توجہ جلد از جلد ہاتھ پاؤں سے چھوٹنے پر مرکوز تھی اور آج میاں بہت مطمئن تھے خاموشی کے ساتھ انتظام کر کے۔ سرکار کی موت سے قبل ہی اور چار دن اس یوم سے بھی قبل اور نہ معلوم کس کس چیز سے قبل انہوں نے قبضہ کر لیا تھا "پری سی بیوی" پر پھر چاند سے بیٹے پر اور پھر دو لاکھ سالانہ کی جائداد اور لمبی چوڑی محل پر خان بہادری آنریری مجسٹریٹی اور باری کرسی پر اور قبضہ سجاد نے جمایا ۔۔۔ یوں بھی انہیں کی تھی اور میڈیا بھی انہیں کا، جائداد بھی انہیں کی تھی اور خطاب و اعزاز اور عہدہ بھی انہیں کی۔ بات جھوٹ بھی کیا تھی، بڑے سرکار ہی تو تھے .....

اور تیسرے روز جھوٹ سچ ہو گیا ۔۔۔ مگر سچ جھوٹ بھی ۔۔۔ شہناز بیگم نے چاند سا بیٹا جنا اور ڈاکٹرنی نے رات ہی میں آج میاں کو فون پر بتایا کہ ریٹنی ہوم میں انہوں نے شہناز بیگم کو سبک بادری اور شوہر کا پورا نام دریافت کیا۔

بیٹے کی خبر پا کر آج میاں کو ایک دھچکا سا لگا ۔۔۔ مگر پھر سنبھل گئے اور انہوں نے اپنے پھیلے انتظامات پر خود کیا آخر کو معطف از زمین پر ہی گرا پایا تو کیا حقہ بیتال نے سچ ہی صبح پہنچے آ شہناز بیگم پر تو جیسے کچھ اس کی پیدائی پی صبی خوفناک کیفیت دیکھی جس کے بچے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں انہیں سنبھالنا دیکھ بھال کرنا مشکل ہو جاتے کی نزدیکی کو تو انہوں نے پیدائش کے صدمے پر محمول کیا مگر نظر میں ہیکل سی اور تیور شدید مشتبہ پاکر ان کا ماتھا ٹھنکا اور پیشانی پر گیا بلکہ زگری کی علامات کھلی ہوئی نمودار ہی تھیں اور شہناز بیگم نے آج میاں کی پر معنی مسکراہٹ کا شرما کر اور مسکراہٹ کے بجائے کچھ زہر خند کے انداز کے ساتھ جواب دیا۔ یہ کرسی گھسیٹ کر قریب کر بیٹھ گئے انہوں نے نرمی سے ہاتھ لیا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے آغاز کلام کے منتظر رہے اور جب شہناز بیگم کے لہجہ میں برزگی کے آثار زیادہ نمایاں ہوئے تو آج میاں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"شہنی بیٹی ۔۔۔ ہوں کیسی موٹا رہی ہے؟"

اور شہناز نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکا لیا۔

اور آج میاں نے اک ذرا ہاتھ بڑھا کر کہا "کیوں شہنی ۔۔۔ پیاری البیت کیسی ہے؟"

"جی اچھی ہوں" اور شہناز بیگم کی آواز زیادہ نحیف ہو گئی۔

اور آج میاں نے ہاتھ میں ہاتھ لے کر سہلا دی اور پیار کے ملے جلے انداز میں کہا "کیوں اکیلا رہ گئیں ۔۔۔ میں رات ہی فوراً کیوں نہ آیا؟"

"جی کچھ نہیں" شہناز بیگم نے خشک انداز میں جواب دیا۔

"نہیں کچھ تو ہے"

"ہوں ۔ آں"

"کچھ تو کہو بیٹی شہنی، خدا نخواستہ کیا؟"

"نہیں کوئی بات نہیں!"

"نہیں کوئی بات تو ہے، آخر یہ آزردگی کیوں؟ بتانا پڑے گی، ایں لو، کیا بات ہے مری جان؟"

"اچھا آپ پوچھتے ہیں تو پھر سنئے لیجئے!"

"مسلوکی سا ——— ایں ——— امریہ تو گھر سے ہی بنا کے چلتے کہ بچے کو ہمیں چھوڑیں گے۔ بس تم علوی سے ٹیک ہو جاؤ اور ہفتہ بھر میں گھر پہنچ جائیں گے!"

"ہوں، اں ——— مگر کس کے بچے کو؟" شہناز بیگم نے ذرا درست سی ہو کر پوچھنا سا سوال کیا اور تاج میاں نے نہایت ہی سادگی کے ساتھ بھولا بھالا جواب دیا۔

"تمہارے بچے کو" اور تب نظروں سے سر سے پاؤں تک شہناز بیگم کو دیکھا۔

"مگر میاں، خیر وہ تو ہے، لیکن اس کی ولدیت میں کس کا نام رہے گا؟" شہناز بیگم نے ضابطہ والے انداز کو طیاں ترکتے ہوئے کہا۔

اور اس غیر متوقع سوال پر تاج میاں اچھل سے پڑے کچھ جواب نہ بن پڑا مگر سنبھل کر اسی سادگی کے ساتھ کہا "جی کا ہے اس کا" اور غور سے دیکھنے لگے۔

اور شہناز بیگم کو جواب دینا سا معلوم ہوا اور ذرا وضاحت چاہی۔ "یعنی"

"یعنی یہ کہ جب تک ہم تم ماجی کی کتاب میں بھی ایک ہو جائیں گے، تو دو تین سال بعد اپنا بچہ یہاں سے لے جائیں گے اور یہاں بڑا اچھا پڑے گا سائیکل اسوار پرائمری اسکول کا ماسٹر ہوگا اور ہمیں کی شہنی ——— اور شہنی کو بیٹا ——— اور کسی کو کانوں کان خبر ہوگی اور سب کچھ ہوگا۔"

"مگر ہاں! میں نہیں سمجھی" شہناز بیگم کا انداز بدستور خشک رہا۔

"لیکن اس میں نہ سمجھنے کی ایسی کون سی بات ہے پیاری شہنی" اب کیوں فکر مند ہوتی ہو بس ہفتہ بھر میں اپنے گھر پہنچ جائیں گے، اطمینان سے بچے پالنا" اور شہناز بیگم کے پیٹ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"ہاں، مگر ذات کے متعلق" شہنی نے گھما پھرا کر سڑولے انداز سے کہا اور تاج میاں چونک پڑے کچھ سٹ پٹا سے اور پھر نہایت سادگی سے ویسے ہی بولے "ذات! وہ تو سرکار ہمارے حق میں اعلان کر ہی چکے ہیں"

"مگر دیکھئے کب اعلان کیا تھا سرکار نے؟ جب خود سرکار کے اپنا بیٹا نہیں تھا، سمجھی تم؟"

اور تاج میاں نے اچھل کر شہناز بیگم کی جانب دیکھا تو بڑی بڑی تھی تھی خوب صورت آنکھوں میں تھا ہی لپک رہی تھی، کچھ ڈر سے پھر سنبھل کر کچھ ترکی بہ ترکی جواب دینے کی کوشش کی۔ "تو اب بھی سرکار کے کیا ہوگا؟" اور پھر بات کو سادھا "اور بیٹا تو ہری کشنی کے ہوا ہے" اور بڑے رومانٹک انداز میں مسکرائے اور بچے کی ننھی مسہری کی جانب پیار سے دیکھا۔

مگر آنکھوں سے نکل کر کمبخت زبان سے چلنے لگی "خیر یہ تو میں جان سکتی ہوں کہ سرکار کے بیٹا ہوا کسی اور کے" مگر شہناز بیگم اپنی بھول چکی تھیں اور جیسے تاج میاں سے سب کچھ جھین کر کہا۔

اور بات تو بڑے ضابطہ کی تھی اور تاج میاں کو امید نہ تھی کہ اس وقت یہاں تک پہنچ جائے گی اور وہ شہناز بیگم سے زیادہ گہری نہ تک پہنچ کر رخ بدلنے لگے اور آنا کانی کرتے ہوئے بولے "دیکھو یہ سوال آج اٹھانے کا نہیں ہے، تم بہت گھبرا رہی ہو، صبح مسا اٹھانے ہوئے اور ہفتہ میں یہ بحث چھیڑ دی اس وقت، ایں:

"نہیں صاحب! یہ چیز تو آج اور ابھی ہمیں پڑے ہونے کی ہے، یہ ہماری زندگی کا سب سے اہم سوال ہے ہر بات صاف ہونی چاہیے لگی لپٹی کیسی؟" اور شہناز بیگم کے تیور تو بڑے شدید اور خشک تھے۔

"اچھا شہنی پیاری، تمہیں آم کھانے سے مطلب کہ پیڑ گننے سے؟"

"ہم آم بھی کھائیں گے اور پیڑ گننے سے تو بھی کہ مطلب ہے۔" شہناز بیگم نہیں جیسے کوئی اور بات۔

"تو پھر کیا؟"

"کیا یہ کہ بات صاف کیجئے، ٹیڑی پٹی نہیں!"

"صاف کیا کروں صاف ہی ہے بنیادی تمہارے پاس پہنچتی ہے اگر بچے تو بھی۔"

"مگر دیکھئے تو آج میاں، جب میرے سامنے یہ بھی سادی صورت ہے تو میں ناک گھما گھما کر میں پیچاں اور جو دنیا جہان کا دستور ہے، وہی طریقہ کیوں نہ اختیار کروں۔"

"یعنی کیا؟"

"یعنی یہ کہ دنیا جہاں میں بیٹے جائداد کے وارث اور مالک ہوتے ہیں اور بیٹیاں اسی طرح جائداد پاتی ہیں کہ شوہروں سے مہروں کے نام پہنچتی ہے اور ان بیٹے کی مالک ہوتی ہے اور اس طرح گویا بیٹے کی ہر چیز اس کی اپنی ہوتی ہے۔"

"لیکن تمہارے لئے اس میں کیا فرق پڑتا ہے، تمہارا بیٹا بھی اسی طرح ایک دن وارث اور مالک ہو جائے گا اور آج تمہارا وہ کون ہوا! تمہارا آنچل جس کے دل کی تم مالک ہو" اور آج میاں نے ڈری ڈری پیار کی نگاہوں سے شہناز بیگم کو دیکھا۔

"مگر آج میاں، یہاں پر ایک بات سمجھ لیجئے گا اور" آنچل" کا فرق ہے اور ایک چیز جب آپ کے بیٹے کو ملتی ہے تو دوسرے کی جھولی میں کیوں پھینک دوں۔" شہناز بیگم کے انداز میں مطلق فرق نہ آیا۔

"اچھا بھئی دوسرے ہیں، اور بیٹا تمہارا ہے" آج میاں نے مخصوص انداز میں کہتے ہوئے شہناز بیگم کی جانب دیکھا اور یک دم شہناز بیگم کی نگاہیں جھک گئیں چہرے پر ایک رنگ سا آگیا۔

اور پھر سنبھل کر بولیں۔ "لیجئے، میں یہ کب کہتی ہوں جب یہی ٹھہرا (تم دوسرے ذہن دوسری اولاد، تمہاری منطق کے مطابق ہی سہی، پھر زیادتی جس طرح قول تمہارے بچے کھچے ہے تو کیوں نہ بھی سمجھتی ہے اپنے بیٹے کے ذریعہ" وہی تین میں، دس ساٹھ، تم باپ میں ماں، پھر بھی سہی، فرق کیا پڑتا ہے؟"

اور عملی طور پر اپنے داؤں پر آپ پچھڑتے ہوئے آج میاں کو ایک دھچکا سا لگا مگر منطق وہ تھا اور بھی زبان کے پاس بہت کچھ کہنے کو بھی باقی تھا بھی طرح سنبھل کر بولے۔ "دیکھو شہنی آج تم کہاں سے بول رہی ہو، اور اپنے تیور کو ذرا دیکھو کیسے بے ڈھب ہیں، ہمارے تمہارے درمیان کیا کبھی ایسی باتیں ہوئے تھے، تم ایسی نہ تھیں۔"

"میں آج بھی اپنے بیان پر قائم ہوں اور جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہی کہہ رہی ہوں جناب!" شہناز بیگم تڑاقے کے ساتھ بولیں۔

"تو آج تم میرے منہ سے بھی کچھ کہلوا کر چھوڑو گی شہناز، تم عورت ہو، ناقص العقل، سمجھ لو یہ توسیع کہ میں حالات اور میں طریقے سے یہ میرا بیٹا بنا ہے ان کے ہوتے ہوئے تم اور میں دونوں اسے دنیا بنا بھی سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں یہ قول کا معاملہ ہوتا ہے" اور اپنا اپنا نقطۂ نظر اور طرزِ عمل" شہناز بیگم نے جیسے خالی الذہن سا ہو کر جواب دیا۔

"نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کے کسی حصہ میں تم کچھ اس پر یہ ظاہر کرو گی کہ یہ میرا بیٹا ہے اور خبردار اتنی دھیان کبھی جاؤ تو بیٹے

سرکار کی اتنی بڑی درخواست پانے کے بعد اس چیز کو یقین کرتے ہوئے بھی اس غریب کو اپنے اندر دھکا پانے سے گیا جو باپ اور بیٹے کے درمیان فطرت ودیعت کرتی ہے اور جسے اور اپنے امین باپ اور بیٹے کا رشتہ کا کبھی خواب میں بھی شائبہ آنے نہ دیا تھا اور خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"اے آپ، تو کیا مجھے پاگل کتا کاٹنے کو جو اس سے کہتے ڈریں گی۔ ایسی بے تکی بات کوئی ماں اپنے بیٹے سے (توبہ! توبہ" شہناز بیگم نے مخصوص عورتوں والے انداز سے کہا۔

"تو یوں کہو اپنے پیٹ سے نکال کر میری زندگی مستعد کھڑا کر رہی ہو، بلکہ باپ بیٹے کے ہاتھ میں تلوار تھما رہی ہو۔۔۔ اور تکیہ شہناز آج مستقبل اور حال کے سب تکیے سمیٹ دیتے ہیں میری کی ماذ ہم اس بچے کو یہیں چھوڑیں اور جب تین سال کا ہو جائے لے جائیں۔۔۔ پہلے تو ہم سے پوچھنے والا بھی کون۔۔۔ اور ایسا بھی اگر کوئی کے رشتہ دار اور جاننے والوں کا تھوڑا بہت لحاظ ہے تو سال ڈیڑھ سال بعد اسی ترنگ ہو ہم یا کہیں کا ہم لے کر پیدائش کا اعلان کر دیں گے اور کہیں گے کہ پرورش کے لئے ہمیں دے دیا ہے، اپنے انگریز کی وہاں جگہ میں تو آج کل یہ عام ہے کہ پیدائش کے بعد پرورش کے لئے ترنگ ہوم میں بھیج دیتے ہیں اور جب انشاء اللہ تین سال کا ہو جائے گا تو اپنا کچھ گھر لے جائیں گے اور سب کو دو ہاتھی سال کا بتائیں گے اور اٹھارہ انیس سال کے تین سال کی عمر میں دیکھنے والے نہیں کہہ پائیں گے اور بڑی بات تو یہ ہے کہ کسی کو کیا پڑی ہے جو اس پر غور کرے گا"

بالکل ٹھیک تجویز ہے مگر ہر تین سال کے لئے کیوں جائیں اس میں کیا قباحت ہے کہ ہم اس کو یہاں بڑے سرکار کی ولدیت میں اٹھا کر خاموشی کے ساتھ چلے جائیں اور بڑے سرکار کے فوراً بعد اعلان کر دیں۔۔۔ اور بڑے سرکار باہر کے باب میں ہی کون جانتا ہے کہ اسی ہفتہ میں اور آج ہی کی تو میں۔۔۔ میں بالغیب بیٹھے بھی نہ یاد ہوں گے ہو جائیں" اور آخیر جملے ادا کرتے وقت شہناز بیگم کی آواز کانپ گئی اور گلوگیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگیں۔

آج یہاں بہت سٹ پٹائے، جلدی جلدی پلک مارے، اتنے دنوں کی کمی کوئی سب پٹی میں لگی، سنبھل کر ایک لمبی سانس لی اور بولے "غیر مگر ان کو بتانے کے بڑے سرکار کب تک زندہ ہوں آج اور اب، یا کب؟ موت زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے"

"غیر یہ تو مسئلہ ہے یہ ہفتہ انہیں تو یہ ہیں" اور پھر آواز دھیمی ہو گئی سنبھال کر اور آنسو پی کر سلسلہ کلام جاری کیا "اور سوال تو یہ ہے کہ یہاں پر کس کو حق حاصل ہے جو ہمارے مفاد پر ہاتھ پڑے گا اس چیز کو ستر عام پر لائے گا کسی کو کیا پڑی ہے"

اور جیسے آج یہاں کے اندر کوئی بولا "میرا حق۔۔۔ جو دولت دولت کی ماں دنیا میں سے دو نمبر کی بھیک مانگ کے ہاتھ سے پائی ہو۔ اب ساری عمر بیٹا پیدا کرنے اور پیدا کرانے کی بنا کر بھیک اس کے ہاتھ سے پائے گا" اور اس جرم کو اپنے دامن پر اپنے کچھ نہ کچھ آج یہاں کچھ نہ جواب دے ہو گئے۔۔۔ ماجد! جس کام کے لئے تمہارا اس پر استعمال ہوا ہو۔۔۔ دائے نصیبی! لگا بیٹا جیسے بھی اسی تلوار کو سامنے آگیا!۔۔۔۔ اور شہناز بیگم جیسے چھٹی حسوں کے ٹھیرے پتہ کر ڈھانپے تک جانی کو یہاں کر ایک جانب تن کے کھڑی ہو گئیں۔

ایک ساعت سناٹا، اور ایک سناٹا، ہر چیز زبان پر نہ سہی، آنکھوں کے آگے تو بڑی بڑے آگئی تھی جو شہناز بیگم کے سامنے زمانوں سے تھی۔ منطق رہ بھی بہت بڑے ہو گیا۔ آج یہاں کے سنبھل کر مردانہ وار اس کو بلا اور سوداگرانہ تیوروں میں تھی پیدا کر کے کہا "مگر شہناز بیگم یہ بھی سمجھ لو کہ سر بلند تو ہو تم ہمیشہ ہی اور ادا کے لئے اپنا بھی بیٹا نہ سہی ہو۔۔۔ ہوں سمجھ لو ابھی ہوتا" جیسے پانی کے پتے ہوئے مرغے کی چاج پٹ کر ایک چوکی سی لی، پھر ایک ساعت خاموشی ہو گئی، گویا ساکتی سی ہونے لگی شہناز بیگم نے جیسے نومولود کا سر پکڑ لیا اپنی طرف کھینچا اور آج یہاں نے انہیں پکڑ کر اپنی جانب گھسیٹا اور غیر آج یہاں کی تو کچھ نہ کہئے ان کا تو گوشت پوست ہڈی سب اسی غیر سے بنا تھا اور خون میں نسل رنگ خوب چاہا تھا اب یہ رنگ وغیرہ شہناز بیگم میں بھی

شامل ہو گیا تھا۔ اور یہ آویزش فطرتی تھا۔ اگر بستر مرگ ہو تو بھی ہر ذی بصیرت کی اس طبقہ میں دلسوزی محبت اور حق سب کے سب چرب سے ہا کرتے ہیں اور اگر دل کی شادی حرت سے نہیں حسن اور جوانی سے ہوتی ہے تو عورت کا جامہ بھی زمین سے ہوا کرتا ہے اور شہناز بیگم تو یہاں ہی اسی چارپائی پر گئی تھیں ۔ نون غنہ زمین کی ٹھنڈی خنک لاگر تھیا ر ..... اور یہ سوچ کر سامنے آیا تھا ناک میاں کے ملہ پر بیٹھا جا سی رہ گئیں ۔

اور ناظر شو کو گھنٹی کی مکمل گھنٹی رسوں کے ایک گروہ نے یک دم کمرے میں داخل ہو کر توڑا ۔ سریلے قہقہوں اور شیریں ہمہموں سے کمرے کی سنگین فضا بھر گئی دو تین چونگ پلے ایک نوجوان خوب صورت رس نے لپک کر بچے کی مسہری سے نومولود کو اٹھا لیا اور بڑی رسیلی آواز میں خصوصی شور بنا کر بولی "دیکھئے ہم بغیر مٹھائی کھائے آپ کو نہ رکنے دیں گے اور نہ کپڑا اٹھا کر بچے کے چہرے کی جھلک دکھا کر جھٹ سے لپٹا لیا" بڑا سویٹ Lovely بالکل آپ کی شکل ہے" اور اگلی میاں نے مسکرانے کی کوشش کی گر مونث سکا لدھ گئے ۔ اور گروہ مسہری رسیلی گلیوں کی آوازوں سے بھر گیا اور جب تھیلے ذرا سرکے پڑے تو ایک بڑھی رس نے آگے بڑھ کر کہا "سیدنی واہ جناب ! واہ آپ کی بیگم صاحبہ نے تو ہمیں Baby کے دادا کا نام بتایا اور ہمیں تو سمجھ رہے تھے سلوم صاحب کو حضرت خود تشریف فرما ہیں ۔ ہائے سیدھے ہاتھ کے پرس نکال کر ہمارے حوالے کیجئے جب کچھ دیکھنے کو ملے گا" اور جب نام سن کر شہناز بیگم چونکیں جب تک ایک اور رس نے لہرا کر کہا "ہمیں تو معلوم تھا کہ آپ ہمیں ٹھہرے ہوئے ہیں سسی دیوانی اور لیلیٰ ڈھونڈتے تو رات ہی ٹولیوں کے بعد فرمانگ کیا تھا آپ کو" اور بڑی رس نے بھرائی آواز نکال کر فراجیت سے کہا " O, God God " بیگم صاحبہ نے ہمیں آپ کے بجائے Baby کے دادا کا نام بتایا جائے باپ کے دادا کے نام کر آپ کے بتایا تھا ۔ تیرہ بندتین انس Sound , Healthy Lovely وغیرہ کوئی بات نہیں باپ دادا ایک سی بات ..... " داغ کی دکھن چھٹ سی گئیں آنکھوں کے سامنے نیلی نیلی تتلیاں ناچ گئیں اور کانی چادر سی لہرا لے لگی کھوپڑی کے اندر موت کا سناٹا پر چھا تا چڑھ گو نجھا دلوں کے دھڑکنے بیک وقت سیٹی سی بند ہوئی ۔ میں اتار دے دیا " ناک میاں پتھر کا بت بن کر کرسی پر اہرے رہ گئے اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ شہناز بیگم آسکتہ سا ہو گیا ۔ چہرہ جیسے ہزار سالہ تابوت کا مکین ۔ ۔ ۔ ۔

جب آنکھیں کھلیں

اور تھوڑی دیر کے لئے تمام عالم آگ کا جوالہ مکھی بن گیا اور خوشی میں بھرائی ہوئی آواز میں سیچ کر اعلان کیا اور آنکھ پر چوہیں گھما کر دیوانہ وار ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا اور سنتے ہی دایاں نے بدحواس ہو کر کہ کہ کر ان سات جوانی فیر داغ دیئے اور دھماکوں کے ساتھ باہر سے اونگ بھلی کی دھار سے خبر پھیل گئی ۔ لمحہ بھر سناٹا ۔ پھر شور انیاں پھیا پڑیں اور تمام عالم نے دوڑ کر سرکار کو مژدہ سنایا ۔ شور بڑھتے ہوئے تھیلے گریہ مژدہ تو دوڑ دوڑ کر ان کے ہم گلیاں میں بھی دیتا ۔ مبارک باد کا مژدہ جانفزا ۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اشارے سے مزید وضاحت چاہی اور جب تمام عالم نے تفصیل کی اور مسہری کے رنگ عوام کا ناڑ کھا کر خیر تاثی تو کچھ سمجھ میں آنے کے بعد سب کچھ سمجھ میں آ گئی خبر کی سیل مذہب پر تو چھڑ کا پڑ گیا تھا اور تفصیل کے بعد سرخ ہو گیا ایک ایک بھی سہار ہو گئی جیسے کچھ کہنا چاہا مگر تمام عالم کے سہ نہ سکا اور آنکھیں بند کر کے تو بہت کے ساتھ منہ پھیر کر جہاں کے تہاں رہ گئے اور تمام وجود پر بوڑھی اور کہولت سی طاری ہو گئی آہستہ سے چادر اوڑھا کر منہ ڈھک لیا ۔

اور اس تمام عالم گوگیں پڑ گیا سر کا سہارا کسی پھر بھی تمام عالم اس قابل نہ رہا کہ کچھ کہہ سکا اور جیسے منہ کی کھا کر کمرے سے باہر نکل آیا ۔ اتنی

دیئے محل کے اندر اس سرے تک اور ہر چبوترا تھا جس پر ہر چبوترا اندھیرے پڑا تھا اور کوئی میں روشنی کی جا رہی تھی اور کشمکش جاری تھی۔ اور ڈھول گھڑیال کی گھنٹ بج رہی تھی۔ دیوان خانے کے چوک میں جگہ جگہ بھاٹ میراثی گت پڑھ رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ بھی تھی چبوترے کے سامنے قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے اور ان پر دونوں کا غول ڈھول نگارا ٹاشا پیٹ رہا تھا اور ہجوم جھوم کر بڑھنے کی آواز میں مبارک سلامت کا شور مچا رہا تھا۔ وہ تو جیسے یہاں سے وہاں تک سب کے سب تیار ہی بیٹھے تھے اور نیاز کے ہاتھوں کے ساتھ ایک دم اور پڑے اور تھاد عام کے دروازے پر انعام کے بار بار تقاضے ہونے لگے اور تھاد عام جیسے کچھ عجیب سے خیال میں زیر زبر کچھ اندھا سا ہو گیا۔ پھر ایک کر سرکار کے کمرے میں گیا اور سر بار دستور جیسے فرش پر پڑے تھے اور انہیں یہ تمام آوازیں ایسی سنائی پڑ رہی تھیں جیسے بہت دور سے چڑھتے چڑھتے محل کی آخری سیڑھی کے اوپر چڑھ آئی ہو انہوں نے مشعل کی روشنی میں ایک گہری سانس لی خدا ہوش آیا اور اپنے ذہن بدن اور دماغ کو درست کر کے پھیلی یادداشت کو سمیٹ کر اصل کو سمجھنے کی کوشش میں دور تک پیچھے سوچتے چلے گئے..... اور تو شدید حالات چل رہی تھی اور یہ تو ہمیں کسی شمار میں ہی نہ آتی تھی پھر ڈیڑھ سال کے اندر کیا دن کو بیتا تھا۔ ظلمت کی کیا ایک رات اور مہرات کی ایک ایک گھڑی سامنے آ گئی اور قلعہ تو اور ڈیڑھ برس بلکہ دو برس سے ویرانی کچھ اور بھی آباد گاہ ہو گئی تھی۔ تبریزی سنان! اور قبر کا حال تو مرد وہ جانتا ہے اور کہنے کو تو سرکار بھی کچھ تھے ــــ سرکار میاں، شوہر اور ہر دو سال سے یا اتنا یا سے آج باپ بھی ہو گئے تھے مگر انہیں تو کبھی طرح معلوم تھا کہ وہ کتنے شوہر ہے ہیں اور آج کتنے باپ ہیں..... اور ان کے اور شہناز بیگم کے درمیان کتنا سا تو ان دو سال کے درمیان بالکل صاف تھا ــــ صاف اور سمجھ۔ کہیں پر خدا ساتھ نہیں تھا نہ ہی کسی آدمی سرکار اک خدا اپنے دو ہمدم کو پناہ دے سکیں تھے کہ آس پاس کہیں جھوٹ موٹ کی بھی نہیں ہیں کی ٹیکے لے کر آج کی خیر کو مڑ دو کچھ کر دل کو سمجھا لیں۔

تمہارا اور ساری رات اور دوسرے دن دوپہر تک بے ہوش رہے۔ معالجین نے شور مچا دیا اور تو عمل بیان تشخیص کیا اور معالجین کی ایک رات اور ڈیڑھ دن کی کوششوں کے بعد سرکار نے دوسرے روز دوپہر کو اچھی طرح آنکھیں کھول دیں ــــ اتفاق سے کمرے میں تنہا تھے اور جب ہوش میں آ کر حواس کا جائزہ لیا تو جیسے ہلنے اور بولنے کی چاہ ہوئی تھی تھا خدمت گار مان کا اندازہ کل بہ تکلم دیکھ کر معمول کے مطابق بات سننے کے لئے جھکا تو وہ اپنا ہاتھ کر غیر معمولی مضبوطی سے اوپر میں کہا "دیکھئے فوراً وکیل صاحب کو بلائیے"..... اور پھر ایک گھونٹ پانی کا لے کر اور بھی زیادہ خدمت آواز میں کہا "اور ہاں دیکھ لو خان صاحب سردار علی خاں کو بھی، اور چیتے کے چڑیمن صاحب مختار علی خاں کو بھی سمجھ گیا دل جوئی والے خان بہادر ــــ اور باہر پوٹ والے کنور صاحب کو جا، خاموشی کے ساتھ چاروں کو بلا کر"۔

اب سے پہلے سرکار کے شیروانی، وکیل صاحب تشریف لائے، کمرے میں گھستے ہی سلام علیک کے ساتھ مسرت اور مبارک باد لگائے۔ "ہوں کیا کروں کل سے تہنیت کے لئے عام خدمت ہونے کی کوشش کر رہا ہوں گو عدیم الفرصتی ــ مجھے آج آپ نے خود ہی یاد فرمایا؟" اور پھر ایک قہقہہ لگا کر مبارک باد دی۔ اور اتنے میں وہ تینوں حضرات بھی تشریف لے آئے اور کورنش دم خوشی کے قہقہوں اور مبارک باد کی آوازوں سے بھر گیا اور سب کے جواب میں سرکار نے ایک ملتزمہ ہونکارا نکالا اور تفخر خدا انداز بنا کر کہا "جی ہاں بے ــ مبارک!" اور پھر سب کی جانب دیکھ کر منہ سا چڑایا۔ یہ انداز دیکھ کر وکیل صاحب نے کہا "ارے کوئی ہے حکیم صاحب کو ہمراہ لیتے آئیے" اور پھر کنور صاحب اور خان صاحب کی جانب دیکھا مگر سرکار نے وکیل صاحب کی بات اچھی طرح سمجھ کر کہا "جی حکیم صاحب کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں، مجھ کو کوئی کچھ نہ سمجھا اور یہ عجیب سا انداز دیکھ کر ایک گونہ تعجب اور استفسار کے انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگا اور سرکار نے ملازم سے کہا "دیکھو تو اعتماد عام کو بھیج دے کاغذ قلمدان لے کر" اور پھر وکیل صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھئے ایک وقت نامہ بنا دیجئے"۔

وکیل صاحب نے قدرے متعجب سا ہو کر اور پھر دست بوس ہو کر کہا "ایں! وقف نامہ! اس وقت؟ ــ خیر، اچھا، ہاں ٹھیک ہے"۔

اور کوئی بات کرنے سے پہلے ہی کئی بار ایسے اور کے ساتھ کہ جیسے کبھی جاتی ہیں بات کرتے ہوئے چلاتی ہوگی اور اغلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کا ملازم تھا اور لڑتے ہیں تو ملازم بھی آگیا اور ایک کرسی گھسیٹ کر سرکار کے برابر کے قریب ہو کر بیٹھ گیا کہ ہے میں ہم بھی لاہور شہر تھا ملازم لے جاؤ ہے کر اور کچھ معاملے کی نوعیت کا اندازہ کر کر اگر ہو جائے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے کہا "کوئی بات کرو ہے" برابر کر اور سر ہلانے کی جانب وکیل صاحب بیٹھے تھے اور بقیہ دائیں بائیں پڑی ہوئی کرسیوں پر تینوں حضرات اور سرکار کے اشارہ پر سب نے کرسیاں بستر کے بالکل قریب کھسکا لیں اور کار کی جانب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ سرکار نے ایک مشکل تمدید انسان کی طرح اپنی پھیلی بات کا سلسلہ ملاتے ہوئے کہا "جی ہاں" وقت نامہ ایک وقت نامہ مرتب کیجئے" میں اس وقت سے اپنی کل زندگی اور سکنی جائداد (تمام زر نقد، اثاث البیت اور ذخائر جواہرات وظروف جملہ اثاث البیت ہر چیز جو میری ملکیت ہے فی سبیل اللہ وقف کرتا ہوں۔ اور تیرہ خانہ کی مجلس عاملہ کے سپرد کرتا ہوں۔ جائداد کے کاغذات اور حال مستغلہ کی مکمل فہرست آپ کر میرا اختیار نامہ لے گا۔" "ہر چلان صاحب کی جانب دیکھ کر سلسلہ کلام جاری رکھا" بہتر ہے کہ آپ تیرہ خانہ کے کسی عہدہ دار کو بھی طلب کریں اور آپ بحیثیت صدر مجلس عاملہ کے تمام ملکیت پر قبضہ لے سکتے ہیں" اور پھر وکیل صاحب سے اور مختار عام سے مخاطب ہوئے "آپ اشٹامپ اور ہر چہار کا انتظام کیجئے میں چاہتا ہوں کہ آج شام تک کاغذی کارروائی مکمل ہو جائے اور ہر حال مستغلہ کا قبضہ ساتھ ساتھ تیرہ خانہ کے صدر کی حیثیت سے خاں صاحب کو دست بدست دیتے جائیے" اور پھر مختار عام سے مخاطب ہو کر کہتے ہے" آج ہی شام کو کاغذ کاغذوں تیار ہی کے لئے پیاسے روانہ ہو اور جملہ اثاث البیت و نقدیات کی فہرست بنا کر خاں صاحب کے حوالے ہر چیز کر دو" اور پھر وکیل صاحب سے کہا" وقت ہمارے تمسک کے اندر غیر مستغلہ جائداد کی تفصیل کے ساتھ مستغلہ ملکیت کی فہرست شامل کر کے ہر چیز میرے بستر سے لے کر خاں صاحب کے قبضہ میں دیدیجئے۔ آپ ذرا قلم برداشتہ ایک مسودہ تیار کر لیجئے" اور پھر مختار عام سے مخاطب ہوئے" کچھ تم کو اسی وقت اشٹامپ فریدانے، ہر چہار کر یہاں لانے کا انتظام کرنا ہے" مکمل فہرست وکیل صاحب کے حوالے کر دے اور آج ہی رات میں تمام علاقہ کے اندر منادی کرا دے" سب لوگ حیرت سے سرکار کی بات سن رہے تھے جس میں کہیں پر تجمل یا معلوم ہوتی تھی مگر کچھ باقی قسم کی چیز محسوس ہوتی تھی ایک دم سے مجلس پر خاموشی چھا گئی اور جیسے ہر ایک آثار کلام کا منتظر سا رہا اور سرکار جیسے کسی بڑے انتظام کے بعد سکتے سے ہو گئے، وکیل صاحب نے ہی سکوت توڑا۔ "مگر کیوں؟"

اور جیسے سرکار خاموشی سے اسی سوال کی امید کر رہے تھے اور شاید اس کا جواب تیار کر چکے تھے برجستہ فوراً بات کہی "اس کا جواب اگر آپ مجھ سے بحیثیت تیرہ خانوادی مانگتے ہیں تو آپ جانتے ہیں کہ میں اپنی ملکیت کا مختار کل ہوں جو چاہوں سو کر سکتا ہوں اور میں یہی کرتا ہوں"

یہ تو خیر ایک حد تک ٹھیک ہے اور ہر ایک متمول جائداد کی کوئی وجہ سرکار تحریر کے وقت دکھائی پڑتی ہے وہ تو خیر قانونی جواز کے لئے رسمی چیز ہوا کرتی ہے اور اس قسم کے ڈاکومنٹ میں تو بہت ہی صاف اور آسان ہے جس میں کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی "نواب دانیں" مگر کلاً وہ تیرہ خانوادی کے آسامی تھے اور جیسے بھی مجبور خاص عنایت فرماتے ہیں اور علاوہ قانونی معاملات کے دیگر خانگی مسائل میں بھی مجھ سے بات کرتے ہیں میں یہ عرض کرتا ہوں آج تو مقام شکر ہے اللہ نے آپ کو بیٹا دیا، حقیقی وارث، پھر یہ اس قسم کا وقف کیا معنی؟ میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ وقف علی الاولاد کی تجویز پیش کر رہے ہیں" خدا نہ کرے، یہ خیراتی وقف کیسا؟"

جی بالکل مجھے اللہ نے بیٹا نہیں دیا اور آپ لوگوں نے میرے بیٹے کی پیدائش کی خبر سنی ہے وہ بالکل غلط ہے آپ سب لوگ گواہ رہیں کہ میں نے ہوش و حواس میں بیٹھ کر یہ کہا ہے" اور سب کا تحیر فزوں تر ہو گیا اور زیادہ آگے والی حاضر بات سننے کے لئے سب کے سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اور جب سرکار اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گئے اور گویا یہ اندازہ لگایا کہ انہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تو وکیل صاحب نے پھر کہا "ہاں، مگر یہ کیسے؟ ماشاء اللہ آپ زندہ و سلامت ہیں آپ کی بیگم کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا ہے؟" اور سرکار نے مزے سے بات لے کر کہا "دیکھئے میں نے پہلے بھی کوئی بیٹی نہیں رکھی تھی بلکہ

کرآ ہوں کہ بیگم کے بطن سے پیدا ہوا ہوں اگر مجھے پیدا نہیں ہوا اسپرا پیدا نہیں ہوا ۔۔۔ مگر یہ چیز "انا" ہوں "آن" ایں آپ اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ رہے ہیں؟" وکیل صاحب نے کہا اور سرکار نے پھر ان کے منہ سے بات لے کر زہر خند انداز کے ساتھ کہا "ہوں تو وکیل صاحب! اتنے یقین کے ساتھ مجھے میرے اور کون کہہ سکتا ہے میں اپنے اور اپنی بیوی کے تعلقات کا تنہا عالم ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ خواہ تو مخواہ کی ان کہی باتیں ہے پہلے تو اس کے اندر بھی میرے اور شہزادہ بیگم کے تعلقات زن و شوئی نہیں رہے ایچھے میں نے بات صاف کر دی اگر کوئی اور تقاضا ہوں تو کہیں یہ حقیقت اظاکر دوں" اور پھر تینوں حضرات کی جانب دیکھ کر گویا ہوں ہی لگا ہوں میں کہا کہ آپ لوگ گواہ رہیں کہ میں نے یہ حقیقت آپ کے روبرو بیان کی ہے۔"

"تو خیر یہ تو آپ جانیں لیکن پھر آپ کا دوسرے درجہ کا وارث آپ کا بھتیجہ مرحوم ہے جو قانوناً اور روایتاً دونوں صورتوں میں حق دار ٹھہرتا ہے اور جس کے حق میں شاید ابھی پچھلے ہی سال آپ نے کچھ جائیداد وغیرہ کا اعلان بھی کرنے کا اعلان فرمایا تھا وہ غریب کیوں محروم ہو" اور پھر "ایں" آں" آپ کی رائے صاحب؟"

بیگم اور بھتیجے کے الفاظ اس کے جیسے بہرے کانوں کی طرح ٹکرائے چہرہ پر زلزلہ کے آثار پیدا ہوئے رنگ آئے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹوں پر زبان پھر کر سو گئے اور جب وکیل صاحب پھر مستفسرانہ نگاہیں چہرے پر گاڑے ہی رہے تو آہستہ سے "بات کٹکھنا کر فرمایا" میرا کوئی کچھ نہیں ہے آپ سمجھ لیجئے" اور پھر ذرا اونچی آواز میں کہا "بھلا آپ کچھ دار ہو کر ایسی بات کرتے ہیں یعنی میں آپ سے انکار کر رہا ہوں اور آپ میرے بیٹے کی ماں کو بیچ کر رہے ہیں" چوتھی اور سرکار خفگی سے ہو گئے۔

"خیر یہ تو آپ جانیں مگر قانونی پوزیشن پیش کرنا میرا کام ہے" دیکھئے جناب آپ کے سامنے اس وقت تین راستے ہیں ایک تو آپ مختار ہیں کہ جب آپ کے بیٹا نہیں ہے تو کسی قانونی اور شرعی حالت میں اپنا جانشین بنا کر کل ملکیت سے دیں اور بقیہ دیگر دشمنار کے حق میں بابائے خصلائے گذارہ مقرر کر دیں اس سلسلہ جانشینی میں صرف آپ کا بھتیجہ آتا ہے اور غیر بیٹے سے کر جائیں مگر بھتیجہ سے آپ انکار کیسے کر سکتے ہیں دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اسے یوں ہی کچھ دے دلا دیں آخر آپ کی عمر ہی کتنے آپ کے بعد بقدر ایک چہارم کے آپ کی بیوہ کو اور تین چہارم آپ کے بھتیجہ کو پہنچے گی جب آپ کے بیٹا نہیں ہے اور اگر بیٹا ہے تو آٹھواں حصہ بیوہ کا اور بقیہ بیٹے کا ۔۔۔"

"حاصل وکالت وکیل صاحب، خواہ مخواہ میرے سامنے آپ سارا قانون وراثت بیان فرمائے میں جانتا ہوں کہ میری موت پر یہ حرام زادہ نمک حرام میں تو اپنی کل ملکیت وقف فی سبیل اللہ کر رہا ہوں، اس کے متعلق بات کیجئے۔"

"جی ہاں! اس کے متعلق تو بات کر رہا ہوں اس وقت پوزیشن یہ ہے کہ وقف کرنے کے باوجود بھی یہ مردود حالت پلٹ کر درمیان میں آ جاتے ہیں تاکہ اور پھتیجہ کی پوزیشن اٹل ہے خیر بیٹے سے انکار یہ تو آپ کا ذاتی معاملہ ہے اور اس کے سب سے زیادہ معتبر شاہد آپ ہی ہو سکتے ہیں اور ہمارے سب کے درمیان آپ نے حقیقت حال بیان کر بھی دی مگر جناب بھائی کے بیٹے سے انکار کیسے ممکن ہے اور وہ تو ہر صورت میں حائل ہوگا ۔۔۔ اور ہو بھی ۔۔۔ زیادہ سے زیادہ آج آپ طلاق بھی دے دیں یا عدہ ہے یہ ظاہر کر دیں کہ پہلے طلاق دے چکے ہیں تو پھر اس کے تو ہم مہر کا بار آپ کے متروکہ پر جائے گا خواہ فی سبیل اللہ وقف کریں یا کچھ بھی کریں۔"

"کیوں؟" سرکار نے مخصوص سرکاری لہجے تیور اکھاڑ کر کہا اور وکیل صاحب نے خاص قانونی لہجہ میں جواب دیا "یوں کہ اس وقت خواہ آپ وقف کریں یا بیہ حتی کہ ہبہ تک بھی ہر قسم کا انتقال آپ کی ملکیت کے ایک تہائی پر قابل پیش رفت ہوگا بعد وہ تہائی پر قانون حالت چلے گا آپ بیٹا تسلیم نہیں کرتے تو بقیہ دو تہائی بیوہ اور بھتیجہ میں تقسیم ہو جائے گا بلکہ اصلی قانونی صورت حال آپ کے اس اظہار خیال کے بعد یہ بنتی ہے کہ جس وقت آپ نے زبان سے

کہہ دیا جائے ایک ٹرسٹ کے وقف فی سبیل اللہ ہو گیا اور یہ تاوانِ وراثت کے حساب سے تقسیم ہو جائے گا۔ یہ تحریر تمسک اور جھڑپی وغیرہ کاغذی کارروائیاں آپ کے اس بیان کی تصدیق کا ثبوت ہی تو ہیں۔"

"خیر وہ تو سمجھا، مگر یہ ایک ٹرسٹ کیوں؟ میں کیا میں اپنی ملکیت کا مختار کل نہیں ہوں؟"

"ہاں خیر وہ آپ یہی سمجھ لیجئے کہ اس اسپیچ پر مختار کل نہیں ہیں۔"

"کیوں؟" سرکار نے ایک تلخی بھرے لہجے کے ساتھ دریافت کیا اور وکیل صاحب نے سرکار کے جذبات کا اندازہ کر کے بڑی نرمی کے ساتھ کہا "میں نے عرض کیا نہیں خان بہادر صاحب اس قانونی شکل کچھ ایسی ہی ہے جو بھی انتظام آپ کریں گے اس کی یہی صورت قائم ہو گی اور یہ صورت موجودہ آپ کی ملکیت کے ایک تہائی سے زیادہ حصہ پر جہاں تک کہ متعلق کرنے کا حق ہے متاثر نہیں ہیں۔"

"اوہ، جب میں یہ کاغذ وقف نامہ میں کل ملکیت لکھ رہا ہوں تو کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ یہ وقف نامہ وقف بالوصیت قسم کا ڈاکومینٹ ثابت ہو گا اور وصیت ایک تہائی سے زیادہ کرنے کے مجاز نہیں۔"

"ایں، وقف بالوصیت کیوں؟ بھلا وقف نامہ وقف نامہ ہے گا یا وصیت نامہ" سرکار نے کہا۔

اور وکیل صاحب نے آداب علالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا "دیکھئے آپ کے ورثا اس ڈاکومینٹ کو ضرور چیلنج کریں گے اور یہ وقف بہ قدر ایک تہائی کے قائم رہے گا اور بقیہ دو تہائی پر وراثت چلے گی۔"

"مجھے بھی تو بتائیے کیوں؟" سرکار نے ذرا جھنجھلا کر سوال کیا اور وکیل صاحب کی تنگ پر جیسے قانونی انداز ابھر آیا اور انہوں نے بڑے شیریں اور مدھم لہجہ میں کہا "یوں کہ یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے جب آپ مرض الموت میں گرفتار ہیں۔" جیسے وکیل صاحب کی زبان پر حاجی کالے رحم نشتر تھا جسے چلا "مرض الموت!" موت اور خوف سے لبی چوڑی سرکار کے سوکھے ہوئے پٹھوں سے نکلی۔ دونوں آنکھیں بجھتے ہوئے چراغ کی مانند شعلہ ہائے سی ہو کر آہستہ آہستہ سنسنے سی لگیں۔ سب نے جلدی جلدی اٹھ کر دیکھا تو جیسے سرکار مسکرا رہے تھے شاید حیران بیٹھی سر ہلانے کھڑی شاخ خوبی دیکھا دیکھا کر عشوہ و ناز کے ساتھ سجا دی گئیں اور ہے خان صاحب سجاد علی خاں نے اور ہے مختار عام نے نبض ٹٹولتے ہی ایک دم چھوڑ دیں اور ایک دوسرے کی جانب ایک بامعنی استعجاب نما اندازِ دانی مختار عام نے جلدی سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر حرکت قلب دیکھی اور خاں صاحب نے نتھنوں کے قریب انگلیاں لے جا کر سانس دیکھی ــــ سرکار ــــ ــــ خان بہادر صاحب!" ایک آواز دونوں نے پکارا مگر ہر حرکت ساکت تھی اور سب حواس دم بخود ہونٹوں کی ملگجی سی مسکراہٹ عمر بھر کے قہقہوں کا حصہ بڑا کر آخری چکی سے جا ملی تھی۔

بچھو پھوپی

عصمت چغتائی

جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اگل رہی تھیں۔ یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کھلتی تھی۔ دونوں اسے بند رکھا جاتا تھا کیوں کہ پردہ والی بیبیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔ رحمان بھائی زنانوں کے جھمیلے سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے بیاہ کے مقدس اسم اللہ کی رسم ہوتی۔ رحمان بھائی اپنے پہلے ان زنانوں کو جو دیتے اور غریب کے گھر میں بھی ایک دفعہ وحیدہ جان سنتری بائی اور نرگس کی گھروانا چ جاتیں۔

گرمجوشی کی داکیاں باکیاں ان کی نظر میں اپنی جگہ اہمیت رکھتیں۔ ان کے چھوٹے بھائی تقریباً گنتا آئے دن تک بھائی کے سلسلے میں سر پھٹول کیا کرتے تھے۔ ویسے رحمان بھائی گھر کی نظروں میں کوئی اچھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی زندگی کی میں اپنی سالی سے جوا قرار کیا تھا۔ اس تیسرا سالی کا سوائے اس بہن کے اور کوئی مرا حیاد تھا۔ بہن کے ہاں پڑی تھی۔ اس کے بچے پالتی بس اور دھونے کی کسر تھی باقی سارا گوشت وہی کرتی تھی۔ اور پھر کسی نک چڑھی نے اسے بہن کے بچے کے منہ میں ایک دن چوسنی دیتے دیکھ لیا بھانڈا پھوٹ گیا اور پتہ چلا کہ بچوں میں آسے بالکل "خالہ" کی صورت پر ہیں۔ گھر میں رحمان کی دلہن چاہے بہن کی نوکرانی ہوں پر کبھی کبھی میں اقرار کر لیتی تھیں "جو کنواری کرے گا اس کے ویسے گھنٹوں کے کرنے آتے ہیں" ہاں تو کی تو ہیں ہر دم سوکھا کرتی تھیں پر اس کیڑا ان بھرے کباب کو کہاں چڑھتا۔ ایک آنکھ میں یہ بڑی کوٹا سی پھلی تھی پر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا۔ کراہا دبا کر ہلتی تھی۔

سارے محلے سے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ رحمان بھائی سے علیحدہ پڑا تو رہوس جا کر بیٹھے۔ محلے میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی یہی کیا کم عنایت تھی۔ رحمان بھائی اسی کو اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔

یہ تو وہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر لمبی لمبی گالیاں دیا کرتی تھیں کبھی کبھی بھائی محلے کے لوگ آ بیٹھتے تھے بھڑیٹے سے کان پر مول لے۔

اس روز پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اچھوتی سگی پھوپی بادشاہی خاندان میں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جا رہی ہیں۔

ماں کا چہرہ فق تھا اور وہ خاموش کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں۔ جیسے بچھو پھوپی کی آواز ان پر بھی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ پتے چھوٹے اسی طرح بادشاہی خاندان رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر بڑبڑا رہی تھیں۔ آپا میاں ان سے ذرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھتے تھے اور وقتاً فوقتاً کسی پر کسی لفظ کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپی بادشاہی پھر سٹاپیاں چھوڑنے لگتیں ہم لوگ سب کھیل کود چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مزا مزا اپنی پیاری پھوپی کے کوسنے سنا کرتے۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھی تھیں وہ ان کے طول طویل جسم سے جالب بھری گئی

تھی۔ باتیاں سے اتنی ہم شکل تھیں کہ جیسے وہی کوٹھیں اتار کر دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئے ہوں۔ اور باورچی کے سنے اور گالیاں سننے کے ہم لوگ بڑے اطمینان سے انہیں ڈکار لیتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، شیر جیسا سینہ، سیدھی لمبی باہیں، بڑے بڑے دانت، بھاری سی ٹھوڑی اور آواز تو ماشاء اللہ باتیاں سے ایک سُر نیچی ہی ہوگی۔

پھپی بادشاہ ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔ جس دن پھپا مسعود علی نے مہترانی کے رنگ کلیس شروع کیں۔ پھپی نے بٹنے سے ساری چوڑیاں چھما چھن توڑ ڈالیں، رنگا دوپٹہ اتار دیا، اداس دن سے وہ انہیں مرحوم یا مرنے والا کہا کرتی تھیں مہترانی کو چھوڑنے کے بعد انہوں نے دوبارہ کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔

یہ سانولا خاصی جوانی میں مرا تھا اور وہ جب سے "رنڈاپہ" جھیل رہی تھیں۔ ہمارے پھپھا جان ہماری اماں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا، میرے ابا میری اماں کے چچا لگتے تھے اور شادی سے پہلے وہ جب چھوٹی سی تھیں تو میرے ابا کو دیکھ کر ان کا پیشاب نکل جاتا تھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ان کی منگنی اسی کھیا ایک جیسے ہونے والی ہے تو انہوں نے اپنی راوتی بلی کا کچھ پی کی پٹائی سے انہیں چڑا کر کھا لی تھی۔ انہیں زیادہ نہیں کہتی اور وہ کچھ دن لوٹ پوٹ کر اچھی ہو گئیں ان دنوں ابا علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے ان کی بیماری کی خبر سن کر امتحان چھوڑ کر بھاگے بڑی مشکل سے ہمارے نانا جو ابا کے پھپھی زاد بھائی بھی تھے اور بزرگ دوست بھی انہوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے بھیجا تھا جتنی دیر وہ بھوکے پیاسے بیٹھے رہے، وہ مکمل سکھوں سے میری اماں نے ان کا چوڑا چکلا سایہ پردے کے پیچھے بے قراری سے تڑپتے دیکھا۔

"امڑو بھائی اگا انہیں کچھ ہو گیا... تو...." ایک آواز لرزتی تھی باتیاں غضب ہے۔

"نہیں برادر خاطر جمع رکھو کچھ نہ ہوگا۔"

اس وقت میری سہمی سی معصوم ماں ایک دم عورت بن گئی تھی اس کے دل سے ایک دم پرانا انسان کا خوف نکل گیا۔ ابھی تو میری پھپھی بادشاہ ہی کہتی تھیں میری اماں جاورگی ہے اور اس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہو کر پٹ گیا تھا۔ میری اماں اپنے جوان بچوں کے سامنے جب یہ گالیاں سنتیں تو ایسی بوکھلا کر رہ جاتیں کہ ہمیں ان کی یاد فراموش ہو جاتی اور پیار آنے لگتا۔ یہ گالیاں سن کر ابا کی گمبھیر آنکھوں میں پریشان ناچنے لگتیں وہ بڑے پیار سے تنے بھائی کے زیر لب بولتے، "کیوں پھپھی آج کیا کھایا ہے؟"

"تیری نتیا کا کلیجہ" اس بے تکے جواب سے پھپھی جل کر مزید ہو جاتیں، "ابا پھر جواب دلواتے۔

"ارے پھپھی جب آپ منہ میں لوا سیر ہو گئی ہے جناب کو جواب۔"

وہ جیسے جوان بھائی کی پیشانی ماتھے پر کوں جھیلوں کو رخصت دینے لگتیں۔ ان کی رانیں کر جھڑ جانے کے بعد اس وقت کہاں تھیں اپنے خیال و دہلے کے عشق میں لرزتی ہوں گی، انہلے کی دعائیں دیتیں، اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دیکر بڑبڑاتیں "ہل تو جھلی تو آئی جا کر ماں تو"

پھر ابا گھبرا کے اور تنے بھائی پوچھتے۔

"پھپھی بادشاہ ہی مہترانی پھپھی کا مزاج آچھا ہے" اور میں ڈر کے کہ کہیں پھپھی کھڑکی میں سے پھاند نہ پڑیں۔

"ہے جانے تیرے زندگ انہیں تو جوتی سے منہ سلوں گی۔ یہ بڑھا اندر بیٹھا یا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ منہ پھٹ ہے تو سامنے آکے بات کرے۔"

رحمان بھائی اسے رحمان بھائی، یہ بڑا کمینہ کتیا کو نکھیا کیوں نہیں کہلاتے۔ ابا کے سکھانے پر ننھے بھائی ڈرتے ہوئے بولتے حالانکہ انہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ سب جانتے تھے کہ آواز ان کی ہے مگر الفاظ ابا میاں کے ہیں۔ لہٰذا گناہ ننھے بھائی کی جان پر نہیں مگر پھر بھی بالکل ابا کی شکل کی چھڑی کی شان میں کچھ کہتے انہیں پسینے آجاتے تھے۔

کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا ہماری دہیال اور ننھیال والوں میں، ننھیال جنگوں گی میں تھی اور دہیال گاڑی والوں کٹہرے میں تھا۔ والے سید چشتی کے خاندان سے تھے جنہیں مغل بادشاہ نے مرشد کا مرتبہ دے کر نجات کا راستہ پہچانا، ہندوستان میں رہے بسے وصہ گذر چکا تھا رنگتیں سنولا چکی تھیں نقوش نرم پڑ چکے تھے مزاج ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

دہیال والے باہر سے سب سے آخری کھیپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار مزلیں مار رہے تھے خون میں لاوا دبکے ہاتھ کہڑے کھڑے تھوڑے جیسے نقوش لال ڈوریوں جیسے منہ مگر لیوں جیسے قد و قامت شیروں جیسی گرجدار آوازیں شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔

اور ننھیال والے، نازک ہاتھ پیروں والے شاعرانہ طبیعت کے، دھیمی آواز میں بولنے چلنے کے عادی، زیادہ تر حکیم، عالم اور صوفی تھے جب ہی محلے کا نام حکیموں گلی پڑ گیا تھا، کچھ کاروبار میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ مثال باف، زردوزی اور عطاری وغیرہ پن چکے تھے حالانکہ میری دہیال والے ایسے لوگوں کو لچر سے خانی سی کہا کرتے تھے جو شکر وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ایسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ گتکا سپہلوانی، تیراکی میں نام پیدا کرنا، بنوٹ لانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور چوسر پچیسی کو جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے لچروں کے کھیل کہنا۔

کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہے تو لاوا وادی کی گود میں اترتا ہے تاید یہی وجہ تھی کہ میرے دہیال والے ننھیال والوں کی ملاقات خود کو کھینچ کر آگے لے گئے۔ کس نے شروع کیا سب شجرے میں لکھا ہے گرچہ ٹھیک سے یاد نہیں میرے دادا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے دادیاں بھی اسی خاندان سے تھیں مگر ایک چھوٹی سی بات ہی تھی نہ جانے کیوں کر دو پشتوں میں بیاہ دی گئی شاید میری اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی چاد کر دیا تھا کہ انہوں نے اپنی بہن بقول چھوٹی بادشاہی کنجروں قصابوں میں دے دی اپنے "مرحوم" شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ اپنے باپ کو فخر سے چین نہ لینے کی بڑھائیں دیا کریں جنہوں نے بھائی خاندان کی مٹی پلید کر دی۔

میر کی چھوٹی کے تین بھائی تھے میرے تایا، میرے ابا میاں اور میرے چچا بڑے۔ دادا سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے تھے تین بھائیوں کی ایک لاڈلی بہن ہمیشہ کی نخریلی اور تنگ مزاج تھیں۔ وہ ہمیشہ تینوں پر رعب جماتیں اور اکثر تینوں بھائی لونڈوں کی طرح پٹیں، شہسواری، تیر اندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاصی مشق تھی دیسے تو پھل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔ سینہ تھا بھی چار عورتوں جتنا۔

آتے جاتے میں اماں کو چھیڑا کرتے۔

"بیگم بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟"

"ارے تو بیری" عالم فاضل باپ کی بیٹی میری اماں کان پر ہاتھ دھر کر کہتیں گرو ننھے بھائی سے تو چھوٹی کو چیلنج بھیجتے۔

"چھوٹی ہماری ماں سے کشتی لڑو گی؟"

"ہاں ہاں اپنی اماں کو آجائے غم ٹھنڈا کر۔ ارے اگر نہ بادوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا لطفہ ہے تو جا۔ بڑا ناز ہے تجھے اپنی اماں کو۔۔۔" اور میری اماں اپنا غصہ کو بڑے پائچوں کا پاجامہ سیٹ کرنے میں ڈھک جاتیں۔

"پھوپی بادشاہی دادا میاں کنوسے تھا۔ بڑے ابا جان انہیں آمنا سر پڑھایا کرتے تھے۔" ہمارے پرنانا دادا جان نے بھی دادا میاں کو کچھ پڑھایا ہوگا ابا میاں ہمیں کرتے کرتے ٹوک کر کہتے۔

"ارے وہ تھے کاٹھیلے کی میرے بابا اگر پڑھاتا، مجاور کہیں کا۔ ہمارے لشکروں پر رہتا تھا۔" یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ کے رشتے سے حساب لگایا جاتا ہر فرنگ یعنی چغتائی اکبر بادشاہ کے خاندان سے تھے جنہوں نے میری ننھیال کے سلیم چشتی کو پیر و مرشد کہا تھا مگر پھوپی کہتیں "خاک پیر و مرشد کی دم! مجاور تھے مجاور۔" تین بھائی تھے مگر تینوں سے دعا لی ہوئی تھی اور وہ فضہ ہوتیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے انھیں خانات سے فقر اور جھک مذکا کہیں۔ ہمارے بابا گورنمنٹ سرکس میں تھے انہیں غدار، انگریزوں کا نمک حلال کیوں کر مغل شاہی انگریزوں نے ختم کرڈالی ورنہ آج "مرحوم۔ جنگ دال کے کھانے والے جملے جن میرے پھپھے کے جاگیردالی قلعہ میں زیب النسار کی طرح عرق گلاب میں غسل فرما کر کسی لگ کے شہنشاہ کی خلد بریں میں موتیں۔ تیسرے منجھلے بھائی جو ہمارے ہن نیرے کے بعد ماشوں میں سے تھے اور پاپا جی فوجداری مجسٹریٹ تھے جاتی کے گھوان کی حاضری لیتے آیا کرتا تھا انہوں نے بھی قتل کے کئے ڈالے تھے شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے وہ انھیں ڈاکو کہا کرتی تھیں جو ان کے کیریکٹر کے بھلے سے تھے پھپھو لفظ تھا۔

"مگر جب وہ اپنے مرحوم شوہر سے متعلق ہوتیں تو کہا کرتیں "مسز بیگ ڈاکٹر کی نہیں ہوں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں ان کو خبر ہوگئی تو دین دنیا ڈبو دے گا اور کچھ نہیں اگر چھ ماس نے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھما دے ڈاکٹر کو، اس سے بچ گیا تو سمجھا موت کے جیل میں سڑوا دے گا ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بھی بچ گیا تو بلا جو اللہ والا ہے تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ دیکھ مغل بچی ہوا تیری اماں کی طرح شیخانی قبائلی نہیں ہوں۔" مگر میرے پھپھا اچھی طرح جانتے تھے کہ تینوں بھائی ان کی پر رحم کھاتے ہیں اور وہ بیٹھے مسکراتے رہتے وہی میٹھی میٹھی زہریلی مسکراہٹ جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے دوسیاں والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔

ہر عید بقر عید کو میرے ابا میاں بیٹوں کو لے کر عید گاہ سے سیدھے پھپھو اماں کے ہاں کو سدھتے اور گاہیاں سنتے فاتحہ پڑھ کر اپنے کو فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھری میں سے میری جادو گرنی اماں اور اکبر اماموں کو سنتے سنتیں لوگ کر جاکر سویاں کھاتیں گرہ کہیں پڑ رہیں نے بھیجی ہیں۔

"ان میں زہر کا ہیں ملا ہوگا!" ابا چھیڑنے کو کہتے اور پھر ساری ننھیال کے چھیڑے بکھیڑے جاتے۔ سویاں کھا کر ابا عیدی دیتے۔ جو فوراً زمین پر پھینک دیتیں کہ اپنے ساتوں کو دو۔ وہی تمہاری روٹیوں پر پلتے ہیں" مگر ابا چپ چاپ کئے اور وہ جلتے پھپھو بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی۔ بچیوں کو دو آنے دو جا کر عیدی دیتیں۔

"حرامزادو اگر اماں ابا کو بتایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی۔" اماں ابا کو معلوم تھا کہ بچوں کو کتنی عیدی ملی۔ اگر کسی عید پر کسی وجہ سے ابا میاں نہ جا پاتے۔ تو پیغام پر پیغام آتے "نصرت خانم بیوہ ہوگئیں بلوا بھیجا ہوا میرا کلیجہ منہ کو آرہا" بڑے بڑے پیغام شام تک آتے ہی رہتے اور پھر وہ غرور خان بجائی کے کوسنے بڑے گالیاں برسانے آجاتیں۔

ایک دن عید کی سویاں کھاتے کھاتے کچھ گڑبڑ سے ہی دانت کرنے لگا۔ ابا میاں کو اُلٹی ہوگئی۔

"لو بادشاہی خانم کہا تھا معاف کرنا ہم تو چلے" ابا میاں نے کراہ کر آواز لگائی اور پھر پشتم پشت پردہ پھینک چاتی کوٹھی نکلی تھی

باگر شرارت سے ہنستا رہتا کر لئے پاؤں کر سی لوٹ گئیں۔

"تم آگئیں بادشاہی تو لنک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے ورنہ ہم تو آج ختم ہو جاتے" ابا نے کہا۔ نرالے چھپی نے کتنے دنوں کی تھکن دیئے انہیں خطرے سے باہر دیکھ کر بولیں۔

"اللہ نے چاہا بجلی گرے گی، نالی میں گر کر مر توڑ گے۔ کتابیت کو کاٹ دھا دینے والا ہے گا" اور ابا چڑھنے کو انہیں دور چلے بھوتے۔

"بھئی ہماری خاندانی ڈوفیاں گالیاں، بددیں تو اسے بیل تو لنی ہی چاہیئے۔" اور پھپی لاکھلاہٹ میں کہہ جاتیں

"بیل دے اپنی اماں بھینا کو" اور پھر فوراً اپنا منہ پیلے لیتیں خود ہی ہنس پڑتیں "اے بادشاہی بندی تیرے منہ کو کالکھ لگے۔ اپنی بیت آپ پیٹ رہی ہے" پھپی کو اصل میں بھائی سے ہی پیار تھا ان کے نام پر آگ لگ جاتی دیسے کہیں بات کے بغیر اماں نظر آجاتیں لگے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے کچھ نہ کہتیں "بچے تو اچھے ہیں؟" وہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچے اسی برات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے لے کر ابد تک کوستی رہیں گی۔ اماں ان کی بیتیں بھی آنکھیں۔ بھئی کس قدر گھپلا تھا میری دو بیاں خیال میں، ایک بشتے سے میں اپنی اماں کی بہن بھی لگتی تھی اس طرح میرے آپا میرے دولہا بھائی بھی ہوتے تھے میری دو بیاں کو خیال، اماں نے کیا کیا غم نہ دیئے۔ غضب تو جب ہوا جب میری پھپی کی بیٹی سرت خانم غصہ اماں کو دل دے بیٹھیں۔

ہوا یہ کہ میری اماں کی دادی یعنی بابا کی پھپی جب اب دم ہوئیں تو دونوں طرف کے لوگ تیماداری کو پہنچے میرے امول بھی اپنی دادی کو دیکھنے گئے، اور سرت خانم بھی اپنی اماں کے ساتھ ان کی پھپی کو دیکھنے آئیں۔

بادشاہی پھپی کو کچھ درخت تو تھا نہیں وہ جاتی تھیں میرے ننھیال والوں کی طرف سے انہوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے اور پھر نیدہ برس کی سرت خانم کا ایجی سن ہی کیا تھا۔ اماں کے کہنے سے لگ کر سوتی تھیں۔ دودھ جیتی سی آنکھیں آنکھیں تھیں۔

پھر جب میرے امول نے اپنی کنجی شرت بھری آنکھوں سے سرت جہاں کے لچکدار سراپے کو دیکھا تو وہیں کی وہیں جم کر رہ گئیں۔ دن بھر بڑے بڑھے تیمارداری کر کے تھک ہار سو جاتے تو یہ فرمانبردار بچے سرہانے بیٹھے مریضہ کو گھم ایک دوسرے پر زیادہ تکتا رہ رکھتے۔ جب سرت جہاں برت میں تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھاتیں تو نظر امول کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔

دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں زلفی کا پنی گاؤ تکیہ کے سہارے اٹھ بیٹھیں اٹھتے ہی سارے خاندان کے بڑے لوگوں کو طلب کیا جب سب جمع ہو گئے تو حکم ہوا "قاضی کو بلواؤ"

لوگ پریشان کہ بڑھیا قاضی کو کیوں بلا رہی ہے کیا آخری وقت سہاگ رچائے گی کس کو ہم مانے کی ہمت تھی قاضی آیا۔

"دونوں کا نکاح پڑھاؤ" لوگ چکرائے کس دونوں کا، مگر ہر سرت جہاں پٹ سے بے ہوش ہو گریں ادھر نظر امول بھکلا کر باہر چلے۔ چوپڑے گئے نکاح ہو گیا۔ بادشاہی پھپی سناٹے میں رہ گئیں۔

حالانکہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے مگر بڑی بی کے لیے یہی بہت تھی۔

اور پھر جو بادشاہی پھپی کو دورا پڑا ہے تو بس گھوڑے اور کھوا کے بغیر انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ کھڑے کھڑے بیٹی

دلاور کو نکال دیا۔ مجبوراً ابا میاں دلہا بھیا کو اپنے گھر لے گئے۔ اماں تو چاند سی بھابی دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ بڑی دھوم دھام سے دلہن لیا۔

بادشاہی بھوپالی نے اس دن سے بھوپالی کا منہ نہیں دیکھا۔ بھابی سے پردہ کر لیا۔ میاں سے پہلے ہی ناچاقی تھی۔ دنیا سے منہ پھیر لیا۔ اور ایک زہر تھا کہ ان کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ زندگی سانپ کے بھن کی طرح ڈسنے لگی۔

"بڑھاپے پوتے کے لئے میری بچی کو پھنسانے کے لئے سکر کا ناٹک تھا۔"

وہ برابر یہی کہے جاتیں کیونکہ وہ اس کے بعد بیس سال تک اور جئیں۔ کون جانے ٹھیک ہی کہتی ہوں بھوپالی۔

مرتے دم تک بہن بھابی میں میل نہ ہوا۔ جب ابا میاں پر فالج کا چوتھا حملہ ہوا اور بالکل ہی وقت آگیا تو انہوں نے بھوپالی بادشاہی کو کہلا بھیجا۔

"بادشاہی خانم ہمارا آخری وقت ہے دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو آجاؤ۔"

نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے بھابی کے پھیپھڑے اور ہتھیا کے دل میں تڑاخ سے ہو گئے۔ بھلا تی بھابی کو کہتی۔ سفید ساڑی کی طرح بھوپالی بادشاہی خانم اس ڈیوڑھی پر آئیں جہاں اب تک انہوں نے کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔

"بادشاہی تمہاری دعا پوری ہو رہی ہے۔" ابا میاں تکلیف میں بھی مسکرا رہے تھے ان کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں۔

بھوپالی بادشاہی بادھو بالوں کے دبی منی سی کچھ تگ رہی تھیں جو پپنیوں میں جائیوں سے مچل مچل کر باتیں سنایا کرتی تھیں ان کی شیر جیسی خانٹ آنکھیں ایک میسنہ کی معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو ان کی سنگ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"بہن کو سو کچھ ہوتی۔" ابا نے پیار سے کہا۔ میری اماں نے سسکتے ہوئے بادشاہی خانم سے کہنے کی بھیک مانگی۔

"یا اللہ..... یا اللہ....." انہوں نے گڑگڑا چاہا گڑگڑا کر رہ گئیں۔ "یا..... یا اللہ..... میری عمر میرے بھیا کو دے دے..... یا مولا..... اپنے رسول کا صدقہ۔" وہ اس بچے کی طرح جھجک کر رو پڑیں جسے مسجد نہ یاد ہو۔

سب کے منہ سے اماں کے پیروں کا دم نکل گیا۔ یا خدا آج کچھ بھوپالی کے منہ سے بھائی کے لئے ایک کوسنا نہ نکلا۔

صرف ابا میاں مسکرا رہے تھے جیسے ان کے کہنے سن کر سکا دیا کرتے تھے۔

بچے ہیں سن کے کہنے بھائی کو سنیں گے وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

جھوٹی زنجیر

حیات اللہ انصاری

ابھی میں کارخانہ لکھا جاتا تھا اور زیادہ دور کی چیزیں صاف دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ لیکن کچھ سایوں کی حرکتوں اور کچھ شور و غل سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ چند لڑکے ایک آدمی کو لڑنے چھیڑنے کے لئے مکان کو گھیرے کھڑے ہیں اور کچھ لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے۔ جب میں مکان کے قریب پہنچا تو بھیڑ منتشر ہو کر پتنگ لگنے کے لئے سڑک کے دوسرے کنارے کی طرف دب گیا اور درخت کی آڑ لے کر گھورنے لگا۔ لیکن جیسے ہی غصہ کے سامنے میں پہنچا تو دیکھا رام کلی اس سے لگی ہوئی کھڑی ہے اور چھوٹ چھوٹ کر رو رہی ہے۔

میں اس لڑکی کو چار سال سے دیکھ رہا تھا جب میں منھ اندھیرے نہانے جاتا اس کے مکان سے گذرتا تھا تو ایک پتلی سی دھوئیں کی لکیر اس کے صحن سے نکل کر آسمان کی طرف بل کھاتی ہوئی جاتی نظر آتی تھی اور جب واپسی میں ادھر سے آتا تھا تو رام کلی بائیسکل پر جاتی نظر آتی تھی پہلے دو چار مہینے تک تو یونہی آنکھیں چار ہوتی رہیں۔ پھر وہ مجھے سلام کرنے لگی اور میں جواب دینے لگا۔ چھ سات مہینے تک حساب کتاب ایک۔ خدا جانے کب پھر ہونے لگا کبھی میں پہلے سلام کرتا تو کبھی وہ۔ لیکن بات چیت کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ اس کا نام اس طرح معلوم ہوا کہ ایک دن جب وہ بائیسکل پر نکل کر دو چار قدم گلی تھی تو گھر کے اندر سے ایک ادھیڑ عورت بول گئی ہوئی آئی اور اس نے پکارا "رام کلی، رام کلی"

رام کلی کے چہرے پر عجیب طرح کی مظلومیت اور حسرت زدگی تھی۔ اس کی سکاہٹ، اس کی آنکھوں کی چمک، اس کے بدن کا خم، اور گردن کا موڑ غرضیکہ ہر نقش نئی نئی حسرتوں سے بھرا پڑا تھا۔ آج پہلی میں نے رام کلی کو اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا جیسے کبھی کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ تب میں کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے اسی طرح ہچکیاں لیتے ہوئے مجھے ہاتھ جوڑ کر منع کیا۔ میں نے پوچھ کیا بات ہے۔

"مکان خالی کرا رہے ہیں ہمارے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں"

میں بھیڑ کی طرف مڑ گیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عورت تھی جس نے اس دن رام کلی کو پکارا تھا اور جو غالباً اس کی ماں تھی کھڑی چلا رہی تھی اور دوسری طرف دس بارہ لڑکیاں لئے ہوئے مکان کو گھیرے کھڑے تھے۔

عورت — مجھ ایک عورت کے لڑانے سے لڑانے والوں کو کیا ہے۔ سینہ میں جانتی ہوں لوگ کیا چاہتا ہے لیکن یاد رکھو کہ رام کلی —

سینہ ہی نے مجھے دیکھ کر سلام کیا میں بھی اسے پہچان گیا۔ سلام کا جواب دے کر اس کے پاس چلا گیا۔ سب لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے رام کلی کی ماں بھی خاموش ہو گئی اور اس نے بھی مجھے سلام کیا۔

میں نے سینہ ہی سے پوچھ کر کیا معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ آٹھ مہینے کا کرایہ چڑھ گیا ہے اور ڈگری بھی ہو چکی ہے۔ میں نے کہا میں ان لوگوں کو

لکھنا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ یہ بہت بڑی آگ ہے اس لئے مکان خالی کرنا ضروری ہے۔

میں نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ تم نے کریہ کیوں نہیں دیا؟ بڑھیا یہ سوال سنتے ہی آگ ہو گئی۔

"میں نے نہیں دیا! میں نے نہیں دیا! یا اس نے ..... سیٹھ نے لیا نہیں۔ کہتا تھا کہ تم تو میری ماں ہو۔ مجھے ماں کہتا تھا اور میری رام کلی کو بدنظری سے ..... یہیں میں کیا بتاؤں شرمیان ..... میں سمجھتی ہوں اس کی چالوں کو۔ لیکن میری رام کلی تو وہ کنول ہے جو کیچڑ میں اگ آیا ہے کہیں وہ اور کہیں پھلو اسیٹھ۔"

میں نے بات آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے اس کی بات کاٹ کر کہا

میں:۔ "اچھا اب تو کریہ ادا کر دو گی۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ لیکن اتنی رقم ایک ساتھ ....."

"بقایا کی فکر نہ کرو۔"

میں نے سیٹھ جی کا ہاتھ دبا دیا۔ اور اشارے سے کہا کہ اس رقم کی ذمہ داری میرے سر ہے۔ سیٹھ جی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ مگر پھر فوراً نظریں پھیر کر میں۔ ان کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں۔

"اچھا آپ بھی! جب میں نے اس لڑکے کو نظر انداز کر دیا تو سیٹھ جی نے ایک مرتبہ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ کیا واقعی آپ کرایہ دیں گے۔ میں نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

سیٹھ جی خاموشی سے اپنے آدمیوں کو لے کر چلے گئے۔ گھر کے دروازے پر بڑھیا حیرت زدہ ہو کر کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی جاتے ہوئے سیٹھ جی اور ان کے آدمیوں کی طرف۔ اتنے میں رام کلی سسکیاں لیتے ہوئے باہر نکل کر کہنے لگی اور اس نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور کہنے لگی۔

"میں کیا کہوں شریمان۔ مجھ سے کچھ نہیں بنتا۔ آپ نے تو وہ کیا جو اپنے بھی نہ کرتے۔"

اب اس کی آنکھوں میں شکر گذاری کے آنسو تھے۔

رام کلی کی ماں بہت لجاجت سے بولی۔

"شریمان ایک منٹ کے لئے اندر چلئے۔ ایک پان ہی کھا لیجئے۔"

رام کلی بھی اسی لجاجت سے بولی "چلئے"

میں نے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔

رام کلی کی ماں۔ "رام کلی بیٹی۔ ذرا اکر بنڈت سے کہہ کہ ایک گلاس میں چائے لے کر بیٹھک میں آئے۔"

مجھے اس خاطر سے انکار کرتے نہ بنی اور گھر کے اندر چلا گیا۔ دالان میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ کچھ میں چائے رکھے ہوئے تھے۔ پیچھے پیچھے رام کلی تھی۔ وہ بولی "چائے پی لیجئے اور کچھ تکلف بھی کیجئے۔ بڑی مہربانی ہو گی۔"

میں نے چائے کا کپ ہاتھ میں لے لیا۔

رام کلی:۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ کالج میں پڑھاتے ہیں۔"

میں۔ "کیسے جانتی ہو؟"

"ہوا یہ کہ میں نے کرشنا جیا کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا۔"

ظاہر ہے کہ رام کلی کو میرے بارے میں کھوج ہوگی اور اس نے متعدد لوگوں سے پوچھ ہوگا۔

رام کلی کی ماں کہنے لگی۔

"آپ پڑھاتے ہیں۔ آپ ٹرینڈ ہوں گے۔ آپ کے یہاں کے سب لوگ ٹرینڈ ہوں گے۔ اب کیسے سرکار اپنے کاموں کے لوگوں کو ٹرینڈ کرتی ہے اللہ ہی کو سرپرس ہیں۔ کہتی ہے۔ دوسرے سے مطلب نہیں۔ میری رام کلی ٹرینڈ نہیں ہے تو اسے سرکاری سروس نہیں ملتی۔ کیا اندھیر ہے؟"

رام کلی بے چین ہو کر بولی "اماں"

رام کلی کی ماں۔ "اے تو میں کیا کوئی بے تکی بات کہہ رہی ہوں اگر ٹرینڈ ہوتی تو یوں بوشن کرتی گھومتی پھرتی ـــــ ہائے اگر کسی پیاری بچی ہے۔ میں بھی کیسی ماں ہوں۔ میں نے غصے میں تجھ اس نگوڑے سیٹھ کی وجہ سے کیا کیا کہہ دیا ـــــ شریمان جی اس لڑکی میں سب گن شرافتوں کے ہیں مگر آپ کی محبت سے مل جائے....."

رام کلی بہت بے چین ہو کر بولی "اماں"

گھر سے غریبی ٹپکتی تھی۔ لیکن غریبی سے زیادہ سلیقہ۔ ایک چیری کی سستی میز پر اخبار بچھا ہوا تھا اور چار کے ٹوٹے پھوٹے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چھوٹے سے صحن کی دیوار کے پاس بے دھوئیں کا چولھا تھا جس کی چمنی سے دھوئیں کی لکیر اوپر جا رہی تھی۔ اسی سال سوریشی نمائش میں اس چولھے کا سرکار کی طرف سے پرو موشن کیا گیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں شاید کمبخت گوالن نے اس نئی چیز کو اپنایا ہوگا۔ اپنی لڈ چاریں سے ایک یہ ہوگا۔

گھر چھوٹے سے صحن، ایک دالان اور ایک کوٹھری پر مشتمل تھا۔ دالان میں دو چارپائیاں تھیں جس پر تہ کئے ہوئے بستر رکھے تھے۔ ایک گوشے میں مٹکے کی ٹھلیاں اور برتن جھلگا رہے تھے۔ میں نے رام کلی سے پوچھا۔

"مس صاحبہ آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"ہائی اسکول پاس ہوں۔"

رام کلی کے جسم پر صرف ایک چیز ایسی تھی جو میرے مذاق کو کھل رہی تھی۔ وہ تھی ایک بھدی زنجیر جو اس کے گلے میں پڑی تھی۔ اس کے چھوٹے سے گول ڈبیا نما تھی۔ لیکن اس کی بناوٹ۔ بس وہ بالکل دیسی زنجیر تھی جیسی گنتے کے گلے میں ڈالی جاتی ہے۔ صرف گڑیاں بھی تھیں۔

رام کلی کی ماں۔ "حضور ہم لوگ پچھڑے سے آئے ہیں۔ لیکن سرکار نے ہم کو ونیوجنوں کے حقوق نہیں دیئے۔ کچھ آپ کر سکتے ہیں بھائے تو"

رام کلی پھر بے چین ہو کر بولی۔ "اماں"

"تو تو بات بھی نہیں کرنے دیتی؟"

"اماں ـــ اماں۔"

پھر رام کلی مجھ سے کہنے لگی

"پان اور سگریٹ لاؤں؟"

میں۔ "میں سگریٹ نہیں پیتا ہوں۔"

"ابھی جا کر پان لاتی ہوں"

رام کلی یہ کہہ کر باہر جانے لگی۔

میں۔ "وہ پاندان کہیں ہے؟"

طاق پر ایک پاندان جگمگا رہا تھا۔

رام کلی کی ماں:۔ "ہاں ہاں آپی کا پان لیجئے"

رام کلی:۔ "آپ ہم لوگوں کے ہاتھ کا پان ——"

میں۔ (مسکرا کر) میں ہر ہاتھ کو پاک سمجھتا ہوں"

رام کلی نے دوڑ کر دو پان لگائے اور لے کر دیئے۔

جب میں چلنے لگا تو وہ سر جھکا کر میرے پاؤں پکڑنے لگی۔

میں نے کہا۔ "دیکھئے اگر آپ میری نوکری چاہتی ہیں تو آج کی یہ سب باتیں ہمیشہ کے لئے بھول جایئے"

اسی دن شام کو سیٹھ جی میرے گھر پر آئے۔ انھوں نے بہت لمبی تمہید سے بات شروع کی کہ آجکل بازار مندا ہو رہا ہے اور آمدنی گر گئی ہے اس لئے مجبور ہو کر انھوں نے مکان خالی کرانا چاہا تھا۔ اگر آج میں نہ جاتا تو وہ خالی کر دیتے۔ اسی وقت ایڈوانس کرایہ اٹھا لیتے۔ کرایہ دار بھی ساتھ تھا۔ لیکن میری مروت میں آ کر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس تمہید کے بعد وہ مطلب پر آئے اور کہنے لگے کہ ان کو یقین ہے کہ میں ان کے بڑے لڑکے پر جو میری کلاس میں ہے خاص توجہ کروں گا۔ ان کے دوسرے لڑکے کو بھی پڑھا دیا کروں گا۔ اور اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لڑکی ہے اس کے لئے اچھی درجہ کا ٹیوٹر سستے داموں پر تلاش کر دوں گا۔ اور چوتھا چھوٹا کنڈرگارٹن میں ہے.....

ابھی سیٹھ جی چوتھے بچے سے گذر کر پانچویں تک نہیں آئے تھے کہ میں نے ان کو کل رقم کا چیک لکھ کر دے دیا۔

سیٹھ کھسیانے بھری مسکراہٹ سے کہنے لگے۔ "اجی اس کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو کہیں بھاگا جا رہا تھا۔ میرا" پھر زور زور سے انداز میں کہنے لگے۔

"پروفیسر صاحب ان لوگوں سے بچ کر رہیئے گا۔ بڑے خراج کے لوگ ہیں یہ۔ میں نے چاہا تھا کہ ان غریبوں پر کرایہ کا بوجھ نہ ڈالوں اور کرایہ کے عوض رام کلی میری لڑکی کو پڑھ جایا کرے۔ اور رات کو بھوجن بھی میرے گھر کیا کرے حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ ایک عورت کی پڑھائی کی فیس ایک روپیہ ہوتی ہے لیکن وہ لڑکی بس کیا تھا دوں غریب چیز ہے۔ یہی کچھ بے تکی سی ہے۔

اب دیکھئے کہ وہ لیکچر کے یہاں ٹیوشن کرتی ہے اور وہاں سے گیارہ بجے رات کو واپس آتی ہے۔ لیکن میرے یہاں آٹھ بجے کے بعد میری کی طرح رسی نہیں ہوتی تھی بے سمجھے آپ کو حیرت ہوتی کہ بس کر پہیں لڑکے کو پڑھاتی ہے نہ صرف ڈھائی سال بچے ہے۔ اس کو پڑھا اور گیارہ بجے رات کو واپس بڑھائی گئی ہے ٹوٹر اس کے باپ کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ بازار سینما، ریسٹورنٹ بھی جگہ تو دیکھا ہے جمعہ نہان دونوں کو"

میں۔ "اور بچہ اور اس کی ماں"

"ماں کو آپ نے نہیں دیکھا البتہ بچہ ساتھ رہتا ہے لیکن ڈھائی سال کے بچے کا ساتھ ہونا نہ ہونا برابر"

پھر سیٹھ جی ہنس پڑے۔

"پروفیسر صاحب۔ آج تک نہیں کھلا کہ یہ لوگ کون ہیں۔ سٹاکٹر کے مطابق یہ لوگ یہاں آئے تھے لیکن ریفوجیز کے دفتر والوں کا کہنا ہے کہ یہ باہر سے نہیں آئے۔ اس لئے ریکارڈ نہیں ہیں۔ رام کلی جہاں ملازمت کرتی ہے وہاں اس نے اپنے کو کرسچن بتایا ہے اور میرے ہاں جب آتی تھی تو ہندو بن کر آتی تھی۔ ان کا بھی ہندوستان رکھ چھوڑا ہے۔ میری بات مانئے تو ان لوگوں پر زیادہ دیانہ کیجئے گا۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن سے ربط ضبط رکھنا ایک نام لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ دیدان کرنے والوں کے لئے ہم لوگوں نے ایک دو ہی آشرم کھولا ہے۔ جہاں ایسی عورتوں کو لیتا ہوں۔ جو اتھی ہلاکت کی تتی ہوتی ہوں۔ ابھی ایک عورت آئی ہے۔ جو ــــــ

اسی وقت کچھ اسٹوڈنٹ آ گئے۔ وہ شاید سیشن جاری رہتا۔ لیکن ان کی باتیں سنکر میں کھنک ضرور گیا۔ طے کر لیا کہ میں رام کلی کے گھر کبھی نہ جاؤں گا۔

(۳)

میں نے تیسری تفریح کا راستہ بدل دیا۔ پہلے تو یہ راستہ ذرا کھلا اگر پھر اس میں نیا سلسلہ آنے لگا کیونکہ کمپنیوں کی سیدھی سڑک تھی۔ اور آنا جانا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ اس عرصے میں میں نے اپنی جگہ سمجھ لیا کہ رام کلی، اس کی ماں اور ان کے گھر کی بات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

ایک دن میں تفریح سے واپس آ کر سٹول پر بیٹھا تھا کہ آواز آئی "میں آؤں"

آواز کے ساتھ ہی رام کلی اندر آ گئی۔ اس کے بدن پر وہی ساڑھی تھی اور گلے میں وہی زنجیر۔

"چاچا جی میں بے بلائے آ گئی؟"

"آیئے مس صاحبہ"

چاچا کا جواب سن صاحبہ اور آپ سے بلاتا ہے ایسا دھچکا لگا جیسے کسی نے کوئی بال جھٹکے سے اکھاڑ لیا ہو۔

میں نے مسکرا کر کہا "بیٹھو"

وہ کچھ خوش ہو گئی اور کرسی پر آرام سے بیٹھ گئی۔

رام کلی۔ "کتابیں کتابیں۔ ہر طرف کتابیں۔ میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ میں پڑھ لیتی ایسے ہی کاموں میں بتا دوں"

ایک دم وہ چھت کی طرف دیکھ کر چونک سے کھڑی ہو گئی اور پھر کرسی کے پیچھے پر بیٹھ گئی

"اسے یہ کیا۔ یہ زنجیر کیسی؟"

"اس مکان میں بجلی ابھی تھوڑے دن ہوئے لگی ہے یہاں پہلے لیمپ ٹانگا جاتا تھا۔ اس کی یہ زنجیر ہے"

"زنجیر نیچے کی کرسی اوپر کی کرسی کے سہارے اور اوپر کی کرسی کے سہارے ــــ جیسے مزدوروں کا گھرانا ہمارے پڑوس میں بھی ایسا ہی گھرانا تھا۔ مجھے زنجیر بہت پسند ہے۔ یہ دیکھئے میں کیسی ابھی زنجیر بنے ہوئے ہوں ــــ

میں۔ "ہاں میں نے پہلے ہی اس کو دیکھ لیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ آپ کو اس کا بہت شوق ہے"

"اچھا۔ آپ نے میری باتوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ دیکھا ہے ــــ آپ کتنے شریف آدمی ہیں۔ لیکن اب۔ یہ آپ کے جانے کا وقت آ گیا"

میں۔ "جانا تو ہے۔ لیکن ابھی اشنان کروں گا اور پھر کھانا کھا کر جاؤں گا"

"تو آپ میری وجہ سے کسی جلوس میں دیر نہ کیجئے۔ آپ کا روٹی گھر کہاں ہے۔ وہیں کھا لیجئے"

میں غسل خانے چلا گیا۔ وہاں خط بنایا، نہایا اور پھر کپڑے بدلنے کے لئے پاس کے کمرے میں آیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے کپڑے بہت قرینے سے رکھے ہیں۔ میں بٹن بھی لگے ہیں۔ جوتے بھی صاف کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ میں نے مسکرا کر کپڑے بدلے اور کھانے کی میز پر آیا۔ یہاں رام لال ایک پلیٹ میں کچھ نکال رہی تھی۔ دیکھتے ہی مسکرا کر بولی۔

"بدھیہ صاحب میں نے آپ کے لئے کچھ بنایا ہے۔ دیکھئے پرا تو نہیں ہے؟"

میں نے پہلے اسی کی ڈش کو چکھا۔ یہ بھاجی کی ایک میٹھی ڈش تھی جو کالی مرچ کے تھی۔ میں نے تعریف کی اور پوچھا "تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"میں نے کہاں سے سیکھا ہے ——؟"

یہ کہہ کر وہ اس طرح یادوں میں ڈوب گئی جیسے خوابوں کے سنہرے دیس کا سفر دوبارہ تازہ ہو گیا ہو۔

"آپ کو فکر نہ تھا ذاں گی پروفیسر صاحب میرے دل میں کچھ ہیں جو تمنا ہے پہلے اتنی وہ یہ بھی کہ میں مشہ لیفوں کی زندگی تا ذاں اسی لئے جو مجھے پڑھنا بھی اور بہت کچھ سیکھا بھی۔ اس کے بعد اس کی نا زائی بھی گی۔ لیکن فلوس؟"

"اوہ کس بات کا۔ تم تو بہت شریف ہو۔"

"شریف ہوتی تو سیٹھ والی بات ہوتی۔ اں کہتی تھی کہ تو بھی ہے سیٹھ کو پٹایا کیوں نہیں؟"

رام لال کے چہرے پر سخت کرب کے آثار چھا گئے اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ میں دوسروں کا راز اسی وقت پانا چاہتا ہوں جب اس کے لئے کچھ کرنے کا ارادہ ہو۔ میں رام لال کے ماضی کو کریدنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے بات یوں ختم کر دی۔

"پریشان نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔"

کھانے کے کمرے سے اٹھ کر میں اپنے پڑھنے اور لکھنے کے کمرے میں آیا۔ یہاں بھی اور حیرت سے سابقہ پڑا۔

کمرے کی ہر بکھری چیز اٹھا کر سلیقہ سے رکھ دی گئی تھی۔ کتابیں الماری میں جس دی گئی تھیں۔ میز پر اخبار درست کر دیا گیا تھا اور کرسیاں اپنی جگہ پر لگی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک کرسی جس پر بیٹھ کر میں کام کرتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹا کر دروازے کی طرف کھڑکی کے پاس ذرا ترچھی رکھ دی گئی تھی۔ اور اس کے برابر چھوٹی میز لکھنے پڑھنے کے ضروری سامان اور اخباروں سے بھری ہوئی تھی۔

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اوہ رام لال۔ تم نے دس منٹ میں کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ میرے کپڑے درست کر دیئے۔ کھانے کی ایک ڈش بنائی۔ کمرہ صاف کیا لیکن اس یہ کرسی وہاں کیوں رکھ دی؟"

رام لال کے چہرے پر شرارت آ گئی۔

"جب آپ اس جگہ بیٹھے ہوتے تھے تو سورج کے بادل پر دھوپ تھی۔ سر پر کو جب آپ کام سے واپس آئیں گے تو اس جگہ دھوپ نہیں ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ اس کھڑکی کے پاس ہو گی۔ اس لئے وہاں کرسی رکھ دی۔"

سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب تک یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ سر پر کو اس کھڑکی کے پاس بیٹھ کر دھوپ کا مزا لیا جا سکتا ہے۔ رام لال کی محبت اور سوجھ بوجھ سے میں اتنا متاثر ہوا کہ تعریف کے لئے الفاظ تک نہ ملے۔ بس میں نے اس کی حرکات دیکھا، پھر دیکھا، پھر دیکھا۔ رام لال ذرا شرما کر بولی۔

"اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو حکم دیجئے۔ میں دونوں وقت آجایا کروں گی۔"

رام کلی کے بچے ہیں ایسی الجھن کہیں بن گیا۔ اگر سیٹھ جی نے مجھے خبردار کیا ہوتا تو ممکن تھا کہ میں اس ندامت کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا۔

"اگر ضرورت ہوگی تو ضرور بلاؤں گا۔"

"کیسے بلائیے گا۔ آپ تو اب ادھر سے گذرتے بھی نہیں۔"

"لیکن وہ راستہ بند تو نہیں ہے جب چاہوں چلا جاؤں۔"

رام کلی یہ سنکر مرجھا گئی۔ اب کلی تھی وہ۔ ذرا میں بکھل اٹھتی اور ذرا میں مرجھا جاتی۔

رام کلی پہلو بدل کر کہنے لگی۔

"پروفیسر صاحب کو سگریٹ بھی بہت شریف ہوتے ہیں؟"

"کیوں نہیں؟"

"ان میں بعض بہت اونچے گھرانے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی بڑی سجاوٹ کی روایات ہوتی ہیں۔ جن کو وہ نباہتے ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی زنجیر کی کڑی ہیں۔ جس کا سلسلہ دور تک ماضی میں چلا گیا ہے۔ رہن سہن کے طریقے۔ تعلیم و تربیت کی پابندیاں۔ اٹھنے چلنے کے آداب۔ یہ سب پرانے خون کے ساتھ ان لوگوں کو ملے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ نہیں؟"

میں۔ "ٹھیک ہے۔ شرافت کسی قوم کی میراث تو نہیں؟"

رام کلی۔ "میری ماں تو کہا کرتی ہے۔ البتہ گرجا وغیرہ نہیں جاتی ہے۔ اگر میرے مراسم ایسے گھرانے سے ہو جائیں تو کیا یہ بڑی بات ہوگی؟"

"نہیں۔ اس میں برائی کیا ہے۔ لیکن کیسے مراسم؟"

رام کلی شرمائی اور خوش ہوئی۔

"ایسے مراسم جیسے آپ کے ایسے شرافتوں کو ہونا پسند نہ ہوں؟"

میری زبان پر آیا تھا کہ کہہ دوں کہ اس معاملہ میں میری پسند کا کیا دخل لیکن باوجود کوشش کے طوعیت کی اس حد تک نہ آسکا۔

سہ پہر کو میں رام کلی کی بھجائی ہوئی گرسی پر بیٹھا یوں ہی جائے کا انتظار کر رہا تھا۔ رام کلی کی بہن کی ہوئی دھوپ کی لیکن ہر میرے قدموں پر پھیل رہی تھی اور رام کلی کی الجھاؤ اسے میں اپنی خدمت کا موقع دوں کہ رہے میں ابھی تک۔ گو نہ آئی تھی کہ اتنے میں گیٹ کھٹ کی آواز آئی۔ اور کرنے دہ کھولا تو رام کلی کی ماں سامنے تھی۔ اس نے بہت جھک کر سلام کیا۔ اور بیٹھنے کی اجازت لے کر پھر ایک سلام کے ساتھ بیٹھ گئی۔ دیکھنے لگی۔

"آج رام کلی آئی تھی۔ اس کا آنا آپ کو پسند ہو تو میں اسے منع کر دوں۔ وہ غریب لڑکی ہے۔ لوگ اسے بلا لیتے ہیں لیکن وہاں کبھی نہیں جاتی۔ لیکن جو اس کو پسند آجائے تو پھر اس کے لئے خاک بن جاتی ہے۔ سیٹھ جی نے کیسے کیسے بلایا میں نہیں جاؤں گی نہ جانے کے بعد جو اس نے نہیں کی تو پھر ان کی التجا سنی اور نہ میری۔ لیکن آپ کی تو وہ خدمت کرنے کو کہہ رہی ہے۔ میں نے کہا کہ پروفیسر صاحب کی مرضی کے بغیر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں یہ سنکر چپ رہا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں پھر وہ کہنے لگی۔

"مجھے یقین ہے پروفیسر صاحب کہ رام کلی کے گھر بہت جاتی ہے۔ وہاں ایک لڑکے کی تربیت پر مامور ہے۔ لیکن مجھے وہ لوگ پسند نہیں۔ بھلا بتائیے کہ ڈھائی تین سال کے بچے کی تربیت کے لئے کوئی استانی رکھتا ہے۔ پھر وہ لوگ اسے مات کو دس گیارہ بجے تک بیٹھے رہتے ہیں۔ جب کہ بچہ کو سو جانا ہوگا۔ یہ سب باتیں مجھے پسند نہیں۔"

"اس گھرانے میں کون کون ہے؟"

"یہی تو بات ہے۔ میاں بیوی ہیں یا ایک اور۔ اور سب شادی شدہ ہیں۔"

پھر وہ میری طرف التجا سے دیکھ کر کہنے لگی۔ "اگر آپ جھوٹ بھی رام کلی کو منع کر دیں۔ آخر مجھے یقین ہے کہ وہ جانا چھوڑ دے گی۔"

مجھے سیلو نا کی بات یاد آگئی۔ اور یہ خیال بھی آیا کہ اگر میرے کہنے سے رام کلی نے نوکری چھوڑ دی تو مجھے اس کی بہت کچھ ذمہ داری لینی پڑیگی۔ اس لئے میں خاموش رہا۔

رام کلی کی ماں بولی۔ "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کیجئے گا۔ میں اسے احسان سمجھوں گی کہ آپ نے خدمت کا موقع دیا۔"

(۳)

اس واقعہ کے تین مہینے کے بعد میں ایک کام سے پیک اسٹریٹ گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ کاؤنٹر پر رام کلی بیٹھی ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کیا۔ اگر کچھ خریدنا نہیں ہے تو کتاب لے کر ایک طرف جا کر پڑھنے لگا۔ ایک گھنٹہ کے بعد آواز آئی۔

"پروفیسر صاحب آپ چھٹی لے کر نہیں جائینگے؟"

"نہیں میڈم جاؤ!"

"میں میڈم نہیں سکتی۔ یہ میاں کے آداب کے خلاف ہے۔ میں پندرہ روز سے یہاں ایک عورت کی پرستش کر رہی ہوں۔ میں نے وہاں گرسچین صاحب کے یہاں جانا چھوڑ دیا۔ ماں نے کہا کہ آپ کو وہ جگہ پسند نہیں اور مجھے بھی کچھ کھٹک ہو رہی تھی۔ بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کی جو بیوی ہیں وہ ریل سے جا رہی تھیں اور گرفتار ہو گئیں اب الگ ہونا چاہتے ہیں لیکن بچہ ان کے ساتھ نہیں جانے کا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ مجھ سے مل جائے وہ مجھ سے شا ——"

کہتے کہتے وہ بے چین ہو گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ ایک کرسی کے پیچھے پر بیٹھ گئی اور آنسو پونچھ کر بولی۔

"مجھے نہ معلوم ہوا کہ دو لڑکیوں کو اور انھوں نے بھی کہ کر دھوکا کھایا ہے۔ میں میرا بھی پھٹ گیا پھر انھوں نے بہت سمجھایا۔ لیکن میرا دل ہو اکھڑ گیا تھا۔ اکھڑا ہی رہا۔ اب اگر میں یہاں لگ جاؤں تو بہت اچھا ہو۔ میں تو بس ایسی ہی جگہ چاہتی ہوں جہاں عزت ہو۔ مگر یہ لوگ طرح طرح کے سائیکٹ مانگتے ہیں۔"

میری طرف دیکھنے لگی جیسے کچھ اور کہنا چاہتی ہو ——— اتنے میں چپراسی جائے لے آگیا اور اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ وہ چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں ادھوری بات گھٹ رہی تھی۔ میری زبان پر بار بار آیا کہ کہنا چاہتی ہو۔ پر کہہ نہ سکو۔

اس واقعہ کے دو مہینے کے بعد ایک مرتبہ وہ پھر آتی ہوئی میرے نگر آگئی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

"پروفیسر صاحب۔ پروفیسر صاحب!"

میں نے دیکھا تو اب اس کے کپڑے بالکل مختلف تھے۔ وہ ڈھاکہ اور لمبا کرتہ پہنے تھی جس پر چار جیب کا دوپٹہ تھا۔ کانوں میں دو سونے کے پھول تھے۔ اور گلے میں وہی پرانی زنجیر تھی کہنے لگی۔

"پروفیسر صاحب! مسلمان بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ جو شریف گھرانے ہیں ان کا کیا کہنا۔ وضعداری۔ اخلاق۔ دوسروں کی عزت اغیروں کی

دوست چھوٹوں کا لحاظ بڑوں کا ادب۔ شاید میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ میرے والد بھی مسلمان تھے۔ تو جل میں ایک مسلمان گھرانے میں پرورش کر رہی ہوں کیسی پیاری لڑکیاں ہیں ایسی باتیں کرتی ہیں کہ منہ سے بس یہی جملے نکلتے ہیں۔ اسانی کا بڑا ادب کرتی ہیں۔ ان لوگوں میں ذات پات اعلیٰ و نیچ نہیں ہے۔ یہ لوگ بڑی عزت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی کہ تم کو ایک شریف گھرانے میں نوکر مل گئی لیکن تم تو بیرسٹری کی لڑکی کو کیا کرو گی؟"

یہ سنکر رام کلی کے چہرے پر دھواں سا آ گیا۔

رام کلی:۔ "وہ لڑکی۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ کاغذ لاؤ۔ وہ لاؤ۔ یہ سلسلہ ٹکٹ لاؤ وہ لاؤ۔ کسی طرح ان چیزوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ میرے پاس ان سکوں کا سارا ٹکٹ تھا۔ وہ میں نے دے دیا۔ اور کہدیا۔ اب نہ کچھ ہے اور نہ دے سکتی ہوں۔ انھوں نے میری تلاشی لی۔ لیکن مجھے زیادہ افسوس نہیں ہوا کیونکہ یہ جگہ تو مجھے مل گئی۔

دیکھئے میں کام پر آئی ہوں۔

آخری جملے کہتے کہتے اس کے چہرے پر پھر کسی حیا کی سرخی آ گئی۔ اس کے معاملہ میں دخل دینا چاہتا تھا لیکن اس وقت بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"کوئی خط آیا ہے؟"

"جی ہاں ان کا لڑکا۔ وہ بھی بڑا شریف ہے۔"

"دیکھو رام کلی مجھے بہت خوشی ہوتی کہ تم خوش ہو لیکن اپنے پچھلے تجربے کو نہ بھولنا اور ــــ اور ــــ یہ سمجھنا کہ مجھے تمہارا آنا ناپسند ہے تم آیا کرو۔"

وہ خوشی سے اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"اماں تو کہتی تھیں کہ تم وہاں نہ جایا کرو ــــ مگر پروفیسر صاحب آپ کو ہی نہیں دیتا ہیں۔" اس نے اس طرح میرے پاؤں چھوئے جیسے پہلے وہاں چھوئے تھے۔

پھر جذبات میں بھر کر بولی۔ "کاش میں ..... اتنا کہہ کر زبان پر آتی ہوئی بات کو اس نے بڑی کوشش سے روکا اور ایکایک سلام کر کے بھاگ گئی۔

(۴)

میں سمجھتا تھا کہ رام کلی اب ہفتہ میں دو پھیرے تو ضرور لگایا کرے گی۔ لیکن چار مہینہ تک اس کی شکل نہیں دکھلائی دی۔

ایک دن پڑوس جلے اس کی ماں آئی۔ اس وقت وہ لڑکی نہیں بلکہ بڑھیا معلوم ہوتی تھی۔ بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور چہرے کی جھریاں دوگنی ہو گئی تھیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"پروفیسر صاحب رام کلی کی خبر لیجئے۔ کہیں وہ جان نہ دے دے۔"

یہ سنکر میرے دل کو سخت چوٹ لگی۔

"کیا بات ہے؟"

وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ دکھائی نہ دیتی ہے۔ نہ پتی ہے۔ دن رات روتی رہتی ہے اور منھ سے بس یہی کہتی ہے کہ اماں تمہاری وجہ سے مجھے دھرتی ماتا کی گود میں جانے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ میں جب بھی اس سے کہتی ہوں کہ تو پروفیسر صاحب کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی انھوں نے تو تجھے مانے کی اجازت دیدی ہے تو اور رونے لگتی ہے۔"

میں نے کہا "چلو میں ابھی چلتا ہوں۔"

لالٹین کی روشنی میں رام کلی رام کلی تو نہیں اس کا بگڑا ہوا خاکہ لگ رہی تھی۔ نہ وہ رنگ نہ وہ روپ۔ نہ آنکھوں میں وہ چمک اور نہ جسم میں وہ بجلیاں۔ کھٹے کی ہر چیز سوائے گھی کے جو بھر کے اپنی جب گھر چکی تھی۔ کنپٹی پر چاند کے تار کی طرح ایک سفید بال بھی تھا۔ البتہ آنکھوں کی مقناطیسیت اور چہرے کی معصومیت میں کچھ بڑھ گئی تھی۔

گھر میں کئی چیزیں ایسی نظر آئیں جو پہلے نہیں تھیں۔

ایک سجاوٹی لیمپ، ایک تاش جس پر دھول جمی ہوئی تھی۔ ایک کتاب کی الماری اور ایک بہت خوبصورت پنجرا۔ جو خالی تھا لیکن ان چیزوں کے باوجود گھر بہت زیادہ نظر آئی پاکھان خالی تھا۔ لالٹین میں بہت کم تیل تھا اس وجہ سے بتی اونچی نہ کی جا سکی۔ اور رام کلی کے سر میں تیل نہیں تھا جس کی وہ بہت عادی تھی۔

رام کلی مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اماں یہ تم نے کیا کیا ان کو تکلیف دی۔ میں اس قابل کہاں جو دیوتا کا درشن کر سکوں۔ پروفیسر صاحب آپ آ گئے۔ ہائے میں نے آپ کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اور۔ اور۔ اور ٹوٹ گئی۔ پروفیسر صاحب آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔ نفرت کریں گے۔"

میں رام کلی کے پاس بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"روئیں نہیں رام کلی روئیں۔ تم میرے لئے جیسے پہلے تھیں ویسے ہی اب بھی ہو۔"

رام کلی۔۔۔ ہاں نے کہنا سمجھا یا کہ سیدھے راستے چل کر شرافت نہیں مل سکتی۔ اتنی سیدھی بات۔ لیکن نہیں سمجھی تو اب کبھی جب سمجھنے کچھ حاصل نہیں۔"

وہ دیر تک روتی رہی جب آواز باہر آنی تو کہنے لگی۔

"آپ جانتے ہیں کہ اس دن میں کیا کہتے کہتے رہ گئی تھی۔ ہائے وہ اب میں کبھی نہ کہہ سکوں گی اور آپ کبھی نہ سن سکیں گے کاش میں مر جاتی۔ میں کم بخت پاپن۔"

میں نے رام کلی کو دودھ ملٹا کر پلایا۔ اور کہا جب تک تم کو کوئی کام نہیں مل جاتا۔ تم دوپہر کو میرا گھر درست کر جایا کرو۔

رام کلی کے چہرے پر یکبارگی عجب مرجھائی سی تازگی آ گئی۔ میں نے کئی بار میری حالت دیکھ دیکھ کر سر جھکا لیا۔ جب میں چلنے لگا آہستے لگی۔

"آپ نے جاسوسی رسالے کے مجھے مرنے سے روک لیا یہ اچھا نہیں کیا۔"

میرے کالج چلے جانے کے گھنٹہ بھر کے اندر رام کلی آتی اور دو گھنٹے میں سب کچھ درست کر کے چلی جاتی۔ گو کہ میرے اس سے کہا نہیں تھا لیکن وہ خود سے اتوار کو بھی اس وجہ سے نہیں آتی تھی کہ میں گھر پر ہوتا تھا۔ مجھے ملازم سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ رام کلی اب تندرست ہو چلی ہے۔

ایک دن ہیڈ لائبریری گیا تو اتفاق سے سکریٹری صاحب سے ملاقات ہو گئی انھوں سے معلوم ہوا کہ رام کلی کو ملازمت صرف اس وجہ سے نہیں مل سکی کہ وہ میٹرک کا سرٹیفکیٹ نہیں لا سکی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ دیکھو اس نے مجھے کبھی اس سرٹیفکیٹ کے لئے نہیں کہا اور شاید اس وجہ

سے جیسے کہ اگر میں نے بیمار کر دیا تو مجھے شرمندگی ہوگی اور اس کی تو قعات بال ہوں گی۔ اس دن میرے دل میں ایک لڑکی رام کلی کی وقعت بہت بڑھ گئی۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس کے لئے جو بھی کر سکتا ہوں کروں گا۔ لیکن افسوس اس کی نوبت نہ آئی۔ کیونکہ اس دن سے رام کلی کا آنا یک دم بند ہو گیا۔

اس کے نہ آنے سے مجھے بہت تشویش ہوئی۔ اس لئے ایک دن میں ہفتہ ہوا صبح کو اس کے گھر گیا تو دیکھا کہ اس میں تالا لگا ہوا ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ رام کلی کو شہر کے باہر کسی جگہ ملازمت مل گئی ہے اور اب ماں اور بیٹی دونوں وہیں رہتی ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد رام کلی شہر میں آئی تو اسے پڑوسیوں سے معلوم ہوا کہ میں اس کو پوچھنے اس کے گھر گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ میرے گھر آئی۔ دوڑا جاتا بچہ اور گلے لپٹے ہوئے تھی۔ سر پر اجلی چادر تھی۔ جس سے ایک چوتھائی سر ہوا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ کا ایک بڑا سا پلستر کے ٹیٹے میں لپٹا ہوا تھا اور دوسرا سامنے آدھے پلستر کے بھار کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ پرانا غیر پلستر شدہ ہاتھ بھی چمک رہی تھی۔ ادھر ادھر کی باتیں کر کے رام کلی کہنے لگی۔

"راجپوت بہت شریف ہوتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں ان کے گھروں میں مارے جاتے تھے اور ان کی بیویاں چتاؤں پر ستی ہو جاتی تھیں۔ اب بھی یہ لوگ بڑے آن بان کے ہوتے ہیں۔ اور ان کا قول پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ جس راجپوت گھرانے میں کام کر رہی ہوں ان کا سلسلہ نسب ہما بھارت تک پہنچتا ہے اور گیری اور میری۔ ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اور تنخواہ کے علاوہ بھی بہت کچھ دیتے رہتے ہیں۔

پھر وہ بڑے زور سے ہنسی۔

"لیکن وہ یونہی تھوڑے ہی ہے۔ وہ تو بدلا سکوں ہے یہاں سے وہاں تک بچے بچے۔ لڑکیاں۔ لڑکے۔ اتنے۔ اتنے۔ اتنے ہر قد اور ہر سن کے اب بھی یہ لوگ کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔ لیکن ماں ان ہر بیوی کا ہوتا ہے۔ جس کا ہاتھ ایک مرتبہ پکڑ لیا بس پکڑ لیا۔ ان کے یہاں لڑکوں کی بھی بہت مان ہوتی ہے۔ اور نوکروں کے بچوں کی بھی۔

(۵)

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر چلا گیا۔ اور پھر وہاں کچھ کام ایسے پیش ہو گئے کہ چھٹیاں اور بڑھانا پڑیں۔ اس دوران میں رام کلی کا ایک خط آیا جس کے ساتھ ایک چوڑے کی پرچی تھی جو اس نے میرے لئے بھیجی تھی۔ خط میں خیریت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جب میں کافی عرصہ کے بعد واپس آیا تو رام کلی کی فکر ہوئی۔ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ماں اور بیٹی شہر کے باہر ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ ابھی راجپوت خاندان کی ملازمت چل رہی ہے۔

ایک دن اچانک ایک آدمی ایک پرچہ لایا جس میں لکھا ہوا تھا کہ رام کلی ہسپتال میں ہے اور وہ آپ کو بلا رہی ہے نیچے ڈاکٹر کے دستخط تھے۔

میں ہسپتال گیا تو معلوم ہوا کہ رام کلی نے ایک بلند عمارت سے یا تو اپنے کو گرا دیا تھا یا گر پڑی تھی۔ تین دن اس کی حالت بہت خراب رہی پھر بچ ہوا اور اب آخری وقت ہے۔ میں بستر کے پاس گیا تو مجھے دیکھ کر بلندی سے گری ہوئی رام کلی مسکرا اٹھی۔ نقاہت بھرے چہرے پر وہ مسکراہٹ بجلی کی کیر تھی جیسے میرے سوا اور کوئی افسوس ہی نہ کر سکتا تھا ایک۔ بوجھ سی چیز۔

"آپ آ گئے۔ دیوتا لوگوں کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ اب میں جا رہی ہوں۔ ان کو آپ سمجھا دیجئے گا۔ افسوس بے چاری ماں۔ ان کو میری طرف سے بہت دکھ ہی ملا۔ اور اب ان کی ساری زندگی کے لئے ایک ٹیس بن جاؤں گی۔ ان کو بھی خبر کر دی گئی ہے۔ مگر وہ وقت پر نہ آ سکیں:

میں نے کہا، تم بھی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔

رام کلی نے اسے ان سنا کر دیا۔

پھر اس نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اپنے سینے سے ایک بچا کھچا کاغذ نکال کر میرے ہاتھ میں اپنا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو اس پر دو یا تین سطر تحریر میں لکھا ہوا تھا

"میں تم سے شادی کروں گا۔" اس کے آگے چند حرف تھے لیکن اس تحریر میں نہ رام کلی کا نام تھا۔ اور نہ تاریخ اس وجہ سے لکھنے والے کے لئے عدالت کے سامنے حاضر ہونے کے بہت سے راستے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے تحریر پڑھ کر رام کلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اسے وہم بھی نہیں ہے کہ لکھنے والے نے اسے دھوکا دیا ہے۔ رام کلی ہنسنے لگی۔

"میں نے آپ کی نصیحت پر عمل کیا تھا اور یہ تحریر حاصل کر لی تھی لیکن اپنے کو اس تحریر کے قابل نہ بنا سکی ۔۔۔ ہائے ۔۔۔ (ہچکیاں لے کر) میرا من گواہی نہیں دیتا۔ لیکن ہونٹ ہلتے تھے ہلے۔ میں گنگنا پائی:

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہچکیوں کے بیچ میں اس نے کہا

"نہیں۔ سمجھ لیجئے گا کہ میں نسائی خواہش کا شکار ہو گئی۔ میں شکار ہوئی اپنی بزدلی کا۔ خاندانی بزدلی کا جس نے مجھے کچھ نہیں بننے دیا۔ ہائے۔ میں یہ کیوں لگی۔"

"پروفیسر صاحب وہ کمبخت کہتا تھا کہ اس کا قول پتھر کی لکیر ہے گروہ تحریر دے کر مکر گیا اب میں کہاں جاؤں اور تحریر سے کیا بن سکتا ہے جب شہر بھر میں رسوائی ہو چکی۔ میں ایک رات اماں کو سوتا چھوڑ کر نکل بھاگی اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ آگے وہ نہ کہہ سکی

میں نے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں۔ "بیٹی"

رام کلی کے گالوں پر رنگ آ گیا۔ اب کیسل اٹھے اور آنکھیں جگمگانے لگیں۔ اب معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی نے موت پر فتح پائی۔

"کیا کہا آپ نے۔ بیٹی۔ بیٹی۔ بیٹی۔ بیٹی"

"ہاں بیٹی۔ میں نے کہا بیٹی۔ تو ہے میری بیٹی"

"ہائے بابا جی۔ پہلے آپ نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا تھا یہ کہہ دیتے تو میں کیوں در در کی ٹھوکریں کھاتی۔ کیوں اس ذلت کو پہنچتی۔ پھر تو میں آپ کی سیوا میں زندگی بتا دیتی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے تھا سوائے اس کے کہ اسٹیرائٹ گرل پتھر کی ایک کرسی بن جاؤں۔ پھر تو میں لائبریری میں شان سے بیٹھ سکتی۔ پتا جی آپ جانتے ہیں کہ اس نام میری زبان پر کیا تھا جسے آپ کے کانوں سے چرا کے میں بھاگ گئی تھی۔"

"نہیں"

"میں یہی کہہ رہی تھی کہ آپ مجھے بیٹی کہیں"

"پھر کیوں نہیں کہا تو نے"

"کیسے کہتی۔ کیا میں جانتی تھی کہ زندگی کی اولاد کو بیٹی کہنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ جو باپ ہوتے ہیں وہ بھی اپنی بیٹی کو بیٹی کہنا اور کچھ نہیں لوگ بے لذت ہی سمجھتے ہیں۔ آپ کے منہ سے ہاں میں کا لفظ نکالنے میں نے اپنے ہاتھوں سے

میرے دل پر چوٹ لگنے لگی۔ اب کہ میں نے کہا۔

"اتنی اس میں سنہری قدرتی بیری اولادوں میں سب سے زیادہ شریف تو یہی تھی۔ ہائے یہ غم ہمیشہ رہے گا۔ کیا کیا میں نے افسوس"

"نہیں بیٹا جی۔ غم نہ کیجئے۔ مرنے کے آپ نے مجھے جگر کی بنا دیا۔ اب میں شانتی سے رہوں گی۔ مگر یہ بتائیے کہ میرا بچہ؟"

"کیا ہے، وہ تو میرے بھلے کا نکلا ہے"

یہ سنکر اسے کیسی ہنسی آئی ہے رام کلی کے ہونٹوں پر۔

رام کلی۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ وہ زندہ ہے، بتا بھی دیجئے نہ مجھے دکھاتی نہیں ہے جب پوچھتی ہوں تو وہ کہتی ہے کہ بھوت کی بیماری ہے تم کو۔"

ادھر سے سسر گذر رہی تھی میں نے اس سے کہ کہ بچے کو سنگو دیجئے۔ میں ذرا سی دیر سے دکھا دوں گی۔ وہ بچہ گا کر بولی۔

"دیکھئے بھی تا جی ہوں۔ ذرا ڈاکٹر سے پوچھ لوں"

پانچ منٹ میں سسر خوش خوش بچے کو لے کر آئی اور میری گود میں دے دیا۔ وہ انگوٹھا چوس رہا تھا اور اپنے میں سے معلوم ہوتا تھا رام کلی ماتا کے پھول برساتے ہوئے بولی۔

"دیکھئے آپ نے گود لے لیا ہے"

"ہاں بیٹا۔ تم دونوں کو گود لے لیا ہے"

لیکن رام کلی جواب سننے سے پہلے ہی اپنی ماتا بھری نظروں کو لئے سدھار چکی تھی۔ اس وقت چہرے کی معصومیت اور مظلومیت بے پناہ بڑھ گئی تھی۔ اور اصلی ہونی گرتی پر حسرت زدہ نظر جھک رہی تھی۔

میں نے نوزائیدہ کو دیکھ کر اپنے گود کے بچے کو دیکھا۔ اور من میں کہا۔ رام کلی تیری حسرتیں اس سے پوری ہوں گی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہنستے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر میں نے سسر سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ختم سنسکار کا میں انتظام ابھی کرتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا۔ "بچہ کو اپنے گھر بھجوا دوں اگر آپ کی اجازت ہو؟"

سسر بولی۔

"بچہ کہاں؟ وہی ساری پروفیسر صاحب۔ رام کلی کو بتلایا نہیں گیا۔ ورنہ اس کا بچہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا"

فاصلے

باجرہ مسرور

نانی کو عصر وقت پر نماز پڑھنے کی سوجھ رہی تھی ــــ

"بھلا چنگاری تو ہیں، گوشے اور پنگارے نہ سہی ــــ" نانی دروازے کے پاس اکڑوں بیٹھی ستارہ کو بھی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"چنگاری، چنگاری یہاں کہاں سے ٹپک پڑی؟" ستارہ نے بڑے غصے کے ساتھ سوال کیا۔

"اے یہ ایک بات کہیں کر لائی کوئلے کے پاس ایک کیسے چھوڑوں؟" نانی نے جواب دیا۔

"ہو گئی ایاغن دلاہیں؟" ستارہ سمجھ کر بولی۔ ایک ہفتہ ہوا ستارہ نے ڈھنڈورا پٹوایا تھا کہ بھٹی میں برتن بھاڑا ہی نہ پھوٹ جائے جو ٹھیک وقت پر ایاغن پہنچا جائیں گے۔ کہ نہیں ہے تو کراچی والوں کو دھن سمجھ کر وہاں جانے والے یا تو انکار کر جاتے ہیں یا لاپتہ ہی ــــ صحیا غن بھی ایک دم صاحب بہادر ہو گئے ہیں۔

اس تکرار سے دھوم دھڑکے نے ستارہ کو بھی سارا تھکا ان کے لیٹ میں تھا ہی کیا۔ چند کرسیاں اور دو میز ہیں۔ ستارہ کل سے اب تک ان چیزوں کو ہر ہر زاویے سے سجا کر چھوڑ چکی تھی۔ اس پر سے تم بھت دوڑی اور سر پر سوار تھی آخر اس سال سے اس جون کے جوتوں کی دھول چاٹ کر دو منٹ کسی کرسی پر بیٹھ تو سکے۔ بھیجے سے جیسوں مرتبہ ستارہ اس پر بیٹھ کر اٹھ چکی تھی گن گن کر بھی تو نہ بتا سکتی تھی۔ ماموں جان بے چارے کیا کرتے اب ہر بار دیدہ لحاظ کو دھر رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے ٹیبل کے اوپر تختہ جوڑ کر ان کے لیے بھی تو کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا تھا۔ بھیجے سے گئی ہوا ستارہ کو اپنے پیلے جوتوں اور ہری کے سلسلے میں بھی دو چکر لگانے تھے۔ ابھی غدار پیچھے جب دو چار ہی سے پاؤں کی ٹھوکر سے کرسی کے سامنے بے صدا فتیاں دے اپنے جوتے پا انداز پر لگائے تھے غائبانہ سے حال سے کچھ کرنے کی اسی تازہ بہت ہو گئی تھی۔ انہوں نے چند گھنٹوں کے لیے اپنے پر زیادہ چوں چرا نہ کی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اٹھا کر قریب میں پیسے ڈالے بھائی جانوں کی جانے کے خوب ہی تھے۔ اس لیے انہوں نے بقی اب ستارہ کے سوال کا جواب پر توجہ دینے کے بجائے بہتر سمجھا کہ باہر کی میں جا کر اپنے کمبر اتوں کی ایک کمر پٹ (بڑا دسترخوان) جب دو بقی کے ٹکڑے کی دعوت سے ملفوف ہو کر گھر سے ہی ٹوٹے تو بڑی معصومیت کے ساتھ ہر ہر سے مخاطب ہوئے۔

"بقی کا خیال رکھنا" کبھی تو ان کو بھی "دو دو" سے بقی کی طرف جاتے ہوئے لے اور ہر دو چار جوڑوں کی بات ہو تو لے ایک بات کہہ بھی تھی جو تک بڑی اس نے گھر کر میں کی بات دیکھا ہو تو بات ہے بات ہر زمرہ کو کچھ ہے ہے تو میل نے ہنسنے لگا نے اپنے کہ ہے سے ہے پانچ برس کے ننھے کو سنجان کر حاس کا ستہ روک لیا۔

"اے ابھی کہاں چلے آپ پہلے نانی کو سمجھائیے کہتی ہیں لڑکی کو کیسے چھوڑوں" جمیل انصاف طلب انداز سے بولے۔
"اور کیا" ماموں کبوتر کی طرح منہ ہی منہ میں گٹکے۔
"کیا؟" ستارہ یوں اچھل جیسے انگارے پر پاؤں پڑ گیا ہو "صبح سے سمجھا رہی ہوں سب کو سب پتہ ہے آپ لوگوں کو اب آپ بھی پسڑی بدل گئے۔"
ستارہ کا جی چاہا کہ زور زور سے رونے لگے اسے اپنی بہن زہرہ پر بھی غصہ آیا کہ ریاض کو سیدھی دعوت دینے کے بجائے اس نے یہ کیوں کہہ دیا کہ سب لوگ سینما جا رہے ہیں۔
"تم نے کیوں کہی یہ بات کہ سب لوگ جا رہے ہوں گے آخر؟" ستارہ زہرہ پر برسی۔
"تو بات اچھی تھی کہتی کہ وہ سب کے ساتھ آتے اس زمانے میں جب وہ مجھے پڑھانے آتے تھے کتنی احتیاط کی جاتی تھی میں پڑھتی تھی تو ساتھ بٹھائی جاتی تھیں اور اب ــــ جب کہ ــــ بڑا اچھا لگتا" زہرہ مارے شرمندگی کے ہانپنے ہو گئی۔
"ہاں اب زہرہ پڑھانے کے لئے شہر کے اس سرے پر جاتی ہے تو اماں یہاں مچھلی پان کھاتی رہتی ہیں ــــ سنجھلا منہ" ماموں پھر کبوتر کی طرح گٹکے۔
"مگر یہاں بات میں لڑکے کے ساتھ ــــ" نانی بر افروختہ ہو کر کچھ دانت دینے لگیں انہیں یہ یاد ہی نہ رہا کہ ان کا پیسٹار توں اور خیرہ کے جھگڑے سے واقف ہی نہ تھا۔ ماموں پچھین پرس کے تھے اور کیا خود نانی کو ان کے سہرے کے پھول کھانے کا خیال نہ آیا۔ ماموں بے تعلق سے گھومے ہے ــــ
"ارے نانی پڑھے لکھے مرد عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے" جمیل نے کہا یا انداز زہرہ کرے سے ہٹ گئی۔ ستارہ ڈری کہ زہرہ جو اس مشتعل سے اوپر آئی ہے پھر دھاگ کھڑی ہو۔
"پھر جناب خود فرمایئے کہ ابھی ریاض کی طرف سے کوئی شادی کا پیغام تو نہیں آیا، ابھی کیا پتہ، سمجھ اسکول میں انگلش آگیا سمجھائے کہ اب وہ اتنا امیر آدمی ہے ــــ وہ تو میرے نہ مرگیں اس کے میرے اور ستارہ کے دماغ میں یہ بات آتی" جمیل اپنے کندھے پر اپنے بچے کو سنبھال سنبھال کر نکال کر رہے تھے۔
ستارہ پریشان ہو کر زہرہ کے پاس چلی گئی وہ کچھ سوچ سکتی تھی کہ آزادی راستے کے اس مرحلے پر زہرہ کیا محسوس کر رہی ہوگی۔
"میرے سارا منہ خراب کر لیا" ستارہ نے اپنی بہن کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر پڑھا پڑھا "ہر بچے دو، تم تو جانتی ہو نانی کو۔"
"تم کیوں رو گئی جاؤ ستو" زہرہ نے کہا اور اپنے آنسو ستارہ کے آنچل سے پونچھ لئے۔
"اچھا بس ٹھیک ہے" اور ستارہ کو ہمت ہوئی کہ جھگڑا ٹالنے کے لئے اس کی سمجھ میں یہ بات پہلے ہی کیوں نہ آگئی "آپ لوگ جایئے باجی مجھے نہیں جانے دیں گی" ستارہ نے ہی سے آواز لگائی۔
اب نانی کے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ ستارہ نے بے حد مشتاق خوشی کے ساتھ نانی کی ہیلپنگ ہینڈ پکڑ لیں جمیل پرسی جو جمیل کے ساتھ آج سینما میں "نور اسلام" دیکھنے پر مصمم تھیں۔

"لیجئے میں پانچ منٹ میں" ستارہ نے بے صبری سے کہا اور پھر جلدی سے برش اٹھا کر بڑی کو جھاڑ دیا۔ میز پر پڑے ہوئے پرل وان میں کاغذی سفید گلابوں کو پھر ترتیب دیا۔ زہرہ میں بھی جانے کہاں سے حرکت کرنے کی قوت آ گئی اس نے بکھرنے والی میز پر انگریزی ادب کی کتابوں کو سمیٹ کر رکھا اور بالکونی کے پردے کا نیا بن جو ذرا ڈھیلے باندھا تھا کھول دیا۔

ڈریسنگ گئے تو ستارہ بھاگ کر پوڈر کا ڈبہ اور لپ اسٹک لائی اور زہرہ کے چہرے پر پوڈر کی ہلکی سی باداں تہہ جمانے کی لپ زہرہ کے چہرے پر لگاتے ہوئے ستارہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ زہرہ کی جلد پتلے پتلے کھنچ کھنچ جاتی ہے اس کا مداوا کچھ نہ سوجھا تو اس نے زہرہ کے کانوں کے پیچھے ایک ایک لہراتی ہوئی زلف نکالی اور گالوں کے پاس منتشر کر کے چھوڑ دی۔ پھر بھی ستارہ کو کچھ الجھن سی محسوس ہوئی تو بھاگ کر اندر گئی اور اپنے کمرے سے نیلے بلب اور نیلے شیڈ والا لیمپ اٹھا لائی۔ دیوار کی کنجی بجھا کر لیمپ روشن کر دیا۔

اب کمرہ نیلی روشنی میں بہت بھلا لگنے لگا۔ ستارہ کو تو ہری بھری سی نظر آئی، سفید کاغذی پھول نیلے نیلے ہو گئے اور زہرہ کا چہرہ تو بڑا ہی پیارا لگنے لگا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہیں بول رہی تھیں۔ صرف کاؤچ میں کبوتر غٹر غوں کر رہے تھے۔ ستارہ کا بایاں گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔

ڈریسنگ کے پانچ منٹ ہو گئے تو ستارہ نے پوچھا۔

"انہوں نے فون پر اور کیا کیا کہا تھا؟"

"بس یہی کہ وہ مجھ سے ضرور ملنا چاہتے ہیں" زہرہ نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب بالکل صاف ہے، دیکھ لینا وہ شریفہ شادی کا پیغام دیں گے۔" ستارہ نے اس طرح کہا جیسے وہ خود کو یقین دلا رہی ہو۔ زہرہ کا سنجیدہ چہرہ کچھ زرد سا پڑ گیا اور وہ پلکیں جھکا کر رہ گئی۔

"کانی کا پانی تو بنے والا ہوگا، اب تم جلدی سے یوں کرو کہ میسے کی پلیٹ اور سپنر لا کر یہاں بیچ کی میز پر رکھ دو، اور دیکھ پلیٹر کھانے کے لئے دو کانٹے بھی لے آؤ" زہرہ ستارہ کی تجویز عمل کرنے کے خیال سے اٹھی اور پھر دروازے میں ٹھہر گئی۔

"میں کانٹے تو بالکل نہیں لاؤں گی، سچ تم نے ڈوسن سے مانگے" زہرہ آہستہ سے بولی جیسے اسے ستارہ کے پہچان جانے کا خوف ہو "کیوں؟ اس میں بھی کوئی بات نکال لی؟" ستارہ پھر جھنجلائی۔ زہرہ ریاض کے استقبال کی تیاری میں کوئی نہ کوئی ایسی بات پیدا سے کئے جا رہی تھی اور ادھر ستارہ کا یہ عالم کہ اس کا بس چلتا تو وہ اپنی بہن کے کانوں میں تاروں کے جھمکے اور ماتھے پر چاند کا لیکر پہنا کر اسے کسی محل میں بٹھا دیتی، اور پھر ریاض کو بلواتی۔ آخر ستارہ اندھی تو تھی یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی بہن کے دل کو ٹٹول نہیں لگانا چاہتی تھی۔

"ریاض کو سہاگ رات والا گھنٹہ یاد ہوگا۔ ان کا گھر بھی تو سہاگ جیسا تھا اب وہ چوباہیں بن جائیں، میرے تو ان کی وہی یادیں ہیں۔ اگر وہ مجھے اس ماحول میں بھی..." زہرہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔

"اس ماحول میں نہیں؟" ستارہ چونکی "کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں! پہلے گاڑی چھوڑ کر ڈھلان پر بڑھنے لگے تھے نا، تم تو جانتی ہو" زہرہ نے نرمی سے مسکرا کر کہا ــــ ستارہ نے محسوس کیا کہ پہلی بار آج پہلے اور گاڑی والی بات کو زہرہ نے اتنے مزے سے دہرایا ــــ بہت دنوں کی بات تھی کہ ستارہ نے اپنی بہن کو غصہ میں ایک ایسی

اپنی بوڑھی نے تشہیر دی تھی جس کے پہلے سے چھوڑ کر ڈھلوان سے آگے بڑھ گئی اور اپنے خیالوں میں مست رہنے پر تلا رہا۔ اس نے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی پھر ستارہ یہ بھی تو سمجھتی تھی کہ نانی کو اس کے بعد سے زہرہ کو بے پہیوں کی گاڑی سے زیادہ کچھ نہ سمجھتی ہیں وہ اپنی ہتھیلیاں دیکھنے میں مصروف تھیں۔

زہرہ بیٹھ اور خشک میدے کی بیٹیں لانے کے بجائے سکرانی ہوئی باغوں میں چلی گئی اور ستارہ بھی زہرہ کی اسی مسکراہٹ کی لہر میں بیٹی اس کے پیچھے چل دی۔ دونوں باغوں کے سبزے پر کیلیاں کھاکر دور تک پھیلی ہوئی کھلونی میں جھنگالی ٹہنیوں کو دیکھتے رہیں۔ پھر گلی میں سے ایک دو انگوری، ستارہ بچکے کچے پھلنے نانی زہرہ کے لئے پکڑ لیا۔

"کوئی اور ہوگا، ریاض سید حامد اس گھر پر پہنچے گا" زہرہ نے بے اعتنائی سے کہا اور ستارہ پھر اپنی بہن کے اس اقتباد پر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"یہاں گلی میں ہماری باتوں کو چھپتا ہوا کوئی بڑا سا پیسپل ہوتا تو کیا رہتا؟" زہرہ نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"یہاں ہیں سال بعد اتنے بڑے درخت ہوں گے جتنا بڑا پیپل وہاں ہماری گلی میں تھا۔ ہائے کیسا گھنا سایہ تھا، ہمارے آدھے آنگن کو ڈھکے ہوئے تھا، گرمی کی راتوں میں ٹھنڈا ہوا کا جھونکا آتا تو ہتوں کی سیٹی، یاں سی بجتیں، اور ہوا کا شور ٹھنڈا رہتا۔ اور پتے باجی، پچھن میں دوپہروں کو کیسا مزا آتا جب پتے جھڑ جاتے گرتے اور ہم تم ان کے کرکرے کچرے بنا کر اڑانے لگتے۔ نانی کتنا ڈانٹیں کہ دوپہر کو آنگن میں مت جایا کرو پیپل پر بھوت ہوتا ہے۔ مگر تم نے کبھی دیکھا باجی؟" ستارہ کو کبھی بھلے آج کیوں پیپل کی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

"ہاں چاندنی راتوں میں میں نے پیپل کے پتوں پر چراغ دیکھے تھے" زہرہ اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے آہستہ سے بولی۔

"سچ؟ ہائے پہلے کبھی نہیں بتایا تم نے" ستارہ سچ مچ روٹھ گئی۔

"بتانی کیسے، اس زمانے میں تم چھوٹی تھیں" زہرہ نے جواب دیا۔

"ناک کی نہیں۔ تم سے دو سال تو چھوٹی ہمیشہ سے ہوں" ستارہ جھٹ بول پڑی۔

"میں نے بھی وہ چراغ کبھی نہیں دیکھے تھے ــــ ایک دن ــــ ایک دن ریاض نے کہا تھا" زہرہ پھر اسی آہستگی سے بولی جیسے ریشم کے دھاگے سے گرہ کھول رہی ہو!

"کس دن؟" ستارہ نے پوچھا اور شہزے پر سے اپنے ہاتھ اٹھائے۔

"بارہویں والی رات" زہرہ نے دور اندھیرے میں نظریں گم کر دیں۔

"سترہویں والی رات تو ہم کئی بہت سی لڑکیاں تھیں گھر پر" ستارہ ابھی تک چھوٹی بہن بنی تھی۔ "ریاض تھیں کب سے تھے؟"

"وہ آنگن میں کسی سے گھر رہے تھے کہ دیکھو معلوم ہوتا ہے پتے پر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ چراغ سے جلتے بجھتے ہیں ــــ تمہیں یاد نہیں اس رات چاند تھا میں جب سے میں نے ہمیشہ چاندنی راتوں میں پیپل پر چراغ دیکھے" زہرہ نے اس طرح کہا جیسے وہ ستارہ سے نہیں کوئی گہری سوچ رہی ہو۔

اور ستارہ نے الجھن کی لمبی سانس لی۔

"ہائے آپا بس یہ باری تھی۔ میں کبھی بھولوں والا تھا ہوگا۔ یہ ریاض تو سب کے باتوں کے اسے میں نے نانی کا پانی آپ سے آتا نہیں" ستارہ جھڑک کر اندر بھاگی۔

"تو اب ریاض کو پسند کر رہی ہیں" ستارہ نے اندازہ لگایا اور اب وہ دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ ریاض خدا کرے باجی کو پسند کر لیں نسیم

نے شادی کے بعد باجی کو کیسا نظروں سے گرایا۔ کیا سب کے سامنے کہا کہ یہی کوئی عورت ہیں۔ ہائے کیسی بے شرمی کی بات ہے۔ باجی بے چاری تو کچھ پر سوئے روئے اور شرمانے کے کیا تھیں۔ بھی شریف لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ اگر باجی شادی کی رات کو نصیر بھائی کو دیکھ کر شرم سے بے ہوش ہو گئیں تو کیا ہوا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا نصیر بھائی بھی۔ شادی سے پہلے کیا مرتے تھے زہرہ باجی کے نام پر اور باجی بھی تو ان کے نام پر سرخ ہو جاتی تھیں۔ شادی کے بعد یاد نہیں کیا باجی کو نصیبوں نے دق بتا دی۔ اچھی خاصی تھیں۔ دق کا سنتے ہی باجی کے زیور دان کا صندوقچہ کہ جو رکھے رہتے تھے اگر باجی کو پہاڑ پر بھیجا جائے تھے۔ تو پھر آج تک پتہ نہ چلا۔ شاید خود کسی پہاڑ کی گھاٹیوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ تو خر صاحب کا یہ حوصلہ کہاں تھا کہ باجی کو۔ خلاف کے تیز بان کہنے کی ہمت کہاں تھی۔ ان میں اچھا بھلا پتہ ہے کہ ایسے ویسی کس کام کے۔ اے پیاری باجی کہتی نہ تھیں۔ لوگوں نے کہا تھیں سال مرد ہوا پتہ ہے تو شہ خاطر لائی ہو گئی۔ کتنے پیغام گئے ان کے۔ مگر انہوں نے ہاں نہ کی۔ وہ تو ریاض کا احسان تھا کہ خاندان کی اور والدین کے ساتھ باجی کی بھی تعلیم کی جاں لگا گئے تھے۔ ورنہ اگر باجی پڑھنے میں رہ لگ جاتیں تو یہ اتنے بہت سے دن کیسے گزرتے اور کہاں سے آکر اگر باجی لوگ نہ کرتیں۔ گھاس اور خود باجی کو کیا پتا۔ جمیل کی تو خیر میں میرا ہی گزارہ مشکل ہوتا ہے بے چارے ماموں تو بھر آئے آئے ہے۔ اماں جب تک زندہ تھیں دوسری بات تھی۔ وہ تو دنیا میں دو ہی چیزوں کی سب سے زیادہ حفاظت کرتیں۔ ایک تو اپنے جیزی کمان ڈبی گھڑی کی جس نے کبھی وقت نہ بتایا اور دوسرے اپنے بھائی کی جس نے کبھی ایک پیسہ نہ کمایا۔

اس پر سے تانی کا یہ حال! کتنی آڑے کوئی کر رہی تھیں آخر ریاض کے آنے پر۔ ستارہ نے ٹرے میں لالی لالی سجتے سجتے خود کو سنبھالا اور ٹرے اٹھا کر کمرے میں آگئی۔

"باجی تم نے دیکھا تانی کی رنگت نہ تھی کہ ریاض نے کہا تم تو سب پر دم دو اور یہ آنا بھی نہ چاہیں کہ تم بس" ستارہ نے لگے۔ ان میز پر تانی کی ٹرے اٹھا دے لگتے ہوئے زہرہ سے شکایت کی۔

زہرہ آرام کرسی پر چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی اس نے کوئی جواب نہ دیا ستارہ نے دیکھا کہ وہ کچھ ایسی کیفیت میں تھی جیسے سوتے میں آنکھیں کھل رہ گئی ہوں۔ ستارہ نے ہوائے اہتمام سے اس کی ناف کے گاؤں پر کھلائی تھیں وہ پھر آنکھوں کے پیچھے پہنچ گئی تھیں اور کاجل کا نالہ پھیل گیا تھا۔

"باجی ــــ باجی ــــ اللہ تمہاری قسمت پھوٹے گا" ستارہ کو ایک دم احساس ہو کر سامنے ناچ رہے ہیں۔

زہرہ جیسے ایک دم جاگ پڑی۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو مجھے میں کوئی قسمت کا کٹورا لے کر کچھ مانگنے جا رہی ہوں ریاض سے؟" زہرہ نے بڑے اچنبھے سے غرور کے ساتھ ستارہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ اور ستارہ کا جی چاہا کہ دوڑ جائے۔ اس کی بہن جیسے اس سے الگ ہو کر سوچتی۔

"ہاں میں دعا کر رہی ہوں کہ ریاض ــ" ستارہ بھی جھجکی۔

"بس! ریاض نے مایوں والی رات مجھے ایک دعا دیا تھا؟" زہرہ پھر اپنی مسکراہٹ جیسے ریشم کے اٹھائے کی گرہ کھول لی ہو۔

ستارہ کو ایک دم دھکا سا لگا

"تو ــــ تو تمہیں پڑھا لکھنے کی بات انہوں نے تم ہی سے کہی تھی نا ــــ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی ــــ میں تمہاری دشمن ہوں" ستارہ تقریباً چیخ پڑی ــــ اتنے عرصے تک یوں اندھیرے میں رہنے پر اسے صدمہ ہوا کہ باجی آنے سے قبل تک جب تانی زہرہ کا ذکر دعا سے کرنے کی بات کرتیں اور زہرہ انکار کرتی تو تانی چلا کر کہا کرتیں۔ اس کے آگے کوئی اشتہار وہ مکمل نہ کرتے تھے ــــ مگر برسوں سے یہ فقرہ نہیں دہرایا گیا تھا مگر ایک ستارہ ہی تو تھی جو ہمیشہ کہتی۔ اے اتنے سے مرد کو اس خیال سے دیکھتی کہ یہ باجی کے لئے گیا ہے گا ــــ پھر جب وہ دن آئے ریاض اور جمیل کی ملاقات

اچانک کہیں راستے میں ہو گئی آپ ستارہ ہی تھی جسے ریاض اور زہرہ کی جوڑی نکالنے کا خیال سوجھا اور گھر میں سب کو اسی نقطہ نظر سے سوچنے پر مجبور کر دیا پھر اسی نے زہرہ کی ریاض سے فون پر بات کرائی اور یوں اسے گھر بلایا ــــ اس سب قصے میں زہرہ نے اس بات کی ستارہ کو ہوا تک نہ لگنے دی کہ نعیم سے شادی سے پہلے ہی ریاض سے وعدے ہو چکے ہیں۔

ستارہ کو زہرہ کے معاشقے کی داستان بے دلی سے کرسی پر بیٹھ گئی جیسے اب اسے کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

زہرہ جو ابھی تک پھر پہلے والا میں گئے ہوئے سوکھے پتے کی طرح چرمرا کر سرخ ہو گئی تھی اب پھر راکھ کی طرح پرسکون ہو گئی۔

"میں تمہیں کیا کیا بتاتی تیری ستر ــــ تمہیں یاد ہے اسی دن مجھے زرد کپڑے پہنائے گئے تھے اور تم نے میرے ہاتھ پیروں پر مہندی لگائی تھی۔ مائے کتنی رونک ٹھونک کی تھی۔ تم سب نعیم کا نام لے کر مجھے چھیڑ رہی تھیں اور مجھے شاکر تم سب ریاض کا نام لے رہی ہو۔ میں اس بات میں الجھن بن گئی تھی" زہرہ جیسے پھر خواب میں بولا رہی تھی۔

"اچھا تو اسے اس لئے ریاض کے بچوں کو اپنے مدایوں والے کرنے میں اڑھا چلتا کر سلایا تھا تاکہ نعیم رات تک جائے اور اس طرح ریاض بھی" ستارہ کو وہ عورتوں کے مختلف مشغلوں اور کشادہ محلوں والا دالان یاد آ گیا جہاں ایک کونے میں پردہ ڈال کر زہرہ کو یوں بٹھایا گیا تھا۔ لیکن وہ پردے اور اس کے بعد برآمدے کے دروں پر پڑے ہوئے موٹے موٹے ٹاٹ کے پردے بھی اس کی بہن کو نہ روک سکے۔

"جب تم سو گئے میں چپکے سے باہر آنگن میں آ گئی ــــ میں جیل کے اندھیرے سایہ تلے بیٹھی رہی دیواروں پر لیمپ جلتی چاندنی تھی ستو، کہ رگ رگ میں اتر جائے" زہرہ کہتی رہی۔

(ستارہ کے جسم میں تھرتھری سی آ گئی یہ وہی تھی جسے وہ ایسی گاڑی کہا کرتی تھی جس کے پہیے سے چھوڑ کر ڈھلانوں سے اتر گئے ہوں)

"میں چپ چاپ بیٹھی رہی اور کانپتی رہی ستو" زہرہ کہے گئی

"ہاں اس رات سردی بہت تھی" ستارہ نے جیسے کوئی ٹھنڈے پہلو سے ٹھکیلنا چاہی۔ آخر ستارہ چھوٹی بہن بھی تو تھی۔

"مجھے سردی بالکل نہ لگی میں تو تپ رہی تھی مگر ریاض نے مجھ سے کچھ نہ مانگا۔ میرے قریب بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ میں دیکھتا رہا، ستو اس وقت مجھے پتہ چلا کہ میں بہت حسین ہوں ایسی ٹپ صورتی جسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ مگر میرا جی چاہا کہ یہ فاصلہ ٹوٹ جائے ــــ مگر وہ فاصلہ نہ ٹوٹا ــــ پھر جب نعیم نے وہ فاصلہ سینا چاہا ــــ تم جو گئی نا ــــ نعیم تھک کر بھاگ گیا۔ حالانکہ اس رات ریاض نے مجھ سے ایک ہی بات کہی تھی۔ ایک ہی وعدہ لیا تھا" زہرہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"ریاض نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں نعیم سے محبت کروں گی" زہرہ نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا

"اور تم نے وعدہ کیا تھا؟" ستارہ نے بمشکل حلق سے آواز نکالی۔

"میں نے اس سے کہا تھا "اچھا" مگر جیسے ہی تو یوں لگا جیسے میں نے ریاض سے ہی محبت کرنے کا وعدہ کیا ہے" زہرہ نے اپنے سر کو کرسی کی پشت پر یوں اطمینان سے ٹکا لیا جیسے وہ کانچ کا نازک مجسمہ ہو ــــ ستارہ نے اس لمحے اپنی بہن کو اتنا خوب صورت لیکن اتنا بے بس دیکھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں ــــ

"تو پھر باجی! جب ریاض کا خط ملا تھا تو تم نے نعیم کو کیوں ــــ میرا مطلب ہے ــــ ریاض نے تمہیں کوئی سال بھر پڑھایا تھا" ستارہ نے اتنی نرم اور مدھم آواز میں پوچھا جیسے سے کسی کی نیند ٹوٹ جانے کا ڈر ہو۔

"بے ریاض سے کچھ بعید نہیں کچھ تصور میں نہیں کیسے سمجھاؤں" زہرہ نے بیماروں کی طرح اپنا سر کسی کی پشت پر ڈھلکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ "یہ تو ایوں والی رات سے دو دن پہلے کی بات ہے۔ تمہیں یاد نہیں کہ تم پڑھائی کے دوران میں بس کر بیٹھ گئیں کہ اب تمہیں نعیم بھائی پڑھائیں گے۔ مجھے ایسے مذاق ہمیشہ بُرے لگتے تھے یوں لگتا کہ دو آدمی ہاتھ پکڑے جا رہے ہوں اور کوئی بیچ میں سے کندھا مار کر گذر جائے ــــ میں اس مذاق پر رو پڑی تھی نا؟" زہرہ یاد دلانے لگی۔

"ہاں تمہیں تو میری باتیں ہمیشہ بُری لگتیں۔" ستارہ بڑبڑائی۔

گو زہرہ تو اس وقت دور بہہ رہی تھی۔

وہ تمہیں ماموں نے آواز دی تھی نا ــــ جب تم چپ گئیں اور میں گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے روتی رہی ــــ تب۔ تب ریاض نے میرا سر آہستگی سے اٹھایا اور پوچھا تم کیوں رو رہی ہو؟ تب تک گاڑی سیدھی پڑی جا رہی تھی۔ جب میں نے آنکھیں اٹھائیں تو مجھے لگا ــــ مجھے لگا میرے اور ریاض کے بیچ میں جو فاصلہ تھا اس کے اس پار میری روح میرا جسم ایک دم مچھتری کی طرح نہ ہو کر سمٹ گیا ہے۔ تم نے بہتے پانی میں کبھی ہاتھ ڈالے ہیں؟ تم کچھ ڈوبنے کچھ ابھرنے کی کیفیت کو جانتی ہو ــــ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں تو اس کے لئے رو رہی تھی؟"

"پھر ــــ؟" ستارہ کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے قریب جیسے کوئی بلی، کوئی گدگدی سی شے لگ کر بیٹھ گئی ہے۔

"پھر تم آ گئی تھیں نا۔" زہرہ نے جیسے شکایت کی۔

"اب آ رہ گئے، میمونہ رہ گئی" ستارہ میمونہ کا نام لیتے ہوئے کچھ سہمی ہو گئی اور اس سہمی کو محسوس کر کے وہ بالکونی میں چلی گئی اسے ایک عجیب سی کوفت ہو رہی تھی۔ دو دن سے وہ زہرہ اور ریاض کی جوڑی توڑنے کے لئے جو تدبیر سوچ رہی تھی زہرہ نے اس سب کو یوں بنا ڈالا۔ جیسے کوئی مکھی کے پھیلے ہاتھ پر روپیہ رکھے اور اندھا کہے یہ تو کھوٹا ہے۔

"اگر ریاض نہ آئے تو" ستارہ کے دل میں یہ خیال عجیب انداز سے ابھرا اور پھر جب اس نے زہرہ کی ذہنی سسکیاں سنیں تو کمرے میں ایک سہمے سہمے کی طرح لوٹ آئی۔

"ارے تم نے تو سارا چہرہ خراب کر لیا۔" وہ بھاگ کر پوڈر کا ڈبہ اٹھا لائی۔ زہرہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"وہ مجھے برسوں پہلے پسند کر چکا ــــ مجھے یقین ہے۔" زہرہ نے جیسے خود کو یقین دلانا چاہا۔

"تو میں کب کہتی ہوں کہ اب پسند کرواؤ گی" ستارہ نے زبردستی اس کا چہرہ اٹھا کر پوڈر کی تہہ جمانا چاہی مگر زہرہ نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور روتی رہی۔

دس بج گئے۔ زہرہ اور ستارہ نے بیک وقت پرانے کلاک کی ٹن ٹن پر ادھر دیکھا اور زہرہ نے آنسو پونچھ لئے۔

"میں اس سے کیسے مل سکوں گی" زہرہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آنسو پونچھے اور ستارہ کو احساس ہوا کہ اگر ریاض نہ آیا، تو اس کی بہن پاگل ہو جائے گی۔

"میاؤں" پڑوس کی بلی سے بلی دہم سے ان کی بالکنی میں کودی مگر دونوں بہنوں میں سے کسی کو اماں کی ہدایت کا خیال نہ آیا۔ پھر یہ ڈیوٹی تو ماموں زہرہ کے سپرد کر گئے تھے ستارہ کو حق تھا کہ وہ ریاض کے بارے میں سوچنے لگے۔ ریاض جس کے لئے اس کی بہن مر رہی تھی وہ جو اس لئے بھی تین پیسوں کا باپ تھا اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود جس کے تینوں بچوں کے سر خسرے سے بچتے رہتے، اور ریاض جس کی بیوی میمونہ جاہل تھی مگر وہ خو

تعلیم نسواں کا زبردست حامی تھا۔ خاندان کی لڑکیوں کو ہمیشہ پڑھنے میں مدد دیا کرتا تھا۔ وہ جب اس کی زہرہ باجی کو بھی پڑھانے آتا تھا اس کی طبیعت کھلتی کرنے کے لیے ہنسی مذاق کرتا رہتا تھا۔ زہرہ باجی سے اتنی تخلیقت سے برتاؤ کرتا کہ کسی کی ہمت اس کے سامنے ٹھہرانے کہنے کی نہ پڑتی ۔۔۔ اور زہرہ جب پوری طرح اس کی شاگرد بن گئی تو اس نے بہت کہنے کی وجہ سے جنبلی اڑانا چھوڑ دیا تھا۔

اور ستارہ اب جس کی موٹر کی آواز سن رہی تھی، جس کی زہرہ اب اپنے ہاتھوں سے جلدی جلدی اپنے چہرے پر پاؤڈر لگا رہی تھی۔

اپنے پجاری کجاری نہ ہوں کی آواز سنتی ہوئی ستارہ جیسے خود بھی کسی کے عالم میں دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔۔۔ اور پھر اس کمرے سے پچھلے کمرے میں جہاں وہ جمیل اور اپنے بچے کے ساتھ رات گزارا کرتی تھی۔ وہاں سے نکل کر سامان کی چھوٹی سی کوٹھری میں آئی جیسے وہ اپنے اس ارمان کو کسی اور کمرے میں چھوڑ کر دھوکے سے بھاگ جانا چاہتی تھی کہ وہ بھی وہاں تک اس کے پاس پہنچ سکتی۔

ستارہ سامان والے چھوٹے سے کمرے میں اس حیال کے پلٹے ہوئے بستر پر بیٹھی رہی جہاں اس کی ساس اور جان کے پاس بار بار محمد جھنجھلاتے ہوئے آتے تھے۔ ایک دم اس کے چہرے میں اسے یہ ساری صورت حال مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ تو اور اس کی بہن زہرہ اور یاض میں۔ "نور اسلام" دیکھتے ہوئے بات کی یہ بات جاتی ہیں۔ ماموں بھی کسی ایرانی ہوٹل میں بیٹھے جانے کی ہر پیالی کے بعد مطمئن حالت ہونے کے انتظار میں ہوں گے اور انہیں یقین ہو گا کہ زہرہ کبھی کسی کے پاس بیٹھی اپنی شادی کی ٹرائل کر رہی ہوگی۔ اور جمیل سوچتے ہوں گے کہ جانے بے چاری زہرہ ریاض جیسے امیر آدمی کو بھا بھی سکے یا نہیں؟

ستارہ اندھیرے میں ہنسی ۔۔۔ "زہرہ اور ریاض کیا کر رہی ہوگی؟" اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ کر سوچا۔ اور اسے یاد آیا کہ زہرہ بچپن میں بھی اپنے حصہ کی مٹھائی اور کپڑا چھپا کر رکھ دیا کرتی تھی۔ جب ستارہ اپنے حصہ کی مٹھائی ہضم کر جاتی اور کپڑا پہن کر میلا بھی کر لیتی جب زہرہ کہیں سے اپنی چیزیں نکال لاتی۔

"ارے" ستارہ مکا بلا کر رہ جاتی۔

"میں رکھ چھوڑتی ہوں" زہرہ جواب دیا کرتی۔

ستارہ زہرہ کے اپنی پٹاری میں سے کیا کچھ نکال کر ستارہ کو چڑا دیا تھا ۔۔۔ حتیٰ کہ میوہ کے دن تک کو اپنی پٹاری میں بند رکھا اور زمانے بھر سے وہاں وہاں کرتی رہی۔

ستارہ نے ماموں کا بستر کس پر سے گرا لیا اور کس پر مرٹھا کر لیٹ گئی کہ اگر اس نے بیٹھے بیٹھے زہرہ اور ریاض کے بارے میں سوچا تو رو پڑے گی ۔۔۔

"اوہ، کتنا وقت ہو گیا، جمیل تکیے کو اٹھائے اٹھائے میری ہی طرح آرزو کے پہلو میں بیٹھے "نور اسلام" دیکھ رہے ہوں گے۔ بھیا کا کیسے ہوئیں گے وقت پر ۔۔۔ اور ریاض کو بھی تو آنی ہو جائے ۔۔۔ اور جمیل ۔۔۔"

ستارہ کے ذہن میں ایک کھنڈر سا بچا ہو گیا جو چیز بھی اس میں پڑتی چکرانے لگتی۔

وہ دن بھر میں بہت تھک گئی تھی ۔۔۔

اندھیرے میں ستارہ نے اپنا ہاتھ ٹٹول کر فرش پر پھیلا دیا اور پھر اس نے فرش پر اپنی انگلیوں کو عجیب انداز سے مروڑنا جیسے نت کر رہی ہو اسے لگا کہ اس کی انگلیاں بڑی خوب صورت ہیں۔ اس نے آہستہ سے بڑی نزاکت سے اپنا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔ مگر یہ ہونٹ اس کے اپنے ہی ٹھنڈے تھرتھراتے ہاتھ پر گر گئے۔ اپنے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اس کے رہے ۔۔۔ وہ کتنا اپنے کے اس عیب سے اچھی تھی ۔۔۔ دراصل وہ دن بھر کے کاموں اور بھاگ دوڑ سے تھک گئی تھی ۔۔۔

وہ دھیرے دھیرے نیند کے بھنور میں ڈوب گئی ۔۔۔ پھر اس نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے مکھڑے والے پرانے گھر میں ہے اور پیپل کے نیچے روز ہی ہے۔ ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی تو دیکھا زہرہ دروازے کی چوکھٹ سے لگی سسکیاں بھر رہی ہے اور کمرے میں روشنی ہے۔

"کیا ہوا باجی؟" ستارہ کو اپنے لہجے کے اشتیاق پر خود شرم آ گئی اسے لگا کہ وہ بھی اپنی ہونہار ننھی کی طرح ہو گئی ہے جنہوں نے ستارہ کی جمیع اس سے کرید کرید کر باتیں پوچھنا چاہی تھیں۔

"کچھ نہیں۔ میں اب شادی نہیں کر سکتی۔ کسی سے بھی نہیں۔" زہرہ سسکتے ہوئے بمشکل بولی اور ستارہ کا دل غوطہ سا کھا گیا۔

"تو کیا ریاض نے ۔۔۔ تم ۔۔۔" ستارہ ایک دم ذہنی دار قسم کی بہن بن گئی۔ "بچے بتاؤ کیا ہوا، میں اسے گولی مار دوں گی خدا کی قسم" ستارہ کا خون کھول گیا۔

مگر زہرہ نے اسے کچھ نہ بتایا، بلکہ وہ یوں ہی سسکتی ہوئی اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

اماں کے دروازہ کھٹکھٹانے پر ستارہ بجلی روشنی اور تبا کو کی بڑے بڑے ہوئے کمرے میں آئی ۔۔۔ ستارہ نے سوچا کہ اب اسے ریاض کے بارے میں سوالات کے جواب دینا ہوں گے اور اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"بی آ نہیں آئی تھیں؟" اماں نے پہلا سوال کیا، ستارہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اں، مجبور تو نہیں لے گئی؟" اماں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"معلوم نہیں" ستارہ نے بے تعلقی سے کہا اور اماں گھبرا کر باہر میں چلے گئے۔ ستارہ نے نیک بچیوں کی طرح ان کا اپنا ہوا بستر اٹھا کر باہر میں پہنچا دیا۔

ستارہ کی سمجھ میں نہیں آیا اب کیا کرے، پھر وہ زہرہ کے کمرے میں آ گئی دو یوں آنکھیں بند کئے پڑی تھی جیسے اس کے سارے کپڑے بی کھا گئی ہو۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی باجی" ستارہ اس کے پائنتی بیٹھ گئی۔

"میں شادی نہیں کر سکتی" زہرہ جیسے کہیں اور پہنچ گئی۔

ستارہ نے زہرہ کی نقاہت میں ایک عجیب سا حسن دیکھا ایک عجیب سی سنسنی محسوس کی، پھر اسے پلنگ زہرہ سے نفرت ہو گئی شاید اس نے پھر اپنی پٹاری میں گھسیٹ کر رکھ دیا۔

"جہنم میں جاؤ" ستارہ مسہری سے پٹخ کر اٹھی اور صحن سے اٹھ کر بجلی روشنی میں اپنے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ کرسیوں پر سے کتابیں اٹھا کر دی پر پھینکے اٹھا دی گئی۔ جب جمیل اور نانی آئیں تو وہ سو رہی تھی ۔۔۔ گرمیوں کو تو وہ جاگی۔ نانی اور جمیل نے ادھر سوالات کے اس کا ناک میں دم کر دیا ۔۔۔

"بچے نہیں معلوم کیا ہوا اور چلی گئی، باجی کہتی ہیں کہ وہ شادی نہیں کر سکتیں" ستارہ نے ایک ہی جواب دیا۔

وہ دسی تو میں کہوں شریف زادیاں کہیں ایک مرد کی صورت دیکھ کر دوسرے کا منہ دیکھتی ہیں" نانی نے ان دونوں کے اندر پیدا اطمینان کی سانس لی، ستارہ انہیں یقین دلانے جا رہی تھی کہ وہ دونوں مرد ایک دوسرے کو پٹخ کر ہی شمل مدتوں سست گزار چکے۔

اور ستارہ کا بھی چار شریف زادیوں کے تعلقہ کے سلسلے میں گالیاں بکنے لگے ۔۔۔ گالی دیکھ سکی اس لئے بے دریغ وہ گالی سے لڑ پڑی

کریسے دوپٹے میں گھونگھٹ نکالے آئی ہیں۔ حالانکہ دوپٹہ پہلے سے سر پہ سجا ہوا تھا۔

"بیاہ کے پاس دولت ہو گئی ہے نا" وہ باجی کو کیسے پتہ کر سکتا تھا" باجی کے سامنے نہ کہنا ۔۔۔ بے چاری!" جمیل نے فیصلہ دیا اور ستارہ اس سے بھی بے تحاشہ لڑ پڑی۔

"بڑے کہ بے چاری کہنے والے" مگر وہ کسی کا منہ کیسے بند کرتی وہ خود کچھ نہیں جانتی تھی۔ زہرہ صبح سے اسکول جا چکی تھی۔ ستارہ سب سے ناراض، زندگی سے بیزار اور اپنے ننھے گرے تمام ان پتہ نہیں کب کب کی سہیلیوں کے گھروں میں گھومتی پھری، اس کا غصہ کھانا پوت جیا تھا، جو روٹھ کر ہمیشہ گھر سے بھاگتا ہے وہ اپنی بہن سے ناراض تھی اور اس طرح وہ سبھی کو پریشان کر رہی تھی۔

"مات کھٹیے، وہ گھر آئی" تو جمیل اسے ڈھونڈنے نکل چکا تھا وہ جانتا تھا کہ جب ستارہ اس سے لڑائی تو اسے سہیلیوں کی یاد ستانے لگتی۔

"کھانا کھا لو" نانی نے خوشامد سے ننھے کو اٹھایا "بے چاری سمجھ رہی تھیں کہ ستارہ دوپٹہ چھوٹ جانے کی وجہ سے ناراض ہے۔

"ستو! یہ کیا حرکت تھی" جمیل بے چارہ شام سے پریشان ہے۔" زہرہ اپنی مخصوص مدہم چال سے اس کے قریب آئی مگر اس نے زہرہ کا ذکر بھی نہ سنا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو؟" زہرہ نے بڑے درد کے ساتھ سوال کیا۔

"میں تمہاری کون لگتی ہوں، کس حق پر ناراض ہوں گی" ستارہ نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا اور باجی میں نکل آئی۔

"کھانا، گڑیا پیتہ، گڑیا نے کھیارے کری" اس نے مجھ کو گھاس دی، گھاس میں نے گیا گڑیا کو دی، گیا نے دودھ دیا، دودھ کی میں نے کھیر پکائی، بیا آئی کھا گئی ۔۔۔" نانی لمحہ لمحہ کر ستارہ کے ننھے کو اپنے پیروں پر بٹھائے جھلا رہی تھیں۔

ستارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کو بھی اپنی ساری محنت کا یہی انجام معلوم ہوا۔

"تم جمیل کا انتظار کر رہی ہو؟" زہرہ نے اس کے قریب آ کر باجی کے کٹہرے پر کہنیاں جما دیں۔

ستارہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کل اس وقت مجھے بھی انتظار تھا۔ مگر وہ نہ آیا ستو! مجھ پر غصہ کرنے کے بہانے ۔۔۔"

ستارہ کو لگا کہ وہ حیرت کے جھٹکے سے نیچے گر پڑے گی۔ وہ ایک دھکے سے سیدھی کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی انگلیاں باجی کے کٹہرے میں پیوست کر دیں۔

"ہائے اللہ وہ کون تھا رات کو؟" ستارہ کی اپنی بہن کوئی الف لیلوی کردار معلوم ہوئی۔

"میں اسے مار ڈالوں گی" زہرہ نے دھیرے سے کہا "ستارہ دم گھونٹ رہا ہے گی۔" اس نے یوں مزے لے لے کر چٹخارے کھائیں اور ساری گالی پی گیا، جیسے یہ بہت اہم کام ہو، پھر وہ آج کل کے نوجوانوں کے سے سر پٹخنے میں مقابلے کی دوڑ کی وجہ سے پریشان ہوتا رہا ۔۔۔ بچے سے پہلے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔"

"اور تم نے مجھے بھی نہ بلایا" ستارہ اس خیال سے کانپ گئی۔

"میں تو اس لمحے کے انتظار میں ہی جو چند دو سال پہلے میری زندگی میں بجلی کی طرح دبے پاؤں آیا تھا۔ میں نے سر جھکا رکھا تھا اور میں رو بھی رہی تھی ۔۔۔ اس نے میرا سر کچھ اٹھایا اس مجھ سے لپٹ گیا، بالکل تعظیم کی طرح ۔۔۔ میری روح میں کوئی کنول سا ہنسا ۔۔۔ اس نے کہا

میں اس کو تول کر دوں ——— اور میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔" زہر نے گلے میں سوکھی ہوئی موتی بیل کا ایک پتہ مٹھی میں لے کر چورا چورا کر دیا اور ستارہ جو اتنی دیر سے انگاروں پر پاؤں دھرتی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی ساکت رہ گئی۔ تنہا کو کی گیلی زہریلے ہونٹوں پر اب تک سوکھ رہی ہے ——— توبہ ستارا اس کے چہرے کی کھال تک پھڑک رہی تھی، اور گلے بانس سوکھ رہا تھا ——— بے چارہ سیمونہ کا میاں ——— ہاں شاید وہ سیمونہ کا میاں ہی تھا۔" زہر نے ستارہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور پھر آنسوؤں سے بھری آنکھوں پر کانپتے ہوئے ہاتھ رکھ لیے۔

ستارہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

نانی مٹھے کراب وہ کہانی سنا رہی تھیں جو اپنی تین پشتوں کو بارہا سنا چکی تھیں

"تو پھر بھی تھی ہاری شہزادی کو کبھی نیند آنے لگی ——— ایک چھپر کھٹ ——— جس پر شہزادہ سویا تھا، بس تو شہزادی نے کیا کیا کہ بیچ میں لگی ٹھوڑا دھرلی۔ اور شہزادہ اور شہزادی ———"

اچانک ستارہ کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ گلی میں جیل تیز تیز آرہا تھا۔ تنہا کو کی گیلی ستارہ کے حواس پر چھا گئی اور وہ زہر کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کے ساتھ سسکیاں لینے لگی۔

مسلسل

آٹھویں قسط

رات، چور اور چاند

بلونت سنگھ

ان سب واقعات سے بے خبر پالو سنگھ دن بھر اپنی تیاریوں میں مصروف رہا اور سورج کے وقت وہ یکسی نیند سو گیا۔ رات پڑنے پر اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، کھانا کھایا اور جوالا سنگھ کے ہاں پہنچ گیا۔

گاؤں کی ایک جانب پالی کی محبوبہ سرفراز کی حویلی تھی اور دوسری جانب پالی دیگر ساتھیوں کے ساتھ آموں کی چھاؤں میں سانڈنیاں اٹھائے منزل مقصود کی اور روانہ ہو رہے تھے۔

لمبا سفر تھا اور سانڈنیوں کی سواری پہلے پہل تو وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے لیکن پھر باتیں چپ ہو گئے اور اپنے اپنے خیالات میں مگن سفر طے کرنے لگے۔

کھیتوں، ندی نالوں اور میدانوں کے پرے دور سے ہوا کی تیزی سے بڑھتے ہوئے سانڈنی سواروں کی ٹولیاں کے ٹھے جا رہے تھے۔ سواروں میں سے بعض کی مونچھیں بہت بڑی تھیں۔ ان کے پگڑ بڑے بڑے پیروں سے آگے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

پالی کو پہلے کبھی سانڈنی پر سوار ہونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اسی لئے وہ جوالا سنگھ کے پیچھے پیچھے گیا۔ بے ڈول جوالا سنگھ کو سانڈنی پر بیٹھا دیکھ کر پالی نے سوچا تھا کہ وہ سانڈنی کے قدم اٹھانے کی رفتار سے ہی دھڑام سے زمین پر آن گرے گا لیکن جب اس وقت پٹھان کی مانند جوالا سنگھ اور قوی ہیکل سنگھ کی بہن بیٹھو بھائی سے بھی بڑھی ہوئی تھی وہ سانڈنی پر کسی بوری کی طرح بیٹھی تھی۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سانڈنی کبھی سب سے زیادہ بدمزاج اور اڑیل واقع ہوئی تھی یا اسی کو رام کرنا اسے قابو میں رکھنے ہوئے تھی۔

آدھی رات کے بعد سردی بڑھ گئی۔ سب دھونکنے ایک پرانے محل کے کھنڈر میں آ پہنچے اور پھر تقریباً سب لوگ سانڈنیوں کو بٹھانے لگے۔ سانڈنیوں کو بٹھانے کے بعد بھی ان کے آگے بندھے ہوئے بیل سنگھوں کے ہاتھ میں رہے تاکہ وہ انہیں کھا سکیں۔ اس لمبے چوڑے کھنڈر میں اس کے سب سے اونچے پگڑ والے کرپی الکاش سے اس کا ایک سردار اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تک اس کے ساتھ ٹہلتا رہا۔ اس پر بھی جب وہ نہ آئے تو اس نے بلند آواز سے پکارا۔

"ارے کون ہے؟ کون ہے؟"

تب سنگھ کے جواب میں قہقہہ لگا کر کہا۔

"ابھی سے سونے لگے کے سپنے دیکھ رہی ہو..... چاند کی روشنی سے ڈرو گے کیا؟..."

پختہ نے ساتھی کو اس کے قریب آتے ہوئے للکارا کہ "کیوں شرما رہے ہو..... معلوم ہوتا ہے پہلی بار سوئے ہو تم۔"
ہم نے بھی دیا دیتی سے

حقیقت یہ ہے کہ سورج نکلنے میں اگرچہ دیر تھی لیکن جس گاؤں کے قریب سے ہو کر وہ گذرتے تھے وہاں سے مرغ کی بانگ دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس واقعہ کے بعد ان میں کوئی نہیں اونگھا بلکہ وہ سب ادھر ادھر کی گپیں اڑانے لگے۔

سب کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں لیکن اس وقت فضا اس قدر خوش گوار تھی کہ دل خواہ مخواہ بہکنا چاہتا تھا۔

سورج نکلا تو دور دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں پر سیاہ پروہٹ گیا۔ جیل سنگھ نے سانڈنی روک لی اور اس کے ساتھ باقی سوار بھی رک گئے۔ جیل سنگھ نے ذرا اوپر کو اٹھ کر ایک ہاتھ سانڈنی کے کوہان پر رکھا اور دوسرا آنکھوں پر رکھ کر دور تک نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

"وہ رہا تیرا وہ باجیسر کی باگاں..... باگاں!"

جواہر سنگھ نے بھی آگے بڑھ کر نگاہ دوڑائی

"کہاں بھائی؟"

"ارے وہ..... وہ کھجور والی زمین کے ٹکڑے کی سیدھ میں نیچے دیکھ۔"

سب لوگ اسی طرف دیکھنے لگے

بہت دور کہرے میں گھرے ہوئے گاؤں کے مکانوں کے دھندلے خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں دو تین دھندلا چلا رہے تھے۔

"ارہاں ہاں..... اب دکھائی دیا گاؤں۔ دھندلے تا اس لئے ٹھیک دکھتا نہیں۔"

جیل سنگھ نے چمکتی ہوئی آنکھ سے سب کی طرف دیکھا

"بس اب ہم آن پہنچے ہیں..."

یہ کہہ کر اس نے سانڈنی کی نکیل کو جھٹکا دیا اور سب کو آگے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا

"اگر ہم سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ جاتے تو اچھا تھا۔ خراب کھجور کی طرح نہیں ہر طرف دھند چھائی ہوئی ہے ابھی گاؤں کے زیادہ آدمی گھروں ہی میں ہوں گے..... آؤ ایک کر دھو۔"

ایک دوسرے پر سانڈنیاں ہانکنے باتیں کرنے لگیں۔ گھاس میں بے تحاشہ دوڑتی ہوئی دو بچھیاں کے شبنم کے چھینٹے اڑانے لگیں سواروں کے پیچھے جہاں جہاں سانڈنیوں کے پاؤں پڑتے تھے وہاں شبنم ٹوٹ جانے سے لمبا گہرا رنگ کے نشانات پڑتے جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ جیل سنگھ نے ایک دم اپنا ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا

"یہ گاؤں ہے جو دعوت سانے کھانی دے رہے ہیں ان کے قریب سے ہو کر نہ جانا ہوگا۔"

جب وہ گاؤں کے قریب سے گذرے تو انہوں نے دیکھا کہ تین چار بیل ایک دوسرے سے اس طرح گتھم گتھا ہو رہے ہیں جیسے کشتی لڑ رہے ہیں ایک دوسری کو نیچے گرانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

امید کے خلاف گاؤں کے لوگوں کی کافی تعداد دعوت رشید کرنے کے لئے کھیتوں میں موجود تھی لیکن انتہائی سردی کے سبب وہ کھیل کے میں اپنے کچھ ایسے مگن تھے کہ ان میں بہت کم نے ان سواروں کی بات دھیان دیا۔

دو گاؤں کے بالکل نزدیک پہنچے تو ایک کتا بھونکتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ یہ گلی نہیں تھی بالکل کاہن سنگھ کے گھر کا راستہ تھا کیونکہ دائیں بائیں اونچی اونچی دیواریں بنی تھیں کسی مکان کا دروازہ گلی کی طرف نہ کھلتا تھا اور گلی کاہن سنگھ کے گھر کے وسیع و بلند دروازے تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔

یہ دروازہ اس قدر بلند تھا کہ سانڈنی سوار بڑے مزے سے اس میں سے گذر کر حویلی و عریض صحن میں داخل ہو گئے۔

بلبلوں کا ایک غول ان کی زد میں آنے سے بال بال بچ کر پھر پھر اتا اور ڈوبکیاں اتا ادھر ادھر کی اونچی نیچی دیواروں کی طرف پرواز کر گیا۔ بیسیوں کرتی ہوئی چند بکریاں دفعتاً میاں بند کر کے اجنبیوں کی جانب دیکھنے لگیں۔

جیل سنگھ نے اور گرنتھ گاؤ دوڑائی اس کی نظریں اپنے دوست کاہن سنگھ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

کاہن سنگھ دودھ سے بھری بالٹی اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اس کی مضبوط باہنوں کے پٹھے اور گٹھے دودھ کی موٹی اور سفید بوندیں چھلک رہی تھیں۔ اس نے نظر اٹھا کر اجنبیوں کی طرف دیکھا اور پھر جب جیل سنگھ سے نظریں ملیں تو اس نے "اعاء" کا نعرہ لگا کر دودھ کی بالٹی زمین پر رکھ دی۔ ادھر جیل سنگھ نے بھی سانڈنی پر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ دوسرے لمحے وہ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ اسی اثنا میں باقی لوگ بھی سانڈنیاں بٹھلا کر اتر آئے اور پھر باگھوروچی کا کھلا سری باگھوروچی کی پھتیح" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

جیل سنگھ کے سوائے کاہن سنگھ کسی کے نام تک سے آشنا نہیں تھا تاہم جب کڑاہی نکریم سے گھر کے صحن میں لے گیا۔ دیواروں کے ساتھ کھڑی ہوئی چارپائیوں کو اٹھا اٹھا کر صحن کے بیچ میں ڈال دیا۔ ان پر چارخانے یا جاجیم پر چوڑی چوڑی مرغ کیاروں والے تکیے کھچا کر مہمانوں کو بٹھایا اور سب سے پہلے باسی روٹی کے ٹکڑوں پر گھی گڑ رکھ کر کھانے کے لئے پیش کئے اور پینے کے لئے ہاتھ ہاتھ بھر لمبے گلاسوں میں چھاچھ۔

بیٹھنے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کاہن سنگھ بڑا ہنسوڑ تھا اس لئے اگر کچھ کہنا ہوتا تو نہیں کرتا اور اگر کوئی بات سننی ہوتی تو بھی ہنسے جاتا۔ پانی کو اس کی شخصیت میں کشش محسوس ہوئی۔ اس کا رنگ گورا، سر اور داڑھی کے بال کالے بھنورا تھا عمر بیس اکیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے موتی جیسے دانت خوب صورت مضبوط اور چمکدار تھے جب وہ ہنستا تھا تو اس کے منہ کے دہانے کے دونوں گوشے گالوں کی لوؤں کی جانب کھنچ جاتے تھے اور اس کے لب ان کی نظارہ بہت دور تک نمایاں ہو جاتی تھی۔ اسے اس قسم کا منہ بہت پسند تھا۔ اس وقت اس نے چکڑی بھی لوگوں کے انعام میں بانٹ رکھی تھی تعیناً پڑھا ایک گوشہ چیتا لی چادر دوسرا گدی پر ہونے کی بجائے دونوں کندھوں کے اوپر سے گئے تھے اور پیشانی بہت سا حصہ پگڑی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

وہ عورت جس نے اسے منتر بنایا تھا وہ بھی ان کے قریب آن بیٹھی۔ عورت کی عمر تیس اٹھائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ حرکات و سکنات سے ذرہ بھر سنجیدگی جھلکتی تھی لیکن شکل و صورت سے وہ بالکل زمرد کھائی دیتی تھی ——— پانی نے جیل سنگھ کی زبانی ان دونوں کا تعارف سن لیا تھا لیکن دونوں کی صورتوں سے اس خباثت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

کاہن سنگھ نے بآواز بلند کہا

"جیل سنگھ مجھ تم نے کوئی خبر نہ بھیجی۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ اب تم نہیں آؤ گے۔"

"واہ..... اے ایسے موقعے پر بھی نہ آتا تو کب آتا۔ جب ادھر اُدھر کے کاموں میں دیر ہو گئی اب کے میں اپنے ساتھ ایک نئے ساتھی کو بھی لے جانا چاہتا تھا" یہ کہہ کر اس نے پانی کی جانب اشارہ کیا "بس اسی لئے بہت پہلے نہیں پہنچ سکا۔ کہیں اسی دیر بھی کیا ہوئی ہے۔ چیادہ سے چیادہ دو لمحے اور ہو گئے ہوں گے..... کیا دیکھتے ہو میرا دوست ہے پالا سنگھ!"

کاہن سنگھ نے مسکرا کر پالا سنگھ کی طرف دیکھا۔ جیل سنگھ پھر بول اٹھا "ارے بھئی اس کی عمر پر نہ جانا بڑا چنٹ ہے یہ۔"

بجائے بار بار کوشش کرے اس کی صورت سے علم اور انکسار کے جذبات کا اظہار ہو ہی نہیں سکتا تھا جیل سنگھ کی بات سن کر کابل سنگھ قہقہہ مار کر ہنسا۔

"واہ یار۔۔۔ خوب کہی۔۔۔۔"

اور پھر کابل سنگھ نے ساتھ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

پالی کو اس کا یہ مشغول پسند آیا اور وہ اظہار خوشنودی کے طور پر مسکرانے لگا یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں میں تھکی ہوئی سوہنے کی سیتوں کے سر نظر آنے لگے۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا دل سے دل مل گئے تھے۔

جیل سنگھ نے انگچھے سے مونچھیں اور ڈاڑھی صاف کرتے ہوئے پوچھا

"اچھا یہ تو بھوسا امرتیار پر فیار ہے تا؟"

"کیا۔۔۔؟"

جیل سنگھ نے دہرایا

"وہی۔۔۔ اپنے آدمی۔۔۔۔ اور ڈاچیاں وساٹیاں"

"ہاں۔۔۔ پرسوں تک تو سب کچھ طے تھا اب بھی طے تو سمجھو ہے یہ کچھ کہ کر شاید تم نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا ڈھیلا پڑ گیا تھا۔۔۔ جو اگر ہی بھیجنا پڑے گا سو کبھی بھیجے دیتا ہوں"

"ہاں تو پھر آدمی بھیج دو کچھ کر دو سب کو؟"

"لے چلو ہو اچھا یہ تو بتاؤ، یہاں تو نہیں بلا لیا کسی کو۔۔۔؟"

"ارے نہیں۔۔۔"

"سب کو کس جگہ ملنا ہوگا۔۔۔"

"گردوارہ کھوا صاحب میں اکٹھے ہو جائیں گے سب، یہاں سب کو جمع کرنا تو بھول ہوگا نا۔ بس گردوارے میں اردا سا سو دیں گے (دعا) کریں گے اور چل دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "کیوں ٹھیک ہے جوالا سنگھ۔۔۔ چنتو۔۔۔"

"ٹھیک ہا بلکل ٹھیک"

اس اثنا میں کابل سنگھ نہ کھولے سب کی جانب دیکھتا، بولا۔

"اور کون سے بجے ہر اکٹھے ہونا چاہیے۔"

جیل سنگھ نے تدبر سے کام لیا

"آج ہمیں جس گاؤں میں جانا ہے فاصلہ کتنی دور ہوگا یہاں سے؟"

"تم کہو گے تو دیکھتے ہیں آپ ہی بتا دینا"

"یہی ہوگا کوئی سات آٹھ کوس۔۔۔ کیوں؟"

"ہاں ہیں اتنا ہی ہوگا!"

"اچھا اور چاند کب چھپے گا؟"

"دیکھو تم چوک گئے، پورے پورے اڑتیس کی رات بھی گنوائی۔"

مہاراجہ سنگھ نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے جو بات ہو چکی اس کو مت دہرایا کرو..... ابھی کوئی گھاص پھوک میں پڑا۔ چنداں آدھی رات سے پہلے ڈوب جائے گا اور میں سمجھتا ہوں ہمیں آدھی رات سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہئے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ گاؤں میں رہنے والے آدمی بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ ہمارا مقابلہ کرنے سے ڈریں گے اگر ڈرانے آئیں گے بھی تو بہت سے لے جائیں گے۔ سمجھے نا، ہم چاند ہے اپنا کام سر کر دیں گے۔"

پنڈت نے ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور حسب معمول جوشیلی آواز میں بولی۔

"اور ادھر چاند ڈوبے گا ادھر ساہوکاروں کی تجوریاں ڈوب جائے گی۔ ہا ہا!"

اس پر سب لوگ "ہا ہا" کرنے لگے۔

جیل سنگھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"رات کا کھانا کھا کر سب لوگ لیٹ جائیں پھر آدھی رات کو جگا دو۔"

"اچھی پھر آپ لیٹ لو۔"

"ہاں اب سب لوگ باتیں بند کر دیں۔ کوہن سنگھ ہم نے ساری رات جاگ کر بہت لمبا سفر طے کیا ہے صبح رات پھر جاگنا ہوگا۔ اب ہم سب کے سونے کا بندوبست کرو۔ دوپہر کو کھانے کے بعد سے پہلے مت جگانا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ پھر سو جائیں گے....."

یہ سن کر کوہن سنگھ نے ان کے سونے کے لیے چارپائیاں بچھا دیں اور رات کے تھکے ماندے مسافر بستروں پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے لئے انہیں جاگنا پڑا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پھر سو گئے۔

کوہن سنگھ کی عورت نے پنکھا جھل جھل کر ان کی تکان کے بعد وہ بڑے مبارک کام کرنے جانے والے ہوں۔

شام ہوئی تو کوہن سنگھ نے بھنے ہوئے بادام، چاروں مغز، مرچ سیاہ، الائچی خورد، سونف، بھنگ، کھویا وغیرہ باہم گھوٹ کر اس میں دودھ ملا کر شربتی تیار کی اور پھر مہمانوں کو جگا دیا۔

جیل سنگھ نے شربتی دیکھ کر پوچھا۔

"ابے کرمے کی سردی میں شربتی کس بیا کو پھولے تابتی ہے تجے۔ اسے پی کر سب کے ہاتھ پانی ہو جائیں گے۔"

کوہن سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا

"چاچا جوانی میں سردی کسے لگتی ہے یہاں تو یہ حال ہے کہ سردی ہو یا گرمی شربتی جو روز پیتے ہیں۔"

سب کو کوہن سنگھ کے اجڈپن پر تعجب ہوا جمعدار سنگھ بولا "تو بھی تم لوگ پی لو، میں بڈھا آدمی ہوں مجھے تو گرم چیز چاہئے۔"

شاباش" یہ کہہ کر جیل سنگھ نے جو اٹھ کر بیٹھ گیا تھا سنگھ کی پیٹھ پر پیار سے ایک دھموکا دیا اور گٹھری کھول کر تین چار تولیں ایسی شراب کی نکالیں اور پکار کر بولا "کوہن سنگھ ہوس یا بچے (تو بچے) وہ"

کاہن سنگھ نے پیالہ شراب بھر کر شرابی کی طرف بڑھایا۔ شرابی نے پانی کی طرف دیکھا۔ ابھی دور ہے لیکن وہاں کون سنتا تھا۔ جیل سنگھ نے اس کے چہرے پر رات ماری کی۔

"لاحاصل جان جھو"

نسبی عظمتوں میں کاہن سنگھ کی کسی نے دستی البتہ اس کے تیار کردہ جنگ کے بگڑے کام آ گئے۔

اتنی ختم کرنے کے بعد جیل سنگھ نے موچھیں پر مس کر ڈکار لی "بھئی شراب کم رہی ۔ بھلا اچھا ہے دو رات کو کام کرنے کی بجائے کسی چوہڑ کے کندے کھیچر میں لٹ لگاتے ہوتے"

کھانا تیار ہوا تو سب نے پیٹ بھر کر کھایا اور قدرے آرام کرنے کے لیے چارپائیوں پر لیٹ گئے۔

اچانک سنگھ نے پرسکی نظروں سے جیل سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بھئی وہ بھیج تو دیا ہے نا؟"

"کون بھیجو؟"

"وہی خاصہ"

جیل سنگھ سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ نیلوتی کی طرف ہے "ہاں بھائی بھیل دیا ہے ..... بھلا وہ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے"

کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں آخر وہ لوگ جنہیں کس کر ٹھکانے لگنا تھا۔ بھس کے ڈھانچے کے قریب تک کر کاہن سنگھ نے حاضرین کو سرگوشی میں بتایا کہ اس نے ساتھ بیاں اور دیگر سامان گدھا اور گھوڑا ساتھ کر بھیج دیا ہے تاکہ گاؤں سے روانہ ہونے پر کسی کو کوئی شبہ نہ ہو"

سب نے اس کی دور اندیشی کی داد دی۔

ٹھکانے کا یہ چھوٹا سا گروہ پیدل چلتا ہوا اس ٹیڑھ کوس پر گدھا گھوڑا صاحب کے ڈھابے میں پہنچ گیا۔ یہ گدھا وہ ویران جگہ میں بنا ہوا تھا کسی پرانے شیشم کی سوکھی ہوئی تھی اور ایک نہایت اڑھا گرنتی جسے آنکھ سے بہت کم سجھائی دیتا تھا یہاں رہا کرتا تھا۔

جیل سنگھ کی صورت دیکھتے ہی اس گیارہ آدمی اُن کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

ان میں مختلف قومیں تھیں لیکن تھے سب کے سب مضبوط اور طاقت ور۔ ان میں تین ساہنسی قوم کے مسلمان تھے اور ایک بازی گر، ایک ہندو جو اسی گاؤں کا رہنے والا اور ان کا بھیدی تھا۔ اور باقی سکھ تھے۔

بالا سنگھ نے بھی بڑے بڑے کام کیے تھے لیکن اس طرح منظم ہو کر ڈاکہ ڈالنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا اس نے ایک سی نظر میں تاڑ لیا کہ ان میں سے ہر شخص بھرپور مزاج ہے لیکن ہر ایک اپنے فن میں کامل نہیں تھا بلکہ بعض تو ایسے بھی تھے جو سرکس کھیل کر یا دوڑ بھاگ کر یا کسی میلے ٹھیلے پر چھوٹی موٹی ڈانڈی جیت کر محنت اٹھانے کے لئے چلے گئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ جیل سنگھ نے نہایت احتیاط سے ان آدمیوں کو چنا تھا وہ سب نہ صرف طاقت ور تھے بلکہ دلیر اور قابل اعتبار بھی دکھائی دیتے تھے۔

جیل سنگھ نے سب کی طرف مسکرا کر دیکھا شاید وہ جانتا تھا کہ ان میں سے بیسیوں آدمی کی مات کے بعد کام سے توبہ کر لیں گے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب ایسے موقعوں پر لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو ہر آدمی کو دشمن تو اپنی جان بچانے کے لئے لڑنا ہی پڑتا ہے اگر لڑنا پڑے تو اس کا اور جوالا سنگھ کا قاعدہ یہ تھا کہ لاشوں کے سر وہ بیتے جو بھاگ سکتے ان کو بھگا دیتے جو نہ بھاگ سکتے ان کو مُردوں میں شامل کر دیتے۔

پتے، بیلوں سے دھرتی کی باتیں کرنے کے بعد جیل سنگھ گاؤں کے بیسیوں من موہنوں ۔۔۔ جیسے سب بھولے کمال کو کرپا کرتے تھے ۔۔۔ کی طرف متوجہ ہوا۔

کمال کا سر استرے سے گھٹا ہوا تھا مگر کہیں کہیں سے کسی طرح کہ نکلی گرمن ہوئی اور کنپٹے مضبوط، پیشانی چوڑی، ہاتھ زخمی اور انگلیاں موٹی تھیں۔ اس کے گھٹے ہوئے سر پر چھوٹیوں اور لاٹھیوں کی مزاروں کے متعدد نشان تھے جنہیں دیکھ کر انسان اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گذر چکا ہے ۔۔۔

جیل سنگھ سے نظریں ملتے ہی کمال نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے ہونٹ پیچھے دانت نمایاں کئے ہنستے سے جواب سنگھ کی طرح اس کی آنکھیں بھی گاؤں، سرکاروں کے درمیان ڈوب کر کوئی موجاتی تھیں۔ جیل سنگھ نے پوچھا۔

"تمہارے کیساں میں اتنے آدمی کتنے ہوں گے؟"

"موکا پھی ہے بھی زیادہ" یہ کہتے ہوئے وہ جیل سنگھ کے اور قریب چلا آیا۔ اس کا قد سردار کی نسبت چھوٹا تھا۔ چنانچہ اس نے ہنسنے ہی آنکھوں سے جیل سنگھ کی اونچی ناک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں بھی کون؟ اپنے جوان تو سارا گاؤں لوٹ سکتے ہیں ..... سامنے کاروں کی مدد کون کرے گا؟"

"اور وہ بندوق؟"

"بندوق شہر میں بیچنے کے لیے گئی۔ ابھی تک نہیں آئی۔"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے؟"

"ہو ..... کیوں نہیں ....."

"گاؤں میں اور کسی کے پاس تو بندوق نہیں؟"

"نہ"

"تمہارے پاس کتنی سائیکلیاں ہیں سنگھ!!"

"دس ..... اور سب کی سب اصیل، پاکی کی پختہ، کوسوں بنا تھکے چلی جاتی ہیں۔ بتی کی طرح پاؤں پڑتے ہیں جمین پر۔ کیا مجال جو ہمی کی کوچ آ جائے۔ ان میں ایک بھی ایسی نہیں جو جواب بھی دیدے۔"

"ہاں ٹھیک"

کچھ دیر پھر ادھر ادھر کے شوشے ہوتے رہے آخر کار وہ اور اس کے ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا وہی حال تھا کہ جب پروہت کے حضور میں حاضر ہوئے تو سب ایک ہو گئے کوئی ذہنی تفریق درمیان میں آنکھیں موند کر حتیں مان گئیں۔

اور اس کے کانوں میں رواج پڑا تھا اور نہ اس بات کو حیرانی کی اب اس قدر پختہ ہی کہ کسی قسم کی دعا کی ضرورت نہیں تھی۔

جانے کی جلدی میں عورتوں کی جگہ مرد پیدا ہوئی اور دو بڑے کرسائیکلوں پر سوار ہو گئے۔ سائیکلیاں نکل کا جیسا محسوس کرتے ہی چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئیں اور چشم زدن میں ہوا سے باتیں کرنے لگیں۔

سب تقریباً سائیکلوں کے لئے سات آٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنا کچھ مشکل نہ تھا چنانچہ ہموار راستے کے باوجود وہ تقریباً دس بجے منزل مقصود

پر جا پہنچے اور گاؤں سے باہر ہی دو قبرستان میں رک گئے۔

یہ بستی مسلمانوں کی تھی جبکہ سکھوں کی آبادی تھی زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی جو قریب تھے سکھوں کے صرف پانچ سات گھر تھے۔ البتہ سنہ ۴۷ء کے ہنگاموں کے سبب یہ گاؤں خاصہ مشہور تھا۔

اس قسم کی تفصیلات بتانے کے بعد گاؤں نے زمین پر انگلی سے کیریں کھینچ کھینچ کر گاؤں کی گلیوں کا نقشہ بنایا۔ مطلب یہ کہ گاؤں کے بیچوں بیچ جو سب سے زیادہ چوڑی آبادی تھی جیسے۔ سیدھا ہاتھ کہنے کے بعد اور اس کے بعد جب موقعہ دوسروں پر ہاتھ صاف کرنے کا بھی خیال تھا سارا پروگرام بن جانے کے بعد جیل سنگھ نے چاند کی طرف دیکھا ہمیں کے ڈھنگ میں ابھی رات تھا۔

ہیا کہ پہلے لے ہو چکا تھا۔ سارھو سنگھ کو ساتھیوں کی رکھوالی کرنی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی اور گھسی جھریوں کے بیچوں بیچ ساتھیوں کو اس ترتیب سے بٹھایا کہ وہ سے دیکھنے والوں کو بھی شک نہ ہو۔ ایک آدمی کو سامان باندھنے کے لئے رسیاں اکٹھا کی گئیں۔ سب نے اپنے جوتے اچھی طرح سے رسیوں سے باندھ لئے۔ ٹھاکے کس لئے گئے تاکہ ضرورت پڑنے پر جلدی بھاگا جا سکے اور دوسری پگڑیاں گلے میں ڈالیں۔ بھتھیاں تیغیاں وغیرہ بھی ساتھ لے لی گئیں اور جب یہ لوگ پھریروں ٹانگوں پر چڑھا کر بالکل تیار ہو گئے تو جیل سنگھ نے پہلے تو ایک مختصر سی تقریر کرنے کے لئے ٹھاکھنکھار دس منٹ دیئے۔ اس طرح دم نہیں پھونکا تھا۔ پھر اس نے ہر ایک کو دو باتیں دلیاں دیں اور ہدایت کی کہ خبردار ہو جائے تو پھر بھوکیں تان کر تو، متعلقہ دروازہ اس طرح دھاڑ دھاڑ سے جھنجھلاتے ہیں۔ گاؤں والوں کے کان بھی کتوں کی آوازوں کی طرف لگے رہتے ہیں جو کتا بھونکے آہستہ سے پچکار کر ایک حکومت دی گئی اس کے کے ڈال دو۔"

وہ لوگ قبرستان کے ایک سرے پر کھڑے ہوئے درخت کے سائے تلے چلے گئے۔ جیل سنگھ نے گاؤں کی جانب نگاہ دوڑا کر دیکھا۔

اس وقت ساری بستی پر شمشان کی سی خاموشی طاری تھی۔ کچی اینٹوں اور گارے کے بنے ہوئے مکانات ایک طویل قبر کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ درخت دم بخود کھڑے تھے ان سے عموم ہوتا تھا جیسے گاؤں کا قافلہ ڈاکوؤں کی آمد سمجھ گیا ہو۔

ڈاکو منتظر ہو گاؤں کے عین سے پر پھیلے ہوئے برگد کے گھنے درخت کی ذات دبے پاؤں بڑھنے لگے جیل سنگھ کی ہدایت کے مطابق پلا سنگھ کی ٹولی یہی کرے جیل سنگھ کے ساتھ۔ رہتے ہے دوسروں کے نزدیک تو یہ قابل فضیلت تھی لیکن پالی کو جیل سنگھ کا حکمانہ انداز پسند نہیں تھا۔ شکر کا مقام ہے کہ اس نے پالی سے ترش کلامی نہیں کی ورنہ دونوں مست ہاتھیوں کی طرح ایک دوسرے سے بھڑ جاتے۔

جوالا سنگھ، چھتر، کاہن سنگھ اور لال وغیرہ ایک دوسرے کو ہاتھوں سے اشارے کرتے ہوئے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ سب بڑ کے درخت کے نیچے پہنچ گئے۔

جیل سنگھ نے ایک مرتبہ اپنے گرد کا جائزہ لیا پھر اس نے چھکے سے اپنے لمبے چوڑے ہاتھ میں کھال کی کھوپن تھام کر زناٹے سے گرد و گھمانے کر دیا۔ اب وہ دو دو تین تین آدمیوں کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر آپس میں تاصلہ رکھتے ہوئے گاؤں کی جانب بڑھے۔

دیواروں کے سایوں تلے سے چلتے ہوئے قدم بہ قدم وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اتنے میں چوکیدار کی پکار سنائی دینے لگی۔

"جاگتے رہو ..... جاگتے رہو!!"

دو دو چار چار کی ٹولیوں پر مشتمل ڈاکو ایک دوسرے کی جانب پُرمعنی نظروں سے دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیتے ان کی نظروں میں چھریوں والے ٹوٹے ہوئے کنگھی کھچا چاند کی کرن پڑنے پر تیز چمکدار چھری جگمگا کر بجلی کی طرح آنکھ دکھا دیتے۔

پالا سنگھ اور برگ راجا ہیبوں انسان ان بے حس مکانوں میں خوب میٹھی نیند سو رہے تھے۔ نہ معلوم وہ کب جاگ اٹھیں اور کب چیخ و پکار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جائے۔ دبے دبے جوش کے تحت پالی کا دل غرور و مزاح سے بھرا ہوا تھا۔ گو سیم میں پیتے کی سی چوڑی تھی۔ بازوؤں پر اس قدر سردی کے باوجود ایسے کپڑے تھے جن پر بندیں نمودار ہو رہی تھیں لیکن اسے بڑا لطف آ رہا تھا۔

اسے کے علاوہ دو چار مرتبہ کتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جوں ہی سنگھ کی ترکیب کارآمد ثابت ہوئی تو ہر ایک مرتبہ تو کتے اپنی مخصوص آواز میں کچھ ایسے بے طرح بھونکے کہ انھوں نے سمجھا کہ قریب کے لوگ ضرور جاگ اٹھیں گے لیکن خیر گذری، آدمی تو نہ جاگے البتہ چوکیدار کی آواز کچھ قریب سنائی دینے لگی۔ اب وہ مطلوبہ مکان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ چوکیدار کی آواز اور قریب سنائی دی تو وہ جاگ جاگ کر ادھر ادھر پھیلنے لگے۔ گلی کے سرے پر چوکیدار ضرور ہوا تو وہ تنہا نہیں تھا۔ چند آدمی اس کے ساتھ موجود تھے۔ اگر کتے کا شاید کتوں کے بھونکنے کے باعث ان لوگوں کو شبہ ہو گیا لیکن کلال نے تسلی دی کہ یہ بات لازمی نہیں۔ چوکیدار کے ساتھ تو گاؤں کے چند آدمیوں کا گروہ بھی پہرہ دیتا ہے اور اگر وہ لاٹھی پڑیں تو کتے بھونکنے ہی بند کر دیں گے۔

اصل معاملہ تو کچھ بھی ہو وہ سب لوگ باہل تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پیل سنگھ نے دبکتی ہوئی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اگر وہ لوگ ذرا سی بھی مشکوک حرکت کریں تو ایک دم پل پڑو اور چشم زدن میں ان کا صفایا کر دو۔

اپنی اپنی کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تو اکثر ہاتھوں میں مچھیاں لے کر ان کے استقبال کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ گاؤں کے آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں قریب سے قریب تر سنائی دینے لگیں۔ یہ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل میں کوئی شک نہیں ہے وہ اپنی ہی باتوں میں مگن تھے یہاں تک کہ وہ بھی کی دوسری طرف چلے گئے۔

اچھا ہی ہوا جو لڑائی کی نوبت نہیں آئی ورنہ بھی سے شور بلند ہوتا اور معلوم اس کا کیا نتیجہ نکلتا!

میدان صاف پا کر سب سے پہلے کلال کمین گاہ میں سے باہر نکلا اور اس نے اپنے گرد بیٹھے ہوئے ساتھیوں سے کہا "چلو آدمی اس طرف چھپے رہیں اور چار مکان کی دوسری گلی کے پرلے سرے کے ملیٹے میں پوشیدہ رہیں تاکہ مکان میں داخل ہونے والوں کو گاؤں والے باہر سے گھیرے میں نہ لے لیں۔

"لڑائی میں سنگھو اب تم وہ آدمی چنو جنھیں تم اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے ہو۔"

تین سنگھ لے پالا سنگھ، جوالا سنگھ، چنتو، کاہن سنگھ، کلال، ٹیڑے اور بیجو سنگھو اپنے ہمراہ لیا اور باقی لوگوں کو ان کی کمین گاہوں میں پہنچا دیا گیا۔

یہ کام ہو چکا تو کلال نے سلدی سلدی کہنا شروع کیا

"تم جس احتیاط اور ہوشیاری سے یہاں کھڑے ہو، میں دیوار پھاند کر اندر جاؤں گا اور بڑھی کا دروازہ کھول دوں گا تم سب اندر گھس آنا۔ بس پھر سمجھو آدمی مسئلہ تو حل ہو گئی۔"

چنتو نے انگلی کھا کر کتے کی چرخ کی طرح اس کی گھٹی ہوئی کھوپڑی پر طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

"بس بیٹا لے چکر، باقی سب کچھ ہم پر چھوڑ دو ہم سنبھال لیں گے۔"

کلال نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے پالا سنگھو سے کہا۔

"کیوں پالا سنگھو تو بھی موسب سے، ذرا اس کی دیوار تک چڑھا دے مجھے۔"

پال نے سہارا دے کر اسے اوپر چڑھا دیا۔

اب دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ ہنتا ہتیا قاعدے کے مطابق دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی اس وقت ان سب کو ایک ایک لمحہ گنتا بھاری ہو رہا تھا۔ آخر دروازے کے تختے جنبش کرنے لگے، پھٹ گئے۔

دروازہ کھلا اور انہوں نے فوراً اندر گھس کر ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

کلال بھیں آستہ دکھا آگے بڑھا۔ سردی کے باعث گھر کے سب لوگ اندر سو رہے تھے۔ کلال نے مسکرا کر کہا۔

"پہلے ڈیوڑھی میں ایک بڑھا سویا کرتا تھا۔ اسے مالک نے نکال دیا۔ مجھے ڈر تھا کہیں دوسرا آدمی نہ رکھ لیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے آج پرماتما بہت ہی مہربان ہے ہم پر!"

کابل سنگھ نے مسکرا کر سرگوشی میں کہا

"ارے بھئی، ایسے نیک کام میں تمہارے پرماتما مہربان نہ ہوں گے تو اور کب ہوں گے!"

کلال نے تہبند کو پھر کس کر ایک مرتبہ باندھتے ہوئے کہا۔

"استاد جیل سنگھ! کام تو پورا ہوا، اب تم آگے بڑھو۔"

جیل سنگھ نے آگے بڑھ کر چپ چاپ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اس وقت وہ لوگ دیوار کے سایے تلے کھڑے تھے۔ جیل نے کہنا شروع کیا۔۔۔

"اچھا تو کلال یہ بتاؤ کہ چھت کی لکڑی سے کوئی ڈر تو نہیں؟"

کلال نے قہقہہ مار کر جواب دیا۔

"ڈر تو ہو سکتا ہے۔ تم جانو چھت سے چھت ملے ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کوئی چھت کے اوپر چلا گیا ہو۔ یہاں چھت کے اندر سے ایک سیڑھی چھت پر پڑھتی ہے وہاں مٹی پڑی ہوتی ہے اس کا اندازہ تو فوراً سے نہ ہو گا لیکن ایک دو آدمی اس اندازے کے سامنے بھی سپرد ہونے چاہئیں اگر گھر کا کوئی آدمی اوپر سے بچ نکلنا چاہے تو اسے قابو میں کر لیا جائے۔"

یہ سن کر جیل سنگھ بولا۔۔۔

"تب یہ کہ چھت پر بھی پکا بندوبست ہونا چاہئے۔ اچھا تو بھائی سنگھو! میں پالا سنگھو کو لے کر چھت پر پہرہ دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اگر سارا گھر کھلا ہو کر آجائے تو کچھ ہی دیر میں نمٹ لیں گے۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے فخریہ نظروں سے پال کی طرف دیکھا اور پال نے خوش ہو کر جواب میں ٹھنے چلائے اور تب تک اپنے بندوق بردار ساتھی جیل سنگھ کے سلسلہ کلام جاری رکھا "بندوق پھنتے کے پاس ہے کل بارہ گولیاں ہیں ایک دو گولیاں تو ہوا میں چلا دینا، باقی گولیاں ضائع نہ کرنا۔ کلال تم پیچھے رہو، پھتو دروازے سے ہٹ کر تنور کے پاس بیٹھی رہے گی تاکہ گولی چلنے میں آسانی رہے۔ دیکھو پھتو آگ یا تو اس وقت جلانا جب گھر کا کوئی آدمی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے یا جب گاؤں والے جاگ کر شور مچانے لگیں اس وقت دو تین ہوائی فیر کر دینا، جو اسنگھ تم باقی آدمیوں کو لے کر گھر کا دروازہ کھلوا کر یا توڑ کر اندر داخل ہو جاؤ، آگے تم کھڈ سے ہوشیار رہو۔"

سب سپاہیانہ نکتہ سنجیوں کے بعد جیل سنگھ پال کو ساتھ لے کر پہلی چھت کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر جیل سنگھ نے پال کی جانب دیکھا۔ دونوں خوب سیراب ہو چکے تھے۔ اس وقت پال کے دل میں عظیم الشان کارکے لئے دوستانہ جذبات

پیدا ہوگئے

جیل سنگھ نے سب کو تیار پا کر اوپر کھڑے کھڑے گردن ہلا کر اشارہ کیا۔ جوالا سنگھ بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اشارہ پاتے ہی اس نے دروازے پر زور سے لات رسید کی۔

"دروازہ کھولو ــــ ہ"

سب کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جوالا سنگھ نے دستک جاری رکھی۔ اندر سے دھیمی سی زنانہ آواز آئی۔

"کون ہے؟"

جوالا سنگھ نے بھاری بھرکم آواز میں قرار کیا۔

"ہشیار دروازہ کھولو..... تمہارے سسر آئے ہیں۔"

یہ سنکر جوالا سنگھ نازنین کی طرف اپنی گدلی آنکھوں سے ایک لمحہ دیکھ کر مسکرایا!

جیل سنگھ نے پالی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"دیکھ لیا حرام جادے کو؟"

اور پھر وہ چھت پر چڑھ گئے۔ یہ اصل نہیں بلکہ پیپل کی چھوٹی اور پچھلی چھت تھی۔ گھر کی بڑی چھت اس سے چھ سات ہاتھ بلند تھی۔ بڑی چھت تقریباً دو تین ہاتھ پڑا چھجا آگے بڑھا ہوا تھا۔ پالی نے چھجے کے نیچے کی جانب نگاہ دوڑائی۔ بڑوی کی متعدد چھتیں پاس آگے تک بڑھی ہوئی تھیں ــــ پالی نے کہا ــــ

"ایسے کھیال میں ہمیں اوپر والی چھت پر جانا چاہئے۔"

"لیکن ہاں، یہاں سیڑھی تو ہے نہیں!"

"بھینی اصل سیڑھیاں تو اندر سے اوپر جاتی ہیں، یاد نہیں جوالا سنگھ نے کیا بتایا تھا!"

جیل سنگھ ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر بولا۔

"ہاں..... ٹھیک کہتے.. لیکن اوپر جانے کا انتظام کیا ہو..... ہاں یہی ہو سکتا ہے کہ صحن میں سے کوئی کھاٹ یا بانس لے آئیں اس کی مدد سے چھلانگ کر اوپر پہنچ جائیں گے۔"

نیچے صحن سے جوالا سنگھ کی بھاری آواز سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ گالیوں اور دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔

"دروازہ کھولو..... تمہاری بچان کو..... تمہاری دھی کی..... میں..... کھور نہیں توڑ ڈالیں گے..."

یوں معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے اندر کہرام مچ گیا ہے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

پالی نے جھک کر تینوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیکے ہوئے کہا۔

"اب بانس کہاں ڈھونڈتے پھریں گے، میری پیٹھ پر پاؤں جما کر چڑھ جاؤ چھت پر۔"

جیل سنگھ ہنس پڑا۔

"واہ کیا ترکیب ہے تجھے اس کا خیال اس لئے نہیں آیا کہ بہت کم لوگ میرا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ آج میرے

جسے ہوا پالا سنگھ ہے:

چشم زدن میں جیل سنگھ اس کی پیٹھ پر چڑھ کر کود گیا پہلے اس نے چھری اوپر والی چھت پر پھینکی اور پھر خود بھی وہاں پہنچ گیا۔ اور گھوم کر کہنے لگا۔

"دیکھو پال جوالا سنگھ کو کب دن جاتا تو ڈالے زمی دھکیوں سے ہم نہ چلے گا۔"

یہ سن کر پال فوراً سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اس نے دیکھا جوالا سنگھ دروازہ توڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ دو آدمی صحن کے پرلے کونے سے ایک بڑا شہتیر اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ جوالا سنگھ گاؤں کو آخری مرتبہ خبردار کر رہا تھا وہ چلا رہا تھا "ہاں ہاں دھیرے سے، دھیرے سے" دیکھ کر پال لوٹ آیا دروازے سے اچھل کر بائیں چھت پر اچھل ڈال کر لٹک گیا اور پھر بازوؤں کے زور پر سارا دھڑ کھینچ کر اوپر گیا۔ اس نے دیکھا کہ جیل سنگھ مٹی سے بت بنا کھڑا اوپر تلے کہ مٹی کھل رہا تھا اسے غور سے دیکھنے لگا اس نے "ہشیخ" کی آواز نکالی۔

لالا اس نے اس کی آواز نہیں سنی

"ہشیخ"

اب کے اس نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھی اوپر کھینچو ——— پہلے میں چھری پھینکتا ہوں"

"ارے ٹھہر میں پگڑی سے لٹکتا ہوں، جھکر تا آ رہا ہوں۔"

"اس قدر دیر میں کر تا کیوں آ رہے ہو؟"

"ارے بے سری نہیں سنتی۔ اس طرح چھری ایسی طرح گھوم سکتی ہے"

پال اسی طرح زور سے چلایا۔ اس کی ناک دیوار کو چھو رہی تھی۔ مٹی کی بو اس کے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔

جب جیل سنگھ نے کرتا اتار پھینکا تو پال نے دیکھا کہ اس کا بدن گو بہت بھاری تھا لیکن بہت ہی خوب صورت تھا۔ لوہے کی مانند مضبوط سینہ، بازوؤں کی ابھری ابھری پھیلیاں، سارے بدن کی لائنس میں جیل روشنی معلوم ہوتی تھی۔ کرتا اتار کر جیل سنگھ نے گھما پھرا کر تہبند کسا۔ چاندنی رات میں وہ دیو پیکر انسان بڑا خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔

اتنے میں صحن سے دروازہ ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پال نے سوچا ممکن ہے کہ قریب کے گھروں کے بعض لوگ جاگ اٹھے ہوں، شور کے مارے باہر نکلتے ہوں۔

جیل سنگھ ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا اس نے شاہین کی طرح سر اوپر اٹھا کر دور تک نگاہ دوڑائی اور جب وہ پال کی طرف بڑھنے ہی کو تھا دفعتاً باہر سے چلنے کی آواز سے ساری فضا گونج گئی۔

فرنانک گرجب آواز کے ساتھ ہی جیل سنگھ دھڑام سے گر پڑا۔

پال نے پہلے تو یہی سمجھا کہ ہنستے ہنستے گر پڑا ہے لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ آواز بندوق کی نال سے آئی تھی اور جب اس نے جیل سنگھ کو گرتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کسی نے اس پر فائر کیا ہے غالباً مٹی کے دروازے میں سے گولی آئی تھی۔

گولی کھاتے ہی جیل سنگھ چوٹ سے ایک جانب ہو کر مٹی کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ غالباً ایک پہلو سے ہو کر مٹی کے دروازے،

تک پہنچ جاتا تھا۔

پال نے رسہ نیچے گرایا۔ وہ جیسے ان کا اب کیا کرے۔ خطرناک لمحوں میں پہنچا تھا وہ چھت پر بھی نہ چڑھ سکتا تھا۔۔۔۔ معاً پھر گولی چلی اور اس دفعہ جیل سنگھ چرخ کر پھر چھت پر آن گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔

مٹی کا دروازہ ذرا سا کھلا اور پال نے اس میں سے بندوق کی نالی کو گھستے دیکھا۔ اس نے زینہ کا تختہ پھینکا اور پھر چھت پر کودتے ہی اس نے سوچا کہ وہ ایک کر جیل سنگھ کو پیٹھ پر لادے اور نیچے اتر جائے۔

اس نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اوپر والی چھت پر چھپٹ کر بڑھنے والے کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور وہ فوراً پیچھے ہٹا اور نیچے کے نیچے زینہ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

پاؤں کی چاپ سے اس نے اندازہ لگایا کہ بندوق والا نیچے کے اوپر کھڑا ہوا تھا تاکہ ایک اور آدمی اس کے ساتھ تھا۔

جیل سنگھ گرم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ پہلی گولی کا تو کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ کہاں لگی ہے لیکن دوسری پیٹ پر لگی تھی۔ اس کا بدن بالکل ننگا تھا۔ پھیلی چاندنی میں اس کے تڑپتے ہوئے بدن کی اوپر تلے ہوتی ہوئی کھلیاں اور پیٹ کا خون بہتا دیکھ کر پال کے چہرے سے رحم اور انسانیت کے آثار ہویدا تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تڑپتا ہوا جیل سنگھ تھا لیکن پال اس کی مدد کرنے سے معذور تھا۔

اوپر سے باتوں کی آواز آئی تو کسی نے بندوق سے پوچھا۔

"وہاں کوئی اور آدمی بھی دکھائی دیتا ہے؟"

پال نے گردن اٹھا کر نیچے کی شہتیریوں کی طرف دیکھا اور پھر اچھل کر دوسری شہتیری سے لٹک گیا۔

دوسری آواز آئی

"مجھے تو اور کوئی دکھائی نہیں دیتا!"

تیسری مرتبہ گولی چلی تھی۔ جیل سنگھ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کوئی اور نہ ہو چھت پر؟"

"دیکھتی تو ہوں۔ نیچے کے نیچے چھپا ہوا ہو؟"

"دکھائی تو نہیں دیتا کوئی بھی!"

بندوق کے دھماکوں سے سارا گاؤں جاگ اٹھا تھا۔ دور سے لوگوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صحن میں بھی کھلبلی مچ گئی تھی جسے بندوق چلنے کی آواز نے کی تھی وہ بڑبڑائی۔ وہ زور سے چلا کر بولی

"بندوق کا گھوڑا خراب ہو گیا ہے۔ یہ چلے گی۔"

یہ سن کر سب عورتوں میں کھلبلی مچ گئی انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ گھر والوں کے پاس بندوق ہے۔ اس کی آوازیں بھی سن چکے تھے اور دانے کے لئے گھر والوں نے معلوم کیا روک لگا دی تھی پھر بے دھڑک کے باوجود مکمل طور پر ٹوٹ سکا۔

چت والے دونوں آدمی بندوق لے کر جلد از جلد صحن کی طرف جانا چاہتے تھے۔ پال نے آنکھیں اٹھا کر پال ایک اور شہتیری میں اس اندازے پہنچا دیئے کہ اس کا دن چھت سے قد کیا اوپر سے آواز آئی۔

"دیکھو تم چھت پر کود جاؤ اور دیکھو کہ نیچے تو نہیں ہے۔ اگر کوئی آگے بڑھے تو میں گولی سے اڑا دوں گا۔"
دوسرے آدمی نے بھی چھت پر چھلانگ لگا دی۔

پال دم زد کے چھت سے چپکا ہوا تھا یہاں بھی وہاں تاریکی تھی گھبراہٹ اور عجلت میں اس آدمی نے بھی نگاہ اوپر نہ اٹھائی اور چلّا اٹھا۔
"آجاؤ، یہاں کوئی نہیں ہے!"

پال نے سوچا مر تو ہوا تو ہوا جھپٹ کر بندوق چھین لوں گا۔
لیکن بندوق بھی بہت بوکھلاہٹ کا شکار تھا اس سے پال کا داؤ چل سکا بلکہ اس کی اپنی جان بال بال بچی۔
دونوں آدمی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تو پال نے اطمینان کی سانس لے کر "ریچ" کی آواز کے ساتھ تھوک کی پچکاری چھوڑی اور اپنا بٹا کپڑا نیچے کی جانب لٹک گیا اور پھر زمین پر آرہا اور نیچے کے نیچے دیوار سے لگا لگا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

ابھی دو تین چار قدم آگے بڑھا ہوگا کہ پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس نے چھوٹی مضبوطی سے پکڑ لی دوڑ کر کہیں بندوقچی واپس نہ لوٹ آیا ہو، بھی کوشش ویسے ہی میں تھا کہ پھر گولی چلی، دفعتاً بہت سے آدمی زور زور سے للکارنے اور چلانے لگے۔

محل میں کھڑے ہوئے ڈاکوؤں میں دو آدمیوں کو گولی لگی۔ گل کے دونوں سرحدوں پر بھی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ محل میں بھی افراتفری مچ گئی۔ محل فائرنگ کے بعد دفعتاً اس قدر زد کا شور بلند ہوا جیسے قیامت آگئی ہو۔ ڈاکوؤں کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے لئے وہاں سے نکل بھاگنا ناممکن ہے، ایک آدمی کا ان کے ہاتھوں بیچ دوسرے تیسرے کی ہر چار تیسرے گاؤں کے کوہیوں کی للکار ـــــ پال چھت کے سرے پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں آدمی سیڑھیوں پر کھڑے گولیاں برسا رہے تھے۔ سب آدمی ڈیوڑھی کی طرف بھاگ نکلے بندوقی دونوں نے ان کا تعاقب کیا پال کو بڑی چھت پر بھی شور سنائی دینے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ واپس بھی نہیں جا سکتا تھا چنانچہ وہ قدم ناپتا ہوا ان کے پیچھے ہو لیا۔ وہ دونوں اکہرے بدن کے پست قد کے آدمی تھے تین چوکیدار کے پاس بندوق تھی۔ کم بختوں نے سب کو آگے لگا لیا۔

قریب محل کے بچوں بیچ مویشیوں کا حصہ علیحدہ کرنے کیلئے ایک چھوٹا سی دیوار بنی تھی۔ باقی لوگ تو دوسری طرف بھاگ گئے مگر تین کے قریب ایک سایہ سا ہلتا ہوا دکھائی دیا۔ بندوقی نے بندوق اس کی طرف تان کر پوچھا۔

"کون؟"

یکایک گٹھا ہوا سر چاندنی میں چمکنے لگا اور ایک التجا آواز آئی۔
"چھوٹے بابو مجھے گولی مت مارو میں کلال ہوں کلال"
"تیری کلال کی ایسی تیسی!"
پھر گولی چلی اور کلال وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

پال کے ذہن میں خیال آیا کہ اب وہ تو ہے ان کی رسائی فاصلہ بہت زیادہ تھا پال بڑی تیزی سے آگے بڑھا لیکن چھوٹے سیٹھ نے فوراً بندوق چھوڑی اور آہٹ پا کر اس نے اندازاً بندوق کی نالی اس کی طرف تان دی۔ پال کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے ٹھوکے کے ساتھ بندوق چھوٹی اور اس کی آنکھ رکی اور اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی بس ایک لمحہ میں اس کی ساری امیدوں کا طوطا اڑ جاتا تھا لیکن کہ بھی معلوم نہ ہونے پاتا کہ کسی نے اس کی خاطر پردیس میں جان دے دی۔

چھنے سیٹھ نے اپنے سامنے پھیلائے ہوئے بڑے گیڑوے کی اندر بندوق والے جوان کو کھڑا پایا۔ اس کی ایکلی بندوق کی نسبت کہیں چوتھی تھی کہ پھپ دیوار کی اوٹ سے چھتو بھل کی تیزی کے ساتھ باہر نکلی اس کی بندوق تو بگڑی تھی ہی البتہ اس نے اس کی نالی پکڑ کر اس کے بٹ سے جو چوٹ لگائی تو بندوق کا نشانہ چوک گیا گولی چل گئی۔ پانی نے بلا کی تیزی سے اسے دبوچ لیا اور اس طرح رگید ایسے جنگلی بلا چوہے کو مروڑ ڈالے۔

چھنے سیٹھ کے ساتھی نے جرأت کے خالی بندوق اٹھالی۔ اور آسوں کی پیٹی چھنے سیٹھ کے گلے میں تھی۔ وہ خالی بندوق لے کر واپس بھاگ نکلانے میں جوالا سنگھ بھی آگیا اس نے جونہی کار آمد سیٹھ کے ساتھی نے بندوق گھما کر بڑی چھت پر پھینک دی اور خود سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اگلی چھت پر چڑھ گیا۔

بڑی چھت پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے ان کا ارادہ کوئی ترکیب نہ چلا البتہ ایسے بیٹھے رہنے لگے۔ وہ جانتے تو کچھ نہ تھے لیکن چاروں طرف سے گھر جانے کا ڈر بھی تھا یوں بھی جوالا سنگھ مقابلہ آدمی تھا اس نے پانی کو آواز دے کر کہا: "پانی اب بھاگ نکلنا چاہئے کام بگڑ گیا ہے جیل سنگھ کہاں ہے؟ بلاؤ کیا۔"

"اُف" کہہ کر جوالا سنگھ دوڑتا ہوا چھوٹی چھت پر چڑھ گیا۔ سیٹھ کے ساتھی کی چیخوں سے ساری فضا گونج اٹھی۔ اونچی چھت پر کھڑے ہوئے لوگوں نے اسے جلدی سے چھت پر کھینچ لیا۔ جب جوالا سنگھ چھوٹی چھت پر چڑھا تو بڑی چھت والے لوگ نیچے کے منہ پیچھے ہٹ گئے۔ وہ سمجھے شاید وہ ان سے لڑنے کے لئے آرہا ہے لیکن جوالا سنگھ نے چھوٹے کہ ایک وار سے جیل سنگھ کی گردن کاٹ دی اور سر کو بالوں سے پکڑ کر لٹکا لیا۔ وہ ایک آدمی اور وہ اٹھا چھتو نے ان کے سر بھی کاٹ لئے۔ بچے کھچے لوگ ڈر کے مارے چیخ و پکار کرنے لگے۔ جوالا سنگھ نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا "اب ہم لوگوں کو ڈال بانکر بھاگنا ہوگا۔ اگر کوئی شخص ہمارا پیچھا بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا اندازہ کھوا گیا تو سمجھ لیا کہ ان کے باہر والے پہاڑوں نے کسی کو اندر نہ آنے دیا تھا۔ جوالا سنگھ نے ہانک لگا کر ایک طرف کے آدمیوں کو بلایا اور گلی کی دوسری جانب والے ٹولے میں جانے پھر وہ سب لوگ تیزی سے چھپیاں گھماتے ہوئے بڑھے اب ان کے قریب بھاگوان آتما جیل سنگھ کا سر بریدہ تڑپتا ہوا دھڑ کی ہمت ٹوٹ گئی۔

تیزہ کسی ڈسی ہوئی طرح سے گاؤں سے باہر نکلے اور جوالا سنگھ کی ہدایت کے مطابق تبرستان کی جانب سمت کو بھاگ نکلے گاؤں کے لوگوں نے ان کا تعاقب کیا لیکن کھیتوں میں پہنچ کر ان کو اور زیادہ آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

جب وہ بھاگم بھاگ چلے جا رہے تھے تو جوالا سنگھ نے پوچھا "شیر کہاں ہے؟"

کسی نے بتایا کہ لکھن میں اسے بھی گولی لگی تھی بھاگا تو تھا لیکن راستے میں گر پڑا۔ جوالا سنگھ نے پانی کو واپس دوڑایا کہ گر وہ مر سکتا ہو تو بہتر ورنہ اس کا سر کاٹ لاؤ۔ مبادا پولیس کے سامنے ان کا پتہ بتا دے یا مر بھی جائے تو اس کی صورت پہچان کر پولیس انھیں گرفتار کرلے۔

پانی واپس بھاگا تو چھتو بھی ساتھ ہو لی۔

"ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں پانی!"

جب وہ شیر کے پاس پہنچے تو وہ بری حالت میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کیوں مرنے والے ہیں اس نے منت کی "مجھے مت مارو چھتو!"

لیکن زیادہ تر لکھن کی گونجتی ہوئی ہنسی ہی تھی چھتو کی چھری موہن گھومی اور اس کا سر گاجر کی طرح کٹ کر زمین پر لڑھکنے لگا۔

چھتو نے سر اٹھایا کہ پھر گولی چلی لیکن وہ بھاگ نکلے سارا گروہ ان کا منتظر تھا۔

وہ لوگ بہت بڑا چکر کاٹتے ہوئے تبرستان میں پہنچے اور ایک لمحہ حفاظت کے لئے سانس لینے کو پتھروں پر بیٹھ گئے۔

پیوند

خدیجہ مستور

[illegible] کیسی کہانیاں بنتا بڑے سنگین مراحل سے گزرا ہوگا۔ ایسے اتوال زریں سے مزین تر کا کچھ چڑچڑ ہو گئی بھی کہہ سکتے ہے معلوم ہوتے ہیں۔ اب کوئی فاطمہ کو دیکھے۔ اس نے خود ہی تیس سال کی عمریں کیسیں بکاں دی تھیں۔ اس کی آنکھوں کو یہ حال تھا کہ جیسے فاطمہ تیس سال پہلے پیدا ہو گئی ہوں۔ ہر وقت سفید سفید کچڑ ابھرا رہتا۔ فاطمہ اور بھی پیلے پیلے انسو آنے لگتے۔ سامنے دھند چھا جاتی۔ دوپٹے کے چھوٹے سے ٹکڑے سے آنکھیں صاف کرتی تو جانی تب کہیں سامنے کا سامان ابھر آتا۔ آنکھوں کی اس درگت کے باوجود ایسی بانکی سجیلی کہ دیکھا کیا ہو۔ پہلے تو خیر بنجی ہوئی تھی۔ آتی تھی گلاب کچھ دنوں سے کام گھر پڑ ہو جاتا۔ دھانگے پیلے ہو گئے تھے اس نے الجھا الجھا کر کھونا شروع کیے۔

مجھے کی سی عورتوں کو فاطمہ پر رحم آتا۔ یہاں ہی ایسے ایسے انکھوٹا طاقتے ہو گئی کام کر کے دیتا تھا۔ شادی کو دس سال ہو گئے تھے چار بچوں کا باپ تھا اس کے بلا ناغہ روزی کمانے کی بات سر پر سے سنتا ہی رہتا تھا جب تک اس کا باپ زندہ رہا اپنی پنشن سے سب کے دال دلیے کا انتظام کرتا رہا۔ جب مرا تو فاطمہ کو اس بات کی بھی کہ اب آپ ہی کوئی کام کرے گا۔ گرجب لڑکے بڑے ہو گئے اور میاں کے معمول میں فرق نہ آیا تو فاطمہ نے اس کے باپ کی جگہ سبزیاں لی پھر اس پیچاری کی کوٹھی پہچان آتی۔ سارا سامان ہاتھوں سے سوئیاں چھوٹی تھیں کہیں بچوں کی دو فراکیں بانک چھپر تیار کر لیتی۔

اس زمانے میں تو سلائی مشین بھی مشکل ہوتی تھی اب تو ایک روپیہ روز لگنے والا مزدور بھی جب سال میں ایک تیس سلائی کے تو سلائی کا ایک پیسہ مزدوری کی خدمت میں پیش کرنے کو پہلے ہی رکھ چھوڑتا ہے۔ یہ تو فاطمہ کے بھلے دنوں کی بات ہے جب وہ کم از کم کپڑا نیچ کھا کر اسے سلائی کے لئے کپڑے دیتے تھے۔ اس طرح اس مہنگائی کے زمانے میں بھی کچھ بچت ہو جاتی اور سلائی بھی اس نہ ہوتی کہ گھاٹا اٹھاتا۔

فاطمہ کو بڑی اچھی سلائی آتی تھی۔ سوتیلی ماں آوارے دشمنی کے سارا سامان اپنے آدھے درجن بچوں کے کپڑے سلائی تھی مگر یہ بھی دشمنی فاطمہ کے کام آدھی تھی۔ بھلے کی جو تیں تعریف کرتے ہوئے کہتیں۔ "فاطمہ کے ہاتھ تو جادو کی مشین ہیں" ۔ اپنی تعریف مسکرا کر سنتی ہوئے سلائی۔ ویسے یہ تعریف اس کی سوتیلی ماں کے حق میں بھی جاتی تھی مگر غیر سے کبھی کسی نے سلائی سمجھنے والے کی تعریف ہی نہیں کی ورنہ فاطمہ ضرور سمجھ لیتی۔ سوتیلی ماں کی کوئی اچھی بات سے یاد ہی نہ تھی۔ وہ تو صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ اس کی ماں کی وجہ سے اس کی زندگی برباد ہو گئی۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔ سوتیلی ماں کے لئے کتنی عید بقر عید سے بیاہا تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ کتنا ہے۔ تیس سال کی عمر میں بھی ایک دھیلہ کما کر نہیں دیا۔ بیمار پڑنے کی عادت ہے۔ پھر کبھی اسے بیاہ کر اپنی جان چھڑا لی تھی۔ اسے یہ بات بھی خوب یاد تھی کہ جس دن سوتیلی ماں اسکے جہیز کے پانچ جوڑے تیار کر رہی تھی تو ہر وقت اسے برا بھلا کہتی رہتی۔ اسے یہ دکھ کھائے جاتا تھا کہ اسکے جہیز کے پیچھے اس کے اپنے بچوں کا پیٹ کٹ رہا ہے۔ وہ ان جوڑوں میں جھولا ڈالتے ہوئے تڑپ تڑپ کر اسے کوستی۔ "اے فاطمہ تجھ پر [illegible] عذاب

نہ ہو، پھر بھی اسے چین نہ پڑتا اور وہ فاطمہ کی مرحوم ماں کو بھی باتیں سنانے لگتی۔ خود تو جنم کر چھوڑ گئی اور مجھے مصیبت میں ڈال گئی۔

ان باتوں کو گزرے دس سال ہو گئے۔ سوتیلی ماں کب کی قبر میں سو چکی تھی لیکن فاطمہ اب تک بدلے پر کاربند تھی۔

"اللہ کرے گوبر میں کیڑے پڑیں ہوا" جب وہ سیتے سیتے تیز سی کر کے اٹھتی تو یہ بددعا بڑے بے ساختہ پن سے زبان پر آ جاتی۔ جانے لوگ یہ بددعائیں کیوں دیتے ہیں۔ یہ زمین تو ویسے ہی کیڑے مکوڑوں سے بھری پڑی ہے۔ پھر یہ کہو میں کیوں نہیں آتا کہ بے چاری گو کب کیڑوں سے پاک صاف ہو گی یہ بددعائیں شاید اسی لئے وجود میں آتی تھیں کہ ایک دن زمین میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہو گی۔ پھر فاطمہ کیسے چوکتی۔

اندھیرا شام دندناتی ہوئی چلی آ رہی تھی، اور فراک کا گلا دوبارہ ادھیڑنے کے بعد بھی ٹھیک نہ ہوا تھا تلے اوپر کے تینوں لڑکے اور لڑکی سر پر دھم دھما رہے تھے۔

"اب اٹھ کر آگ نہیں جلاتیں۔ میں قینچی سے گلا کاٹ دوں گا" اس فراک کا" محمد سالار کا ہاتھ میں قینچی لئے دھمکا رہا تھا۔

"ذرا قریب آؤ پھر بتاؤں"

"بڑی آئیں بتانے والی میں تو ساری فراک کاٹ دوں گا۔ ہیں بھوک لگی ہے" وہ دیدے گھما کر آگے بڑھا

"ذرا اور پاس آ" فاطمہ بھی دھمکا رہی تھی۔ ویسے تو بچے چاہے کچھ کر لیتے مگر کبھی دانتیں نہ لگاتے۔ بس زبان ہی چلتی۔

"بھوک لگی ہے" باقی تینوں بھی بڑے لڑکے کی لیڈری میں ٹھنک رہے تھے۔

"مجھے کھانا تو بھوک مٹ جائے" وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ پھر دھندلا چکا تھا۔ اس پر سے ڈوبتے سورج کا دھندلکا مکرے کی دہلیز سے سرکے صحن میں آ گئی۔ لڑکوں نے ماں کو قابو میں آتے دیکھ کر دوسرا حربہ استعمال کیا وہ تینوں مکرے کی چوکھٹ پر چل پڑے فاطمہ سے چاہتی جو زیادہ تھی۔ لڑکی ذات اپنی ماں کے پاس تو سکھی ہے۔ نہ جانے آگے زندگی کیسے گزرے۔

"میں جاؤ بھوکے کو" آخری ناکہ لگا کر وہ جلدی سے ان کی طرف لپکی۔ تینوں لڑکے گلی میں بھاگ گئے۔ اماں لڑکی کو سینے سے لگائے وہ باورچی خانہ میں چلی گئی۔

آگ جلا کر ابھی گوندھ ہی رہی تھی کہ قاسم آ گیا۔ فاطمہ نے چوری چوری اس کی طرف دیکھا اور اپنے کام میں لگی رہی۔

"آگ جلا چکیں؟" وہ باورچی خانہ کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی جلدی سے باپ کی گود میں ہوا ہو گئی۔

"ہوں"

"اچھا آٹا گوندھ رہی ہو؟" اس کی آواز میں بھکاریوں جیسی لجاجت تھی۔

"ہوں"

"اتنی تیزی سے آیا ہوں کہ بس بھول گئی"

"ایں!" فاطمہ کو اپنی سانس گھٹتی محسوس ہونے لگی۔ شام کو چھ سے پہلے آنے کا مطلب وہ خوب جانتی تھی۔

"میں نے آج سلائی نہیں کی" اس نے بہانہ کیا

"تو وہ سامنے کیا رکھا ہے"

"کیا!" فراک تو وہ صحن میں پلنگ پر چھوڑ آئی تھی عقل پہ تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ وہ بڑبڑائی۔

"اب جلدی سے لاؤ بیٹا، بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ سب بہت جا چکے ہیں۔ اگر میں نہ گیا تو وہ کیا کہیں گے۔"

"وہ سب بڑی کی کمائی پر تو غلہ دیکھتے ہوں گے۔"

قاسم چپ رہا۔ ایسی باتوں پر وہ ہمیشہ چپ ہی رہتا تھا۔

"تو میں جاؤں؟ پیسہ تو ہے نا؟ اب کی دفعہ اور کپڑا بھی بہت سا لانا اور شاید فاطمہ کو خوش کرنے کے لیے وہ بچوں کو پیار کرنے لگا۔ فاطمہ کے چہرے پر ناگواری کے آثار لوٹ گئے۔ وہ چپ چاپ اٹھ گئی۔ کمرے میں جا کر وہ قمیض، ازار بند اور پردہ میز پر چھوڑ گئی۔

خادر بوجھ آئی تو شوہر کی ہتھیلی پر سوا روپیہ رکھ دیا۔ بچی کو گود سے اتار کر وہ تیزی سے چلا گیا۔

"ہم تمہاری گود میں بیٹھیں گے بڑے۔" فاطمہ نے ہنستے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

"ہاں چلیں گے۔ لڑکی نے ماں کے غم کی پروا نہ کرتے ہوئے اطلاع دی۔

"اچھا جاؤ کھیل۔" فاطمہ نے ہنس دیا ——— "بیٹا ہونے کا بے جا خدا مجھ موت دے دے۔" وہ بڑبڑائی۔ لڑکی جھڑکی کھا کر باورچی خانہ کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور یوں ہی کرنے لگی۔

سب کہتے کہ قاسم اتنی شادی پر حیران اور بہت خوش ہے۔ اور چونک اسے بہانہ سے پڑھا تھا۔ باپ بہت چاہ سے پڑھا تھا مگر بیٹے پڑھنا بھی وحشت ہی تھی۔ کہنا بات تھا جو چاہتا تھا کہ تمام اتنی شادی پر حیران ہو۔ تمہارے اس کی ہر بات پوری ہو جاتی۔ پڑھنے سے انکار کیا تو باپ کے ذہن میں فوراً آ گئے آئی۔ اتنا تو کر دیا ہے۔ بس ہو چکی پڑھائی۔ کوئی کام دھندا کرو۔ پڑھ پڑھا کر وقت خراب ہو جائے گا۔

باپ کی بات ہو چکی تھی پھر بھی حضرت مانتے نہیں کیں تو اس کے بیٹے کو ٹرافیک کے بیٹے کی جگہ مل گئی۔ اس کے جوتوں موجب میں ایسی ڈوبی تھیں تو بند نہیں گھٹا کہ نوکری جھوٹ نکلا۔ جوتوں کا کبھی چوپیے کا سوداگر لایا ہوا یہ مشقت کیسے برداشت کرتا۔ کھڑے کھڑے پاؤں ٹوٹ جاتے۔ اسٹیئرنگ کرتے کرتے ہاتھ شل ہو جاتے۔ نوکری چھوڑ دی۔ کوئی کرتا اس کے بعد دو تین ہے کہ یہ دوستوں میں بھی ملتا تھا۔ سارا سارا دن اڈوں پر بیٹھ کر ہیں ہنسی کی بازیاں گشتیں تھیں کے پروگرام بنتے دیکھے جاتے اور پھر مکین صورت جائے نکلا کر سو ہتھیلے سے بھنڈنے کے لیے آخری کوشی شادی تھی۔ سوچی گئی دیکھی بھالی بادی بڑھنے کے علاوہ کوئی فرق نہ پڑا۔ اسی طرح پنشن سے سب کا گذارہ ہوتا رہا اور آخر ماں باپ بیٹے کی کمائی کا دان لینے قبر میں جا سوئے۔

ویسے قاسم میں دوسری برائی نظر نہ آتی۔ اپنے کام میں اتنا شریف کہ بھیڑ سر جھکا کر چلتا۔ اگر کوئی زور سے بھی بات کرتا تو سر جھکا کر سن لیتا۔ جب بات ہی نہ ہو سننے میں کیا حرج ہوتا ہے۔ زبان کا ایسا میٹھا کہ بھول سے بھی کسی کو سخت بات کہہ جائے۔ جب سے نوکری چھوڑی تھی باپ بالکل سے اپنی آمدنی بات نہ کی۔ کچھ ایسی لاپرواہی ہو گئی تھی کہ دیکھنے والے کو ترس آتا اور اب تو بیس سال کا بھرا تھا۔ ڈھنے لیاقت کے سخت بات نہ نکلتی۔ فاطمہ سے بھی کبھی سختی سے بات نہ کی۔ باپ کے مرنے کے بعد تو وہ اور بھی جھک گیا تھا۔ فاطمہ چاہتی کہتی گردہ سخت سے سخت مذاق کرتا۔ بڑی خاموشی سے دونوں وقت کھاتا، کھاتا اور سارا وقت باہر گذار دیتا۔ تجربہ تو وہ باپ کے زمانے میں بھی دیکھتا تھا۔ اب بھی اسی کام پر بیوی کی آنکھوں کی روشنی لڑتے لیے سہکاریاں کی طرح اڑ کر اڑتا کہ فاطمہ کو پیسے دیتے ہی بن پڑتی۔

فاطمہ بھی تو ماں کی طرح اسی حد تک بگاڑ رہی تھی جب ساس زندہ تھی تو وہ نہ تھا کہ کہاں بھی دباتی۔ اگر کبھی بھر لیتی تو اس پر بھی "واہ میرا بچہ تھک کر آیا ہوگا اور یہ تو جب سے چلنے کے لائق ہوا ہے نہ اس کے پاؤں دبائے اور اب تم بھول کر بھی مت کہنا" فاطمہ نے اب پاؤں تو دبانے چھوڑ دیئے تھے مگر کھانے پینے کا اسی طرح خیال رکھتی جیسے وہ بے حد کمزور ہو۔ اس کے سامنے ہر وقت کھانا ہوتا۔ اس میں بھی ایک مناسب حد تک شادی

کی تفریح کر بچوں کے دودھ کے لئے جو بکری پالی تھی اس کا آدھا دودھ بھی قاسم کے حصے میں آتا۔ رات سونے سے پہلے سرہانے سے دودھ کا گلاس اٹھا کر پینے سے عار جاتا۔ اگر کسی دن پینے کو جی نہ چاہتا تو پھر فاطمہ سونے سے اٹھا دیتی اور ضد کر کے پینے پر مجبور کرتی۔

اس وقت بھی سے میاں کا خیال کرنے کے باوجود وہ سارا دن کر لیا کرتی۔ کون سی بری بات تھی جو اسے قاسم کے نام پر یاد نہ آتی۔ کسی کسی وقت تو ایسا ہوتا کہ چپکے چپکے گالیاں دیتی رہتی۔ چہرے پر ناگواریوں کی پھٹکار برستی رہتی۔ کپڑے سینے سے اگر کچھ وقت بچ رہتا اسے بھی باہر گلی میں ادھم ڈھالنے والے آوارہ لڑکوں کو چپ چاپ بیٹھ جاتی۔ ایسے وقت میں وہ ان بیتے دنوں کو یاد کرتی جنہیں بولنے روک دیا تھا۔ وہ پیغام آنے والی طرف کے جانے والوں کے تھے ملک کی آزادی کے بعد وہ دونوں گھرانے بھی فاطمہ کے ساتھ ہی یہاں آ گئے تھے۔ راستے میں فاطمہ کا جیا رہتا تھا۔ پھر جب ذرا چین سے بیٹھنے کو ملا تو دونوں گھروں سے پیغام آ گئے۔ کیسے کیسے ناز کچھ اٹھائے تھے۔ کیسی کیسی ادائیں کریں۔ اب تو جانے کتنا ترقی کر چکی ہوں گے۔ ان کی گھر والیاں کیسے مزے میں ہوں گی۔ فاطمہ سوچ کر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ وہ دونوں پیغام تو کیچلے ہی کی طرح اکڑ کر رہ گئے تھے۔ دن دنا سے دکھوں پر دکھ پھیلتے چلے جا رہے تھے۔

شادی سے پہلے کتنے ارمان تھے۔ اپنا چھوٹا سا گھر ہوگا۔ اس گھر میں اس کا میاں ڈھیروں پیسے کما کر لایا کرے گا۔ اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے خوب بن ٹھن کر بیٹھا کرے گی۔ اس کی ایک شادی شدہ سہیلی نے بتایا تھا کہ جب میاں گھر میں آئے تو خوب بن سنور کر بیٹھنا چاہیئے۔ مرد کی ساری تھکن چٹکی بجاتے میں اتر جاتی ہے۔ یہاں تو میاں رات کو دس گیارہ بجے سے پہلے گھر آتا تھا اور جب آتا تو مردوں کی طرح چپکے سے بستر میں دبک جاتا۔ فاطمہ کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا اگر وہ کچھ کہتی تو ایسے گھما کر جواب دیتا جیسے وہ اسے کچا چبا جائے گی۔ کپڑے لتے پہن کر سہانے کا وقت ہی نہ آتا۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ صبح سویرے ہی کام پر نکل جاتا۔ پیٹ ہی شکل سے بھرتے اور پیٹ بھرنے کے لئے دولت کہاں سے آتی۔

اب راستہ کے کنوئیں پر تھے۔ پیچھے پہر سوئے تھے۔ فاطمہ محلہ کی دوکھنی میں مٹی ڈالنے کی بھی چوکیداری تھی۔ آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی نے اتنا تنگ کر رکھا تھا کہ بچے کھچے ٹکڑے بار بار لیے ہو جاتے جنہیں ادھر ادھر ڈھیر ٹٹولنے تنگ آ چکی تھی۔ پھر بھی کام کرتے ہوئے اس کی نظریں ادھر کو اٹھ جاتیں۔ کیسی بنکن بھری تھی ڈھیلوں میں۔ یہ بھی بے چاری فاطمہ کے نصیبوں کے پھیر تھے ورنہ آج اپنے بال بچوں کی مدد کی کمائی کھا رہی ہوتی۔ اس کے خاندان میں تو جھوٹ نے بھی ایسی بات سوچی بھی تھی۔ میاں، باپ، بھائی کو بھی روپیہ دھیلہ کماتے اسی میں گذر ہوتی۔ اگر کبھی کسی زمی کو پرائمری اسکول بھی بھیجا تو سارے تھوڑے تھوڑے پیسے جوڑ کر لڑکی کو کیوں نہ پڑھایا جائے کہ اس کی کمائی کھائی ہے۔ سلائی کرتے ہوئے جب فاطمہ کو اس کا خیال آ جاتا تو اسے زلت کے دورے پڑتے۔ اس دن قاسم کی بھی خیر نہ رہتی۔ ایسی سنائی کہ دھوئے نہ چھوٹے۔ مگر کیا مجال جو وہ پلٹ کر جواب دے جائے۔ چپکے سے کھانا کھا اور بستر پر لیٹ کر ٹانگیں دبانے لگتا۔ ساس کی زندگی میں فاطمہ کے چار بچے ہو گئے تھے ان کے مرنے کے بعد تو جیسے اس نے بڑھاپا دیا تھا۔ کبھی کبھی میاں کے قریب جاتے ہوئے بھی اس کا دل نہ جانے کیسے ہونے لگتا۔ وہ قاسم جو ہر سال تھا جب سے اس کی ماں اور ابا مرے، جیسے جنگ سا دھر لیا۔ ایک آدھ بار جو اس نے سہما سا اشارہ کیا تو فاطمہ بھڑ اٹھی۔ ”اے شرم نہیں آتی مفت کی کھا کھا کر اتراتے ہوئے۔“ اور قاسم بھیگی بلی کی طرح سکڑ کر رہ گیا۔

رات دس بجے کے قریب قاسم کو دیکھ کر کہ وہ تو سیدھا اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ سلائی چھوڑ کر فاطمہ کھانا لے آئی۔ پھر خود بھی اٹھا کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ گلی پر ابھی سے کتنا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ جا بجا کہیں کہیں کتے بھونک رہے تھے۔ چاند کی تیرھویں تاریخ تھی۔ پیلے شفاف آسمان پر بادلوں کے دو چار ٹکڑے بچے کھچے ٹکے ہوئے تھے۔ فاطمہ کنوئیں میں بھرے ہوئے پانی کو پونچھ کر کسی وقت آسمان کی طرف دیکھ لیتی۔ آنکھ لگنے لگتی تو ایک دم چونک کر اٹھ جاتی۔ دستے بہت سے پلنگ اٹھا کر اندر کمرے میں لے جانے پڑتے۔ قاسم تو سب سے پہلے اٹھ کر کمرے میں جا سو جاتا۔ ایک ہی بار فاطمہ نے زور کر اس سے پلنگ اٹھوانے تھے تو کمر میں ایسی تکلیف ہوئی کہ تین دن گھر پر پڑا کراہتا رہا۔ اس کے یار دوستوں کا تانتا بندھ گیا۔ چلتے پانی سے ان کی حالت کرنی پڑی اور کہ کہ کر اٹھیں

گر کے اٹھ بیٹھ گئے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" فاطمہ نے سہمے ہوئے لہجے سے پوچھا۔ قاسم نے کھڑکی پلنگ کے نیچے سرکا دی۔

"ارے بڑی اچھی فلم تھی اور فلم سے پہلے تو ایک نرس کی بات دیکھی۔ وہ ہیں امریکہ کے لوگ۔ وہ چاند پر چلے ہیں۔ پہلے انھوں نے ایک راکٹ بھیجا ہے۔ یوں شوں شوں کر کے چاند کی طرف بڑھتا ہے کہ مزہ آگیا۔" قاسم نے بہت خوش ہو کر بتایا۔ اگر کبھی فاطمہ اس بات پر ہنستی تو وہ کچھ نہ کچھ سنا جاتا۔

"کیا یہ لوگ دن کو یہ گانا کرتے۔ چاند پر کونسی دولت رکھی ہوگی؟"

"ارے دولت ہوگی بھی تو نا۔ لے کے تو نہ چلے جاؤں۔" وہ ہنسا۔

"ہوں!" ــــ اس نے منہ پر ہیٹ کر رکھ لیا۔ "اب تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا ــــ تم سے زکری تو ہوتی نہیں۔ چاند پر گیسے جاؤ گے باتوں میں مہینہ آجائے گی ــــ" فاطمہ نے فالیں بھجا دی اور منہ پر کر کے سو گئی ــــ "کیا مل گیا ہے پیسے اکٹھا کر کے۔ اب کل کے لئے تھک ماندی گی تمہارے تو بھرا ہی ہیں ــــ" وہ کروٹ کے چٹنگ کی طرف ہو لی۔ قاسم یا تو بیٹھا تھا یا جلدی سے لیٹ گیا۔ اور چادر میں منہ چھپا لیا ــــ "کب تک میری آنکھوں کی کمائی کھاؤ گے۔ اللہ کرے پھوٹ جائیں یہ آنکھیں ــــ" اس کے بچے نے رو کر گود میں اٹھا کر قاسم کے پہلو میں سلا دیا۔ تینوں بچے ایک ہی پلنگ پر کھٹی پر ٹے ہو گئے تھے۔ فاطمہ اپنی لڑکی کے پاس لیٹ گئی۔

"مرے نے وہ سوکا گلاس رکھا ہے۔ وہ بھی پی لو۔ خوب پیٹ بھر جانے تو نیند آتی ہے۔" فاطمہ کو بچے کا ظہر کے کھانے کو کہنا دے رہا تھا۔

"اب بھوک نہیں۔" قاسم نے کہا۔

"بھوک نہیں۔" یہ کہتے کہتے اور کو رونا آ گیا۔ "میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔" اس نے جل کر کروٹ بدلی اور دوپٹے سے منہ چھپا لیا۔ ہوا نے مزے تیز ہو چلی تھی۔ بادل گھر کے آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ تھکن اور آنکھوں کی جلن کے مارے نیند کو سول رہی تھی۔ ہاں قاسم کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ فاطمہ نے منہ کھول کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر اس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ چادر میں سکڑا سمٹا قاسم گٹھا ہوا اور چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔ ویسے بھی چالیس سال کی عمر میں اس کے سر پر بے رحمتیاں پڑنے لگی تھیں۔

اندر پلنگ کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر شانہ جھکا کے اٹھا دیا۔

"یہ دوا پی لو۔" اس کی آواز گلوگیر آنسوؤں کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔ قاسم نے گلاس کے ساتھ فاطمہ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اس نے تھی بید دلی سے اپنا ہاتھ چھپا لیا۔ "نہ ٹنگ۔ دوا پی لو۔" قاسم نے دوا پی کر لیٹ گیا۔ فاطمہ کی زندگی اس کی ساری جان میں رینگ رہی تھی۔ اس نے بے حد ٹھنڈی سانس بھری اور چادر کے اندر سکڑ کر رہ گئی۔ گلی میں آوارہ کتے منہ اٹھائے رونے چلے جا رہے تھے۔ فاطمہ اپنے پلنگ پر لیٹ کر سو رہی۔

"ہائے ابا جی گھر میں کیڑے پڑیں۔ تمہاری جائیوں کے آگے آئے۔" اس نے جھک کر کوسا۔ ایک ذرا سے رونے نے آنکھوں کی جلن کو گھنا تیز کر دیا تھا۔

ذرا نیند کی ہوکی نے جھریوں زدہ چہرے کو سہلا دیا۔ "لو بھلا کوئی اس طرح سوتا ہے۔ یہ لیجئے ٹانگیں ہیں کہ لکڑی کا کندا۔ ہیں غریب جان کر ایسا کام کیا ہے کیا ہمدردی سے نہیں رہ سکتے تھے۔"

فاطمہ کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے تو بڑے وثوق سے یہ کہا تھا کہ اب آنکھیں ہی ساتھ دیں تو کوئی کیا کرے۔

"میں تو تمہیں نہ لوں گی۔ نہ سلمیٰ کا ایک پیسہ دوں گی۔" اسے ٹھیک کر کے لاؤ۔"

فاطمہ پھر لے کر واپس آئی اور سارا دن دھیرے دھیرے کرسیتی رہی۔ آنکھوں کے سامنے بار بار دھند چھا جاتی۔ پانی اتنا بہا کہ دو پشتے تو ہو گیا۔ پھر ڈرائیور کی بیوی کی مرضی کا تو نہ سلا مگر سلمیٰ مل گئی۔ اس کے بعد تو فاطمہ سب کے کپڑے سینے لگی۔ روز دو کپڑے واپس ہوتے۔

"ہم تو تمہارا خیال کرتے ہیں کہ شریف عورت ہو۔ وقت پڑے پر کام کر دی ہو۔ اور تم ہو کہ اس طرح کپڑوں کا ستیاناس مارتی ہو۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔" فاطمہ جھنجھلا اٹھتی۔ عورتیں اسے اور کپڑے دیتے ہوئے گھبراتیں۔

اس دن خانساماں صبح صبح منہ اندھیرے دھمکا کر اسپتال چلی گئی۔ اب تک تو صرف اس کے ٹانکے ہی کھلتے رہے اور کرائے کے لئے پیسے نہیں بچے پیدا لگی تو اتنی تنگ جائے گی کہ پھر کام کس طرح ہو گا مگر اب روز روز کی جھانے اسے اسپتال جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ آنکھیں ہی تو اس کی روزی کا ذریعہ تھیں۔ اسپتال تک کا راستہ پورے ایک گھنٹہ میں طے ہوا۔ اس پر پندرہ بیس جھونپڑوں کے بعد اس کی باری آئی۔ ڈاکٹر نے جو اس کی آنکھ میں خاکہ نہ پایا۔ اگر کبھی بھی تو صرف اتنا ہی کہ وہ نظر کا چشمہ لگوا لے۔ لکھی ہوئی دوا دن میں تین بار آنکھوں میں ڈالے پھر کچھ دن بعد اسپتال میں داخل ہو کر آپریشن کرائے۔

فاطمہ جب اسپتال سے واپس ہو رہی تھی تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اپنی آنکھیں ڈاکٹر کے پاس رہن رکھ آئی ہے۔ روز بروز غم کے مارے کی گھٹا چھا رہا تھا۔ نقاب کے اندر بار بار آنکھوں کو رگڑتی گرد و دھند چھٹتی۔ چار چھ دن سے تو آنکھوں کی بری حالت ہو گئی تھی۔ ہاتھ روکھ کے بے تحاشہ قدم اٹھاتے ہوئے رونے لگی۔ کمبخت دھند پھر بھی صاف نہ ہوئی۔ یہ بھی کوئی گرد کے طوفانوں کی دھند تھی جو بادل سے چھٹ جائے اور آسمان نکھر کر رہ جائے۔ یہ تو وہ دھند تھی جو آنسوؤں سے اور بڑھتی تھی۔

سارے راستے رونے کے بعد گھر آ کر اسے ذرا سکون ہوا۔ کچھ عجیب سی امید شاید اب اس کی زندگی آرام سے کٹ جائے۔ اب آس کا خوبر یقیناً کوئی کام کرے گا اب تو وہ آنکھیں ہی نہ رہیں جن پر سب عیش کرتے تھے۔ آج بڑی مدت کے بعد وہ قاسم کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ گلی میں ذرا سی چاپ ہوتی تو چونک اٹھتی۔ اور جب وہ آیا تو اس کی طرف لپکی۔

"ہو گئے؟"

"ہاں ابھی دیر تو نہیں ہوئی۔" قاسم کپڑے بدل کر اپنے بستر کی طرف بڑھا۔

"آج میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔"

"کیوں؟"

"میری آنکھیں جو خراب ہو رہی تھیں۔ تمہیں کیا پتہ"۔ وہ قاسم کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"نہیں نہیں مجھے تو معلوم تھا۔" وہ بوکھلایا۔

"ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ نظر کا کام کرانا چھوڑ دو۔ ورنہ اندھی ہو جاؤ گی۔ دوا بتائی ہے اور پھر کہا ہے کہ اسپتال میں داخل ہو جانا۔ آپریشن ہو گا۔" وہ سخت فکرمند ہو گئی۔

"پھر اب کیا ہو گا؟" اس نے بڑی امید سے قاسم کی طرف دیکھا۔

"بھائی ڈاکٹر کہتے بھی ہیں۔ میں تم کو سرد اور دن کا حکیم صاحب کا بیٹا بہت دوست ہے۔ اس سے تو بڑے بڑے جانے بھی کترا جاتے ہیں"
فاطمہ نے کتنی ہی گفتگو سے دیکھا دل پر کسی چوٹ لگی تھی۔ وہ اس وقت مائے رکھ کے کچھ کہہ سکی اور چپ چاپ باورچی خانہ میں چلی گئی۔ ہنڈیا بھی دم توڑ رہی تھی۔ وہ اسے سنبھالنے لگی مگر کام نہیں کرے گا۔

کھانا اس کے سامنے رکھ کر فاطمہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ قاسم سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا اور فاطمہ دوپٹے کے پلو سے منہ چھپائے آنسو بہاتی رہی۔

دوسرے دن قاسم پھر سویرے کی ایک بڑیا لے آیا۔

"حکیم صاحب کہتے ہیں کہ یہ مچھلیوں کے ہر مرض میں فائدہ دیتا ہے۔ انشاء اللہ تمہاری آنکھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی"

"ہوں" فاطمہ نے بڑیا اس کے ہاتھ سے لے کر نالی میں پھینک دی۔ قاسم سر جھکائے کمرے میں چلا گیا۔

"ہائے میری آنکھوں کے علاج کی کتنی فکر ہے! اس نے نا کردہ گناہ کی کتنی سزا دی ہے! جو تم کو محنت مزدوری کرنی پڑے تم سا بے شرم اس دنیا میں کون ہوگا اللہ کرے میری آنکھیں پھوٹ جائیں"

قاسم سر جھکائے کھڑا سنتا رہا اور قاسم کرتے میں دم گھٹ رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دو چار دن سلائی کا کام نہیں کیا۔ راشن کے بچے کھچے ٹکڑے سے کام چلاتی رہی۔ اس سے آگے کیا کر سکتی تھی؟ آخر کو سلائی کا کام لینے والے کپڑے تو مانگتے اگر ایسے ویسے کپڑے پر سب نے بہانے کرنے شروع کر دیئے

"اے فاطمہ اس بھنگانی کے زمانہ میں کون دو دو کپڑے خریدتا ہے" بھلا اپنے کپڑوں کی کون گت بناتا۔ اب تو مانگے تک سیدھے نہ ہوتے خاوند ہر گھر سے مایوس لوٹتی۔ "کمبخت فقیر جا جا کر دیں کیا اچھا ہوتا کہ وہ کہیں امیروں کے محلے میں بستی ہوتی"۔ فاطمہ کو اپنی سلائی کے بجائے اپنا پڑھا لکھا ہونا سب کچھ بھی نہ آتا کہ کیا کرے۔ گھروں گھروں سیر سیر آٹا مانگتی پھرتی۔ کچھ دن تک تو قرض ملتا رہا مگر جب واپس ملنے کی امید نہ ہو تو روپے کا تین سیر آٹا کون قرض دیتا ہے۔ یہ کوئی مسجد کا لنگر تو تھا نہیں کہ دروازے پر آیا ہوا فقیر بھی پاؤ ڈیڑھ پاؤ آٹے پا جاتا۔ دن بڑے کٹھور ہو گئے۔ بچے جان توڑتے۔ فاطمہ تب تب اپنی بوائی کی قبریں کیڑے ڈالتی رہی۔ قاسم نے دس پندرہ دن سے دوپہر کو گھر میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ ماں جب آتا تو بھوک سے ہونٹ خشک پڑے ہوتے۔ چہرے پر جیسے کسی نے مٹی مل دی ہو۔ فاطمہ سے کیا چار کرتا تھا۔ جو منہ میں آتا کہتی۔ اب تو اپنی دکھی تو نہیں لڑتی کہ سارا محلہ سنتا۔ قاسم جلدی جلدی سودا بیچ کر گھر آنے لگتا۔ ان دنوں وہ کیا کمزور لگنے لگا تھا۔

انسان تو اپنے بچوں کی بھوک بھی نہیں دیکھ سکتا پھر اپنے بچوں کو تڑپتا ہوا کیسے دیکھے۔ یہ حضرت انسان پر دل سے ناطہ خاندانی رشتہ وغیرہ یہ سب مگر وہ خصوصیات پیدا کرنے سے رہے۔ بندر یا کا جسم جلے تو اپنے بچے کو اٹھا کر نیچے پھینک دیتی ہے۔ فاطمہ سے ایک دن بھی یہ نہ ہو سکا اپنے بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ سکتی۔ شرم و حیا اور خاندان کی عزت کی پروا کرتے ہوئے وہ دو چار گھر چھوڑ کر پیتے گھروں میں اور بھی کام کرنے لگی۔ اس پورے محلے میں بس ایسے چار ہی گھر تھے جو تھوڑی سی اجرت دے کر کام کرا سکتے۔

تین چار گھروں میں جا کر برتن اور کپڑے دھونے کے علاوہ اس بارہ آنے ملتے۔ ساتھ ہی ایک وقت کی خوراک مل جاتی۔ دوپہر تک کام ختم کر کے وہ اپنا کھانا لے گھر واپس چلی جاتی۔ اپنے حصے کا کھانا قاسم کے لئے رکھ چھوڑتی۔ جب سے فاطمہ نے کام شروع کیا تھا وہ دوپہر میں چند منٹوں کے لئے آنے لگا تھا۔ کھانا کھا کر جلدی سے واپس چلا جاتا۔

ان بارہ آنے میں چھ جانوں کے پیٹ خاک بھرتے۔ بچے ہر وقت بھوک بھوک کرتے رہتے۔ البتہ فاطمہ کا یہ حال کہ ایک دو چھلکا کھا لیتی بچے

کے خیال سے دوسرا بچہ نہ اٹھاتی۔ خالی معدہ خاوند کی جان سفید رنگ پر پلی مل گئی تھی۔ قاسم جب گھر آتا تو فاطمہ کی زبان تیز کھدار ہو جاتی۔

دھر کچھ دنوں سے فاطمہ نے قاسم سے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا تھا۔ بچوں کو پیٹ بھر کھانا مل جاتا۔ فاطمہ کے چہرے پر بھی رونق آگئی تھی۔ بچوں کے لئے ایک ایک جوڑ کپڑا بھی بن گیا تھا۔ مگر اب جانے کیوں وہ ہر وقت چپ رہتی۔ فاطمہ جو ہر وقت کسی جھگڑتی رہتی اب بالکل خاموش رہتی۔ قاسم بڑے مزے سے کھانا پیتا۔ ایک دو سالہ بچوں سے باتیں کرتا مگر فاطمہ اسے جیسے نہ دیتی بلکہ اب اس کے کھانے پینے کا زیادہ ہی خیال کرنے لگی تھی۔ ان دنوں آمدنی بہت کھانے نے کمزور کر دیا تھا۔ کئی دن تک اسے بخار بھی آتا رہا۔ اس کی کھوئی ہوئی طاقت واپس لانے کے لئے چاہے کے ساتھ پراٹھا بھی پکنے لگا تھا ان مداراتوں کے باوجود فاطمہ نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ جب وہ گھر آتا اور اپنے بچوں کو سینے سے لگا کر ہنستا بولتا تو فاطمہ دور بیٹھی اسے دیکھا کرتی۔ قاسم اچھا کر اس سے باتیں کرتا مگر وہ دوسری طرف منہ پھیر لیتی۔ اس کے چہرے پر ایسی نفرت ابھرتی کہ قاسم بوکھلا کر رہ جاتا۔

یہ مزے مزے زندگی گذارنے پر کوئی کس طرح سوچتا کہ صرف چند برتن کی برکت ہے۔ یا تو فاطمہ بھوکے پرندوں کی طرح چہچہاتی اب ہر وقت صاف ستھری نظر آتی۔ آنکھوں میں سرمے کی باریک دھاری دیتی۔ نفیس سرکوں چلا بلاؤز پر کس کو پھر آتا۔ عورتیں دوسروں پر دھونس جما کر اپنے مال کی بات کہنے لگیں۔ فاطمہ سنتی تو کلیجہ پھاڑ کر رکھ دیتی۔

"دیکھو تو پاپا ہاتھ گھس گئے برتن مانجھ مانجھ کر پیاز کی کھار سے آنکھیں نم ہو گئیں"۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا دیتی۔ برتن مانجھ مانجھ کر ہتھیلیاں گلابی رنگ سے بھور ہو گئی تھیں اور پھٹی ہوئی ہتھیلیوں پر کالی کالی لکیریں اس کی کم نصیبی کا پتہ دیتی تھیں۔

"لوگ خواہ مخواہ کہتے ہیں اے چاچی بدنصیب کو، میاں ایسا ہوتا تو آج کیوں کسی کی باتیں سنتی"۔ اطلاع دینے والوں کو نوالہ تر نہ آجاتا۔ سننے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ "کوئی نانی کا لال پکڑ کر دکھائے"۔ وہ نظریں جما کر ٹھنڈی سانس بھرتی۔

اور اسی دن فاطمہ کو موقع پر پکڑ کر دکھا دیا گیا۔ وہ ٹھیکیدارنی کے ہاں اوپر کے کام پر لگی ہوئی تھی۔ دس روپے مہینہ اور ایک وقت کا کھانا۔ ٹھیکیدارنی اس سے بہت خوش تھی۔ ذرا ذرا سے لونڈے بھی کام کے لئے رکھو تو تیس پچیس روپے کی بات کرتے۔ فاطمہ نے تو کبھی منہ سے اتنا بھی نہ کہا تھا۔ اس نے جو کچھ دیدیا چپکے سے رکھ لیا۔ انھیں دنوں ٹھیکیدارنی کا بھائی ان سے ملنے آگیا۔ بھائی کو پہرہ وقت پیاس لگنے لگی۔ بار بار خانے جن کے ہوئے کورے گھڑوں کا پانی پی پی کر پیٹ نہ بھرتا۔ اللہ جانے کہاں کی آگ لگی تھی سینے میں جو بجھنے میں نہ آتی۔ ٹھیکیدارنی کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔ ایک بار دبے قدموں پیچھے ہو لیں۔ راستے میں زور سے اتلاج ہونے لگا۔ اس بلڈ پریشر کے مریض نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اور جب انھوں نے دیکھا نرس کرنے لگی کہ بچہ بچوں کی اماں ان کے معصوم کو مارے بھائی کو خراب کر رہی تھی۔ حد ہے کہ وہ اس کا دودھ پی رہا تھا اور وہ نخرے کر رہی تھی۔ بھائی تو خیر ذرا معصوم بن کر دم چھلا گرفاطمہ جیسے جیتے ہی مر گئی۔

"ہری بے شرم پانچ ہاتھ کا میاں دکھ کر یہ حال ہے، کنوارے لونڈے کو چھل بے شکھاتی ہے"۔ انھوں نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس جوش کے ساتھ اپنے کمرے تک کھینچتی لے گئیں۔ ان کی اماں کو معلوم ہوا تو وہ بھی تڑپ اٹھیں۔

"اچھی تو میں لڑکے کے ساتھ شہر آتی نہیں، خدا بچائے یہاں کی عورتوں سے" اماں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔

ٹھیکیدارنی اور ان کی اماں کی اونچی آوازیں سنکر پچھلی منزل میں رہنے والی پڑوسن بھی آگئی۔ اب ان تینوں کے بیچ میں کھڑی ہوئی فاطمہ ایسی لگتی تھی جیسے ابھی ابھی بیوہ ہو گئی ہو۔

"صدقے جاؤں کس منہ سے کہتی تھی کہ کوئی نانی کا لال پکڑ کر دکھائے اور ادھر ہمارے ہی گھر میں ہاتھ صاف کر رہی تھی" مکرم سب چپ

کیوں کھڑی ہے؟ ٹھیکیدارنی بری طرح پھنس گئی تھیں۔ کنوارے بھائی کی منگنی ہو چکی تھی۔ بھابھی کب برداشت کرتیں کہ ایسی جھوٹوں کے پیر میں پڑے۔ اس پیر میں پڑنے سے خاندان تباہ ہو کر رہے گا۔ فاطمہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس نے اب تک ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ بس اتنا معلوم ہوتا کہ ابھی پتی جان پیٹ پیٹ کر بین شروع کر دے گی۔ کھڑے کھڑے وہ اس طرح دھپ سے زمین پر بیٹھی جیسے کسی نے دھکا دے دیا ہو۔

"اب کچھ بول بھی نا کہ لڑکے سے کیوں جیلیں گر رہی تھی۔ شرم نہیں آتی۔ تیری اوقات کے برابر ہوگا۔ کیسا بدلہ دیا ہے میرے احسانوں کا۔ ایک روٹی زیادہ ہی دے دی کہ اس کے بچے میں ٹھیکیدارنی کی زبان نہ رکتی۔

"کچھ تو بتا بھی نا کہ کیا ہوا۔ کچھ پتہ بھی چلے۔ کیوں فاطمہ کیا ہوا؟" پڑوسن فاطمہ کے منہ سے سننے کو بے تاب تھی۔ مگر فاطمہ اس طرح چپ تھی جیسے پیدائشی گونگی ہو۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"چوری اور سینہ زوری تو دیکھو کہ سب کہہ کر تھک گئے۔ اللہ شاہ صاحب کی زبان نہیں کھلتی۔" ٹھیکیدارنی کی ماں حیران ہو کر فاطمہ کو دیکھ رہی تھیں۔ "اللہ ایسی عورتوں کو اٹھا لے جو پردہ رہ جائے۔" فاطمہ نے سر اٹھا کر سب کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

"دیکھو فاطمہ تم کچھ بتاؤ گی بھی یہیں بھی بات معلوم ہوگی۔" پڑوسن نے فاطمہ کا شانہ تھپکا۔ "گھنٹہ ہو گیا تم چپ بیٹھی ہو۔ تمہارے بچے اکیلے پیچھے ہوں گے۔ انہیں بھی تو کھانا پکا کر دینا ہوگا۔"

فاطمہ جیسے یک دم چونک پڑی۔

"تم ہو بھی کچھ بولتی یا" وہ ایک دم گھڑکی ہو گئی۔

"بھلا کوئی بھی مردوں پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی۔" ٹھیکیدارنی کی ماں غصے سے لال پیلی تھیں۔

"میں اپنے بچوں کو روٹی کھلا آئی۔" فاطمہ نے اس طرح کہا جیسے کوئی بات کہی ہی نہیں۔

"تو پھر۔ میں بھوکے بچوں کی جان چھوڑ دوں گی۔" بھنگیا جا۔" ٹھیکیدارنی کو اپنے بھائی کی بے رنگی ہی کا یقین تھا شاید۔ تبھی تو وہ فاطمہ کے پیچھے پڑی تھیں کہ اظہار جرم کرے۔

"مجھے صاف دے وہ آپا۔ وہ پانچ روپے جو تمہارے بھائی نے دیئے تھے یہ بھی رکھ لو۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے نوٹ کھول کر پلنگ پر پھینک دیا۔ "وہ تو بالکل شریف ہے۔" اس نے ٹھیکیدارنی کی حماقت سے ٹھیکیدارنی کو دیکھا۔

ٹھیکیدارنی اور ان کی ماں کا منہ اتر گیا۔ کبھی لڑکے کے لئے ایسی ویسی بات نہ سنی تھی۔ سب تعریف کرتے تھے۔ پڑوسن کے سامنے کیسی بھد ہوئی۔

"تو نے سکھا کر بھیجا ہوگا۔"

"ہاں تمہارے بھائی جیسے لوگوں نے تو یہ سب سکھایا ہے۔"

"مگر فاطمہ تم ایسا کیوں کرتی ہو۔ بتاتا شہر ہے۔ بچے ہیں۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی۔" پڑوسن نے فاطمہ کو سمجھانا چاہا۔

"ہاں آپا میرا شہر ہے مگر کہاں ہیں اب میری آنکھیں جو اب لڑنے گئی ہیں تو کیا کروں۔ دس سال ہو گئے میں نے بیٹے رکھ چھپائے ہیں۔" فاطمہ نے جیسے سب کچھ خواب میں کہا۔

"تو اسے نکال باہر کر دے کیوں کھلاتی ہو اسی لئے تو کما کر نہیں دیتا۔" پڑوسن نے بھد اڑنے سے مشورہ دیا۔

"نکال دوں گی تو بھوکا مر جائے گا۔ یہ نہیں کر سکتی۔"

مرنے والا بھی جانتا ہے ایسے لوگوں کا تو مرنا ہی اچھا ہے تم کیوں اس سے عشق کرتی ہو؟ تھپکیدار بی بی اب کچھ نرم پڑ چکی تھیں۔
"میں اس سے عشق کرتی ہوں!" ــــ ناظم نفرت سے چیخی اور پھر زمین پر تھوک دیا۔ "میں اس سے عشق کرتی ہوں!" ــــ اس نے بیزار نفرت سے دیکھا ــــ "خدا اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر کہو کیا اسے مرنے کی چھوڑ دوں؟ وہ میرے بچوں کا باپ ہے میرے بچے پھر کسے باپ کہیں گے؟" ناظم اس طرح بلک بلک کر رو رہی تھی جیسے اسے پتہ لگا ہو، وہ روتی ہوئی اٹھ کر چلدی۔ خدا دیر کو سناٹا طاری ہو گیا۔ بڈھن کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔

ویران گلیوں میں بارش

اے حمید

شہر کے اندر کی ایک تنگ و تاریک گلی ___

دونوں جانب پرانے مکانوں کے بھیگے ہوئے بھاری بھرکم چھجے تدریجی قوسی طرز کے ہیں۔ ان کا رنگ، پلاستر اور دھوپ کی ادرے اڑ گیا ہے۔ زیادہ تر مکان بند ہیں۔ شاید ہی کسی مکان کے پٹ کھلے ہوئے ہیں اور جو اب دار کھڑکیوں پر پھول پتی کا کام بھی کیا گیا ہے کہیں کہیں ان کھڑکیوں کے بغلی میں اونچے لمبے جالی دار مچھر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ گلی کا بیچ کا پختہ فرش خاصا نشیبی ہے اور اس کے بیچوں بیچ نالی کا پانی بڑی تیزی سے بازار کی طرف بہہ رہا ہے۔ اس گلی میں کشمیری اور غیر کشمیریوں کے ملے جلے گھرانے آباد ہیں۔ سالہا سال سے ایک ہی گلی کی رہت بست نے ان کے میل جول میں ایک ہی گھرانے والی یگانگت اور بھائی چارہ پیدا کر دیا ہے۔ اس کے باوجود کا تکراریاں، سماوار اور شب دیگ آپ کو کشمیری گھروں میں ہی ملے گی۔ اسی گلی کے ایک اونچے 'لمبے' بھدے سے مکان میں آج بہت چہل پہل نظر آ رہی ہے۔ رات کا پچھلا پہر گذر گیا ہے اور ادھر ادھر مکانوں میں لوگ سو بھی گئے ہیں لیکن اس مکان میں چھوٹے بچوں کے سوا سبھی جاگ رہے ہیں۔ جالی دار کھڑکی کے پردے کی درزوں میں سے بجلی کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی ہے۔ مذہبی رسوم اور بجلی جوتی چھت والے کمروں میں پرانی طرز کی گلاس شمائیاں روشن ہیں یہاں وہاں خالی سفیدیوں اور گوٹے کے سرخ کناروں والی پتلی پتلی رلائیاں رسی کے اشغار میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہی ہیں کوئی نئی سفیدیوں میں کھل کر بات کرتے ہوئے گھبرا رہی ہے اور کوئی بڑی عورتوں کی سی متانت سے گردن اٹھائے پلکیں جھپکائے اپنی خاکی نقشہ بیان کر رہی ہے کوئی اس امید میں بار بار کان کھڑے کر رہی ہے کہ شاید کہیں سے برات کے باجے کی آواز سنائی دے جائے کسی نے سیٹ کریپ کی قمیض پر حنائی مجھار نشار کھی ہے تو کسی نے شیفون کے دوپٹے پر سرخ کرن کی گوٹ سجائی ہوئی ہے جن کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا وہ کچھ جھجکی کچھ مارے جذبوں کی دبی دبی ہنسی سے لدی ہوئی میں ایک لڑکی کے لئے رات بڑے چاؤ سے ہاتھوں پر مہندی رچائی تھی۔ مگر سونے میں ایک ہاتھ گال سے چھو گیا جتنا چہ منہ پر بائیں جانب مہندی کا خاکی دھبہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ موٹے جان کی ایک لڑکی سی لڑکی کرنے میں مگن ہے۔ مہندی کے سوکھے ہوئے پپڑی سبز چائے میں دانستہ ناں ڈبو کر کھا رہی ہے ایک شوخ لڑکی کہیں سے ڈھولک اٹھا لائی ہے اور اب اپنی سہیلیوں کے بیچ میں بیٹھی گردن جھکا کر گا رہی ہے۔

بانہ دکیت کی اے نگری
میں ناں ٹنگ ٹنگ ہوئی سکھیاں
تیریاں نھماں ریچ جیویں ڈھولا

دختر کراری

کنکے تاباں

کتنی بھولی ہے یہ شرمیلی آنکھوں والی لڑکی۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ اگر اس کا بھولا نوکر کسی سے یہ کہہ کر واپس آگیا تو وہ سمجھ گزیدہ ہو جائے گی پھر بازار میں "نکڑی" بیچے گی اور نہ گھر میں ڈھولکی کا رسیا نی دے گی۔ نکڑی لٹ جائے گی اور گھونگھٹ پھٹ جائے گا لیکن بے وقوف وہ کسی سے میں گائے جا رہی ہے۔ اچھا ۔۔۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر گائے جاؤ گائے جاؤ مگر اپنے گھر میں نہیں۔ سیاہ دیوے گھر میں ہے اور سیاہ والے گھر میں تو ایسے گیت رات گئے گنگناتے ہیں جب اپنے گھر میں سے کوئی دیکھا جائے گا۔ کہیں ۔۔۔

۔۔۔ دختر کراری

کنکے تاباں

دوسرے کمرے میں اوپر تلے عمر کی کچھ عورتیں بچوں کو ساتھ لئے سو رہی تھیں ایک عورت جاگ کر خواب میں بیٹا اٹھائے ہوئے اور اسے گھٹنے ٹیک رہی ہے۔

"تینوں نیند نہ آوے ڈوری اکھ نہ لگے"

دالان میں نلکے پر الباکی چچی بیس صابن سے منہ دھو رہی ہے کچھ لڑکیاں دکان کی چھت پر گھوم پھر رہی ہیں اور سیٹن کی دوسرے دکھائی دینے والی رنگینیوں کا نظارہ کر رہی ہیں۔ دو سہیلیاں چنگڑی پر بیٹھی چائے کے پیالے ہاتھوں میں لئے باتیں کر رہی ہیں۔

"صغرا کریم نے تشبیل کا جوڑا دیا تھا۔"

"اور میں نے سونے کی انگوٹھی دی تھی مگر ابا اس کے خاوند کا سارا گھنٹا تا سنبھال کے بے چاری کو گھر سے نکال باہر کیا۔"

"ہاں بے چاری بدقسمت نکلی۔ سنا ہے آج کل "کراچی" میں ہے۔"

"میں اپنے بھائی کے پاس ہے ۔۔۔ چار میں ٹھنک اچھا ہے۔"

"خیر سے وزیر خالہ چولھے کے پاس بیٹھی ہے۔"

دکان کی اس ٹرائیکا میں ہنسی دبکیاں، مجرے اور سالے کی پڑیاں اور چاند بھی لئے بیٹھا ہے اور دیئے کی دعوت کا بندوبست کر رہا ہے۔ سیاہ والے گھر سے لے کر بازار تک گلی کوچے اور آسمے تیوں سے خوب سجایا گیا ہے۔ گلی کے موڑ پر کیلے کے درختوں کے بڑے بڑے درختوں کو اوپر سے خاکستری اندازہ بنایا گیا ہے اور میان میں تیلے اور سرخ لب رنگین میں ایک لڑکا کیلے کا تنا اور ساگوٹ کر اس میں سے جھلی اور سفید ریشم نکال رہا ہے۔ ابھی رات بہت باقی ہے ابھی دن چڑھنے اور گلی والی مسجد میں اذان ہونے میں کافی دیر ہے ڈیڑھ گھنٹی میں چارپائی پر دیئے سو رہے ہیں ایک گھنگھریالے بالوں اور سیل ناک والا لڑکا کسی پر تنگیں پیارے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے مگر وہ سونا نہیں چاہتا بلکہ دانتوں میں دیا سلائی سے خلال کرتے ہوئے اوپر کھڑکی کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک لڑکی جامنی رنگ کے سوٹ میں ملبوس چق کے ساتھ لگی کھڑی ہے کمرے میں روشنی ہونے کی وجہ سے اس لڑکی کے چھریرے جسم کا خاکہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ مچھلی ہوا دوپٹہ اوڑھ کر اس کے بازوؤں پر آن گرا ہے ایک دل آویز دبلی سی بانکپن کی صورت میں سر کے بالوں کے درمیان سے گذر گئی ہے اور وہ کچھ اس انداز سے کھڑی ہے کہ اس کی گردن میں ایک لطیف ساخم پیدا ہو گیا ہے۔ جیسے کسی کی بات پر وہ دھیان سے سن رہی ہو اور اس کمرے میں اکیلی ہے صرف ایک کم سن بچہ دیوار والے پلنگ پر سو رہا ہے۔ کمرے میں کہیں باسی کی ادا تک نہیں ہے اور کہیں صندوقوں پر غلافوں، گدیلوں اور بستروں کی قطاروں سے بنی ہوئی گرم دیواروں کا اندھیرا پڑ رہا ہے۔ یہ لڑکی دیر سے یہاں کھڑی ہے اور ایک

انگلی سے جو اس کی بات کھینچے اِدھر جھانک رہی تھی۔ اس کی نمودار ہی رنگ کی آنکھوں نے گہرے ملتے پڑے میں جنہیں ہڈیوں پھیلانے کی بری کوشش کی گئی ہے ــــ ہڈیوں کی ہڈیوں کے بھوتے سے چہرہ جو کبھی خوبانی ایسا گول ہوگا اب لمبوترا ہوگیا ہے ناسلے پر سے چہرہ بے داغ اور دل کش دکھائی دیتا ہے مگر قریب سے دیکھو تو معدوم ہوگا کہ سفید کے بھورے ہلکے ہے اور رخساروں پر چھائیوں کے نشان ہیں۔ ایک موٹی پر سرخ سپ شلک ہے گلوبند کا کھردرا پن یہاں بھی یہیں چھپ سکا۔ بائیں جانب رخسار پر ایک چھوٹا سا داغ ہے جو کبھی گرم اندھیری راتوں میں ہونے کا بھول بن کر سمٹتا ہوگا لیکن اب کسی ویران خانہ کے تاریک دہانے کی طرح بے نور بے خاموش ہے۔ انھیں سرخا کی ٹھوڑی، ترش دال ماتوں کو گرم گرم ہے میں ان کسی کہانیاں سنا تا ہوگا اور آج راستہ بھولے ہوئے بھٹی بچے کی طرح ادھر ادھر بھٹکے جا رہی ہیں۔ ان کو ان کو ہے اور گھورنے والے کو چھوٹی آنکھوں سے تک رہا ہے ــــ بھی کانٹوں کی جوڑیوں کے نیچے کھلونی کی نیلی رگیں صاف دکھائی دے رہی ہیں کھوکھلے چھلاوے میں ایک بے نیازی اور کاہل سی لاپروائی ہے جو شاری شدہ لڑکیوں میں خود بخود آجاتی ہے۔

اس لڑکی کا نام کملیہ والے رجسٹر کے سرٹیفکیٹ پر اس کا نام عطیہ ہانوٹ تھا مگر گھر والے اسے عطی کے نام سے پکارتے ہیں۔ عطی کی شادی کو تین سال ہوگئے ہیں۔ اسی دوران میں اس نے اپنے خاوند کو دو بچے دیئے ہیں ایک لڑکی اور دوسرا لڑکا۔ لڑکی گھر پر اپنی نانی کو سونے نہیں دے رہی ہے اور لڑکا عطی کے بغل میں چمٹا پڑا سو رہا ہے۔

ڈیوڑھی میں مزدور نے گرم مسالہ کوٹنا شروع کر دیا ہے۔ ہر کسی پر نیم ہوا گنگھریلے بالوں والے لڑکے نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا ہے اور اس بات پر بڑا فخر محسوس کرنے لگا ہے کہ ایک لڑکی چق کے ساتھ لگی اسے اتنی دیر سے تک رہی ہے۔ اب وہ اسے بہت آہستہ آہستہ بھولنے کی ترکیب پر غور کرنے لگا ہے لیکن یہ لڑکی جس کا نام عطیہ بانو ہے اور جس کے رخسار پر ایک تل ہے اس لڑکے کی موجودگی سے بے نیاز ــــ بڑی گہری اور محویت کے عالم میں ڈیوڑھی کے دروازے پر کھیلے کے ان دو تنوں کو تک رہی ہے جن میں سنہری پیلی دانتیاں جھلک رہی ہیں ــــ شروع اکتوبر کی رات ہیں ــــ ٹاہلیوں کی گھنی چھاؤں ایسی خوشگوار ٹھنڈک ہے گویا ہے جس میں جنتی ہوئی مکئیوں اور بھٹے بالی کی کباب کے باعث فضا میں گرمی پیدا ہو رہی ہے اور عطی کے اوپر والے ہونٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملانے لگے ہیں۔ اب موسم کی خشکی ملک میں گرم مسالوں کی تیز خوشبو مخلوط ہونے لگی ہے۔ کیلے کے پتوں کی تازگی اور ٹاہلی پر ہری ہو رہی ہے ان کے چوڑے چوڑے ہاتھ مرجھا کر سرنگوں ہوگئے ہیں۔ اور دھنجان شہر کی اس تنگ گلی میں سمندر کنارے کے ان جھگڑوں کو یاد کر رہے ہیں، جہاں برسات کی سیاہ و سفید راتوں کو موسلا دھار بارشیں ہوا کرتی ہیں جہاں آم کے گھنیرے جھنڈوں میں رات بھر دل ہلی کو لیس ہوتی رہتی ہیں اور کچے پیلے سمندر کی وحشی ہوائیں کھجوری چٹانوں سے لپٹ کر شور مچایا کرتی ہیں عطی کو یوں لگا جیسے وہ کیلے کے سبز پتوں پر موتیے کے دو ہیا پھول رکھے تن پڑ گئے ہیں جھگڑوں میں سے گذر رہی ہے اور تیز ہوا میں اس کے سیاہ بال اڑ رہے ہیں اور سمندر کی سمت سے آنے والی شوریدہ سر غضبناک ہواؤں میں تاڑ اور ناریل کے درخت دہرے ہوئے جا رہے ہیں اور کچھ بھرے گلے تالابوں میں ٹوٹے ہوئے نارنگ کنول باس پر چڑھی ہوئی بیلوں میں چھپ گئے ہیں ــــ اری او لڑکی! اگر کیلے کے پتوں پر موتیے کے پھول رکھے اس طوفان میں کہاں آئیں گے، کس کے لئے جا رہی ہے؟

عطی ــــ عطی!

اور عطی نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ وہ اپنے گی والے مکان میں کیلے کے پاس بیٹھی کپڑے دھو رہی ہے۔

•

ٹوٹی کے منہ سے پتلی کرن بندھی ہے اور پانی ہلکی ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ بالٹی میں گر رہا ہے وہ آستین کہنیوں تک چڑھائے ہوئے بیٹھی ہاتھ سے مل مل کر ہاتھوں کی دھجیاں دھو رہی ہے بالوں کی ایک لٹ پھسل کر اس کے منہ پر آن گری ہے اور بھولے سے ہے۔ چہرے کی گوری رنگت

رنگ کر سرخی مائل ہو رہی ہے اور اوپر والے ہونٹ پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے ہیں دو کپڑے بھی دھو رہی ہے اور دھیرے دھیرے گنگنا بھی رہی ہے ڈیڑھ بجے کا وقت ہے اور پہلے وہ نہا کر پھر اس کا پہلوان بھائی بھی اندر داخل ہوتا ہے دستے کے گھی میں موتیے کے ہار میں اور بھی نے نیلے ٹھمے کے اوپر جالیدار کریشے کی بنیان پہن رکھی ہے اور ململ کا کرتہ کندھے پر ہے۔ عطی نے وہ نے کو دیکھ کر کہا۔

"آج تو پریم کا ہاتھ دولہا بنا ہوا ہے بھائی!"

بھی نے بڑے فخر سے وہ نے کے سر پر ہاتھ پھیرا' اسے تخت پوش کے پائے سے باندھا' نیچے سے چنے کی دال والی کڑاہی کھینچ کر رکھی اور بڑے پیار سے بولا۔

"پئے جا میرے پریم کا ہاتھ!"

ایک بار پھر وہ نے کے سر پر ہاتھ پھیرا' اسی ہاتھ اپنے سر پر پھیرا' کرتہ کھونٹی پر لٹکایا' دیوار کی طرف منہ کر کے دھوتی کھول کر جھاڑی' اسے کس کر باندھا اور تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آج صبح کی بانگیں میں مرنگ والوں سے چکری ہو گئی۔ کہنے لگے بھی کا وہ نہ مُرا ہے کیا لڑے گا' میں بھی تاؤ میں آ گیا' فوراً پریم کا ہاتھ کی زخیر کھول دی' پھر کیا تھا پہلے ہی ہاتھ میں مرنگ والوں کا وہ نہ اکھاڑے سے باہر تھا' پورے سوا دو روپے کے ہار پہنائے ہیں۔"

"پھر تو یہ بڑا بہادر ہو گیا ہے۔"

"ارے پہلوان ہو گیا ہے پورا پہلوان' اب اس میں اور بھی میں کوئی فرق نہیں۔"

اس کے بعد بھی نے اپنی جسمانی آمد کریہے کپڑوں کے ڈھیر میں پھینک دی۔

"لمائے بھی ہاتھ مار دینا ـــــ اور میں نے کہا عطو' آج پکایا ہے؟"

عطی نے لقمے پر لگا ہوا ہاتھ منہ کا جھاگ کھینچ سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"عطو کدو"

"کیا؟"

بھی غصہ میں اٹھا' قمیض کھونٹی پر سے اتار کر سر پر ڈالی اور تہمد اوپر چڑھاتے ہوئے آناً کہہ کر باہر نکل گیا۔

"ان گھر والوں کی ماں کا عطو کدو مارا' انہیں عطو کدو کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

عطی بھی کے بنیان پر سائیں ملتے ہوئے ہونٹ بھینچ کر ہنسنے لگا وہ اپنے بھائی کی عادت سے پوری طرح واقف تھا وہ جانتا تھا کہ عطو کدو کی مخالفت کے باوجود رات کو کھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آئے گا اور عطو کدو اور چاول کھا کر' پانی کا پورا ڈول پی کر بستر پر گرتے ہی سو جائے گا صبح منہ اندھیرے اٹھے گا اور وہ نے کو ساتھ لے کر اکھاڑے نذر کرنے چل دے گا۔ وہاں سے واپس آ کر نلکے کے پاس سوا پانی گھونٹے بیٹھ جائے گا۔ سوا پانی کا پورا ڈول پی کر کولے والی چارپائی پر پڑ کر سو جائے گا۔ دوپہر کو اٹھ کر نہائے گا اور روٹی کھائے گا اور پھر سو جائے گا تیسرے پہر اٹھے گا وہ نے کو ساتھ لے گا اور اکھاڑے کی طرف چل دے گا جہاں سے شام کو واپس آئے گا بس یہی اس کا معمول تھا' اکھاڑے میں زور کرنا اور سو جانا۔ مہینے میں ایک آدھ بار سے رنگ میں کوئی چھوٹی موٹی کشتی مل جاتی اس کے معاوضے میں جو تھوڑے بہت پیسے ملتے وہ ان کے بادام اور گھی خرید کر اپنے مہینے بھر کا راشن لا کر گھر میں ڈال دیتا۔ بھی کے سوا کا شوق تھا نہان اور سگریٹ کا ـــــ اگر کوئی شوق تھا تو صرف یہی کہ وہ کسی طرح بہت بڑا پہلوان بن جائے۔ گھر میں اس نے یہاں

دل علی کی مخالفت کے باوجود سپاہیوں کی فریم کی ہوئی تصویریں شاید کبھی تھیں۔ محلے کے سوا ہی سے ہر ماہ ایک نیا تھوپنے کا بازو پہنا ہوتا اور کبھی کبھی منہ اندھیرے ہی اکبر اموں کے پاس تخت پوش پر سر کے بل کھڑا ہو جاتا تھا۔

"یہ نسخہ (نسخہ) ایک ہوگی بادلے دیا ہے کہنے لگے اس طرح تمہارا دماغ موٹا ہو جائے گا" میں نے کہا بابا جی دماغ تو گوبی ماریں میری آنکھوں موٹی کر دیں یا لے گردن بھی موٹی ہو جائے گی بچہ" ! میں نے کہا ست بچن مہاراج :

آخری شلوار دھو کر علی نے نچوڑی تھی کہ گلی میں پھیری والے نے آواز لگائی۔

بشتیل فالسے ۔ ٹھنڈے فالسے ۔"

علی نے پکڑی ہوئی شلوار نل پر لٹکا چھوڑی رسے سے ایک آنے کے فالسے لے کچھ منہ میں ڈالے اور باقی تاقد میں پوٹلی بنا کر طاق میں ٹنگ رسے ٹب کے اوپر کو لیے اور کپڑے چھت پر ڈالنے اوپر چلی گئی۔ دوسری منزل میں اوپر تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جو ایک دالان سے ملتے ہوئے تھے۔ دو کمروں میں علی کی دونوں بھاوجیں اپنے بال بچوں اور خاوندوں کے ساتھ رہتی تھیں اور ایک میں اس کا پہلوان بھائی سوتا تھا۔ رسوئی کے ساتھ والی کوٹھڑی میں علی اپنی امی کے ساتھ سوتی تھی۔ دالان گھٹا ہوا اور تنگ سا تھا جس کے ایک جانب کھڑے ہیں پرانا حمام پڑا تھا حمام کی ٹوٹی کھانسی کپڑے سے بندھا تھا جس طرح رات دو دکھے تو آدمی باندھ لیتا ہے پھر بھی ٹوٹی سے پانی قطرہ قطرہ ہو کر ٹپک رہا تھا۔ گلی کی جانب تین کھڑکیاں کھلتی تھیں جن پر خستہ سی جالیاں پڑی تھیں۔ پاس ہی علی کی ریل پیل سوکھی سی بڑھیا ماں جست کا تسلہ سامنے رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سامنے والے کمرے کے باہر چھوٹے بھائی کی بیوی ایک پنکھی کو گود میں لئے کھاٹ پر بیٹھی قرآن شریف کے سبز غلاف میں ٹانکے بھر رہی تھی اور اس کی دوسری بچی زمین پر ٹوٹے کھیل رہی تھی دوسرے بھائی کے کمرے پر تالا پڑا تھا اس کی بیوی کچھ خرید و فروخت کرنے محلے کی ایک عورت کے ساتھ نارنگی گئی ہوئی تھی۔ پہلوان بھائی کی کوٹھڑی کے باہر دری کا پھٹا ہوا ٹکڑا بچھائے بیلے سے نکلتے پر اکڑوں بیٹھا کسی گاہک کی پتلون رفو کر رہا تھا جس کان کے تھڑے پر بیٹھ کر وہ رفوگری کا کام کیا کرتا تھا وہ آج بند تھی چنانچہ ٹھڑی کام کر رہا تھا وہ عینک ناک کی چونچ تک کھسکائے کام میں اس قدر محو تھا کہ اس کا سوکھا ہوا خشک چہرہ پچک کر لمبا ہو گیا تھا۔ گھسی زمانے میں اکبر اموں کا محلہ شہر میں بیٹھنے کی رنگائی دھلائی اور پھیری کا بڑا کام تھا وہ بزازوں میں کھیلا کرتا تھا۔ گھوڑا بوسکی کی کمیض، ٹاسے کی چوڑا دھوتی، اور پیٹنٹ کے سیاہ کپ شو پہنے سونے کے بٹن لگائے جب وہ رات کو ذکریا سٹریٹ کے کشمیری سوداگروں کی ہٹیوں کے چکر لگانے کو نکلتا تو اس کی سج دھج پر راہگیر کو رشک آیا کرتا۔ انگلیوں میں زمردی انگوٹھیاں ہوتیں اور ہاتھ میں کریون اے کا ڈبہ کھانے پینے کا شوق اسے ورثے میں ملا تھا۔ مرغ گھر لا کر ذبح کرنا، بگھارنا اور پیٹ کے لئے رات رات بھر گوشت کوٹتے رہنا اور قہوے کی خاطر چاپانی باورچی خلقی کی تلاش میں رہنا اور امرتسر سے خالص کھنڈ تلچے اور انار کلیاں شکر لانا اس کے معمولات میں شامل تھا اس کی خوبرو بیوی کھانے پینے کے معاملے میں اس سے بھی دو قدم آگے تھی گوشت کے بغیر اسے بھی چال ہضم نہ ہوتے تھے اور رات کو اگر بیاں نہ ہو دیتے تو اس کے حصہ کی بوٹیاں بھی خود ہی ہضم کر جاتی شادی کو آٹھ سال ہو گذرے تھے مگر خالے اولاد کا منہ نہ دیکھا تھا اکبر اموں دوسرے تیسرے شیکسپیر میں جانتے دار 'طوس' دھلے ہوئے پہننے کا دوسرا تیسرا مال لاہور کراچی روڈ پر ہر مہ تلہ اور محمد علی پارک کے ہیرے پنجابیوں اور غیر ملکی سفارتی نمائندوں کی کوٹھیوں کا ایک چکر لگاتے اور اپنی پختہ زبانی، تجربہ کاری اور خود اعتمادی کی بدولت پچاس کا مال سو میں اور سو کا مال دو سو میں بیچ کر بڑے مزے سے واپس آجاتے۔ فرووں کی رنگائی اور دھلائی کے لئے انہوں نے کشمیری باورچی اور امرتسری رنگریز ملازم رکھ چھوڑے تھے کھلا دانی، اعلیٰ خوراک اور بے فکری نے انہیں چالیس کے پیٹے میں بھی جوان رکھا ہوا تھا اور چہرہ تو انار کی طرح دمکتا تھا۔ دن بڑے مزے سے گذر رہے تھے کہ جاپان اور امریکہ کی جنگ چھڑ گئی اور ایک روز مکھنے کے شام بازار میں اچانک ٹھاہ دھم دھاڑ جاپانی بم آن گرے۔ ہر طرف

بگڈر پڑ گئی۔ لوگ دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ ان لوگوں نے ہر کچھ نہ دیکھے تھے۔ ہاورہا ایک دم ٹھپ ہو گیا۔ مارکیٹیں بند ہو گئیں اور سٹیشن کے تاجروں نے دبڑا دبڑ پنجاب کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ اکبر ماموں کلکتہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر اس کی بیوی بہت گھبرا رہی تھی۔ اس نے سوچا بیوی کو گھر چھوڑ آنا چاہئے چلو کچھ دن کے لئے کراچی ہو آئے واپس جانے لگا تو بیوی کو ہارٹ اٹیک ہو پڑا۔ ہسپتال میں آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب رہا مگر اگر دوسرے ہی روز وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اکبر ماموں تو حیران سا رہ گیا یہ اچانک صدمہ اسے گھر لٹنے کی طرح آگر گیا زندگی میں پہلی بار غم نے اپنا گھر پورا دار کیا تھا۔ وہی دن میں وہ ادھ مرا سا ہو گیا۔ رات گئے تک بیوی کی قبر پر بیٹھ کر روتا رہا۔ بڑی اور ٹاسا قبرستان کی خاک میں مل گیا آخر بہن نے دم دلاسا دیا اور سمجھا بجھا کر پھر کلکتہ روانہ کر دیا کہ کسی طرح اس کا جی دوسری طرف لگ جائے۔ لیکن اب کلکتہ میں کیا رکھا تھا؟ وہ کریا سٹریٹ کے سوداگروں کی منڈیوں پر ٹالے پڑے تھے۔ وہ لائی کی دکانوں کے باہر رنگدار کے خالی ٹاپ دان لٹے پڑے تھے۔ واپس جانا بھی بے کار تھا وہیں اپنی میٹھک پر تھوڑا بہت کام شروع کر دیا۔ بمشکل ڈیڑھ دو سال گذرے ہوں گے کہ ہندو مسلم فسادات کی خونیں شعلے بھڑک اٹھے اب اکبر ماموں کو ہمیشہ کے لئے کلکتہ کو خیرباد کہہ کر لاہور آنا پڑا لاہور جل رہا تھا۔ بلکہ سارا پنجاب جل رہا تھا اکبر ماموں کراچی چلا گیا اور وہیں پھر کی کا کام شروع کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی چلتے اور کراچی میں بڑا فرق تھا یہاں آگ قسمتی دوسری بستی تباہ شاہاں کریں الٹ پلٹ کر دیکھتے جیسے گھر لینے کے لئے بروکر ہے ہوں اکبر ماموں کی حالت بڑی پتلی ہو گئی ساری جمع پونجی بھی خرچ ہو گئی اور نوبت فاقوں تک آ پہنچی اس نے ایسے تاریک دن زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے آخر پٹ کی آگ بھی بجھانی تھی اس کے صندوق میں شاید کاپرانے زمانے کا بیل بوٹوں کا نکاح نامہ پڑا تھا اسے نکال کر تکے کے جیب میں رکھا اور ایک امریکی فوجی افسر کی کوٹھی میں آ کر گھنٹی بجائی۔ نکاح نامہ پر چاروں طرف رنگ برنگ پھول پتوں کا حاشیہ تھا اور درمیان میں تصاویر دشتائی سے ایجاب و قبول کی عبارت لکھی تھی امریکی افسر نکاح نامہ میں دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"ویل! یہ کیا ہے اسٹر صاحب؟"

اگرچہ بھوک نے اکبر ماموں کی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو دبا رکھا تھا اور اس میں زیادہ بولنے کا یارا نہ تھا مگر اس خاص کی پرانی چوب زبانی اور خود اعتمادی عود کر آئی اس نے دو منٹ کی گفتگو میں ہی یہ ثابت کر دیا کہ وہ نکاح نامہ اصل میں مغل بادشاہ اورنگ زیب اور والئے مارواڑ سردار گاداس راٹھور کے درمیان طے پانے والا عہد نامہ ہے جو ۱۶۹۰ء میں جودھپور کے مقام پر گھمسان کی لڑائی کے بعد لکھا گیا تھا اور جس کی رو سے مرہٹوں نے چوتھ کا تیس لاکھ روپیہ منظور کر لیا تھا۔ امریکی افسر تو حیران رہ گیا کہ ایسا نادر نکاح نامہ اتنی آسانی سے ہاتھ آ گیا حالانکہ اس نے نکاح نامہ اصلی پکڑ رکھا تھا فوراً ایک ہزار کا چیک کاٹ دیا اور اکبر ماموں اگلے ہی روز لدا پھندا بستر اٹھائے لاہور آ گئے لاہور آ کر اس نے میکلوڈ روڈ پر ایک دکان الاٹ کروائی مگر بارشوں میں اس کی چھت بیٹھ گئی۔ مرمت کروائی۔ بعد میں اس کا ایک اور دعوے دار پیدا ہو گیا مقدمہ بازی شروع ہونے ہی والی تھی کہ من چلے اکبر ماموں اس بک بک سے خود ہی باہر نکل آیا۔ چنانچہ بعد میں اس نے بیان روڈ پر ایک لانڈری کی دکان کی سیڑھیوں کا ایک حصہ کرائے پر لے لیا اور وہیں بیٹھ کر پتنگیں اور کٹے وغیرہ رکھنے لگا۔ دکان کی سیڑھیوں پر اکڑوں اکڑوں بیٹھے اسے دس سال بیت گئے تھے پے در پے صدمات اور انقلابات نے اسے دیکھتے دیکھتے بوڑھا کر دیا تھا اس کی حالت اس کھجور پھول کی سی تھی جو ساری بہار پتوں کی ڈھال میں چھپے چھپے بسر کرے مگر خزاں کے پہلے گرم تھپیڑے میں ہی پکی پکی ہو کر زمین پر گر پڑے اس کا سر سلیٹ ہو گیا تھا گردن کی رگیں ابھر آئی تھیں اور چہرہ سوکھ کر پک سا گیا تھا لانڈری کی سیڑھیوں پر سارا سارا دن گزار کر ہوٹلوں اور ٹاک کی چرخ پر ٹیک کھسائے گاہک کی تپلوں گھنٹے پر گھنٹے وہ بڑے انہماک سے تاکتی کیا کرتا اور رات کو نبت روڈ پر کلکتہ کے اپنے ایک پرانے کشمیری ساتھی کی دکان میں چوکڑی سے ٹیک لگا کر بجھ جاتا اور گندے ہونے والوں کی باتیں کرنے لگتا۔ سارا دن چلنے کی بتیاں چھوڑ کر آگ سلگا دی

جاتی اور اکبر ماموں بیگے کے سگریٹ کا کل حساب کر لیا کرتا۔

"تمہیں یاد ہے خواجہ کھٹے میں میرے پاس بارہ ایک ہزار کا مال آیا تھا جسے میں نے ایک فرنچ کرنل کے پاس چار ہزار میں بیچ دیا تھا، بس یہ انہی دنوں کی بات ہے ..."

مگر یہ سب ان دنوں کی باتیں تھیں اور ان دنوں کی بات یہ تھی کہ اکبر ماموں کے پاس ہر ماہ دکان کی سیڑھیوں کا کرایہ دے کر جو تھوڑا بہت بچتا تھا اس میں سے تیس روپے ہر حالت میں اپنی روٹی کے لئے بہن کو دے دیتے اور باقی جو رقم بچتی ان میں سے ان کا بھلوان بھانجا اپنے ماموں اور پھپھی کے لئے تھوڑا بہت شوربہ اس سے جو کرائی بکھات سے دیتے اور خود چپکے ہو کر بیٹھ رہتے۔ گھر میں اس نے کسی سے کبھی زیادہ بات نہ کی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اپنے اندر کی سنسان خاموشی سے سہما ہوا ہے جو اسے بڑی دل آویز اور سن موہنی تصویریں دکھایا کرتی ہے۔ گھر میں بھی اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی سوائے شادہ بھابیوں نے اسے ایک بوجھ سمجھ رکھا تھا جو انہیں روپے دے کر سارا مہینہ ان کی روٹیاں توڑتا رہتا تھا۔ سوائے بھابی علی احمد اس کی اس کے گھر کو ہر فرد اس سے ایک طرح کی پوشیدہ اندیشہ چھپی ہوئی بدگمانی سے مخاطب ہوا کرتا گویا وہ سیٹھے نلکے کی ایک کھردری سی تنی ہوئی رسی پر کھڑے اکبر ماموں سے سہما ہوا ہم تھا جس پر سے حفاظت کے گدے گر پڑنے کے باوجود احتمال ہو اگر میں اس کی کھاٹ کا فرش چھت پر بنا جانے کے پاس نکلتا اور سڑکوں میں دست بچی نہ ان کے پاس تخت پوش پر دیس نکالا مل جاتا۔ وہ اپنا میلا سا بستر تخت پوش پر بچھا دیتا جہاں رات اندھیرے اس کا بھلوان بھانجہ تیل ملش کے بعد تخت پوش پر ہاتھ جما کر اسے جھلے دیتا ہوا تک بلنگ کر ڈھیر لگتے تھا۔

بچی پھپھو نے اپنی کوٹھری میں رستم زماں گاما، امیرا، گنگو شکلو اور گوگا پہلوان کی تصویروں کے ساتھ ہی ایک اپنی تصویر بھی ٹانگ رکھی تھی۔ جس میں وہ خالی لنگوٹ باندھے علم اکبر موچی کے ساتھ ایک کوچ پر اس طرح بیٹھی تھی اس کا ایک ہاتھ کمر کی گرہن میں تھا۔ یہ تصویر وزنگ کے ایک فوٹو گرافر نے اسے دس روپوں میں دان بات کی ہوتی ریزی کے بعد تیار کر کے دی تھی۔ بچی کی ایک تصویر گلے کے ٹھاکری کی دکان پر بھی ٹنگی تھی جس میں وہ بھلے کے گیند نے کے ساتھ ہوا سے کے ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا۔

گھر بھر کا خرچ دونوں بھائیوں کے ذمہ تھا۔ ان میں سے ایک تو رکشا چلاتے میں فرق تھا اور دوسرا کسی پریس میں بلاک میکری کا کام کرتا تھا۔ بڑا بھائی ایک مدت سے بیمار جانے کی فکر میں تھا مگر بعض وجوہات کی بنا پر ٹالتا رہا تھا۔ دونوں بھائی ہر ماہ بیویوں سے لڑنے جھگڑنے کے بعد اپنی اپنی تنخواہوں میں سے ساٹھ ساٹھ روپے اپنی اپنی والدہ کو دیتے جس میں ان کے پورے کنبے کو روٹی چائے اور دودھ ملتا اور بیویاں میلے کچیلے کپڑے بھی صاف سے دھلا لیتیں۔ اس کے باوجود عورتیں خرچ کے معاملے میں اپنی ساس کے خلاف کڑوی زبان میں بڑبڑایا کرتیں۔ بچی پہلوان کا کام گھر کے تمام کھانے والوں سے اپنی پہلوانی کا ٹیکس وصول کرنا تھا اس سے گھر کا ہر آدمی دبتا تھا عورت کوئی بھی نہ کرتا تھا ہمیں حجت کرتی تھی اور ماں اس کے ڈیوٹ پنے سے تنگ آئی ہوئی تھی، مگر بڑھی بڑی گھر گو، اذیت کش، عاجز اور نیک کی کھلی اقدار کی حامل تھی۔

دوسری طرف علی احمد پوش قرضے کے بوجھ تلے دبے ہوئے سگھڑاپے کی رکھ رکھاؤ کو برقرار رکھنے والے کنبے کی بچی ہوئی واحد کھونٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس پر ہر آدمی اپنے تسمے ہوئے کپڑے ٹنگا دیتا۔ وہ اذان کے وقت اٹھ کر پورے گھر کی صفائی کرتی۔ غسل میں پانی بھرتی، چولہے میں آگ جلا کر چائے کا پانی رکھتی سبھوں کا ناشتہ تیار کرتی، بچے کھچے بیتیوں کے لئے دودھ گرم کرتی، پہلوان بھائی کے سر پر ہاتھ پھیرتی، برتنوں کو اکٹھا کر کے بارہ دریوں، دلغت خانے میں لگاتی، پھر میلے کپڑے دھونے بیٹھ جاتی۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کا دھندا شروع ہو جاتا۔ ایک بار پھر برتنوں کی بھائی ہوتی، رات کا کھانا پکانے میں لگ جاتی، بستروں کو جھاڑ پونچھ کر بچھاتی، جاڑوں کے بچوں کی خاطر لحاف صاف کرتی انہیں گود میں لے کر کھلاتی، انہیں

لیاں دے کر سلاتی، ماں کے پاؤں دباتی اور سب سے آخر میں اپنے بستر پر جا کر گر پڑتی۔ اور بے سدھ ہو کر گہری نیند میں کھو جاتی۔

مقیس کی مرغی ساتھ والی چھت پر انڈا دینے کے بعد زور زور سے کڑکڑانے لگی۔ علی منڈیر پر گیلے کپڑے پھیلا ہی رہی تھی کہ اس نے جلدی سے اوپر آئی، کڑکڑاتی، اٹھاتا ہاتھ میں لے کر مرغی بغل میں دبائی اور نیچے اتر گئی۔ چاک علی کے پاس دھپ سے بیٹھ گیا ایک ڈھیلا ان گنا۔ اس نے چوک کر ایک طرف اچھالا۔ گل پار تیسرے مکان کی چھت پر برساتی میں اسلم کھڑا اسے ہنستے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔ علی نے کوئی خاص خیال نہ کیا عورت اس کی طرف عام سے انداز میں مسکرائی اور آگے سے نیچے اتر گئی۔ اسلم علی کا بچپن کا ساتھی تھا جو ابھی ابھی ساتویں جماعت میں داخل ہوا تھا بڑا اسمارٹ اور شوخ تھا علی سے ہر گھڑی چھیڑ کیا کرتا اور اپنی محبت جتایا کرتا لیکن یہ محبت ایسی ہی تھی جیسے ہر لڑکے کی لڑکے کو اپنی کسی نہ کسی خوش شکل رشتہ دار لڑکی سے ہو جایا کرتی ہے یہ بڑی عمر کی ہوتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح اس کے جواب میں لڑکی کا معمولی طریقے سے مسکرا دینا بڑا معنی رکھتا ہے علی نے اسلم کو کبھی اتنی اہمیت نہ دی تھی کہ اس سے محبت کرنے کی فرصت نہ تھی دوسرے بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہنے سے علی اسلم میں وہ اجنبی تقابل اور انیت نہ پاتی تھی جس کی کچھ سے محبت کے شعلے جنم لیتے ہیں پھر بھی جب کبھی دو سہیلیوں وغیرہ میں پیچھے سے علی کا دوپٹہ کھینچ لیتا یا شرارت سے اسے کبھی گدگدا دیتا تو شرقی عورت ہونے کی بنا پر علی کے جسم میں ایسا بار بار کے جانے کی شدید خواہش اپنے موکے ہوئے کھردرے خشک ہونٹ مار دیتی ایک دن دیئے کی لو کے پاس مچھلی پڑتی، تجوری بھی کچھ سے کھلی تھی آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ علی نے ایک بارس قسم کی پرانی لذت بھری محسوس کی اس نے جلدی سے سر جھٹک دیا پیچھے اسلم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میں پھر بھی سے کہہ کر جوتے مگواؤں گی تمہیں ــــ مجھے ایسا مذاق اچھا نہیں لگتا۔"

"چلیے سو بار کہہ دو، میں بھی کہہ دوں گا، کیا کروں بھی مجھے علی اچھی لگتی ہے۔"

علی نے کچھ شرم اور کچھ غصہ سے لال ہو کر گیلا پڑا تھا ہی تھا کہ اسلم ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں پڑتے ہوئے اس کی بے فکری ایسی ہنسی کی آواز دور تک علی کے پیچھے قائل اور دیوان جیسوں کو بجھوتی رہی وہ برتن، بھیجے ہوئے خود کو ٹھکانے لگی اور سوچنے لگی کہ کہیں اسلم واقعی اس سے اسی طرح محبت تو نہیں کرتا جس طرح عام مرد عورتوں سے کیا کرتے ہیں ــــ دھڑک سے دروازہ کھلا اور بی پہلوان وہنے کو ساتھ لئے اندر داخل ہوا وہنے کو بچھاتے ہوئے کہنے لگے وہ سر کو ہاتھ سے جھاڑتا ہوا کھسیانی سی ہنسی ہنستا علی کے پاس آ کر کھڑے کی پیڑھ پر پاؤں کے بل بیٹھ گیا اور کہنا شروع کیا سر علی کے پہلو میں گھستے ہوئے بولا۔

"میری مالو بی! تو نے ایک روپیہ تو مدد خرچی سے نکال دیا تیل ختم ہو گیا ہے ــــ اری گل نے سیتا، بھلا کوئی بے اعتباری ہے ٹوٹکے کیا دیکھ رہی ہے۔"

علی کے ایسا ہنس پڑی اور جاتے ہوئے کہتی ہوا پھر بھی واپس نہیں کرتا وہ اٹھ کر اوپر گئی اور ان پیسوں میں سے جو اس نے دودھ لے کر بچے کر رکھے تھے ایک روپیہ گن کے آئی، بی پہلوان کو پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ عزت وہ گھر میں ادھر ادھر سے پوری کر لیتا تھا مگر کوئی کام نہ کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ پہلوان بن ایک عام سے اگر کوئی اور کام کیا جائے تو پہلوانی میں فرق واقع ہو جاتا ہے پہلوانی کو ترقی کرنا، ڈنڈ لگانا، غریب ٹٹ کرنا اور کھا کر سو جانا تھی ہے چنانچہ وہ سیر ڈیڑھ سیر دودھ ایک ہی ڈبک میں پی کر چارپائی پر گر پڑتا اور پڑے پڑے خراٹے لیتے تھا کسی روز بکریوں کے دو تین بچے سر جھول میں ڈال کے آتا اور ذبح کرتے ہی نمرہ لگاتا۔

"کافانی بکریوں کے سر میں ان ــــ بڑی تیز یا چولے پر چڑھا دو ــــ بس آج ذرا گھی کی طرف سے ہاتھ کھلا رکھنا۔"

گھر کے معاملات میں اسے کبھی کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ اور اسے بھی کوئی پروا نہ تھی۔ گھر کا خرچ کیسے چل رہا ہے، اس کی بڑھتی ہوئی اور مختلف ضرورتوں کو بھاوجوں کی کیسی کیسی دل آزار باتیں سننا پڑتی ہیں؟ ان باتوں سے اسے اور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مکان میں سے اس نے اپنا حصہ الگ کروا رکھا تھا۔ اس کے عقب میں پچھلا دالان خالد ہی تھا جب گھر میں لڑائی جھگڑا اور پڑا آپی پہلوان دبنے کی زنجیر گلے میں ڈالے دھیلی دھوتی باربار کس کر باندھتا چوپڑے بنے کی طرح اندر باہر ہوتا پھرتا اور کہتے لگتا۔

"خبردار گھر والوں کا حلوہ کدو ہمارا ــــ میں سب کی گردنوں کے منکے توڑ دوں گا۔ میں اپنا دالان خالد کرکے پرچھاوں گا۔ میں نیچے تنور لگوا دوں گا اور تم لوگوں کا ناک میں دم کر دوں گا۔"

کسی روز ایسا بھی ہوتا کہ وہ تکئے سے جنگ کا پیار چڑھا کر آجاتا پھر وہ اتنی ساری روٹیاں اکیلے ہی ہڑپ کر جاتا کہ بے چاری عطی اور اس کی بھاوجوں کو بھوکا رہنا پڑتا۔ اس کے بعد وہ نیچے جا کر اکبر ماموں کے پاس تخت پوش پر لگا کر لے کر بیٹھ جاتا اور اسے کھاتے ہوئے تکئے کے چوسنیوں کے سے بیٹھے انداز میں الٹے سیدھے ہچکولے شروع کر دیتا اس کا ربڑ یہ ہاتھ بھی بھی اس کی بات نہ کرکے داد دیتے ہوئے زور سے ہلا اٹھتا۔ اکبر ماموں بے چارہ مچھر بیٹھا بیگ کا سگریٹ پیتے پیتے اٹھ جاتا پھر اسے کوسنے میں پھینک لیٹ جاتا اور پہلوان کی پنچم ٹھاٹ میں سونے کی کوشش کرتا جب نیند آتی تو کسی وقت تنگ آکر جھنجھلا اٹھتا ــــ

"بی اب بس بھی کرو اس دُہر بد کو۔"

اور بی جنگ کی ترنگ میں اکبر ماموں کے کہنے باتوں میں ہاتھ پھیر کر اونچی آواز میں گانے لگتا۔

"لیلے لیلے پکاروں میں بن میں
میری لیلے ہے میرے من میں
ماما ماما پکاروں میں۔۔۔"

گرمیوں کی گرم آلود گرم راتوں میں جب میوہ منڈی کی طرف سے میٹھے خربوزوں کی خوشبوؤں کے ساتھ ساتھ سیف الملوک گانے کی درد انگیز سی آوازیں آنے لگتیں اور کیڑا کھائی سجر سجر کی بیری کے درخت پر سیاہ پیلا سا میلا میلا سا چاند نکل آتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ترائیوں سے لدا ہوا کوئی ٹرک گھڑ گھڑ کرتا اور ہر دو گھنٹے بعد گھنٹہ گھر سے ملکہ آدھی رات کی بجت پر لیٹی نیند اسلم کے متعلق سوچنے لگتی۔ کیسا ہے یہ لڑکا؟ اسے کون سمجھائے کہ کسی کنواری لڑکی سے محبت کرنے کے پاس بیٹھے رہنا ہی سب سے بڑی بات نہیں ہوتی۔ کہتا ہے کہ عطی کو اسلم کے بے رونقوں ایسے چہرے پر پھیلی ہوئی بچوں ایسی سکراہٹ یاد آجاتی اور وہ اپنے دل کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی کہ نیچے گلی میں اس کے عین نیچے فرش پر گلاب کا ایک سرخ پھول پڑا ہے۔ سب کی نظروں بچا کر اس پھول کو اٹھا لینے کے بارے میں سوچنے لگتی اور سوچتے سوچتے اسے نیند آجاتی اور وہ سو جاتی۔ دن کی روشنی میں اس نے اسلم کے متعلق کبھی اتنی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ دراصل اسلم نے بھی کبھی محبت کا کھلم کھلا اظہار نہ کیا تھا۔ بلکہ ہمیشہ ایک طرح کی خوش رفتی اور لاابالی پنے سے کام لیا تھا جس طرح کوئی کالج کا لڑکا ملک کے پروگرام میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ عطی کا ذہن گھریلو کام کاج کی زیادتی، روزمرہ کی بے روح یکساں محنت اور بھاوجوں کی دبی دبی استہزایہ سنسنیوں، بے پروائی کے طعنوں، نمائندگی کی محبتوں، بھائیوں اور بھاوجوں کے رحم و کرم پر پڑے رہنے کی تلخیت روحانی اذیت اور بڑھی ماں کی بے بسی کے پریشان کن خیالات کے جال میں اس بری طرح الجھ گیا تھا کہ اسلم اور اس کی محبت کے متعلق سوچتے سوچتے کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ تیز رفتار ریل گاڑی میں بیٹھی کسی اجنبی سے بے معنی اور غیر اہم دیہاتی سٹیشن کو قریب سے گذرتے دیکھ رہی ہو۔ کیسی بیڈ

گھڑیاں تھیں جب اس برسیل سی تنگ الجھنوں میں بکلا ہوا بھرا بھرا بدن بچے ہوئے بھیل کی طرح اپنی ٹہنی پر لٹکا ہوا میں کانپتے ہوئے تیز تیز سانس لینے لگتا۔ اور سارے بدن کے روئیں روئیں اذیت کشی کی تمنا میں اپنی سلگتی ہوئی لاتعداد آنکھیں کھول کر چاروں طرف جنگل میں دیکھنے لگتے اور عظمیٰ کا جی چاہتا کہ کوئی پیچھے سے آکر اسے اس ندرے کھینچ لے کہ اس کے ہزار ٹوٹ جانے اور سنت ساجت بچھی اسے نچھوڑ دے۔ ایسی روئے ہوئے جب اندر ہی اندر دل ہی دل میں وہ اپنا سب کچھ اس پہلے آدمی کو سونپنے پر خود کو تیار پاتی جو ہاتھ کے ایک خفیف اشارے سے اسے اپنی طرف بلاتا پھر ذرا ہی دیر میں اپنی بڑھی ہوئی ماں کا خیال آجاتا جس کی عمر بھر اپنے مرحوم خاوند، بیٹوں اور اب بہوؤں کی خدمت کرتے کرتے مجلک گئی تھی اور جسے اس پر بھی دن میں ایک بار بہوؤں کی دل ربی بھری کھریاں سننا پڑتی تھیں۔ عظمیٰ کو ایک دم غصہ آجاتا پہلے بہوؤں کے پیچھے بچے ہوئے بھائیوں پر پھر محمد بخش پر اور سب سے آخر میں اپنے آپ پر کہ وہ ایسا کیوں نہ کر سکی اگر وہ ایسا کر سکتی تو اس کی ماں کی یہ عبدگت نہ بن رہی ہوتی۔

ایک روز کیا ہوا کہ وہ بچھو کے گھر آنا بھول گئی۔ دوسرے یا تیسرے روز وہ ڈرتی ہوئی میں سے گذر کر اس کی طرف بڑھی۔ وہی تھی کہ اس نے مجھے اسلم نے اسے وہیں دبوچ لیا اور چٹاخ پٹاخ ہوتے ہوئے تڑ تڑ توڑ دیئے۔ عظمیٰ پہلے تو ذرا سی جھجکی اور پھر مرے ہی تھی کہ اس نے خود کو اسلم کی آغوش میں کسی ہوئی بیل کی طرح گرا دیا۔ اسلم نے اپنے ہونٹ عظمیٰ کے ہونٹوں میں پیوست کر رکھے تھے اور اپنا بدن اس نے اپنے آپ ہی اونچے کی طرح چھوڑ دیا تھا۔ اچانک گلی میں کسی کے قدموں کی آہٹ ڈوبتی ابھرتی سنائی دی۔ عظمیٰ بجلی کی طرح اسلم کی گرفت سے نکلی اور لپکتے ہاتھ سے اپنے بکھرتے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی عجلت سے دروازے پر جا گ گئی۔ اس رات عظمیٰ کا سارا جسم درد کرتا رہا اور پنڈلیاں کڑی ہوئی سی رہیں اور جب اس نے رات کے کسی لمحے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی دشت کی ایسی تاریک شاخ پر ہاتھ پھیر رہی ہو جس پر بے شمار ننھی ننھی کونپلوں نے اپنے سر نکال رکھے ہوں۔

گرمیاں نکل رہی تھیں کہ عظمیٰ کی دونوں بھاوجوں کے ٹخنے پیٹ ننگے ہونے اور دونوں بیٹیوں زبیدہ اور فاطمہ کی فراخیاں اور قمیصوں کا اوپر جھولنے کے لئے پیدا ہو گئیں۔ گھر بھر میں سوگ ایسی فضا طاری ہو گئی دونوں بھائی اپنی اپنی بیوی بچوں کو گھر میں چھوڑ کر ان کے پاس سوتی میں آکر سو جاتے جن کے ان کی دلاسیاں دبھی ہوئی تھیں اور بات چیت سے آنکھیں سوال انکارہ ہو چکی تھیں اور یہاں کھڑکی سے ہو گئے تھے بڑا بھائی پہلے ہی ایک ہزار روپیہ مقروض تھا۔ یہ قرض اس نے بھاوجوں کے بڑے بڑے خرچ کرانے کے آبا ان کی بھرتی کی خاطر ایک ہیڈ مستری کو بے تحاشہ رشوت دینے اور اپنی نوکری پندیری کے لئے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک ایسے آدمی سے لیا تھا جو اس کی بیوی کا رشتہ دار تھا اور جس کی ڈیلیوڑی کی ٹھیکے داری کرتا تھا اس ٹھیکے دار کی پہلی دونوں بیویاں مر چکی تھیں۔ ان میں سے چار بچے تھے اور اب تیسری شادی کی فکر میں تھا۔ شہر کے بازاروں میں اس کا بڑا اثر و رسوخ تھا اور اس نے ٹھیکے داری کی بدولت کافی دولت کما رکھی تھی۔ بچوں کو اپنی ماں کے ذمے سونپ کر وہ شہر کے قریب علاقہ میں ایک خیمے میں تنہا رہتا تھا اور ماہوار گھر کا سو روپے مجبور خرچ دے دیتا تھا۔ اس کے خیمے میں ہر اتوار کی رات کو چوری چھپے شراب کی محفل گرم ہوتی تھی۔ جس میں ٹھیکے دار اور اس کے دوست شراب کے نشے میں دعوت ہو کر ایک دوسرے کو فحش گالیاں دیتے۔ رات بھر کے لئے سنگھاری ہوئی عورت کو نوچا کھسوٹا جاتا اور سارا بچھے ہوئے مرغ اور بڑے بھائی کی بیوی کو اپنے رشتہ دار ٹھیکے دار کی ان خصلتوں کا پورا علم تھا بلکہ اس کے دل میں کبھی کبھار یہ آرزو بھی پیدا ہوتی کہ وہ ایسی حیا سوز زندگی مضطر کو جھیل چکی تھی۔ اور مرے ہوئے ان ہی عریاں اور نرم و گداز لمحوں کی وجہ سے اس عورت کے لئے ٹھیکے دار کی شخصیت بڑی دل کشی اور پرکشش ہو گئی تھی بلکہ کچھ رشتہ دار بڑی بڑی بوڑھیاں تو یقین تھا کہ دونوں کے درمیان کچھ ایسے ویسے تعلقات بھی ہیں گذشتہ باروں کا کیا ہے وہ تو ایسی باتیں اڑا دیا کرتے ہیں۔

مصیبتوں کی گلی والے اس گھر پر ایک دم اخراجات کا مزید بوجھ آن پڑا اور محدود آمدنی میں گندہ مشکل سے ہونے لگا بڑے بھائی

لے ایک بار پھر آواز دے کے ٹٹولا دی، مگر ثبوت نہ دے سکنے کے باعث ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا بیوی کے کہنے اور زور دینے پر اس نے ٹھیلے دار سے ایک بار پھر قرض مانگنے کا ارادہ کر لیا اور اس قرض کے لئے اسے اپنے گھر دعوت سے ٹال دیکھتے دیکھتے دو عدد مرغ ذبح ہو گئے اور عملی اور سامان کر سوئی میں جھونک لان کے گرد پھلکے والی چیزوں کا انبار لگا دیا گیا۔ بی پہلوان شام کو گھر آیا تو اس نے دروازے میں ہی تھوتھنی پھلا کر استقبال کیا۔

"ہوں ہوں یہ مرغ پلاؤ کی مہک ہے۔"

رسوئی میں پہنچ کر جب اس نے انواع و اقسام کی نعمتوں کو مختلف چولہوں پر پکتے دیکھا تو خوشی اور حیرانی سے اپنا خشخشی سر جھاڑنے لگا۔

"ارے تمہاری ماں کا صدقہ کدھر سے ۔۔۔ کہیں ڈاکہ تو نہیں ڈال دیا تم لوگوں نے؟"

کھانا ابھی پوری طرح تیار بھی نہ ہو پایا تھا کہ پی ڈبلیو ڈی کے ٹھیکے دار صاحب آ دھمکے یہ نئے قد کا گول مٹول بھدا سا اور بیڈھنگا آدمی تھا جس کی پھولی ہوئی مونچھوں نے ہونٹوں پر سایہ کر رکھا تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ چہرے ایسی کھال پر چیچک کے پچکے پچکے پھیلے ہوئے نشان تھے اور لال لال سستی ہوئی آنکھوں کے گرد شرابیوں جیسے حلقے دکھائی دے رہے تھے دونوں بھائیوں اور بھاوجوں نے بڑے شوق سے کپڑوں میں ملبوس تھیں اور خوب سرخی پاؤڈر تھوپ رکھا تھا بڑھ کر مہمان کا استقبال کیا اور اس کے ہاتھ سے وہ ٹوکری تھام لی جس پر چپل ٹھنسے ہوئے تھے۔ بڑی بھاوج نے بڑی احتیاط سے بیلے پر سے دوپٹہ ہٹاتے ہوئے ایک کر کہا۔

"بھلا اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی؟"

"بھئی یہ تو بچوں کے دکھانس کر) بچوں کے لئے لے آیا۔"

ٹھیکے دار کی آواز پھٹے ہوئے ڈھول ایسی بے روح اور سپاٹ تھی اور بات کرتے ہوئے مونچھوں تلے پھلا ہونٹ بیلچے کی طرح ہلتا گویا ٹک آتا اور پیسے پیسے گنے دانتوں میں ایک چاندی کی دانت اپنی جھلک دکھا جاتا۔ پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے ہی اس نے اپنے موٹے کے بٹنوں میں سے قمیض کا اوپر والا بٹن کھول دیا اور سونے کی زنجیر والی گھڑی نکال کر اپنے قریب ہی پلنگ پر کھول اور شین واکٹ کی جیب میں سے سرخ رومال نکال کر تماش بینوں کی طرح مونچھوں پر پھیرنے لگا۔ دونوں بھائی باورچی خانے کی طرف دوڑ گئے چھوٹی بھاوج روتے بچے کو لے کر اپنی کوٹھری میں سلانے چلی بڑی بھاوج نے الماری میں سے کیشن کی ڈبی نکال کر ٹھیکے دار کے سامنے رکھ دی۔

"یہ تم بیچتی ہو کوئی شے؟"

کوٹھری میں ایک خاموش طبع شرافی کے ساتھ تنہا کر اکیلا پا کر بڑی بھاوج کا منہ گرم ہو گیا۔ مال رہ گئے تھے۔ حلق سوکھ گیا اور آنکھیں ایک پرلذت خلش سے اینٹھنے لگیں اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"نہیں بھابی ۔۔۔ یہ تو چھپی کا آیا ۔۔۔۔"

ٹھیکے دار نے بڑی بھاوج کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف کھینچ لیا اپنے نئیر پلنگ پر گرا دینے کی کوشش میں اس کا لال شاہ رگ بیں منہ کے پاس آ کر پھڑپھڑانے لگا اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا اس کا فائدہ بھی کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ بی پہلوان کو ٹھیکے دار سے لایا گیا تو وہ شرما کر اپنے سر پر لئے سیدھے ہاتھ پھیرنے اور بغلیں جھانکنے لگا۔ ٹھیکے دار نے واکٹ کی جیب میں سے چاندی کا سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بھئی یار! کوئی دنگل بھی لڑاتے ہو کہیں؟"

بی ایک دم اصل حالت میں آگیا اس کی گردن اور بازوؤں کے پٹھے لوہے کی طرح تن گئے۔

"پھوپھا ہے کہ بھی پرسوں چت کیا ہے بھائی ۔۔۔ آلو کا حلوہ کی بالچھی میں علی پہلوان سے لڑتی ہے"

"خوب ۔ خوب" آنکھ کر ٹھیلے والے نے کوچوانوں کی طرح سگریٹ کا لمبا کش کھینچا اور گھوڑے کی طرح کھانسنے لگا۔ اس دوران میں بڑی بھاوج نے اپنے فائدہ کو باہر بلوا کر علی کی پھوپھی کی طرف روانہ کیا کہ وہاں سے صینی کی بڑی پلیٹیں اور شیشے کا سرخ بحرین والا جگ لے آئے چھوٹی بہو پان کا ٹکا چباتے ہوئے دبی زبان سے بولی۔

"خدا کا شکر ہی رہا۔ میرا تو خیال تھا پلاؤ کا معاملہ ہے کچھ گڑبڑ ضرور ہوگی"

ہمیشہ سے دکھ سہنے والی بوڑھی ماں نے کوئی جواب نہ دیا صرف علی نے اتنا کہا۔

"تو پھر بھائی یہاں آکر خود ہی جا تھا"

بھاوج نے چمک کر کہا۔

"بھلا تو جوب دینے سے کبھی باز رہ سکتی ہے"

چھوٹا بھائی فوراً بیچ میں بول اٹھا۔

"اب اس بک بک کو چھوڑو اور وہ پلاؤ والا دیگچہ ادھر کرو۔ یہ وقت ٹاک ٹک کا نہیں ہے"

بڑی بھاوج کے کہنے میں چنگ کے پاس ہی فرش پر دری اور سوزنی اور اوپر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا۔ علی اور اس کی امی کے ساتھ بچوں نے مل کر دعوت اڑائی۔ باقی پہلوان کی آمد عید ہو گئی تھی پہلے تین ماہ ہوئے کہ ایک دوست کی شادی پر پلاؤ کھانے کو ملا تھا وہ تو سمجھا کہ کھانے میں بٹ گیا اور دیکھتے دیکھتے پوری تھالی صفاچٹ کر کے دوسری بھروا لی۔ بڑے بھائی نے گھر کر دیکھا گرہی جاتا تھا کہ اس وقت وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا چنانچہ بے فکر ہو کر دوسری تھالی پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا اس کے عین سامنے بیٹھے ہوئے ٹھیلے والے نے اپنی تھالی پلاؤ سے منہ زور منہ بھر کر اس میں شوربہ لاگ، دہی، ادرک ۔۔۔ سب کچھ ملا کر اسے گھول گھول کر دانا اٹھا تھا۔ وہ اوپر نیچے اس تھالی میں گھسیر کر نوالہ اٹھاتا اور جیسے ایسا منہ کھول کر اس اندوہناک تھر کی طرح جبڑے چلانے لگتا۔ جاوں کا دانہ یا گوشت کا ریزہ اس کی مونچھوں میں عزم پھنس جاتا جسے وہ بیل زبان باہر نکال کر مونچھوں کے چاروں طرف گھما کر چاٹ لیتا۔ بچی ایک صحت مند وحشی کی طرح کھا رہا تھا جسے پھر موقع کھانا ملنے کی امید نہیں تھی اس کے سامنے ٹھیلے والا ایک ابلا ہوا مرغ رکھ گیا تھا جسے اس نے کچا ہی کھا لیا تھا اس کے سدھے کا بھولا بھر کر چبا رہا تھا اس کی ساری انگلیاں کھانے میں لتھڑ گئیں جنہیں وہ بدھ میں ایک ایک کر کے بڑے مزے سے چاٹنے لگا اس کے بعد اس نے ٹھنڈا بھر کر کچلی ہوئی تو پیاز کے ہوئے زردست کو ڈالی اور شکر الحمد للہ کہتا ہوا پھرے ہوئے ساڑی کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ بستر چائے پر بیٹھ کر پی گئی پیٹ کا تخمینہ بھرنے کے بعد ٹھیلے والے تنکے سے ٹیک لگائے آنکھیں نیم وا کئے بھرپور مرغن غذا کے خمار میں ہولے ہولے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ علی چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی۔ علی کا بھرا بھرا گورا بدن پھول دار ریشمی تکلیف میں ٹھنسا ہوا تھا اور وہ ٹرے اٹھائے ذرا آگے کو جھکی ہوئی تھی جس سے اس کا دوپٹہ آگے سے کھسک کر ٹرے پر آن گرا اور سینہ سینہ تھوڑا ننگا ہو گیا۔ ٹھیلے والے کی آنکھ جیسے کسی مشعل نے لات لیا وہ ہڑبڑا کر سیدھا بیٹھا اور علی کو دیکھتے ہوئے منہ ٹھنڈا کر کھنکھارنے لگا۔ علی نے ٹرے میز پر رکھی اور پھر دست کر کی جلدی سے باہر نکل گئی ٹھیلے والے کی بات بنا سے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ بڑا بھائی میز پر پالیاں لگانے لگا اور اس کی طرح دار بیوی تنکیوں سے خلیدار کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی ان میں چائے انڈیلنے لگی۔ ٹھیلے والا دیا سلائی سے دانت کرید رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے نال کی ایک بوند اس کے نچلے گندے ہونٹ سے پھسل کر ٹھوڑی پر آن گری جسے اس نے فوراً

رومال نکال کر سات کیا اور پیالی اٹھا کر سڑڑ چائے پینے لگا۔ اس کے بعد کاروبار کی باتیں شروع ہو گئیں جن میں بڑے بھائی کی بیوی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ٹھیکے دار کی آنکھوں میں عملی جانفشانی میں پھنسا ہوا گاہک گھوم رہا تھا۔ اس نے بڑے جوش و خروش سے اعلان کیا کہ وہ بڑے بھائی کو فٹ میں بدھان بھی استعمال بھرتی انسپراس کا یا رہا ہے۔ چھوٹے سے بچنے لگے۔

"آخر کب تک نوکری کرو گے میاں ——— میری مانو اپنی جاک میکری کی چھوٹی سی دکان کھول لو"

"اس کے لئے روپیہ چاہئے بھائی! اور یہاں تو آپ سے کیا چوری ہے بہ مشکل گذارا ہو رہا ہے۔"

"بھئی روپیہ تم مجھ سے لے کر کبھی کام چلا سکتے ہو آخر میں کوئی غیر نہیں ہوں سب پاس ہوں گے دے دیا۔"

بڑی بھاوج کا سر تن سے تن گیا، جھلتی ہوئی بولی۔

"اپنوں کی مدد ایسے ہی کیا کرتے ہیں؟"

دونوں بھائیوں کی تیوریاں کھل گئیں۔ تمام پریشانیوں، چھوٹے موٹے قرضوں کی بڑھی سلیں ایک ایک کر کے جھٹکتی سنوائیں، بیویوں کے چہرے بھی ایک دم کھل اٹھے تھے اور گھروں میں زندگی کا یا خون دوڑنے لگا تھا جو چیز یہ کہ پھر پہلے بڑی اہمیت رکھتی تھیں اب بے وقعت ہو کر رہ گئی تھیں، آنکھوں کے سامنے قسم قسم کے ریشمی سوٹ دوپٹے اور غرارے لہرانے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ لئے آنگن میں گھوم پھر کر ٹہلنگ کر رہی ہے اور پھر لفافوں، جنڈوں اور ڈبوں سے لدے ہوئے آٹھے میں سوار واپس گھر آ رہی ہیں۔ طے یہ پایا تھا کہ مزید قرض حاصل کرنے کی بات بڑی بھاوج ہی ٹھیکے دار سے کرے چنانچہ فیصلہ انہیں کے حق میں کیا پھوڑ دیا گیا۔ ادھر ادھر کی بے معنی باتوں کے بعد جب اس نے مطلب کی بات کی تو ٹھیکے دار نے ہنستے ہوئے ہمدردیوں پر ہاتھ پھیرا اور بڑی بھاوج کی ران کی پٹلی بھرتے ہوئے بولا۔

"میرا تو سبھی کچھ تمہارے گھر شیئر ہے۔"

وہ ہچکچا کر رہ گئی۔ ٹھیکے دار نے لگے رہو بڑے بھائی کو پانے ہاں آنے کی ہدایت کی اور ڈالر لیتا بھینچے ایسی گردن جھٹکتا رخصت ہو گیا۔

اس دعوت میں اکبر ماموں شامل نہ ہوئے تھے ایک تو انہیں بلایا بھی نہیں گیا تھا۔ دوسرے وہ خود بھی شریک ہونا نہیں چاہتے تھے وہ جانتے تھے کہ دعوت کس لئے کی جا رہی ہے۔ ظاہر کا اصل مقصد کیا ہے مگر خاموش تھے ایک تو انہیں اپنے اعضا کے خوابوں سے ہی فرصت نہ تھی دوسرے گھر میں انہیں اتنی اہمیت حاصل نہ تھی کہ کوئی ان کی بات سنتا گھر کا سب سے بااثر رکن اس چال میں شامل تھا۔ چنانچہ اکبر ماموں اس کی مخالفت کے دوسرے ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ جہاں سے تیس روپوں میں دو وقت کا کھانا اور تخت پوش پر لگا بھا بستر مل جاتا تھا۔ دعوت کا سارا وقت اس نے کام سے فارغ ہو کر نسبت روڈ والی دکان پر گذار دیا، سلگتی سماوار کے پیچ میں رکھے دو پیالے کی پیالیاں خالی کرتے اور جگے کے سگریٹ پھونکتے رہے اور اپنے پرانے یار سے گلشن کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے ہی دن ٹھیکے دار نے بڑے بھائی کو بغیر رسید کے مزید ایک ہزار روپے بہ طور قرض دے دیئے اور اسے آباد ان کے بھرتی انسپرے بھی بنا دیا۔ جس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اگلی گرمیوں میں اسے مزدور فیکٹری میں ملازم کروا دے گا۔ ایک ہفتہ بعد اس نے چھوٹے بھائی کو اپنے اثر و رسوخ سے گاڑی شاہ میں ایک دکان و لانڈری اور کاروبار شروع کرنے کے لئے دکان میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا مال بھی ڈلوا دیا۔ دونوں بھائی ٹھیکے دار کو فرشتہ سمجھ کر پوجنے لگے۔ بڑی بھاوج بات بات میں اس کا تصیدہ پڑھنے لگی اور اپنے رشتہ داروں کی تعریف میں زمین آسمان ملانے لگی۔ دوسری طرف ٹھیکے دار نے

ہی پہلوانوں سے بھی خوب میل ملاقات بڑھالی۔ اس کا خیال تھا کہیں یہ اکھڑ اور منہ پھٹ آدمی اس کے گلے نہ پڑ جائے۔ [illegible] چنانچہ وہ اسے پوری طرح گانٹھ میں لانا چاہتا تھا اور پہلوان کو رام کرنے میں اسے زیادہ وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ [illegible] روپے پیسے کے زور نے اس نے بعض مشہور پہلوان کو چاروں شانے چت گرا دیا۔

علی کے گھر اب سفر میں وہ ایک بار ٹھیکے دار کا آنا جانا پھر سے لگا۔ آتے جاتے وہ اپنے ساتھ پھلوں سے بھرا ہوا تھیلا یا مٹھائی کی ڈالی وغیرہ ضرور ہوتا۔ [illegible] جلدی سے باتوں اور بلاؤں میں [illegible] جانتے تھے کہ ٹھیکے دار ان کا رشتہ دار ہے۔ لہٰذا کسی کو ایسا ویسا خیال بھی نہ آتا تھا لیکن رشتے داروں کو خوب معلوم تھا کہ اس کی رشتہ داری کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی طرف سے باتیں ہونے لگیں۔ [illegible] ان باتوں کی پروا [illegible] صرف بڑی بی اور نے بڑے بیٹے سے دبی زبان میں اس بات کا اظہار کیا کہ ٹھیکے دار کا زیادہ آنا جانا اچھا نہیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ مگر بڑے بھائی نے جھڑک دیا۔

"لوگوں کے ساتھ تمہارا بھی دماغ چل گیا ہے۔ وہ ہمارا رشتے دار ہے اور ہم اسے نہیں روک سکتے۔ لوگ باتیں کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔"

چنانچہ گھر کے اس محاذ پر مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔

ایک دفعہ ٹھیکے دار نے علی سے بھی بات کرنے کی کوشش کی مگر علی نے   اس کی بات کا [illegible] اور گھر سے باہر نکل گئی۔ بعد میں [illegible] آنکھوں میں [illegible] کے تمام [illegible] آنکھوں سے گھورتا [illegible] تیز ناخنوں والا ہاتھ اس کی طرف بڑھتا محسوس ہوتا اور وہ سہم کر وہاں سے بھاگ جاتی۔

اور جب [illegible] ٹھیکے دار کی [illegible] علی کا رشتہ مانگنے گھر میں آ گئی تو علی نے [illegible] ہاتھ کے تیز ناخن [illegible] ٹھیکے دار [illegible] اس کے منہ سے [illegible] گھر [illegible] مخالفت میں شریک ہو گئیں۔

"غضب ہے خدا کا۔ اس کی اتنی مجال۔"

بڑا بھائی زخمی [illegible] کی طرح [illegible] لگا۔

"اس نے سمجھ کیا رکھا ہے [illegible] رشتے [illegible] پانی اس کے منہ پر [illegible]"

چھوٹا بھائی پریشان [illegible] پانی [illegible] ٹھیکے دار [illegible] اور دوسرے [illegible] مخالفت [illegible] ٹھیکے دار [illegible] اور دونوں گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

پہلوان بھائی گویا چپ چاپ دروازے سے باہر نکل گیا۔

"اس کی ماں کا حلوہ کردیا ——— دیوروں کو مسلم کرنے کے لئے سہاگ ہی رہ گیا ہے میں کس کا ایک ایک بادام اسے واپس کروں گا۔ سالے نے کچھ کیا رکھا ہے۔"

ڈیڑھ ایک مہینہ خاموشی سے گذر گیا۔ گھر میں اس موضوع پر کسی نے کوئی بات نہ کی۔ منجھلے دادا بھی مصلحتاً خاموش ہو کر بیٹھ رہے اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے کہ اس بھونچال میں شکار کو خود بخود آہستہ آہستہ اپنی طرف آتا دیکھ کر جھاڑیوں کی اوٹ میں گھات لگا کر بیٹھ جائے۔ حقیقت میں دونوں بھائی اندر ہی اندر اس رشتے پر فریفتہ ہو رہے تھے۔ وہ بے حد پریشان تھے انہوں نے اپنے متعلق کی مہمات جو ماضی میں ادھر کے گاؤں سے جوڑے کی پیدائش سے گھر کی کلیوں ان کی ٹانیں کھسکنا شروع ہو گئی تھیں۔ چھوٹے بھائی نے اس پر کاٹال دیا تھا کیونکہ نہ یہ سامان فروخت کرنے کے لئے رقم موجود تھی اس رقم کو وعدہ خلافی کے لئے رکھا تھا۔ بڑے بھائی کا جہاز آباد ان کی طرف تیزی سے ہچکولے کھاتا ہوا آنے لگا تھا۔ منجھلے دادا کا وہ بھی تین ایک ہزار کا مقروض ہو چکا تھا ان تمام بے رحم حقیقتوں نے مل کر اس کے سوچنے کی ریل گاڑی کو ایسی پٹری پر ڈال دیا تھا جس کے آخری سٹیشن پر منجھلے دادا سہاگ بانسے کپڑوں کے ہار گلے میں ڈالے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ خاندان کے انداز فکر میں اس تبدیلی کو ان کی بیویوں نے فوراً بھانپ لیا اور بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ کیونکہ آندھی کے اس خوفناک طوفان میں ان کو بھی تھانوں، جوتیوں اور سنگار کی ان گنت چیزوں سے لدا ہوا آنگن بھی نکلا ہوں سے اوجھل ہوا تھا۔ قلعہ کی دیواریں باہر کی گولہ باری سے پہلے ہی کمزور ہو رہی تھیں اب تو اندر سے بھی سینہ ملانے کی جائے تو اچانک ایک جگہ اچھا خاصا شگاف پیدا ہو گیا۔ بڑی بھاوج نے فوراً منجھلے دادا کے مکان کی جانب ٹھنڈی ہوا دی چنانچہ اب کے بار منجھلے دادا کی طرف سے ایک باشعور بزرگ پیامی بن کر بڑے بھائی کے ہاں گئے۔

"بیٹا لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں کہیں نہ کہیں تو انہیں بیاہنا ہی ہوتا ہے تو پھر اس رشتے میں کیا برائی ہے اسلام کی رو سے بالکل جائز ہے لڑکے کی عمر کوئی ایسی زیادہ نہیں ہے پھر اکیلا رہتا ہے ہزاروں کی جائیداد ہے لڑکی ساری عمر راج کرے گی اس کے علاوہ شرع نے بھی ایسی شادیوں پر زور دیا ہے جن کی رو سے دو گھروں میں خوش حالی اور فارغ البالی کا کوئی سبب بن سکے۔"

چھوٹے بھائی دل ہی دل میں پہلے ہی راضی تھے اب جو اس جرگے نے اسلام اور شرع کا حوالہ دیا تو وہ اس رشتے پر تیار ہو گیا ذہنی طور پر بڑے بھائی بھی اس رشتے کو قبول کر چکا تھا مگر اس کا ضمیر اسے بار بار اس فیصلے پر ملامت کر رہا تھا وہ اس فیصلے تک پہنچنے کے اثر و ہے کے مزمن کسی معقول دلیل کی موجودگی میں اپنے اور دنیا کے سامنے کوئی قوی دلیل پیش کرنا چاہتا تھا ایسے بھی یہ قاعدہ ہے کہ ہمیں اپنے ہر خلافانہ فعل کے لئے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے واسطے کتنی ہی شدید دلیلیں کی کوئی دلیل پیدا کرنی پڑتی ہے ورنہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ہمارا کلیجہ اپنے ظلم کے تقاضے سے پھٹ جائے بڑے بھائی نے اپنے وفاق کے نمونہ خانے کی پوری تلاشی لی آخر ایک کونے میں پڑا ہوا بچے ہوئے گوشت کا ایک لقمۂ تر اکھل گیا پھر کیا تھا اس نے اسی بزرگ کے ہاتھوں منجھلے دادا کو یہ پیغام بھجوایا کہ شادی کے سلسلے میں ان کی کچھ شرطیں ہوں گی اور شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ مہر پچاس ہزار ہوگا اور فوراً طلب ہوگا۔

۲۔ لڑکی کا پہلے والے بچوں سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

۳۔ لڑکی ہمیشہ الگ مکان میں رہے گی۔

۴۔ وہ ہر ماہ ایک ہفتہ اپنی والدہ کے پاس آکر رہے گی۔

۵۔ تین ہزار روپے رنڈی کے نام الگ بنک میں جمع کرا دئے ہوں گے۔

جس وقت بھگتے دار کو یہ پیغام ملا وہ اپنے دوستوں کے گھر اپنے فلیٹ کے نیچے کمرے میں بیٹھا پیٹ بھر کر بیئر پینے کے بعد تحفہ کی روٹیوں کے ساتھ پسند سے اڑا رہا تھا روٹیوں کے بھوسے اس کی مونچھوں میں اٹکے ہوئے تھے اور انگلیاں شوربے میں چپڑی ہوئی تھیں پیغام سن کر اس کی گردن تیغ مندی کے زخم سے تن گئی۔ دو ایک سانس اس زور سے لے کر پھولی ہوئی مونچھوں کے بال کانپنے لگے۔ زبان کی نوک سے منہ کے آگے آیا ہوا غیری روٹی کا بھورا چاٹا۔ ڈکار مار کر تو ند پر ہاتھ پھیرا۔ پیغامبر کے کان میں جھک کر کچھ کہا اور پھر آگے کو جھک ایک پسلا دانتوں میں دبا اسے جانوروں کی طرح چبانے لگا۔

پیام لانے والے کے تین چار پھیروں کے بعد خوش کہار کے بیٹے میں عطیہ بالو کی ٹھٹھے دار سے شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ نے ان کی ساری شرطیں منظور کر لی تھیں پہلوان بھائی نے دیوار پر دو ہتڑ مارا اور چاگول کمدا لیا سر ہاتھوں میں لے کر بڑے کرب سے بولا۔

"تم سب قاتل ہو۔ بیسیوں کی خاطر میری بہن کو اس شرابی سے بیاہ رہے ہو؟"

بڑے بھائی نے غصہ میں اسے ڈانٹا

"بجو اس بند کر بتی۔"

بتی اٹھ کھڑا ہوا

"میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ تم روپوں کے بھوکے ہو۔ میرے پاس دولت ہوتی تو میں اپنی بہن کے سر پر وار کر تم کتوں کے آگے ڈال دیتا۔"

بڑے بھائی نے زور سے اسے ایک تھپڑ رسید کیا بتی کی آنکھوں میں ایک دم خون اتر آیا ایک خاموش مچھلی سی کوندی اور بتی نے دھوتی کے ڈھب سے چاقو نکال لیا اور بڑی ماں چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی عطی بتی کے ہاتھ جوڑنے لگی بڑی بھاوج روتی چیختی اپنے خاوند پر آن گری بتی نے چاقو فرش پر پھینک دیا۔۔۔

"میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ میرا ڈیرہ صمدو کی بیٹھک میں ہوگا میں اپنی بہن کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

لیکن گھر سے دھکے کھا کے نہ بھاگے کبوتر کی طرح مکان کے اندر ہی دبکتا رہا۔ پھر پھڑپھڑا کر چلتے گھڑے میں سے گھٹنے پانی کا ایک گلاس پیا۔ دھوتی کے پلو سے ناک صاف کی اور چوکی پر بیٹھ کر اسے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں اس کی حالت اس بھوکے چیتے سے ملتی تھی جو پنجرے میں بند ہو کر شدید غصے اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں چاروں طرف غراتا پھرتا ہے لیکن جب پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا ہے تو پنجرے کے احساس سے بے نیاز ہو کر کونے میں لیٹ کر نیند کے جھونکے لینے لگتا ہے۔

عطی پاگل سی ہو کر رو گئی تھی اس کا رنگ دنوں ہی میں پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ٹھنڈے بے جان پرزے کی طرح گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ اسے اپنے ساتھ کی جانے والی بے انصافی کا پورا احساس تھا مگر وہ اس گھر میں بے بس تھی اسے بارہا معلوم ہوا تھا کہ اس کی تقدیر کی باگ خدا کے ہاتھ میں نہیں جگہ اس کے بھائیوں اور بھاوجوں کے ہاتھ میں تھی وہ مکان کی مٹی پر کھڑی ہو کر اس ظلم کے خلاف واویلا مچانا چاہتی تھی مگر جیسے ہی سیٹی سی پر اس کی بہت جواب دے جاتی اور اس کی ٹانگیں کانپنا شروع کر دیتیں اور ایسا ہوتا ایک قدرتی بات تھی جب اس کے ذمہ دار بھائیوں نے مرد ہو کر ہتھیار ڈال دیئے تھے تو وہ میدان جنگ کی سب سے پہلی قطار میں ہتھی کھڑی دشمن کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی اور پھر ایسی حالت میں جب کہ اس کے ہاتھ میں تلوار کی بجائے دھنیوں کو پانی پلانے والا مشکیزہ ہو۔ اکبر بادشاہوں کی پوری ہمدردیاں عملی کے ساتھ تھیں لیکن ہمدردیاں وہ چاہے تھے جو ہم کے بغیر ہی زمروں سے چپکائے جا سکیں وہ اس لڑائی کا خاموش تماشائی تھا جو میدان جنگ سے دور ایک بلند ٹیلے پر سمادر گرم کئے ہلکے کا سگریٹ سلگائے بیٹھا ہوا اور لڑنے

والوں جیتے والوں، ہارنے والوں، گرنے اٹھنے والوں کو موت ایسی بے حس سنگین اور دل ہلا دینے والی بے تعلقی اور بے نیازی سے دیکھ رہا ہو۔

وہ عملی سے صرف اتنا ہی کہہ سکا: "میں مجبور ہوں منی! یہاں میری کوئی نہیں سنتا ہے عملی کہ میں ان لوگوں میں کوئی اجنبی آگیا ہوں جسے یہ بالکل نہیں جانتے تنہائی کی حالت دیکھ کر میرا دل خون ہو رہا ہے مگر میں کہہ ہی کیا سکتا ہوں تاہم بہت جلد انسانی میری بداشت سے باہر ہے شاید میں بھی جلد نکلنے چلا جاؤں اور پھر کبھی اس گھر کا رخ نہ کروں گا ــــ" عملی کا زرد پھیکا، پژمردہ چہرہ بجھا ہوا تھا پھر بھی اکبر ماموں اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا جیسے اس دردناک حادثہ کی کچھ ذمہ داری اس پر بھی عاید ہوتی ہو ایک ایک کر کے ہر اپنا آدمی عملی کا ساتھ چھوڑ رہا تھا اسے اچانک اسلم کا خیال آگیا وہ عملی سے محبت کرتا تھا وہ اس کے لئے مضطرب کچھ نہ کچھ کرنے کا وہ ہمیشہ کی طرح اٹھ دوڑی اس نے ایسی اندھیری اور گھپ اندھیرے کے عالم میں طوفانی سمندر کی ہیجان خیز لہروں کی سطح پر تیرنے والے آخری تختے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اسلم اپنے کام کے کرشمہ بیچ پر جا رہا تھا اس نے صفید کپڑے پہن رکھے تھے ایک پاؤں کرسی پر ٹکائے جھک کر سفید بوٹ کے تسمے باندھ رہا تھا اس نے عملی کو اوپر چڑھتے دیکھا تو بڑے لاابالی انداز میں سیٹی مارتے ہوئے مسکرا کر بولا "مبارک ہو تمہیں ــــ اری او میرے بھولے بھالے تو کیا ہوا تو بھی تو کرے گی ــــ اچھا تو ہیں کلمہ گھڑا ملک ہے گی نا؟" آنکھ کر دبڑے مکروہ انداز میں ہنسا، منہ عملی کے پاس لا کر بڑے فحش انداز میں سیٹی بجائی اور گاتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ اسلم کا بدبودار سانس عملی کے چہرے پر سانپ کی پھنکار بن کر لگا وہ خوف سے زرد پڑ گئی وہ گم سم وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس نے شدید سراسیمگی کے عالم میں طوفانی سمندر کے گھر تے، سرپھرے، گھبرے، وحشت ناک وحشی گرداب میں اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا، چکراتے، شور مچاتے گرداب کی پہاڑ ایسی دیواریں اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی تھیں اور وہ نیچے ہی نیچے گرتی جا رہی تھی، عملی کا چہرہ طوفان بجوا اوپر اٹھتا گیا اس نے گھٹنے خون میں لتھڑے ہوئے، آگ اگلتے، گھبرے سرخ جہنمی آسمان کو آخری مرتبہ دیکھا اور اپنے آپ کو بے رحم سمندر کی غضب ناک لہروں کے حوالے کر دیا۔

ایک لمحہ بعد وہ دھین بن کر تھپیڑے مار کے ساتھ رخصت کر دی گئی، ڈول چلی گئی، گھروں کے دروازے بند ہو گئے، گلی ویران ہو گئی۔ پھر ٹھنڈی سی سسکیاں بھرتی ہوا چل نکلی اور گلی کے نوش پر بھی ہوئی آگ کی راکھ اڑنے لگی، اور پھر بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی اور گلی میں جلے ہوئے پھول کچھ میں لت پت ہو گئے اور پھر . . . .

فضا میں کسی بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی

عملی نے گھوم کر دیکھا اس کا لاڈ پیسرت بچہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ننھی ننھی مٹھیاں بھینچے روئے جا رہا تھا وہ کھڑکی چھوڑ کر اس کی طرف لپکی اور پاس آ کر ایک دم ٹھٹک سی گئی۔ اسے ایسا لگا یوں لگا جیسے اس کا مکروہ صورت گندا بچہ ناشرابی فاحشہ بچہ بن کر پلنگ پر بیٹھا رو رہا ہے وہ اسے ہاتھ لگاتے جھجکنے لگی جیسے اس کے چھوتے ہی وہ بدصورتی کا پلپلا سا لوتھڑا اچھے سے پھوٹ جائے گا اور اس کی ہری ہری سبز ہری لفافت میں اس کی انگلیاں لتھڑ جائیں گی۔ بچے کے رونے کی مسلسل آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی پھر جیسے اپنے آپ ہی اس کے ہاتھ بچے کی طرف بڑھے اس نے بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور خود بھی روتے ہوئے اسے پاگلوں کی طرح چومنا شروع کر دیا۔

بچے کے سامان میں پتیلی، آگ اور گھنگھریلے بالوں والا عاشق مزاج لڑکا ابھی تک وہیں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اس نے جب کھڑکی کی جالی میں لگی لڑکی کی پراشتیاق نگاہوں سے تیر جیسوں کی طرف دیکھنے لگا اسے یقین تھا کہ اب کام بن گیا ہے اور وہ لڑکی اس سے ملنے مزید نیچے اترے گی۔

کلیوں کی پکار

صادق حسین

پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں رات کی تاریکی میں گم ہو چکی تھیں۔

اسلم شیبی راستے پر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا جب پہلے بگلی کے گھیبے کے پاس پہنچا تو برف باری پھر شروع ہو گئی۔ اس نے رک کر اپنے اونی گلوبند اور گن ٹوپ کو درست کیا۔ اور کوٹ کا کالر اوپر کو اٹھایا اور چھڑی کھول کر دستانے پہنے ہوئے ہاتھ میں تھام لی۔ اس کے سیاہ رنگ کے اوٹ نرم نرم برف میں دھنس دھنس کر گہرے گہرے نشان بناتے ہوئے بڑھ گئے۔ سنسان راستے کے دونوں طرف اونچے کی نالی دار چادروں کی چھتوں پر برف کے گالوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے مکان بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ البتہ اکا دکا کوٹروں کی دروں سے روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ بجز اس کے معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے مر رہی ہے۔ جیسے جیتی جاگتی زندگی کا کبھی دھوکہ سے گذر بھی نہ ہوا ہو۔ لوگ کہتے تھے چڑھائی کا دوسرا نام بہار ہے اور اترائی کا خزاں۔ اسلم کے ملنے جلنے والے اکثر کہا کرتے تھے کہ ہنسی مسکراتی زندگی کی آماجگاہ جس تیزی سے یہاں نمودار ہوتی ہے سال کے اس حصے میں اسی رفتار سے سیدانی علاقوں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اسلم کے ساتھ پڑھے ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والے اس موسم سے بے خبر لوگ تھے۔ مسلسل برف باری جب آمد و رفت کے سلسلے بند کر دیتی تو وہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر آگ تاپتے، چلغوزے کھاتے، نمکین چائے پیتے اور گذشتہ سیزن کی جھیل پھل کو یاد کر کے وقت کاٹتے۔ لیکن اسلم کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس ویرانی میں بھرپور زندگی کا احساس ہوتا۔ ان خاموشیوں میں اس کے کان فطرت کے گیت سنتے۔ جب وہ دیوتاؤں پر چڑھی ہوئی برف کی ٹیڑھی میڑھی ٹہنیاں اور پتے دیکھتا تو اس کے سوئے ہوئے جذبات آنکھیں مل کر جاگ پڑتے۔ ہر شے برف کی سفید اور ٹھنڈی اوڑھ کر کنواری مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کرتی۔ ایک کشادگی سی، ایک پھیلاؤ سا، ایک نامعلوم وسعت سی اس کے چاروں طرف پھیل جاتی۔ اس میں کھو جانے کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ چند روز رہنے کے بعد اس کا دل یہ گھر کے ماحول کو بالکل بدل دیتا۔ ایسے میں وہ اپنی سب سے چھوٹی بچی یاسمین کو گود میں لے کر اسے اب لوب پیار کرتا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ آتش دان کے پاس بیٹھ جاتا اور مزے لے لے کر پچھلی بار کی پہیلیاں کہتا۔ وہ پہیلیاں جو اس نے اپنی مرحوم ساس سے سنی تھیں اور اس کی ماں نے اپنی ماں سے اور یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا تھا۔ جب ہی اور تبھی کھڑکی، کھیت اور گھیاؤں سے زندگی خوبصورت تھی۔ اسلم کو ایسے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر اس کی اہلیہ سکینہ کام چھوڑ کر پہلو بدل اٹھتی۔ وہ چپکے سے دھنے کا مٹھا منہ میں ڈال لیتی۔ آنکھوں میں سرمے کی دو دو سلائیاں پھیر لیتی۔ مسواک کھول کر نئے سرے سے پرانی کر لیتی۔ الجھا ہوا پٹ اون پر ڈال لیتی۔ دھنے کی بھوری چمک اس کے ہونٹوں کو تازگی اور سرخگونی بخش دیتی۔ دانت موتیوں کی لڑی بن جاتے جب

سب لڑکیاں سو جاتیں تو وہ اسلم کی چارپائی کی پائنتی بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگتی۔ اسلم کی پیشانی پر کوئی شکن نہ پا کر اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ وہ سرکتے سرکتے سرہانے کی طرف چلی جاتی اور چپکے سے اسلم کے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگتی۔

اسلم آٹھویں جماعت کے لیے کے پاس پہونچ کر مجھ بھر کے لئے رکا۔ یہ کھبا اس نے نشان رکھ چھوڑا تھا۔ یہاں سے اپنے ہاتھ کو موڑ کر اسے وہ چھٹی پڑھنی تھی جو سیدھی بھاگو دائی کے گھر کو جاتی تھی۔ یہاں سے وہاں تک ٹھیک پانچ سو قدم مکان کا فاصلہ تھا۔ گیارہ سال کے عرصے میں اسے یہ مسافت دن اور گھپ اندھیرے میں طے کرنی پڑی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے قدم گنتا چلا جاتا۔ دیوں کرنے سے اس کی اپنی آواز اس کی ساتھی بن جاتی۔ آج رات بھی وہ اسی انداز سے چل کر بھاگو دائی کے گھر تک پہنچا۔ اس مختصر اور پوسیدہ مکان کے سامنے چیل، بلیاتی اور جنگ کے پیڑ چپ سادھے کھڑے تھے۔ ان پیڑوں کے قریب ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا جشمہ لفظ "انجو" پر پہنچ کر بے آواز ہو چکا تھا۔ بھاگو دائی کے مکان کے دروازہ کی جھریوں میں سے لالٹین کی جھلملاتی لو نظر آ رہی تھی۔ اسلم نے برآمدے میں کھڑے ہو کر جھریری پر سے ہرت جھاڑی اور پھر دروازے پر دستک دے کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

ایک اجنبی شخص نے دروازہ کھولا۔

"ماسی بھاگو....." اسلم ابھی جملہ مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ وہ اجنبی شخص بول پڑا۔ "بھاگو دائی کا انتقال ہو گیا ہے۔" اسلم دھک سے رہ گیا۔ چھری ان کردہ چپ چاپ لپیٹ کر پگڈنڈی پر ہو لیا۔ کوئی دس دن پہلے جب سکینہ کو بھوٹے درد ہوئے تھے تو بھاگو دائی اس کے گھر پر آئی تھی۔ اسلم کی اور دادی زندگی کے گیارہ سال پورے ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں سکینہ دس لڑکیاں جن چکی تھی۔ بہم ٹھنی کی رفاقت سے لے کر ننھی یاسمین تک سب کی سب بھاگو دائی کے ہاتھ کی تھیں۔ اب گیا وہاں بچہ آیا تھا۔ ہر سال فطرت اسلم کو حقیقت کا ایک تیز جام پیش کرتی۔ کبھی کوئی کرائے اندر سے رونا اور باہر سے سکرانا پڑتا۔ دس دن پہلے بھاگو دائی نے اپنے پاؤں سے سکینہ کے کولہے دباتے ہوئے کہا تھا۔ "گھر کا کام کاج کیے جاؤ پہونچا تی بڑی تسلی رہے گی۔ کوئی اندیشہ نہیں آنکھ جھپکنے میں معاملہ ہو جائے گا۔" یہ سن کر اسلم کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا "کاش یہ معاملہ ہوتے پاتے بھاگو دائی کیوں نہیں کہتی کہ بچے نے پیٹ میں حرکت بند کر دی ہے۔ وہ ہمیشہ کہتی ہے "کوئی اندیشہ نہیں" میں اس کے منہ سے ایک لفظ سننا چاہتا ہوں "خطرہ" لیکن سکینہ کو تھی پر لے درجے کی ڈھیٹ ہڈیوں بھاری ہوتا گھر کا کام کاج بے تکان کیے جاتی۔ چارپائیوں کی ادوائن کستی۔ پانی سے بھرے گھڑے اٹھا اٹھا کر گھڑنچی پر رکھتی۔ گھر کی جھاڑ پونچھ کرتے وقت صندوق اور ٹرنک گھسیٹ گھسیٹ کر ادھر ادھر کرتی۔ اتنے اتنے طبیوں کے باوجود اس کے جننے کے ہفتے کو کوئی روگ نہ لگتا۔ بعض اوقات کچے بچے دنوں میں وہ اپنی بیٹیوں کو ساتھ لے کر گھر کے پچھواڑے میں چلی جاتی۔ بہتی پر چڑھتی اور پھر کگڑے لگا کر اترتی۔ یہ سب کچھ کرنے پر بھی جب اس کی ناف کے اردگرد درد نہ اٹھتا تو وہ خود کو کوسنے دیتی۔ اندوہناک زندگی کے ابتدائی دنوں کو یاد کر کے کڑھتی رہتی۔ وہ دن جب اسلم جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز سے پکارا کرتا تھا "سکینہ بانی" اور یہ سنکر اس کے دل کا کنول کھل جایا کرتا تھا اور وہ اپنے سب کو سچ مچ کی رانی محسوس کیا کرتی تھی۔

شادی کے تقریباً دس ماہ بعد پہلی لڑکی ہوئی۔ ننھی سی جان کی آمد نے گھر کا نقشہ بدل دیا۔ اسلم کے چہرے پر دلی رونق آ گئی۔ خوشی سے اس کا سینہ پھیل کر چوڑا ہو گیا۔ بچہ گیریاں گانے لگیں۔ اپنے پرائے نے منہ میٹھا کیا اور جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں۔ دوسرے برس سکینہ کے گئے بیٹھے دن تھے کہ بڑی پرمیشوں نے پیشینگوئی کی "بیٹا ہوگا" وہ بات سچی ثابت نہ ہوئی۔ اس کے بعد ہر سال سکینہ کھٹ سے

ایک بن دیتی ہوں جس میں لڑکیاں پیدا ہوتی گئیں سکینہ کی مسرتوں پر اداسی پڑتی گئی۔ اس کے کان اسلم کے منہ سے مسکینہ بانی سننے کو ترس کر مایوس ہو گئے۔ جنس گھٹ اور زندہ دل اسلم کبیدہ رہنے لگا۔ تفکرات نے اس کے چہرے کی آب و تاب کو مجھوڑ ڈالا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ تھا۔ اس کی بات وہ اکثر کہا کرتا تھا "دو چار ہی کو موت آجائے تو شاید یہ سکون کا سانس لے سکوں" لیکن موت آنے کے بجائے اس کی دشمن اور زندہ ہی نہیں جلد تندرست و توانا تھیں اور برسات کی مکھیوں کی طرح تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں۔

اسلم نے سن رکھا تھا کہ عورت کے لئے بچہ جننا زندگی اور موت کا سوال ہے۔ وہ سوچتا "یہ سراسر جھوٹ ہے" اس لئے کہ سکینہ کا بچہ جننا تو کسی طرح تھا جس طرح چڑیا بیٹ کر کے پر جھاڑے اور پھر رات دن چہکنے میں لگ جائے۔ اگر اب بھی ہو کر سکینہ نے کبھی بکار سب کو کھلا بھرتن اٹھا کر کونے پر رکھے اور پھر گرم گرم چلے سے پانی کر جھاگ بانی پر لے گئی اور جھاگ دانی کے پہنچنے تک نیا تماشے جاگنے کی بات ضرور تھی کہ بچے دو دن میں سکینہ کی بغیر محل جا اگر تھیں۔ لیکن یہ چیزیں بھی اسلم کے احساسات کی دیوار کو چھو کر نہ پاتیں کیونکہ جب کبھی اسلم کو گردے کی تکلیف ہوتی تو درد کی شدت، اچھن، اور تندی اسے موت کے دروازہ پر لا کر کھڑا کر دیتی۔ اس کے خیال میں دو زندہ گردے کے درد کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔

اسلم آخری بھی سکینہ کے قریب سے گزرتا روپیہ پیدا اس کا دم اکھڑنے لگتا۔ اسے سردی لگ کر اس کے پاؤں پنجے، پنڈلیاں، ٹانگ کی پٹھے اس ہوتی جا رہی تھی۔ بوجھ سے گھٹنے بدستور گر رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس کو دیکھ کر بھی سی بانی تیز سے کام کرنے لگی۔ آٹا پھولا۔ انھیں نیاں نے پھر لپٹی میں وہ دس دن پہلے کا نی دیرنگ، الجھا ہوا جب، جھاگ دانی پھٹی گئی تو اس نے منہ و چھ کھول کر اس میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا ہتھوڑی، سوب، بلیک پوڈر، روئی، ڈیٹول، سیفٹی پن اور دوسری چیزیں جو زچہ اور بچہ کے لئے ضروری تھیں۔ سرخ رنگ کے موم جامہ میں کاتوں رکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سیخے، روئی اور ٹوشک، رنگ رنگ کی قینچیں اور ڈاک، ننھے ننھے روئی موزے، سوئیٹر، کوٹ، سر لپٹر کے لنگوٹ، ایک گٹھڑی جس میں دھلے ہوئے لیرتے بندھے تھے۔

اسلم نے محسوس کیا تھا کہ یہ گھناؤنا چکر کبھی ختم نہ ہوگا۔ چنانچہ سیدھی راہ پر اس کے تحت الشعور سے ابھرتی تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ "بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دوں۔ پھر اس کے دل میں ایک اور خیال نے سر اٹھایا تھا کہ "اس سکینہ ہی کا کام تمام کر دوں۔ نہ بانس نہ بجے بانسری۔ پھر اس تیسرے خیال نے کہ "کیا فائدہ کیوں نہ فضیحت کو سر کے پیالے زہر دے دوں۔ وہ اسے پیار کی چھری سے ذبح کر کے چھٹکارا پا لوں۔ اس لئے کہ پیوٹھی کی رفعت بڑی مہلک ثابت ہوئی تھی۔ روکھی سوکھی کھا کر بھی وہ غیر معمولی تیزی سے جوان ہو رہی تھی۔ اس کے بعد کی دو بیٹیاں بھی اسی کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔ سامنے گھنے کے لئے روٹی کپڑا جب کہ اصل جان تھا۔ ان چیزوں کے متعلق تو سوچنا ہی گناہ تھا۔ آج رات بھی اسلم اسی بچے پر سوچ بچار میں رفتہ سے اٹھ کر کچھ دور سڑک پر پہنچ اور پھر تھوڑی دیر بعد اس بچہ زندگی پر پھیلنے لگا ہوا ہے اس کے گلے کو جا رہی تھی۔

"بھاگوانی مر گئی۔ اب کیا ہوگا؟"

اس کی عقل پیوند کی مخصوص حیثیت کا جائزہ لینے لگی۔ برف باری کے موسم میں وہاں سوائے بھاگوانی کے اور کوئی دائی نہ پائی جاتی تھی۔ اور اگر تھی تو اس کا اسلم کو علم نہ تھا۔ دفعتاً وہ محمود کا مکان دیکھ کر رکا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ محمود اس سے کم تنخواہ پاتا تھا مگر گھٹ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے ڈانگ روم کی کھڑکیوں اور دروازوں پر جھولدار کپڑے کے پردے پڑے ہوئے تھے

اس کی بیوی نفیسہ عمدہ عمدہ ساڑھیاں اور ان سے میچ کرتی ہوئی چولیاں پہنتی تھی۔ اس کے صرف دو بچے تھے لڑکا ڈنٹ میں پڑھتا تھا اس کے بعد ڈیوسیٹ۔ سلائی کی مشین اور بجلی کی استری کے علاوہ ایک ٹیبن اور صوفہ سیٹ بھی تھا۔ محمود کے گھسنے پر اسلم فرش پر تمت آسن بچھا تھا۔ تاش کے پتوں کو تو جیسے اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جب داؤں لگا بات کھائی۔ ہر ہر تہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل گئی رشوت کے متعلق بھی اس نے جیسوں سو چا مگر جیل کے خوف نے مٹھی گرم نہ ہونے دی۔ یکایک اسلم رک گیا۔ اس کا دایاں پاؤں اپنے گھر کی پہلی سیڑھی پر تھا۔ پھیلا سا سرکاری مکان جس میں نل اور بجلی لگی ہوئی تھی۔ جس کا کرایہ بڑے نام تھا۔ سردیوں میں ایندھن بھی رعایتی داموں ملتا تھا۔ ان سہولتوں کے باوجود پاؤں چادر سے باہر پڑتے تھے۔

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسلم نے اپنا بایاں پاؤں دوسری سیڑھی پر رکھا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے بڑھ کر دروازہ پر دستک دی اور پھر سب معمول رفتہ کو پہنچا۔ پندرہ منٹوں کے بعد سکینہ نے کنڈی کھولی۔

"بھاگوانی کا انتقال ہو گیا ہے۔" اسلم نے سپاٹ انداز میں خبر سنائی۔

"ماسی بھاگو" سکینہ نے دایاں ہاتھ پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اور کچھ کہے بغیر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اسلم نے چھتری کو الٹا کر بند بھاڑی اور پھر کمرے کے اندر داخل ہو کر کوٹ اتار پھینکا۔ چھتری کو دیوار کے ساتھ ٹکا کے بوٹ اتارے۔ ایک ایک کونے میں رکھے۔ کن ٹوپ، اوور کوٹ اور گلوبند اتار کر کھونٹیوں پر لٹکائے اور پھر آتشدان کے پاس بیٹھ کر موزے اتارنے لگا۔

مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پیدا کرنے میں نو لڑکیاں جھلنگوں پر لحد اٹھائے سو رہی تھیں۔ لحافوں کے کنارے چمکتے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سے سیون اوور لگی تھی۔ اسی کمرے میں اسلم آتشدان کے پاس چھپر کے مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ آتشدان پر لگی ہوئی لکڑی کا چمان سرخ پھیپھٹ سے دھکا ہوا تھا۔ اس پر ایک آئرن چینک کی سفید گھسی سیرپٹان کی کیتلی۔ فینسی کیک گورٹ کا پیکٹ اور ماچس رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں دو چارپائیاں آمنے سامنے دیواروں کے ساتھ بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر سکینہ بے نوری کی گھڑیاں گذار رہی تھی۔ دوسری پر نجمی یاسمین سو رہی تھی۔ یاسمین اپنی ماں کے پاس سویا کرتی تھی۔ نجمی اور ایک اور بچہ باپ کے ساتھ سونے کی علت ڈالی جا رہی تھی۔ ایک کونے میں تپائی پر فیڈکس کا ڈبہ، انڈیا ٹیسٹ کا ڈبہ اور گرم پانی سے بھری تھرماس پڑی ہوئی تھی۔

اسلم نے دو بوتل سوکھی لکڑیاں دیکھتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیا۔ دھواں اٹھا۔ لکڑیوں نے آگ پکڑی شعلے بلند ہوئے۔ مقابل کی دیوار پر اسلم کا سایہ لانبا ہو کر عمودی رخ میں بے تحاشا لرزنے لگا۔ باہر ہوائیں سیٹیاں بجانے لگیں۔ پانے کی لہریں بند دروازوں اور کھڑکیوں کی درزوں میں سے داخل ہو کر حدت حرارت کو اور پیچھے گرانے لگیں۔ اسلم نے پہلے ہاتھ تاپے، پھر گرم ہتھیلیوں سے بک تھوڑی اور گالوں کی سکوڑی۔ پھر اس نے ٹانگیں پسار کر پاؤں سینکے۔ آگ کی تپش سردی کو نگلنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کھڑے ہو کر چمان پر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ آئینے میں اسے اپنا چہرہ خوفناک حد تک زرد دکھائی دیا۔ کنپٹیوں کے بال بالکل سفید اور سر کے پچھلی بھنوؤں کے نیچے سیاہ حلقے۔ اس نے مونڈھے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا۔ دھوئیں کے چھرے نے چھوٹے حلقے بنے بعد ازاں گہرے اور آخر کار فضا میں تحلیل ہونے لگے۔ رفعت سے چھوٹی لڑکی کا ہاتھ کھاٹ سے باہر نکل کر نیچے لٹک رہا تھا۔ جھلنگوں کے پایوں پر گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اسلم کے دماغ میں شعلے کوندے بھرنے لگے۔ عجیب آوازیں گونجنے لگیں۔ خلاف معمول اس نے رفعت سے چھوٹی لڑکی کا ہاتھ لحاف سے نہ ڈھانپا تیز تیز

لڑکے نے بازو کھجاتے ہوئے کروٹ بدلی۔ لحاف سا کونا الٹ گیا۔ ہلکی روشنی میں اس کی کلائی پر دو ننھی ننھی ہڈیاں ابھرتی نظر آنے لگیں۔ آج اسلم کو قطعاً احساس نہ ہوا کہ کھلے ہوئے کالر کے بٹن پوچھ رہے تھے۔

"ذرا فضیہ بہن کو بلا لائیے۔" دوسرے کمرے سے سکینہ نے بمشکل تمام کہا۔

اسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں جلنے لگیں۔

یکایک یاسمین رونے لگی۔

"ذرا یاسمین کو دیکھئے تو۔ اسے بھوک لگی ہوگی۔" سکینہ نے رک رک کر کہا۔

اسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کوئی جنبش نہ کی۔

"بھوکا تو میں بھی ہوں۔" اس کا دل ابلنے لگا۔ "میرا بھی جی چاہتا ہے کہ بیچ اٹھ کر مکھن ٹوس اور انڈے کھاؤں۔ مگر ہائی روٹی کا کرنا چلا جاتا ہوں۔ تم گھسے گھسے میرے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ دانتوں سے کوئی کوئی بچر تیر اور ان دس انگلوں کا پیٹ پال رہا ہوں اب میں اس گیا رھویں بچے کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

یاسمین زور زور سے رونے لگی۔

"جی بھر کر رو لو۔ روتے روتے دم توڑ دو۔ آج اس گھر میں موت کے سائے لہرا رہے ہیں۔" اسلم پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اینٹھنے لگیں۔ آنکھوں کے سفید بال اسے گھورنے لگے۔ آنکھوں کے سیاہ حلقے اسے مذاق اڑانے لگے۔ چہرے پر چھائی ہوئی زردی نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کے کانوں کی لویں گرم انگارے بن گئیں۔ دماغ کھول اٹھا۔ اس نے آئینہ پر گھونسہ دے مارا۔ زور کا چھناکا ہوا۔ رفعت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے لپک کر رفعت کو چٹیا سے پکڑ کر پٹاخ دو چار تھپڑ رسید کیے۔ رفعت سہم کر لحاف میں دبک گئی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" سکینہ انتہائی تشکل سے اٹک اٹک کر بولی۔

"خاموش!" اسلم گرجا۔ اس کی خوفناک آواز کمرے میں گونجی۔ رفعت نے دم روک لیا۔ یاسمین کی گھگھی بندھ گئی۔

دفعتہً سکینہ نے ایک دل دوز چیخ ماری۔ اسلم کی رگِ پیشانی نے کچھ گرد و گھری لکیریں نمایاں کر دیں۔ اس کا ارادہ پختہ تر ہو گیا۔ حال اور مستقبل کی چھاتی پر کھڑا ہو گیا اور اس پرانے سینے سے جوانا پھوٹ نکلنے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ اس کی تمام قوت انگلیوں میں سمٹ آئی۔

سکینہ کی آنکھیں پھر کمرے میں گونجیں۔ جبڑا طویل الدور گلے میں ڈوبی ہوئی چیخیں جیسے پسلیوں کے نیچے پستے ہوئے انسان نے آخری بار پکارا ہو۔

اسلم کے قدم خود بخود حرکت کرنے لگے۔ تنی ہوئی گردن بے نوچ بانہیں۔ پیشانی کی دو گہری لکیریں بدستور نمایاں۔ بکھرے ہوئے بالوں کی جنبش بند۔ ہتھیلیاں ساکت۔ اس نے خود بخود کل کا کارڈ پھینک دیا۔ وہ کل جسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پہونچ کر ایک چارپائی پر جھک جانا تھا۔ ایک ہاں اور اس کے فولادی پنجے کے گرد پروئی انگلیاں رکھ کر پوری قوت سے دبا دینا تھا۔ خود بخود کل کے بازو بے جنبش پہنچ کی رک گئے۔

تپائی پر لکڑی کا صندوقچہ نما گلدان پڑا تھا۔ سکینہ کے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ ناگ کا بایاں مڑا ہوا تھا۔ پھر سے پرورش کی زندگی بچھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سے چاپائی کی پٹیاں مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں۔ سرخ رنگ کا موم جامہ اس کے نیچے بچھا ہوا تھا۔

ایک نئی زندگی طلوع ہو رہی تھی۔ خود رحمی کل سے پاؤں بڑھا کر پلنگ کے قریب پہنچ گئے۔ کل پائنتی پر جھک گئی۔ فولادی ہاتھوں نے نوزائیدہ بچی کو تھام لیا۔

سکینہ نے ایک گہرا سانس لے کر خلاء۔ ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کا انگ انگ ڈھیلا پڑ گیا۔ ایک ناقابل بیان سکون میسر آگیا جیسے کسی نے اس کے بدن سے کانٹے نکال کر پرے پھینک دیا ہو۔

فولادی ہاتھوں نے نرم نرم گوشت کے لوتھڑا بالکل بے جان معلوم ہوا۔ نہ کوئی جنبش نہ کوئی آواز۔ جیسے ننھے ننھے پھیپھڑوں نے پہلی حرکت کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ یکایک۔ خود رحمی کل ہی ایک لرزش سی ہوئی۔ تتی ہوئی گردن نے حرکت کی۔ بانہوں میں لچک آگئی۔ پلکیں جنبش کرنے لگیں۔ ہتھیلیوں نے گودکشی کی۔ اسلم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ایک لمحہ اور..... اگر یہی کی آواز نہ آئی تو..... اسلم نے محسوس کیا جیسے اس کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ اس کے بدن میں لہو کا ہر قطرہ طوفان بن کر صرف ایک نقطے کا طواف کرنے لگا

"سکینہ دائی" اس نے گھمبیر آواز میں پکارا

"جی" سکینہ نے حیرت سے جواب دیا۔

"بچی روتی نہیں"

"اچھا جی"

اسلم کا تنفس رک گیا۔ جیسے اس لمحے سے پہلے کا سانس آخری سانس تھا اور دوسرے سانس کا اعتبار جاتا رہا ہو۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوزائیدہ بچی کے کولھوں کو تھپتھپایا۔ ننھے ننھے پھیپھڑوں نے حرکت کی۔ سرخ سرخ ہونٹ ہلے اور پھر آناً فاناً وہ معصوم جان مرد کو زندگی کا ثبوت دینے لگی۔ اسلم نے محسوس کیا جیسے اس میں زندگی خود کراہی ہو۔ ایک انجانی مسرت کی لہر اس کے رگ و ریشے میں دوڑ گئی۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ اور آنسوؤں کے دو بڑے بڑے موتی اس کی آنکھوں میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔

وقت کی آنکھ

آغا بابر

شہر کی فصیل سے باہر بسنے والوں کو جب بھی اچھی چیزوں کی ضرورت پڑتی تو وہ شہر کا رخ کرتے۔ ان اچھی چیزوں میں کھانے پینے کی اشیاء سے لے کر پہننے برتنے کی سب سے شاندار ہوتا۔ ہن خلائی سموسہ۔ دس شیر مال بہترین تھا۔ ۱۰۰ سے لوگ مچھلی اور کباب کھانے آتے۔ بہترین کھلی اور خالص اندرون شہر دستیاب ہوتا۔ ہر محلے کی اپنی چوپٹی ملائی کی دکان ہوتی۔ جس میں دودھ کی لاکھ کھوں میں ملائی کی تہہ جمی رہتی۔ جسے حلوائی کھرچ کھرچ کر نکالتا۔ ان دکانوں پر صبح صبح تنکے پر لدا ہوا خشک گھاس سے بھرا گیا ٹوکرا سے ہی پریاں تنکے کی چٹائی پر بیٹھ کر آواز لگانی شروع کر دیتی شہر کے باسی اپنا پسندیدہ اشیاء خریدنے سے کتنے بعض لوگ دکان پر ہی کھا لیتے مگر اکثر گھر لے جاتے۔ اپنے عام کاج کی واپسی ہو جاتے۔

چھوٹے چھوٹے محلوں میں ایک گلی کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوتی تھیں۔ ان گلی میں کپڑے بازی کی دکانیں۔ سوہا بازار سے ہوا اور سے بجا اور گوشت منڈی کے بہترین بازی گر انہیں۔ دکانوں سے منگا لیتے۔ ماڈرن فیشن کی سب چیزیں ڈالی بازار میں مل سکتیں۔ دولتی ہیرا پھیرے کے لیکن ٹیکہ لگا کر اسان ہر فیشن سے لیجئے۔ مسجد کے پچھواڑے میں ہر قسم کے برتن ملتے اسے ایک ہاتھ سے خریدیں کا بازار کہہ لیجئے۔ بہترین چوڑیاں، عطر، پستہ لاکھ کی بادام اور اصل زعفران کے لئے قرب مرغ کے چوک اور دلی دروازے میں بھیڑ لگی رہتی۔ یہ آرہ چھوارہ شکن۔ بچے ہوئے کھانوں میں شہر کے نانبائیوں کی بریانی بڑی شہرت رکھتی تھی چاول اور امراس کے ہاتھ پر دھرے۔ بال بچوں میں بیٹھ کر ورق اڑانی۔

تھوڑا بھی سرت شہر کے اندر بھی ہے پھیل فرمش نکلے۔ ادھی ہوئے کہ ۱۰ کہ کر گلی محلوں میں بیچتا پھرتا۔

ایک بازار میں دوکان پر مچھلی میں بکروں کی سریاں اور پاؤں جھلسے جاتے لکڑی کی بڑی بڑی بالٹیوں میں آبریاں دھوئی جاتیں اور باورچی ایک بجے تک ڈھیروں کے ڈھیر تیار ہو جاتے شام تک ایک ایک دکان کا سیکڑوں پائے اور سریاں بیچ لیا تھا۔ مسلمان تو بکرے کا کچھ چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ بھی بھی دل بھوان کر چٹ کر جاتا تو آگ سرا اور پیر بھی کھا جاتا ہے۔

ام کاج پر جلے دیئے آگ صبح دکانوں پر تیل پھیل چھڑک جاتے شام کو گاہکوں کو لوٹتے تو دکانوں کے سامنے چھڑکاؤ ہوئے ہوتے دھوپ نکل چکی ہوتی۔ مٹھائی کھانوں میں سجی آنکھیں ادھ کھلی دکان پر بڑے بڑے تھے ہوئے تھالوں میں مرغی کی ٹھوکریاں پڑی ہوتیں۔ شکنات پانی سے بھرے تھیلے میں ڈالوے کے لچھے پھیلتے، روح گلاب اور کیوڑے کی پٹی گھماؤ اتاں رہتیں۔ تیز رفتار چھینے والے بھیڑ کے پیچھے کے پرواہ کئے نہ دیتے جدا ایک چپک کا اس خریدے ہوئے سے کر سبزہ فروش کی کرتوں کو ٹاٹ کی کھڑی پر لے لیتے وہیں تک جانے کو جی چاہتا۔ گرچوں ہی سے دکان

کے ہو گئے۔

"ایک گلاس شربت دینا"

دکان والے نے تھالے سے برف کے ٹکڑے نکالتے ہوئے پوچھا "آج پہلے سے زیادہ بھیڑ ہے؟"

"ہاں بھیڑ آگیا ہے، اس کی تیاری . . ."

اس نے شربت کا سرخ سرخ گلاس آپ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بیچ جو دکانوں پر قطار پڑے تھے اب بھر گئے تھے۔ کہیں کوئی بھی ہوئی ٹھنڈی ڈنی کھا رہا ہے۔ کسی نے تازہ کا لیاب پیا رہا ہے۔ صبح گھر سے نکل کر ان دکانوں پر کھلے تھے یہاں سے دوڑ گئے تھے اب پھر یہیں دم لینے کو بچ گئے۔ ہر ایک خبر ان والے نے سنی، سات آٹھ گھنٹوں کی غیر حاضری کی خبریں۔ دکان والے نے بتائیں۔ بال بچوں والے جو تھے انہوں نے پوچھا۔ بھتیجا یا بھانجا میں دیا گیا۔ گھر میں کا سرخ کیا۔ جو من اور کھانے لے رہے۔ کسی نے چوتھا گلاس دودھ کا پیا۔ کسی نے پیڑے کی لسی کا پیالہ منہ کو لگایا اور گھنٹوں کے ٹپارے کھل گئے۔

سورج اور ڈھل گیا۔ بازاروں میں چہل پہل زیادہ ہو گئی۔ کالج کے لڑکے بائیسکلوں پر بیٹھے شہر سے باہر کا رخ کرنے لگے۔ اب بھی بھیڑ سے ایسی ٹولیاں نمودار ہونے لگی ہیں کہ کسی کے ہاتھ میں ہاکی ہے کسی نے دوڑنے کے بوٹ سائیکل کے پیڈل سے لٹکا رکھے ہیں۔ کسی نے کچھے دار نیکر پہن رکھی ہے۔ یہ لڑکے پر ہجوم بازار میں آنکھوں اور انگلیوں سے بچتے گھنٹیاں بجاتے، ایک دوسرے کے آگے پیچھے بڑھتے چلتے زن میں کہیں سے کہیں جا پہنچے ان میں سرخ گلاس والے کا نام سلطان ہے جس نے اپنے دوڑنے کے بوٹ سائیکل کے پیچھے کیریئر پر رکھ چھوڑے ہیں اور جو اپنا چشمہ لگا رکھا ہے یہ اپنے کالج کا جانا پہچانا کھلاڑی ہے کئی انعام جیت چکا ہے اب کے پھر کالج کے سالانہ کھیلوں میں کئی انعامات لے جائے گا یونیورسٹی کے کھیلوں میں بھی اپنے کالج کی نمائندگی کر چکا ہے، بی اے کے آخری سال میں ہے۔

یہ لڑکے مرکزی سڑک سے ہٹتے ہوئے بائی روڈ کے چوک میں دو حصوں میں بٹ گئے۔ تین قریبی روڈ کی طرف ہو گئے، یہ راستہ ان کے کالج کو نزدیک پڑتا تھا۔ سلطان سیدھا لوہاری دروازے کی طرف موڑ لیا کیونکہ اسے ڈیوٹی پر سیٹی گراؤنڈ پہنچنا تھا۔

وہ بائیسکل کو سیٹی سے رگاؤنڈ کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ شفاء اور صفیہ پہلے سے پہنچے تھے اور اپنی اپنی نکریں چڑھائے جیولن پھینک رہے تھے۔ سلطان نے تولیہ اور قمیض اتار کر پویلین میں رکھی۔ اس نے تھوں کے نیچے اپنی نکر اور قمیض کے نیچے نیان پہن رکھی تھی۔ اس نے نئے بازوؤں کو دو چار بار بند کیا اور کھلا سانس آہستہ آہستہ پھیپھڑوں میں بھرا۔ پھر دو چار قدم لے کر اس بات کو ہوا دیا جو مرشفاء اور میز جیولن پھینکنے کی مشق کر رہے تھے، وہ اپنے دونوں بازوؤں پر باری باری ہاتھ مارتا رہا اور شفاء اور صفیہ کو دیکھتا رہا۔ شفاء اور صفیہ نے جب سے تیار دیکھا تو صفیہ بولا "آؤ نا"

سلطان نے دو چار قدم چل کر اپنی ٹانگیں اس طرح ادھر ادھر سے جھولیں جیسے کوئی تیز تیز مارچ کرنے لگے اور ساتھ ہی ہوا میں اچھلنے کی کوشش کرے۔

اس نے جیولن اٹھایا، پیچھے مڑا، صفیہ اور شفاء اسے دیکھ رہے تھے اس نے جیولن ہاتھ میں تھاما اپنے بدن کے وزن کو اپنے احساس سے تولا۔ ایک سیدھے انداز سے جا کا اور لائن پر آ کر ہاتھ کو جھٹکا دے کر جیولن پھینک دیا جو ہوا کو چیرتا اور لہراتا شفاء اور صفیہ کے فاصلے سے بہت دور جا کر پڑا۔

شفاء جیولن اٹھاتے ہوئے بولا "ٹیپ نہ مارنا نہیں"

صفیہ نے چہکار کر آواز دی "ٹیپ لاؤ"

اب شمشاد نے میرن چھلکا اور چھلکے کی بولا "پاکن ہل گیا"۔

"کوئی بات نہیں پھر ٹرائی کرو" سلطان نے حوصلہ بڑھایا۔

اب شمشاد بھی میرن زیادہ فاصلے پر گرا وہ باری باری پھینکتے ہے اور ٹپ سے اپنے ہے اب طبیعت اکتا گئی تو اپنی چھلانگ لگانے لگے گنڈیری بیچنے والا حوصلہ ہار کے پار بیٹھا ایک ہاتھ سے برخاں والیاں ٹوبی دوسرا گنڈیریاں" سڑک سے ہٹ کر بیٹھنے کے باعث وہ چھپا ہوا تھا اور انہیں ایکھنے لگا۔ اس کے صدا لگانے میں ایسی سی یاسیت تھی کہ وہ جس جذبے سے ایک ایک گنڈیریاں بیچ رہا تھا وہ ویسا ہی پڑ گیا۔ اب تو وہ یہی سوچتا کہ وہ زکام بھگا ہوا آرہا ہے بس جسم کو چرا کر اس طرح کروٹ کے لکڑی نیچے نہ گرنے پائے۔ یہ لڑکے کس طرح تھوس اور سخت زمین سے گیند کی طرح ٹپ کھا کر اچھلتے ہیں یا پھر ہوا میں کس طرح جھک کر اچکتے ہیں گویا لکڑی تنی مسل ذات ہے انگلی کی پور بھی چھو جائے تو نیچے گر پڑتی ہے جب شمشاد، میر یا سلطان بھاگتا ہوا آتا تو گنڈیری والے کا دل بھی میں اٹک جاتا، لکڑی گر پڑتی۔ پھر وہ دوسرے کی چھلانگ کا انتظار کرنے لگتا جب کوئی ٹاپ جاتا وہ لکڑی سڑک کے کنارے دبی کی دبی رہ جاتی تو گنڈیری والے کے منہ سے آپ ہی آپ ایک میٹھی سی صدا بہہ نکلتی "لے برخاں والیاں ٹوبی دار گنڈیریاں"۔

اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان تینوں لڑکوں میں سے سرخ سرخ گالوں والا لڑکا وہ اور کبھی چھلانگ لگاتا ہے۔

مغرب کی جانب شفق پھول رہی تھی۔ مین روڈ کی آمد و رفت اب ٹھہلتی سی نظر آنے لگی تھی۔ شمشاد، میر اور سلطان نرم نرم گھاس پر ٹانگیں اور ہاتھ پھیلا کر لیٹ گئے وہ چار طوطے مٹھو ٹیں ٹیں کرتے ان کے سر پر سے گذر گئے۔ شمشاد گھاس پر پیٹ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

میر محبت کے نیا پاداری تانگہ جس جگہ ہاسپٹل تھا بڑے بانکے انداز سے ڈرک چال چلتا ہوا تھا سڑک پر سے ٹپ ٹپ کتا گذر گیا۔ گنڈیری والے کی صدا فضا میں گونجی۔ "لے برخاں والیاں۔۔۔۔"

"سلطان نے آواز دی "گنڈیریاں"

گنڈیری والا لڑکا ذرا متوجہ ہوا۔

"ایک سیر دے جاؤ"

"اچھا جی"

"لفافہ ہیں ہے تو اخبار وال لے جاؤ" میر نے پوچھا۔

"لفافہ ہے جی"

گنڈیری والا ایک سیر گنڈیریاں لفافہ میں ڈال کر خیمے میں سے کود آیا۔ یہ لڑکے گنڈیریاں چوسنے لگے اور تھیٹس کے گذشتہ مقابلوں کی باتیں کرنے لگے۔

اب فضا میں تاریکی لہریں ابھرنے لگیں۔ شام کا جھٹ پٹا چل رہا تھا گنڈیری والے نے چھابڑی اٹھائی اور تین لڑکوں کی طرف دیکھ کر بولا "اور تو نہیں چاہیں باؤ جی؟"

کوئی جواب نہ آیا۔

شمشاد، میر اور سلطان نے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ سائیکل کو اپنے اپنے سائیکل کے کیریئر پر رکھا اور گراؤنڈ کے احاطے سے نکل کر باہر گوٹ کے پاس سے ہوتے ہوئے مال روڈ پر آن پہنچے۔ یہ حالت تھی کشادہ سڑک پر سائیکلوں کے سانپ رینگ رہی تھی یہ تینوں دوست بھی سیاہ

ابھی بریگیڈ کے چوک میں پہنچے، کچھ ٹریفک کا اس کے پیچھے چھوٹتے ہوئے آگے نکل گئے۔

باغ جناح میں چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ گھاس کے سبزے پر جیسے ٹھنڈی چادر بچھی ہو شام کی للچاہٹ نے پھولوں کی کیاریوں کو ڈراما ٹک بنا دیا تھا۔ گلوں اور شاخوں کی طرف سے پرندوں کے چہکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اگر اِدھر اُدھر شاخوں پر ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے باغ کا چکر لگایا۔ ایک جگہ سائیکل زمین پر ٹکا دیئے، اور گھاس سبز سبز گھاس پر ہاتھ پھیر ڈال کر نیم دراز ہو گئے۔ لڑکیوں کا جھنڈ ان کے پاس والی روش پر سے بے باکی کے ساتھ گذر گیا۔ لڑکیوں کے چہرے تمتما گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ سبزے کے وقت پر سے ٹرٹر کرتا کوئی پرند اڑ کر دور نکل گیا۔ اس سے کسی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ سلطان نے گھاس کا تنکا توڑ کر منہ میں دبا لیا پھر دانتوں سے کاٹنے لگا۔ جونہی اس کی زبان کو تنکے کی مٹھاس لگی وہ کھلے ہوئے ٹکڑے کو پھینک دیتا اور دوسرا ٹکڑا توڑنے لگتا۔ باغ کے گھنے درختوں کے سایے میں تاریکی چھانے لگی۔

وہ جب باغ سے نکلے تو سڑک کی بتیاں جل چکی تھیں۔ لوگوں کی ٹولیاں سڑک کے کنارے کنارے جا رہی تھیں۔ ہر قمقمے کے نیچے روشنی کا غبار چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈا ریچنگ کراس سے دائیں طرف کو گھوم گیا اور ٹھنڈا اور صنوبر سیدھے نکل گئے۔

موچی دروازے کے باہر کتب کی دکانوں پر سے گوشت اور مسالے کے جلنے کی خوشبو سلطان کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ پان والے کی دکان پر تیز تیز روشنی میں ظرافتوں کی تصویریں دکھائی دے رہی تھیں۔ دکان کے سامنے بے فکروں کا ایک جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ وہ موچی دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ لوگوں سے کترا کر جانا سنسنی خیز تھا۔ کبھی نہ بچنا۔ اسے کہا تھا۔ آگے نکلتا گیا۔ اب پر رونق بازار پیچھے رہ گیا تھا۔ بس لیٹ والا قصبہ آ گیا۔ کنارے پر ڈلے پان کی دکان کے چبوترے پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ان گلیوں میں اس کا بھرا پرا ہاتھ تھا۔ بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس ہوا خوری کی خاطر نکلی ہوئی لڑکیاں اس کی دکان سے ہو کر گزرتیں۔ وہ ان سے ہنسی مذاق کرتا۔ ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا۔ اس کی دکان پر ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی۔ اس کی دکان سے ہو کر گزرنے والی لڑکیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ سلطان نے سائیکل کو ذرا دور ہٹا کر کھڑا کیا۔ اور اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔ اس نے حقہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور اٹھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے بھبکا سا اٹھا۔ سلطان نے اسے اپنے سینے سے الگ کر دیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اور ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ اس کے دانت پان کی لالی سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اور ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ اس کے دانت پان کی لالی سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اور ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ اس کے دانت پان کی لالی سے سرخ ہو رہے تھے۔

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اور ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ اس کے دانت پان کی لالی سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اور ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ اس کے دانت پان کی لالی سے سرخ ہو رہے تھے۔

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اور ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ اس کے دانت پان کی لالی سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ اور ہنسا۔ وہ بھی ہنسا۔ اس کے دانت پان کی لالی سے سرخ ہو رہے تھے۔

ایک چھوٹے میز پر آبی پائپ تھیں جس کے ساتھ ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس کی گدی پر ایک پرانا غلاف چڑھا ہوا تھا جس پر شوخ رنگوں کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ طاقچے پر کانچ کے گلاسوں میں جیتے ہوئے تمغے سازکے سپرد کئے تھے اور اس کوٹھری میں بڑے بڑے آدمی سے ملنے آتے تھے۔ ایک پرانے اخبار نویس پر نیل نیں پڑا تھا جب وہ داخل ہوئے ہی سلطان نے پہلے اس کی مرہم پٹی کی پھر آہستہ آہستہ اس کی تیز رفتار میں کمی کر دی۔ اس نے گھبرائے کی دوا کے ساتھ ٹکے ہوئے سائیکل کو اندر کر اس کے سٹینڈ کو پاؤں سے نیچے دبایا سائیکل کو کھڑا کر کے کونے کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور پاؤں اٹھا کر پنگ کی پٹی پر رکھ دیئے۔

پنگ کے پیچھے بغلی کے دو کمرے تھے جو چھت کے شہتیر کو سہارا دے رہے تھے ان دو کمروں کے درمیان جانری بنی ہوئی تھی دراصل یہ جانری کا ایک پردہ تھا جو ان کمروں کے درمیان آدمی کے قد تک اونچی سلک تک آگیا تھا۔ پہلی نظر میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ دو کمروں کے درمیان جانری لگی ہے لیکن قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ چوکھٹوں اور شہتیروں سے جانری کا چوکھٹا اس میں جڑ دیا گیا ہے تاکہ کمرہ دو حصوں میں تقسیم ہو سکے۔

جانری کے پیچھے ایک نل تھا جس کی ٹوٹی کھلی رہتی تھی بند ہونے پر پانی ٹپکتا تھا سامنے دیوار میں بالٹی لٹکتی تھی سامنے والی دیوار پر کھونٹی کے ساتھ سلطان کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے کھونٹی کے نیچے جوتوں کی قطار تھی۔ پاس ہی اوپر تلے لوہے کے دو صندوق پڑے تھے جن پر ایک کپڑا بچھا کر سلطان نے شیشہ کنگھی رکھا ہوا تھا۔ میں طاق ان صندوقوں کے نیچے ڈبل اینٹیں رکھی ہوئی تھیں اسی طرح دو دو اینٹیں دائیں بائیں رکھ کر ان پر دو ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔

سلطان پنکھی ہوا کی سامنے سستانے کے بعد اٹھا اور جانری کے پیچھے جا کر کپڑے بدلنے لگا اور ساتھ ہی کچھ گنگنانے لگا۔

جب وہ واپس آیا تو پنکھے کی ہوا کے سامنے ٹرنک کے پاس ایک پرزہ کاغذ کا پڑا پھڑا رہا تھا جیسے ٹرک وہاں پھینک گیا ہو اس نے پرزہ اٹھا کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ سائز ۳۰ پیڈال۔ یہ پرزہ فارزیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا کوئی نصف گھنٹہ ہوا اس نے سلطان سے ایک بریسلٹ لانے کو کہا تھا سلطان کے کان اس وقت شاید اللہ دیا دو سرخ ہو گئے تھے یا ان پر لگے تھے وہ خود بھر کے لئے شرما سا گیا وہ ٹرالی بازار یا بازار گی سے گذرتا ہوا ہر اس والی کوٹھی میں جو عورتوں کے دو جیسے دیکھتا ہو کی چھتوں پر بطور اشتہار لٹکا دیا جاتا ہو جس عورت نے وہ دوسری طرف منہ پھیر لیتا تھا اس نے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا جب سے زینت نے اس سے فرمائش کی تھی۔ وہ ایسا کرنے لگا تھا۔

زینت سلطان کی سوتیلی ماں کی بڑی بہن تھی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا، لمبا قد، بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں جن کا کاجل پھیل کر کناروں سے باہر نکلے جاتی آنکھیں سانپ کی آنکھ کی طرح پر اسرار دکھائی دیتیں۔ تنگ کپڑے پہننے کی شوقین، کمر میں خم دے کر چلتی تو یوں لگتا جیسے کمر کے ساتھ کولہوں کا کوئی واسطہ نہیں، ہاتھ گداز، کلائی بھری ہوئی، ہتھیلی پر بالوں کی گچھی ہوئی لٹ پڑی تھی۔ ابھی تک شادی نہ ہوئی تھی۔

سلطان نے ایک روز شناسے پوچھا تھا تو زینت بریسلٹ کس طرح خریدتی ہے تو شناسے نے بتایا تھا کہ تمغے ساز ہوتے ہیں سلطان کو جیسے عید ملنے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا اس نے اطمینان کا سانس لیا اور موضوع بدل دیا۔

چند روز بعد زینت نے یاد دہانی کرائی تو اس نے کہا "اس کے تو سازہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے تین روپے واپس لے لیں۔"

بہرحال جب گندی گندی گالیوں کی دراز دی سے یہ پرزہ اندر پھینکا گیا تھا۔ اس نے پرزہ اٹھا کر اپنے کمرے سے باہر پھینک دیا۔

—— ۲ ——

سلطان جب اوپر آیا تو شیشہ اٹھا کر اپنا چہرہ دیکھا، لمبا دیکھا، تھا اس کے دو بھائی اور ایک بہن پاس بیٹھے سکول کا کام ختم

کرکے اپنے بستے باندھ رہے تھے۔

"مرحوم سلطان گیا" اس کا باپ بولا۔

سلطان اکڑ کر تخت پر بیٹھ گیا اور بستوں میں کتابیں نہ رکھنے والے بچوں سے پوچھنے لگا "کام کیا؟"

انسری نے کہا "جی" اور اپنا بستہ اٹھا کر چلدی۔

یہ دونوں بھائی تھے۔ فلاح اور بہن انسری سلطان کے سوتیلے بھائی بہن تھے ایک اور بہن ایک سال کی اوپر تھی جسے ماں لڑکا شمہ چھک چھک کر سلا رہا تھا۔ اندھیرا کی وجہ سے روشنی دے رہی تھی کیونکہ اوپر درمیان میں چھت نہ تھی روشنی کے لئے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

سلطان کی سوتیلی بہن مریم باہر والی نالی میں سالن دیکھ رہی تھی "فلاح کہاں ہے؟" سلطان نے پوچھا۔

"روٹیاں مانگنے گیا ہے آرہا ہوگا" سلطان کا باپ بولا

مریم باورچی خانہ سے نکلی دوپٹے کے کنارے سے اٹھے کا پسینہ پونچھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور سیر بھیاں کی وجہ روشنی کی مدد دیکھ کر بولی۔

"آگیا ہے!"

پھر اس نے آواز دی "فلاح"

زینہ میں سے فلاح بولا "جی" اور دو منٹ میں بہت سی روٹیاں پرانے دسترخوان میں لپٹی ہوئی تھیں اس کے پاس چارپائی پر رکھ دی مریم نے سلگی کی طرف منہ کر کے پوچھا "تمنے سو گئی ہے کہ نہیں؟"

"سو گئی ہے" شمہ نے جواب دیا۔

"تو پھر چلے آؤ"

مریم باورچی خانہ سے سالن کی دیگچیاں اٹھا لائی اور چولہے کے پاس بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ انسری نے بالٹی میں سے رکابیاں نکال دیں۔ اس نے ایک رکابی میں سالن ڈالا اور چمچہ میں کچھ روٹیاں رکھ کر فلاح سے کہا "جاؤ تم آگاہ" اور انسری اوپر جا کر کھا لو"

فلاح نے چمچہ اٹھا لیا۔ سلگی نے گڑوی پانی کی اور انسری نے گلاس۔ تینوں اوپر کی چھت پر چلے گئے

شمہ نے تخت پر دسترخوان بچھایا۔ رشید نے اخبار کا ورق الٹ کیا اس نے دوسرا ورق جو سلطان کے ہاتھ میں تھا وہ بھی اس میں رکھا اور دونوں دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے۔

سلطان بیٹے باپ کے ساتھ تخت پر اور فلاح اپنی ماں کے ساتھ مونڈھے پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا شمہ دونوں طرف پانی پلا رہا تھا اور اوپر سے جو ذائقہ کی کمی رہ گئی تھی اسے بھی پورا کر رہا تھا۔

سلطان کی ماں مر چکی تھی سلطان کے باپ کی یہ دوسری شادی تھی جس سے یہ پانچ بچے تھے سلطان کا سگا بہن بھائی کوئی نہ تھا۔ رشید دفتر میں اسسٹنٹ پرنٹنڈنٹ تھا گھر پر مہمان اس کا بہنوئی تھا مگر مہمانی کے مارے گھر کا خرچ اور بچوں کی تعلیم کو پہاڑ تھا اس کے لئے سخت مہوال تھا وہ دور نزدیک کے واقف کاروں اور دوستوں سے قرض لیتا رہتا تھا قرض کے چپراسی اور قرضی کمسے وہ قرض لے چکا تھا قرض خواہوں کے تقاضے اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ تنگ دستی اب اس کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کا فالتو خرچ کوئی نہ تھا۔ دفتر میں وہ دو تین چائے پیتا تھا استعمال شدہ پتی سے جو چائے تیار کی جاتی تھی اس کی قیمت ایک آنہ فالتو بچتی ہوتی تھی اور وہ اخبار چائے کھلاتی تھی۔ سگریٹ کی بجائے اس نے بیڑی پینی شروع کر دی تھی

گھر پر تھہرتا تھا۔ سکاؤ، صلاح اور اصغری چھوٹی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ فلاح آٹھویں میں تھا۔ ان کی ماں کا کہنا تھا کہ سلطان تو بی اے تک پڑھ چکا ہے رشید اور اب دوسری اولاد کی طرف توجہ دینی چاہیے جو ابھی کم عمر ہے اس لئے رشید شام کو ان بچوں کو پڑھاتی کرتا تھا۔ سے باہر آنے جانے کا وقت دیتا تھا۔ اس لئے اس نے اخبار سر پہ رکھنے کا انتظام کر رکھا تھا شہر میں کئی آسامیاں ایسی تھیں جو صبح کو اخبار لے کر دوپہر تک فارغ کر دیتی تھیں پھر اخبار فروش اسی اخبار کو سہ پہر تک دوسری آسامیوں کو پہنچا دیتے تھے اس طرح اخبار کی قیمت نصف دینی پڑتی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر رشید نے اخبار کو پرچہ دروازے کے اوپر محراب والے طاق میں رکھ دیا جہاں اخباروں کا ایک پلندہ پہلے سے جمع تھا۔ بھیجنے کے لیے اخباروں کا یہ پلندہ ردی والے کے پاس بیچ کر اپنی قیمت وصول کر لیتا تھا۔

"تم نے چلو کتنے پر رکھی رشید بولا" اوپر چل کر بیٹھیں گے"

سلطان نے حقہ اٹھایا آگے آگے رشید اور پیچھے پیچھے سلطان اوپر چھت کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ رشید سیڑھیوں میں زور سے کھانسا اور آواز دے کر بولا "فلاح آجاؤ اوپر" اس کی بیوی نے جو رسوئی سمیٹ رہی تھی جواب دیا "وہ پہلے ہی اوپر چلا گیا ہے"

رشید بولا "اچھا" اور تنگ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں وہاں ایک کمرہ جب اپنی پیلی پیلی روشنی میں بڑا مخمل سا لٹا آیا تھا چارپائیاں سب پرانی اور ڈھیلی تھیں ایک چارپائی جو باقیوں سے زیادہ بڑی تھی اس پر ایک سال کی بچی سوئی ہوئی تھی۔ چھت پر پہنچتے ہی رشید کی نظر پہلے اس بچی پر پڑی اس نے بڑی نرمی اور آہستگی سے اس کی پیشانی پر سے بالوں کا گچھا پیچھے ہٹا دیا ایک چارپائی پر صلاح، اصغری اور آگاہ تینوں گچھا مچھر ہو کر سوئے ہوئے تھے جیسے کہانی سنتے سنتے انہوں نے اس کی تمام دلچسپیوں کو دیکھنے کے لئے آنکھیں بیچ دی ہوں۔ اور جیسے یہ شرارت کی جھوٹ موٹ نیند ہو اس نے غور سے دیکھا اور بولا "یہ تو سچ مچ سو گئے"

"ہاں ابا جی" ساتھ کی چارپائی پر لیٹا ہوا فلاح بولا۔

"تم نے ابھی سے چادر کیوں لے لی؟"

"جی مچھر بہت ہیں"

"چارپائی ذرا دوسری طرف کھینچ" رشید نے اس کی چارپائی کو لئے میں سے باہر کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ جس چارپائی پر صلاح، اصغری اور آگاہ سوئے ہوئے تھے اس کے پاس ہی برتن پڑے تھے جن میں انہوں نے ابھی کھانا کھایا تھا۔ رشید نے فلاح سے ان برتنوں کو چارپائی کے نیچے کھسکا دینے کو کہا۔ فلاح نے جھک کر اگرادی چارپائی کے نیچے کھسکا دی۔

سلطان نے حقہ اپنے باپ کی چارپائی کے پاس جا کر رکھ دیا۔ جسے رشید گڑگڑاتے ہوئے بولا "فلاح تو اپنے چچا کے پاس کھٹی پر کیوں نہیں سوتا!"

"وہاں دوسری چارپائی کہاں آسکتی ہے!"

"کیوں سلطان؟"

"آ سکتی ہے مگر مشکل سے۔ کوئی چھوٹی سی ہو تو۔ کہو تو میں خود وہاں چنگڑی پر سوتا ہوں"

"اچھا چل سہی" رشید بولا۔

مریم نے آگ افسری کو جو صلح اور آشتی کے درمیان سوئی پڑی تھی اٹھا کر پائینتی کی طرف ڈال دیا۔ پھر گری ہوئی پرانی بدرنگ چادر کو اٹھا کر جھاڑا جو دریان میں سے گرد کا بگولہ سا اٹھ کر نکلنے کے لئے کہا۔ "میں ان چادروں کی مرمت کروں گی۔"

شیخ نے سوچا چوکوں کی چارپائیوں پر چادریں کہاں ہیں؟ یہ آگ موٹی چادروں سے چھوٹی کی ہوئی تھیں۔ پرانے کھیسوں کے ٹکڑے تھے اس نے کروٹ بدل لی۔

مریم ادھڑا منڈیر پر رکھتے ہوئے بولی "تجھے یاد آیا، زینت؟ پامیرے دو پٹہ کو گرہ لگا گئی تھی تمہیں پوچھنے کو سلطان کہ تم نے انکا کام کیا؟ کون سا کام" سلطان نے پوچھا۔

مریم گرہ کھولتے ہوئے بولی "بس آتا ہی کہہ گئی تھی کہ سلطان کو یاد دلانا کوئی کہا تو ہوگا سی انکا کام جو تمہیں یاد دلانے کو کہہ گئی ہیں۔"

تاروں کی مدھم روشنی میں سلطان کٹی پر بیٹھا ہوا تھا اس کے آس پاس اونچے نیچے مکانوں کی چھتوں اور منڈیروں کا ایک سلسلہ تھا اور ایک مکان کی چھت سے آنے والی ریڈیو کی موسیقی ختم ہو چکی تھی تاہم اب اس پر جھکے ہوئے تھے جن کی روشنی خفیف میں اس طرح تحلیل ہو چکی تھی کہ مکانوں کے نیچے منڈیریاں مٹیالی اور کھارے جیسے مٹی نیند میں اونگھتے ہوئے جانوروں کی پیٹھ جیسی منڈیروں کی اونچ نیچ اور مٹیالی کھارچوں کے ناہموار پن میں سکون کا ایک یکساں پیدا ہو گئی تھی ایک مسلسل طمانیت سا بہنے لگا۔ معلوم نہیں دیر کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی تھی کہ پہلے دروازے کی کنڈی کھٹکنے کی آواز آئی۔

وہ پہلے اترا تو دروازے کے سامنے دو سپاہی کھڑے تھے۔

"رشید احمد کا مکان یہی ہے؟"

"جی ہاں"

"آپ کون ہیں؟"

"میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"ذرا انہیں بلائیے ان سے بات کرنی ہے۔"

سلطان باپ کو بلا لایا۔ مریم بھی گھبرا کر سیڑھیاں اتر آئی ——— "جی میرا نام رشید احمد ہے۔"

"آپ مسمات زینت کے کیا لگتے ہیں؟"

"میں اس کا شوہر ہوں۔ بات کیا ہے؟"

سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ذرا رکنے کے بعد دوسرا بولا "ہیرا منڈی کے ایک ہوٹل سے ہم نے انہیں مشتبہ حالت میں گرفتار کیا ہے بس۔"

"ابھی کوئی ایک گھنٹہ ہوا۔"

"وہ کسی شخص کے ساتھ..." رشید احمد کو اپنے بیٹے کی موجودگی کا احساس ہوا پھر اس نے بیٹیوں میں اپنی بیوی کو کھڑے دیکھا بولا "چپ خاموش" اٹھ کر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

پہلا سپاہی بولا "آپ اگر اس کی ضمانت دینا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ تھانے چلیں" دوسرا سپاہی اپنے بید کی چھڑی سے دہلیز کے کونے کو ٹھکرانے لگا جہاں کائی کے چند ٹکڑے پڑے تھے۔ یہ اسی پرچے کے ٹکڑے تھے جو ابھی سلطان نے پھاڑ کر پھینکا تھا۔ (تاؤں کے دو بار)

بازگشت

واجدہ تبسم

مرزا ہاپ پھٹ پھٹا کر اٹھا اور سیدھا ڈپٹی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھا۔ انھوں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا ——— نیم اور پگی دونوں کو دیکھ رہے تھے ———

"کیوں بے نامعقولو ——— یہ سونے کو کس نے ٹانگا یا؟"

"جی میں نے" پگی ذرا سا پیچھے کو ہٹ کر بولا۔

ڈپٹی صاحب کنپٹی پھاڑ کر چیخے ——— "اور کم بخت بولتا بھی ہے کہ "میں نے" عقل کسی دشمن ....."

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ پیچھے پیچھے اور بچے آگے آگے ہو لئے۔ دونوں جلاکیاں ان کے ہاتھ لگنے والے تھے۔ یہ بھناتے ہوئے ہو کے کمرے میں داخل ہوئے اور تیزی سے بولے ———

"میم صاحب سنتی ہو، تمھارے لاڈلوں نے میرے ٹانگ پر سونے کو ہرکا دیا، جو کبھی گندگی کر دیتا تو ———"

ناہید نے بات کی اہمیت کو سمجھے، سادگی سے بولی ———

"تو آپ نہا لیتے"

"ہیں ——— اس خانساماں اور کچھ کرتا ———"

"بھلا آپ کیا کر لیتے" وہ سادگی سے آنکھیں اٹھا کر بولی۔

"ارے گندگی جو کر دیتا تو اس نامراد پگی کا گلا ہی ریچ دیتا"

"اچھا" ناہید نے بھولپن سے پوچھا ———!

"ہاں اور کیا سمجھ رہی ہو تم ——— دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میرے ہاتھوں کسی کا خون ہو کر رہے گا"

ناہید نے بے بسی سے سر سے کو دیکھا۔ پھر ذرا جھلا کر بولی۔

"پپا آپ سے کئی بار کہا ہے کہ اپنی طرف کا دروازہ بند رکھا کریں۔ آپ سے خود تو ہوتا نہیں، بچوں پر لعنت بھیجتے ہیں"

ڈپٹی صاحب نے ویسے گھما کر بہو کو گھورا پھر چلائے ———

"مجھ سے کچھ ہوتا نہیں ——— مجھ سے کیا نہیں ہوتا، بتاتا تو ———"

"اونہہ ——— ہوتا ہو گا بہت کچھ ——— مگر اس وقت تو سر اصر آپ کو تھپڑ ہے۔"

"میرا ——— یعنی کہ میرا ——— یعنی کہ میں نے غصے کے ہاتھ سے اپنے کندھے پر بٹھایا اور خود ہی تمہارے پاس چلی آئی ہے لے رہا ——— ؟"

شہید کو ہنسی آ گئی ———

"اوہ پیا۔ آپ بھی غضب کرتے ہیں ——— میں بھلا یہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے مرغے کو کندھے پر بٹھایا ——— ؟"

"پھر کیا کہہ رہی تھیں ——— ؟"

"اگر آپ دروازہ بند رکھا کریں تو یہ جھگڑے کھڑے ہی کیوں ہوا کریں ——— ؟"

"تو مطلب تمہارا یہ ہے کہ سارے جھگڑے محض دروازہ بند کر دینے سے ہی سلجھ جائیں گے ؟"

"یقیناً ——— " دوسرا جھٹک کر بولی۔

"اور جو تمہارے اڑوسے پڑوسے، دھکیلنا شروع کر دیتے ہیں ؟"

"کون پگلی اور نیلم ——— ؟" ناہید حیرت سے بولی۔ "ان کی بھلا یہ مجال کہ آپ کے دروازے پر جا کر شور مچائیں ؟"

"ہاں ہاں تو پھر مطلب تمہارا یہ ہے کہ میں خود ہی دروازہ دھپ دھپاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ بچے پٹ رہے ہیں ——— کیا باتیں کرتی ہو تم بھی ؟"

"اف خداوند ——— چت بھی میری پٹ بھی میری۔ آپ نے تو پہیلی بنا کر رکھ دیا ہے۔ بچوں سے یوں الجھتے ہیں جیسے ان کے ہاتھ ہوں دیا ذرا برابر کے بچے ہی ہوں ؟"

"میں ——— ؟ میں لڑتا ہوں ——— ؟"

"پھر کون لڑتا ہے ——— ؟"

"دیکھو نیم، صاحب جیسا منہ نہ کھلواؤ ——— پھر جب بولنے پر آتا ہوں تو کفن پھاڑ کے بولے ہی جاتا ہوں ؟"

"آپ کے بولنے میں کمی ہی کیا گئی ہے۔ ہمیشہ ہی تو کفن پھاڑ کر بولتے ہیں۔ کوئی نئی بات ہے ؟"

ابھی ڈپٹی صاحب گرجی میں کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ کھپاڑے کے باغیچے سے تیز تیز آواز آئی۔

"بولو منھ میاں ——— "

"بولو منھ میاں ——— "

ڈپٹی صاحب کے کان اُدھر ہی لگ گئے۔ ناہید بھی کروٹ اونچی کر کے سننے کی کوشش کرنے لگی غالباً پگلی کی آواز تھی۔

"پتا نول ——— پتا نول ——— "

تیزی سے ڈپٹی صاحب چلے اور پھر بیٹھ گئے۔

"سنو میر صاحب منھ ——— یہ کمبخت منھو کو کیا بول سکھا رہے ہیں ——— پتا نول ——— پتا نول ——— یہ تمہاری تربیت ہے ؟ بڑوں کو یوں کہا کرتے ہیں ؟"

ناہید کھڑا کھڑی ہو گئی ——— "مامی گاڑی پیا میں نے ہرگز ایسی تربیت نہیں کی ——— یہ تو آپ ———

"ہاں ہاں آپی آپ ——— کہہ دو ناں میں نے ہی سکھایا ہے۔"؟

ناہید نے کچھ رک کر سسرے کو دیکھا پھر ملائمت سے بولی۔

"ہو سکتا ہے آپ ہی نے سکھایا ہو ——— آپ ہی تو دن رات ہر کس و ناکس کو فون فون کرتے رہتے ہیں۔ بچوں نے سوچا ہو گا پاپا تو کہتے ہیں چھوٹی بھی کہو ———"!

خون فون کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ہنسے ———

"ابھی ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔" ان کے پیچھے پیچھے ناہید دائیں دائیں کرتی لپکی، مگر وہ تب تک چھلانگیں مارتے ہوئے صحن میں اتر چکے تھے۔

بڑھیا کی آواز سن کر ڈرائنگ روم سے سراج نکل آیا ——— ناہید سیڑھیوں کے پاس کھڑی بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی۔

"کیا ہوا ———؟" وہ قریب آ کر بولا۔

"ہوا کیا ——— آپ کے پاپا نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ کوئی بات بھی ہے، بچوں سے برابری والوں کا سا سلوک ہے۔"

"اوفہ ———" سراج زچ ہو کر بولا "یہ تو روز کی کہانی ہے۔ اس وقت مگر کیا ہو رہا تھا۔"

ناہید کو ذرا سی ہنسی آئی "مجھے تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ میں مچھی امپانڈری کر رہی تھی۔ دھماتے ہوئے آئے اور بولنے لگے "میم صاحب تمہارے بچوں نے میرے انگ پر مرغا بنا کا دیا۔ ابھی یہ بات منہ ہی میں تھی کہ کچھ اڑنے سے خیرا اور ٹپکی کی آواز ان کے کان میں پڑ گئی اور ان کے مرچیں لگ گئیں۔"

"کیوں بچوں نے کیا کہا ———؟"

"منہ کو بولنا سکھا رہے ہیں۔ پاپا فول ——— پاپا فول ———"

ناہید نے ہنس کر میاں کو دیکھا ———

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر پاپا کب تک یہ دشمنی نبھائیں گے۔ حد ہے کوئی۔"

"لگ گر کیوں نہیں کر لیتے" ناہید تیزی سے بولی۔

"جانے کیسے پاپا ہیں ——— حیران کر کے رکھ دیا ہے۔"

بات کیا ہوتی، سراج میاں ماں کے بعد باپ کے ہی ہاتھوں پلے۔ جب باپ نے بیک وقت ماں اور باپ بن کر پالا ہو تو محبت کا کیا پوچھنا۔ باشت برابر کے کیڑے تھے۔ تب سے ہوکا ارمان تھا۔ پڑھایا، لکھایا۔ پالا پوسا۔ اور بیٹے کو شیر جیسا بنا دیا۔ ڈپٹی تھے۔ رسوخ سے کام لیا۔ کچھ لیا کچھ دیا اور بیٹے کو پانچ سو کی سروس پر چڑھا دیا۔

باپ دورے پر تھے بیٹے اپنی سروس پر۔ آخر کو آدم تھے، حوا کی خوشی تو ہونی ہی تھی۔ آدم نے تو تڑپ لپک کر اپنی پسلی سے ایک حوا برآمد کر لی تھی۔ انھوں نے پسلی کو پیرنے پھاڑنے کی ضرورت نہ سمجھی، اوپر والے صاحب کی تیز نظر تھی، کانونٹ کی پڑھی لکھی، ماڈرن ٹیچر ناہید سے بچے پچے شادی رچا ڈالی۔

ہر بار باپ بیٹے سے ملنے آیا کرتے تو گھر میں وہی پرانے مردوں کا سا سناٹا پاتا کرتا۔ کمرے میں ادھر اُدھر یہاں وہاں سگرٹوں کے ٹوٹے، ماچس کی تیلیاں اور راکھ۔ پھٹے ہوئے کاغذ، کترنیں سے نکلے کپڑے، کچھ میلے، کچھ دُھلے، نائیاں میز پر، جوتے کرسیوں پر۔ اور وہ اس کے مادی ہم پلہ تھے۔ سب کے سے جو پلٹے تو کایا ہی کلپ دیکھی۔ سب سے پہلے جو چپ تک سے داخل ہوئے تو انگن اور مردانے صحن کو ملانے والے دروازے میں، ہرے رنگ کا پردہ اڑا دیا تھا۔ چونک کر دیدے جھپکا جھپکا کر دیکھا پھر نظر اٹھی تو سامنے بیٹھے گاکرہ پڑتا تھا۔ داخل ہوئے تو سارا سامان سلیقے قرینے سے سجا سجایا۔ اب وہ جوتے کہاں تھے جو کرسیوں پر لڑھکتے ہوتے تھے۔ میزوں پر پڑی رہنے والی نائیاں سگریٹیں تک رہی تھیں۔ سگرٹوں کے ٹوٹے جمع کرنے کو جھلملی کرتی ایش ٹرے میز کے بیچ رکھی ہوئی تھی اور ایش ٹرے کے نیچے ہلکے کریم کلر کا ٹیبل کلاتھ، جس پر بہترین وزنیس میز اڑھی اور پھر تو نظر اٹھانے کی بھی کیا ضرورت رہ گئی، وہ تو آپ اپنے آپ اٹھتی ہی چلی گئی۔ دیکھا جو سامان وہاں جھولتے رہتے تھے اب اپنے جائز مقام پر پہنچ چکے تھے۔ ناول رسالے جو اِدھر اُدھر بکھرے رہتے تھے، کونے میں شیلف میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ یوں حیران حیران نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ پردہ ہلا۔ پردہ ہلتا تو یہ دیکھتے بھی تھے، مگر وہ سنہری چھلے (جن میں پردہ اٹکا ہوا تھا) کھن کھنائے اور انھیں تو چونک ہی جانا پڑا۔ اس جنت کی سیر پوری ہوئی بھی نہ تھی کہ ان کی نگاہیں انھیں اور جیسے جنت کی حور نکل آئی پردے کے پیچھے سے۔

"ارے یہی جنت تھی تو ملتی ہی ——— حور بھی آئیگی"۔ انھوں نے دل ہی دل میں سوچا ——— آتے ہی پٹ سے بولی۔

"اُف پاپا آپ۔ اسے بھیجئے نا۔ سراج نے مجھ سے آپ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ آپ کی تصویریں بھی بتائی ہیں اور دیکھے ہم نے آپ کی بڑی سی تصویر یہاں لگا بھی رکھی ہے نا۔"؟

اس کی انگلی کی گردش کے ساتھ ان کی آنکھ بھی گردش میں آئی اور پردہ پر دیکھا کہ وہ خود براجمان ہیں۔ ہنستے ہوئے اٹھتا کر انھوں نے اسے کو دیکھا۔ جیسے وہ کب ہنسا ہے تھے۔ !؟

"آپ بیٹھئے تو ——— میں اتنے میں آپ کے نہانے کا انتظام کروا دوں ذرا"۔

جانے سراج یہاں کدھر جا مرے تھے۔ یہ تو آپ سب سے ملے کئے جا رہی تھی ——— ہونہہ پاپا ——— میں کب اس کا باپ ہوں۔ اور یہ تیسرے کے گھر میں یوں رانی بنی کیوں گھوم رہی ہے؟۔ لاحول ولا قوۃ ——— آج کل کی لڑکیوں کو شرم حیا ہے کہ نہیں؟ ——— آخر ہماری بھی بہنیں تھیں ——— انگلش پڑھی تھی، باہر کی دنیا بھی دیکھی تھی مگر یوں تیز اور منھ پھٹ تو نہ ہوتی تھیں۔ ابا آنے دو بچو کو۔ ابھی خبر لیتا ہوں۔ پوچھ پر سر دس ہو رہی ہے۔

ابھی یہ فقرے یہاں ہی تھے کہ پھر پردہ چھن چھنایا اور پھر وہ پری پیکر نمودار ہوئی۔

"مائی گڈنس ——" وہ سینے پر ہاتھ لے جا کر بولی۔ "آپ ابھی تک بیٹھے ہی نہیں ——— میں تو آپ کے لئے پانی بھی گرم کروا آئی ——— سراج آتے ہوں گے۔ مجھے شیو کر رہے تھے۔ بھلا آپ کے سامنے بوٹی کیسے چلے گا تے۔"؟

واہ ——— بے باکی سے ہنستا تو دیکھو ——— اور مراج کا ذکر یوں کرتی ہے جیسے ساتھ کا کھیلا ہو ——— ارے بھی کرتا رہے گا مراج شیو۔ تمھیں کیوں فکر ہوتی ہے؟

مجھے بیچ دتاب کھاتے رہے کہ خدا کرے جنت کو ہو گئے تو وہ پھر دیکھتا ہوں ——— کم بخت آیا تو اس حیثیت کے

ساتھ کر نگاہ نیچے سے اوپر ہوتی تھی اور پہلے تو آنے کی خبر پاتے ہی پکا چلا آتا تھا ——— سلام دعا تو دور کی دیکھتے ہی للکارے ———

"کہیں میاں کس کنکاؤ کو پکڑ لائے؟"

"کنکاؤ ——— ہیے کے دیسے لفظ سے گھوے جلتی کا تھوں بشکل اندگیا۔ کھنکارے اور بولے ———

"وہ ——— وہ تو جی ——— آپ کی ہو ہے"

"ہیں ——— ہو۔؟"

بس یہی دو الفاظ ان کے منہ سے نکلے اور پھر جو چپکی لگی تو زبان کھلی ہی نہیں ——— دھان پھون، دھان پھون کرتے سارے میں پھرا کرتے ——— دو تو کلوے نے ساری روداد سنا دی کہ کیسے "میاں جی ابیا کے" حسک" میں پھنسے کیسے بڑے صاحب نے بیا کو "آبادی" دے رکھی ہے کہ جو چاہے کرتی پھرے ——— رہا ڈپٹی صاحب کا معاملہ تو روز کی بات تھی۔ بٹیا تو اچھی تھی پگ چراغ لے کر ڈھونڈتے تب بھی ایسا داماد نہ ملتا ——— اگر داماد مل بھی جاتا تو ایسا نہ ملتا جو بٹیا کو اتنی چاہت سے بیاہ لے جاتا ——— اکلوتی اولاد کو اکلوتے باپ کی ذرا تو یاد آئی ——— اور بھلی بڑھوں کا کیا ہے، صرف سہرا دیکھ بھنے سے ایسا کون ارمان پورا ہو جاتا ہے ——— ! اصل چیز تو گھر آنگن ہے سو کبھی نہ کبھی دیکھ ہی لیں گے ——— !

سو آج دیکھ رہے تھے ———

کس کا بیٹا، کہاں کی ہو، جو حالات کا پتہ چلے، اور حالات بھی ایسے تو کیا جی ٹھہرے ——— جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔ وہ تو ڈپٹی صاحب کا تانا کا تھا ——— اپنے زمانے میں اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ بیٹے کو کیا خاطر میں لاتے ——— مگر بڑھاپا تبادلے کا، باپ بیٹے پھر تن گئے۔ ادھر باپ تو انڈ منڈ گول گول پوتا بھی ساتھ آیا۔ جب ایک ہی شہر میں دو گھروں کی سروس چلے تو الگ الگ کیسے رہ سکتے ہیں ——— ؟ اور پھر باپ کی پنشن ہو گئی تو جاتے بھی کہاں ——— ؟ رہتے تو یہیں تھے مگر دالانگاروں پر جلا کرتے ——— اپنے وقتوں میں انھوں نے انگلش بگھاری تھی اور صاحب لوگوں کی دنیا دیکھی تھی۔ مگر یہ زمانے وقتوں کی خوبو تھی تو جاتی کیسے ——— ؟ ہو ہیے کا کیا حال تھا کہ بس تو بہ ———

اس طرف سسر کا کمرہ، اس طرف بہو بیٹے کا ——— دنیا نے کیا ترقی کی کہ ساری شرم حیا پی جاتی رہی ——— بیٹے آفس کو جا رہے ہیں اور علی الاعلان میم صاحب سے کہہ رہے ہیں ——— "واہ بھئی واہ، آج تو عورا می کس دیا ہی نہیں" اور پھر چٹاخ پٹاخ شروع ہو جاتی ——— "اے نامعقول یوں پیار کرنے کو کون منع کرتا ہے مگر ذرا یہ تو سوچ لو کہ دیوار آڑ ہی بڈھے باپ کا کمرہ ہے ——— لاحول ولا ———"

ڈپٹی صاحب کا دل کبھی بہو بیٹے سے نہ مل سکا ——— پتا تھا وہ الگ گھر کا غرا ——— ایک آیا سدا اس کے ساتھ لگی رہتی مگر وہ جب دیکھو تب دادا کے کمرے کو گھسا آتا ——— ماں باپ پیا پیا پکارتے تھے سو آپ بھی دادا کو پیا کہنے لگ گیا ——— ان کی نماز کی چوکی، قرآن شریف، جانماز، سب لگ تھلگ کونے میں ہوتی، یہ جاتا اور عین جملہ مؤث کر آجاتا۔ بہو سے تو باپ مارے کا بیر تھا۔ نام تو کبھی لیا ہی نہیں۔ ترقی پسند گھرانے کی بٹیا کو سوائے میم صاحب کے اور کیا کہہ کر پکارا جا سکتا ہے۔ ہو تے کی خطا پر ہو یاد آئی ———

"دیکھو میم صاحب تمھارے بچے نے جانماز پر پیشاب کر دیا"

"پپا ——— وہ بڑی تمنائی آواز سے بولتی ——— میں نے سکھا تو دیا ہوگا"

"اور کیا میں نے سکھایا ہے ——— اٹ کرد ہر بار یہی جواب دیا کرتے۔

ہم بیٹھے تو جیسے تھے سوتے۔ پوتے پر بھی ان کا کیا سحر چلا۔ مسلمانوں کا گھرانا اور نام دیکھو کیا الٹ پلٹ رکھ چھوڑے تھے۔ ایسا کیا اب سوائے چکی کے دنیا بھر میں کوئی نام ہی نہ تھا ——— ؟!

اور تو مذہب وہ چیز تھی کہ گویا ہمیں یکجا پیدا ہوئی تھی۔ بکھرے کے ہاتھوں کیسے کیسے کلموں کا مرہم نام رکھیں ——— نہیں صاحب، وہاں تو ہی ہوگا جو ہمیں آتے گا ———

"ابے کلو سے تو کیا جانے سے نام و نام دیے چیے صاحب فرما رہے تھے! اس کی آنکھیں تو دیکھ کیسی نیلی نیلی ہیں، بس اس کا نام تو نیلم ہی ہوگا"

واہ رے ہمارے ننھے کے کبھی نیلم پری سے ہٹ کر کچھ نام ——— یوں بات ہی کیا کرتے، جو کبھی شکایت کا موقعہ آتا تو بس نیلم پری ہی بول جاتے ———!

———

اپنے کام میں مگن رہتے، دن بھی گزر جاتا، پڑھنے لکھنے میں رات بھی ——— اب جو پنشن ملی تو گویا مرنے کا پروانہ آگیا ——— اب تو سارا سارا دن گھر پر ہی پڑے رہتے ——— کبھی یہ کتاب الٹ رہے ہیں، کبھی وہ رسالہ ——— کبھی پرانے دوستوں کے خطوط نکال کر پڑھتے تو کبھی طالب علمی کے زمانے کی تصویریں لے کر بیٹھ جاتے ——— کھلا بار بار دیکھا جاتا

"ابے دیکھ۔ یہ اب کی تصویر ہے کہ میں بیس سال کا تھا"

"تو نے پہچانا یہ کون ہے ——— ؟ ابے میں ہی تو ہوں، ڈرامے میں بادشاہ بنا تھا"

یوں ہی بار بار انہیں تصویریں دکھانی پڑتے تو بچوں کو چھیڑ کیسے آتے ——— ادھر سے پنکی، ادھر سے نیلم ——— کبھی یہ اٹھائیں، کبھی وہ پہنچ ہیں ———

"نیلم صاحب سے روپے پیسے کچھ لے لیں۔ میں اٹھنے والا کی جھاڑو دے لگاؤں"

"نیلم صاحب سے کہو دادا نے چھینکنے کی آواز آئے تو پھر دوا تی نہ آئیں ——— ہاں ———"

اور کبھی ایسا ہو جاتا کہ دادا جی نے دانت پیس کر ایک آدھ جما ہی دی ——— ادھر سے سراج دوڑا آتا، ادھر سے ناہید بلبلاتی ہوئی نمودار ہوتی ——— سراج تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ——— ناہید، ماں کا دل پلٹے کھانے لگتا ———

"پپا ——— کوئی بات ہے، کال تو دیکھئے کتنا لال ہو رہا ہے"

یہ ایسا ٹھوٹھ چھوڑتے ——— "باپ گورنے، ماں گوری، اولاد کیوں دھیروں کے ایسی آئے ——— وہ تو گلاں ہی خود بکھ دل ہیں"

ناہید پاؤں پٹخ چلی جاتی تو یہ ہاتھ جھاڑ کر دانگ سی دیتے

"بچو ——— جو اب کے آئے تو یاد رکھنا ——— ہاں، خوں نکل پڑے گا منہ سے"

چیلیں جوں گوشت پر منڈلاتی ہیں یہ داڑھیاں منڈلاتے۔ ادھر ان کا پیشہ پارہ کھلا کہ دو مرجو ——— داڑھی بھڑ کی گھر کی سن ہی لے ہیں۔ اور شرارتیں کر ہی رہے ہیں ——— اور بڑے میاں آجا کے میم صاحب میم صاحب کرتے دوڑے جا رہے ہیں

"میم صاحب لکھیں اپنے کام دھام سے فرصت ہو تو ذرا دیکھ جاؤ کہ ان نامعقولوں نے میری داڑھی کی کیا گت بنا رکھی ہے"

داڑھی تو داڑھی رکھنی قیامت ہو گئی ——— آجائے کمبخت داڑھی کی شامت ——— نیلم تو اسے چھوتی موتی چھاڑو ہی سمجھتی۔ کئی بار اصرار ہو چکا تھا کہ وہ سفید کالی جھاڑو ان کے استعمال کو دے دی جائے ——— مگر پاپا سنتے کب تھے؟

"سنا میم صاحب، تمھاری نیلم پری نے میری داڑھی مٹھی میں پکڑ لی۔ آخر تمھارے ہاں تہذیب تربیت سکھائی جاتی بھی کہ نہیں؟"

"پاپا ——— باتی گارڈ میں آپ کی شکایتیں سنتے سنتے بور ہو چکی ہوں۔ دیکھ لیجئے گا ایک آدھ دن میں خود کشی کر لوں گی"

"تم سے پہلے میں کیوں نہ مر گئوں۔؟" اور جب وہ تیز تیز قدموں سے صحن میں کھڈے لئے کودتے تو خیال آتا کہ پہلے اپنی گت بنوا لیں تو سمیٹ لوں، کون جانے میرے مرے بعد پوتا پوتی کیا حشر کر دیں ان کا ——— کہ ابھی کہتے کہتے قتل لگانے تک مرنے کا خیال اچھا خاصا ذہن پر ہو چلا ہوتا اور پھر ایسے شیطانوں کے پیچھے مرنا اور وہ بھی خود کشی کرنا، کتنا دیسی بات تھی! ان سے تو ٹن کی کر بدلے لیے کو کئی سو سال زندہ رہنا چاہئے ——— ہاں۔ یہ ہوئی نہ کوئی بات ———!

دو چار مہینے میں ہی پتہ چل گیا کہ چاچا پوتی سے تو دل کھانیں اور وقت تو کاٹنے سے کٹتا نہیں ——— بیٹے ہوتے تو آگے چل پھال بیٹھا تھا۔ کم بخت خبر بھی کیا مرنے سے ملی تھی ——— اس دن ٹھٹھے ٹھٹھے صدر گئے۔ آتے آتے دائیں ہاتھ میں پنجرہ لٹکائے ——— پنجرے کے اندر میاں مٹھو براجمان ——— ہرے ہرے پر، لال لال چونچ۔ بیچ میں لگی بیچ پاپا ادھر سے ادھر پھدکے جا رہے تھے۔ ابھی پھاٹک کے اندر داخل ہوئے تھے کہ جمن میاں نائیں کی آواز سارے میں گونج گئی ——— ناہید نے سویٹر بنتے بنتے سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی میں پڑوہ جھول رہا تھا، اٹھ کر آئی۔ دیکھا تو سسرے مٹھو سنبھالے چلے آ رہے ہیں۔

"تو نہ اب مٹھو سے دل بہلائیں گے؟" اس نے جل کر پوچھا اور پھر سے اگر سوئے میں رہنس گئی ——— نیلم پری اور پاپا کسی معمے کو سر کرنے میں جتے ہوئے تھے۔ نئی نوازی آواز جو سنی تو ادھر ہی لپکے آئے۔

"ارے پاپا یہ کیا ہے"

"پاپا سے کیا بولتے ہیں؟"

"اے پاپا.....

"تم را سر؟" ——— وہ جل کر بولے۔

"ہمارا سر ——— ! پھر ہمارے سر کو کیا بولتے ہیں؟"

کلوا بگڑی سے ہاتھ پونچھتا برآمد ہوا۔

"ارے مالک یہ مٹھو کا ہے خرید لائے؟"

(ہوں تو مٹھو نام ہے اس چڑیا کا ——— !)

دونوں آگے پیچھے ڈائننگ روم کو دوڑ گئے۔

"دیدی ——— نمی ——— پپا منھ لائے ہیں؟"

"پپا منھ لائے ہیں ———؟"

———

اب ڈپٹی صاحب خالی وقت میں منے سے منھ کو باتیں کرنا سکھاتے رہتے ———

"منھ میاں کو روٹی چاہیے؟"

"منھ میاں کو غصہ آگیا؟"

"ڈپٹی صاحب ——— منھ کو پانی چاہیے؟"

بچے بچیاں ہنستے اور نیلم گھس گھس کر اپنی ہی ٹانگ اڑاتے ———

"نیلم بی بی منھ کو روٹی کھلاؤ؟"

"نیلی صاحب، منھ میاں کو غصہ نہ دلایئے؟"

تاہم اکثر ڈپٹی صاحب نے منھ کو سکھا دیا۔

"نیلی فول ——— نیلم پری نامعقول؟"

نیلی نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔

"منھ پیارے بولو ——— پپا فول ——— پپا فول؟"

آدھی بات منھ کے منہ میں، آدھی بات نیلی کے منہ میں تھی کہ پپا آ گئے اور پورے پر لپک پڑے۔ پپا بھی ڈپٹی صاحب کا تھا ——— آگے آگے نیلی پیچھے پیچھے پپا۔

دونوں بھاگتے بھاگتے سراج کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو اسے قہقہہ لگاتے ہی بن پڑی۔ بیٹے کے ہنسنے پر ذرا اپنی پوزیشن کا خیال آیا تو دھیرے سے چھڑی پٹخ، اپنے کمرے کو ہو لیے۔

"نامعقول کہیں کے۔" انھوں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے دل کی جھان اتاری۔

ایسے ہی وہ بچے کو منھ کو چین نہ لینے دیتے۔ اچھا یہ بات! تنگ آ کر انھوں نے خود ہی منھ کو چھوڑ دیا۔ "اب دیکھوں گا بچو جی ——— جو ادھر آئے تو ٹانگ ہی توڑ ڈالوں گا؟"

کل ناشتے کے لیے انڈے خرید کر لایا تو ڈپٹی صاحب کی نیت میں فتور آ گیا ——— ایسے بڑے بڑے انڈے ——— واہ بھئی واہ ——— بچے نکالنے چاہئیں ——— ایسے انڈے تو بس لیگھارن مرغیاں ہی دے سکتی ہیں ——— یا پھر مینار کا ———

"چلو انڈے بھنتے ہیں۔"

بیکار آدمی کا دماغ تو یوں ہی شیطان کی دکان ہوتا ہے۔ انھیں کام تھا بھی کیا ——— ! پتہ پوچھ، خود ہی انڈے خریدنے چلے۔

کھیں انڈے ماں پر بٹھانے کو ایک کڑک مرغی ——— اب نکلیں گے بچے اور ترسیں گے وہ بچے ہوئے سارے زمانے ———

مرغی کی وہ وہ خاطریں ہوتیں کہ بس اپنی بیگم کی ہی کی ہوگی جب کہ وہ خود بچے دینے والی رہی ہوں گی ——— روزانہ انڈوں کی گنتی ہوتی ——— اس کے سونے، جاگنے، کھانے پینے کا خیال رہتا ——— جب تک یہ دانہ چگتی ——— بچے انڈوں کی رکھوالی کرتے کہ بلی اور نیلم پری انڈوں کو خود برد نہ کر دیں ——— کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے رہتے کہ اندر چوں چوں ہو رہی ہے ——!

اکیسویں دن تو بچہ بچہ ہی چوں چوں چیں چیں کی آواز سنائی دینے لگی ——— بس خوشی کو عین میں وہی حال تھا کہ جیسے سارے میاں پیدا ہوئے ہوں ——— مرغی تو خود ہی اپنے بچوں کے حق میں شیرنی ہوتی ہے، مگر یہ کیا کم تھے؟ چپل اٹھا کر نکلے جاتے اس مارے آگے پیچھے ہی رہا کرتے، یہ چپل کے بھائے شکرا ہو کر رہ گئے۔

"اب جلیں گھنٹ چوزے دیکھ دیکھ کر" وہ دانہ چگاتے چگاتے مزے سے سوچتے ——— بچے کس کی ماننے والے تھے۔ ڈیڈی ممی ماں ماں کرتے ہی رہتے اور یہ دادا کی گود میں گھسے ہی جاتے ——— کسی چوزے کی دم پکڑ کر اچھال دی، کسی کو اپٹ دے دی ——— دادا کو دق کرنے کسی کو جنگلے سے باہر نکال کر دیا کسی کو باغ کی راہ بتا دی کہ گھومتے رہو۔ اور دادا جی کو جلاتے رہو ———

ایسی بے ہودی ماں تھی یہ مرغی بھی۔ سارے بچوں کو لے کر باغ میں گھس جاتی اور بچوں سے ساری زمین کھودنی شروع کر دیتی ——— ماں کی حیادت میں بچے بھی کھود کھاد شروع کر دیتے اور ڈیڈی صاحب کا ناک میں دم آجاتا بکالے بکالے۔

مرغیوں کو بند کرتے تو اکھڑے، اکھڑائے پودے اور کچی بھائی گھاس دعوت دیتی کہ آؤ میاں ہمیں قرینہ دو۔ پائنچے گھٹنوں، آستینیں چڑھائے لوک گارڈننگ پر تل جاتے۔ بیچ بیچ میں بلی اور نیلم پری اپنی خدمات پیش کئے جاتے۔

"پپا ——— لائیے گڑھا ہم کھود دیں"

"لائیے زمین گھر پ دیں"

باپ کی طرف سے ایسا غصہ دل میں بیٹھا تھا کہ کسی بات کا ٹھیک سے جواب نہ دیتے۔ رہ رہ کے ممی کو جلنے پڑتے اور خود بچوں پر گالیاں ——— مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ جھاڑتے ہوئے، گھنے تو پامسٹری کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتے اب بڑھاپے میں پامسٹ بننے کا شوق چرایا تھا۔

ایک دن کتابیں اتنے پتے بیٹھے تھے کہ دونوں جوان پروان ہو گئے ———

"پپا یہ آپ دن بھر کیا پڑھتے رہتے ہیں" بلی بولا

"اور جھک جھک کر عینکی میں کیا دیکھتے رہتے ہیں" نیلم پری تو بس بلی کے نقش قدم پر چلتی تھی۔

"تمہارا سر" ان کا سدا ایک ہی جواب ہوتا۔

"واہ آپ کی بدولت ہی ہمارے سر کہاں سے آئے بھلا" بلی حیرت سے بولا ———

"پپا جھوٹ بولتے ہیں" نیلم نفرت سے بولی۔

اور جیسے انھیں قائل کرنے کو بلی بولا "سعید انکل سے آپ کہہ رہے تھے کہ میں ہاتھ دیکھ کر آگے کا حال بتاتے ہیں"

اس نے شرارت سے اپنی ہتھیلی بڑھا کر کہا "پپا گل میں کیا کروں گا۔ بتائیے تو"
دادا نے گھور کر ہتھیلی کو دیکھا اور بولے "ڈنڈے کھانے کی آرزو ہے کیا۔"
ننگی ہتھیلی بڑھاتے ہی تھا تو دانت اچکا کر بولے "کل تو آپ مٹھائی کھائیں گے جناب ——— ای ای"
دوسرے دن ننگی اور نعیم صبح ہی صبح اٹھ بیٹھے۔ دادا کی کہی بات تو پوری ہونی ہی تھی ——— دونوں ان کے کمرے میں گھس گئے۔ دادا جان جاگتے کے لئے اور لیٹی، بسکٹ اور مسکہ سلائس لا کر رکھنے ہی تھے کہ دونوں نے انہیں جگا بیٹھا دیا۔ اور مٹھائی بتانے کو ان کے پاس پہنچ بھی گئے۔

"پپا ——— آپ تو سچ مچ ہی سچا حال بتاتے ہیں؟"
انھوں نے چشمے میں سے گھورا۔ نعیم نے بات کی وضاحت کر دی۔
"کل آپ نے کہا تھا نا کہ مٹھائی کھائیں گے۔ آج تو سچ مچ کھانی۔ وہ آپ کے کمرے میں کریم لے بسکٹ، جیلی اور کچھ تھا کر نہیں....."
پپا نے کروٹ لے کر جاگنے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ قسمت کا حال کتنا سچا بتایا تھا ——— دوسرے ہی لمحے وہ ڈائننگ روم کے دروازے میں، سرخ سرخ آنکھیں لئے چنگھاڑ رہے تھے۔
"میم صاحب۔ تمہارے صاحب کی تنخواہ پورے ساڑھے سات سو ہے۔ اپنے لاڈلوں سے کہو اپنے باپ کا کھائیں۔ باپ کے باپ کو کیوں کھا جاتے ہیں؟"
"کیا ہوا پپا؟" وہ ہڑبڑاتی ہوئی بولی۔
"تمہارا مر۔ ایک سرے سے سارا خاندان وہی اڈھائی ——— شوہر دیکھو تو اس رنگ کے، بیوی دیکھو تو اس رنگ کی اور بچے دیکھو تو ایسے۔ آخر تم لوگ مجھے جینے دو گے کہ نہیں؟"
"ہم نے بھلا کیا منع کیا ہے آپ کو جینے سے" وہ سہم کر بولی۔
"ہاں ہاں تو میں خود ہی گرنا مرنا چاہتا ہوں نا" ان کی اس طرح کی الٹ پلٹ باتوں سے ناہید زچ آچکی تھی۔
"میری کسی چیز کو چھیڑیں نہیں۔ کمرہ دیکھو تو کباڑ خانہ۔ باغ دیکھو تو گھل گھپل۔ مرغیاں دیکھو تو پرچی۔ منھ دیکھو تو گالیاں سکھا رکھی ہیں بے ہودوں نے۔ بلی دیکھو تو لنگڑی۔ آخر یہ سب کیا ہے؟" وہ چیخ کر بولے۔
ناہید نے کچھ جواب نہ دیا تو جھلا کر بولے "یہ تعلیم یافتہ گھرانے کی ماں ہے۔ ہونہہ۔ بچوں سے ڈنگ نہیں سکھایا کرتیں ہے یہ سوکھ کرتیں۔ نامعقول کہیں کے۔"
سراج ان کے پیچھے ہنستا ہوا نکلا اور بیوی سے بولا۔
"کیوں برس رہے تھے پپا؟"
ناہید الجھ گئی "خوب ہیں آپ کے پپا بھی۔ کوئی بات سی بات لبی ہو۔ جانے کیوں گرم رہتے ہیں ہر دم؟"
"ارے ڈارلنگ میں نے ستر بار تم سے کہا ہے کہ بوڑھے آدمی ہیں۔ ان کی بات کا نوٹس نہ لیا کرو۔ اور اصل میں نے تو میرٹھ کے

انھیں مستقل ناراض کر دیا۔ ویسے بُرے آدمی نہیں ہیں۔ یقین کرو۔"

"بڑے اچھے آدمی ہیں۔ کلیجہ نکال کر دیا ہے میرا تو۔" سراج ہنس دیا۔

"چپاد پر سے بتانے کو ایسا کرتے ہیں۔ بچے بچے تھوڑا ہی کرتے ہیں۔"

"ہاں آپ تو اپنے پپا کی سائیڈ لیں گے ہی۔ بتانے کو بھی کوئی اتنے سالوں تک غصہ بنایا کرتا ہے۔ شادی ہو گئی، بچے ہو گئے، بچے باتیں کرنے لگ گئے اور جناب کا غصہ ہی نہیں اتر چکتا ——— اپنی نوجوان بیٹی میں ہے ——— آپ تو صرف باہر کے آدمی ——— دن بھر گھر میں وہ بڑ بڑ بڑ بڑ مچا رہتا ہے۔ اُدھر سے مرغیاں کڑکڑا رہی ہیں۔ ادھر سے مٹھو نے مٹھو پیارے کی رٹ لگا رکھی ہے ——— بلی میاؤں میاؤں کر رہی ہے تو مرغے وقت بے وقت اذانیں دے رہے ہیں۔ اچھا خاصہ ایمبل فارم کھول رکھا ہے۔ آپ کے پپا نے تو" سراج ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ اُدھر کھپاڑے سے بھی تک ڈپٹی صاحب کے گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں ———

اب کبھی بلی اور نیلم پری ڈپٹی صاحب کو ستانے آن ٹپکتے تو وہ بھی ہرے بن جاتے ——— مرغے سے گن ہتے ——— باجری اور جوار کی کوئی مرغیوں کو چگاتے، چگاتے رہتے ——— دونوں بیچے سے مرغیوں کو ایسے ہنکاتے کہ کبھی تو پپا کے کندھے پر کبھی سر پر۔ اس دہشت میں کسی دن کسی مرغی سے خطا ہو جاتی اور پپا بیچارے گوبر میں نہا جاتے۔ دیدے سرخ کر کے وہ پیچھے لپکتے۔ تب تک دونوں اڑ کچھو ہو جاتے۔ باغبانی کرنے کو کیاری میں پہنچتے تو بھاڑے سے جا بے جا پانی انڈیل دیتے۔ مٹھو کو باتیں کرنی سکھاتے تو وہ دن بھر گالیاں سکھانے لگا رہتا۔ کتا ہیں لے کر بیٹھتے تو پیچھے سے کرسی کو دو دھکے دیتے کہ بس کتابیں رکھتے ہی بن پڑتی۔ کبھی بلی کو پیار کرنے کا موڈ سوار ہوتا تو نامراد اس کی دم کھینچ کھینچ کر ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ ڈپٹی صاحب کی جان زہر آپکی تھی۔

اس دن سہ پہر کی کوئی ساعت اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ سراج آفس کا کوئی اہم کام کر رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب حسب معمول اپنی اٹھائیج میں بیٹھے ہوئے تھے اور چکی اور نیلم باغ میں روندن مچا رہے تھے ——— ہوا یہ تھا کہ کوئی مرغی ان کی ممی کی کیاری کے کھاد کو بھی چگ گئی تھی ——— اس سے بدلہ لینا ضرور تھا ——— وہ جدھر جدھر جاتی دونوں بھی پیچھے پیچھے ہی جاتے ——— اس مقابلہ بازی میں باغ کی وہ گت بن گئی کہ پپا کا بھلا خاصہ باغ کھنڈیر بن گیا۔ ڈپٹی صاحب کی وہ حالت کہ بس انگاروں پر بیٹھے ہوں جیسے۔ تنک تنک چلتے ہوئے بہو کے کمرے پر دو ——— دونوں کو دیکھ دیکھ ایک تو ان کے یونہی آگ لگا کرتی ——— ہو لتی تو تھی، بیٹا بھی اس کے رنگ میں رنگ گیا کم بخت ——— سیر سپاٹے کو جاتے وقت جب گھر سے باہر نکلتے تو ہاتھوں میں ڈنڈا اور آنکھوں میں آنکھیں ——— لاحول ولا ——— اور جو میاں کو پیار آتا تو وہ کافوری پنجہ اپنے منہ تک لے جاتا اور ——— کوئی بے تری سی بے تری ہے ——— ارے یوں محبت کرنے کا شوق ہی ہے تو شوق سے کرو مگر یہ تو سوچو کہ گھر میں بڑا باپ بھی ہے؟ ہر لمحہ کروہی سوچے جاتے ——— آخر ہماری بھی شادی ہوئی تھی، ہم بھی تو اپنی سوسائٹی میں موو (MOVE) کرتے تھے، مگر اس بے ڈھنگے پن سے ——— ؟ بس ماں باپ کے کارن تھے یہ دو نوپتو ——— ذرا جو کوئی کام میں ڈھنگ ہو۔

"نیم صاحب میں نے کہدیا۔ اپنے پکوتی کو دیکھو، ورنہ ——— ..... تا وید سونے کے قریب تھی ——— یوں کفن پھاڑ کر چلائے تو اس کی آنکھ چٹ سے کھل گئی ——— گھبرا کر بولی۔

"کیا ہے پپا ——"

"تم لوگوں نے یہ اسارا باغ روند ڈالا۔ کیا تمہارا گھر نہیں ہے کہ انہیں تنبیہ کرو؟"

"آپ ہی نے انہیں سر چڑھا رکھا ہے تو میں بھی کیا کروں۔" وہ جھلا گئی۔

"میں نے ——؟" وہ چیخ کر بولے۔ "ارے میں نے یا تم نے اور تمہارے صاحب بہادر نے؟"

"آپ نے —— آپ نے —— آپ نے —— اگر پہلے سے ہی آپ یوں محبت نہ کرتے تو ان کی کیا مجال تھی کہ آپ کے منہ آتے ——؟"

ڈپٹی صاحب کو بچھو کاٹ گیا۔ "محبت —— ارے میں ان حرام زادوں سے محبت کرتا ہوں —— لعنت —— لاحول ولا —— یہ لکے محبت کے قابل ہیں بھلا ——؟"

حرام زادے —— کیا یہ حرامی پلے تھے —— یا باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔ تب پیدا ہوئے تھے، پھر یہ پپا کیا کہہ رہے ہیں ——!!

ناہید کا چہرہ جھک گیا۔

"پپا —— آپ کی ہر بری بھلی بات میں نے برداشت کی اور آپ یہ گالیاں بھی دینے لگے؟"

"ہاں ہاں دوں گا —— دوں گا —— دوں گا —— پھر وہ پاگل بچوں کے سے انداز میں چلائے —— ای —— ای —— ای ——

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو ناہید کو یوں بڑھے ہوئے آدمی کو زبان چڑاتا دیکھ ہنسی آ جاتی مگر اس سمے تو وہ اداس ہو رہی تھی۔ اس نے وہ ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا جو نہ ہنسی کے پاس بھی نہ تھا —— آنسو ——

پہلے تو ڈپٹی صاحب نے دیدے پھاڑ کر دیکھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ پھر غور کو ڈھیٹ بنا کر بولے۔ "بونہہ —— آنسو؟"

سراج فونٹین اٹھ میں تھامے تھامے بیزاری سے باہر نکل آیا۔

"پپا —— آخر آپ گھر میں سدا طوفان کیوں اٹھائے رہتے ہیں؟" اس کے لہجے سے حد درجہ ناگواری اور بیزاری چھلک رہی تھی ——

کبھی کبھار جواب دینے سے بہتر ہوتا ہے کہ صرف گھور ہی لیا جائے۔ سو ڈپٹی صاحب بھی محض گھور کر رہ گئے۔

سراج اپنی ہی کہے گیا۔ "اور حیرت اس بات پر ہے کہ بچوں سے آپ یوں کھیتے کھاتے ہیں جیسے کوئی بڑی دولے ہوں؟"

"پھر کیا اٹھا لے کر کے عورتوں کی طرح تمہاری میم صاحب سے لڑا کروں ——؟"

"کیوں میم صاحب سے لڑنا ایسا کیا ضروری ہے؟" وہ نیکا ہو گیا۔

"اس لئے کہ وہ مجھے پسند نہیں۔"

ناہید نے میاں کو دیکھا —— بیچے ——" اب کہئے نا ——؟"

سراج فونٹین گلے میں ٹکا کر، اکھاڑے میں اترنے کے سے انداز سے بولا۔

بھلا یہ تو بتایئے کہ اس کی کون سی بات پسند نہیں۔ اس میں کیا کمی ہے ——؟

"تم نے آتی نار، روڈ ہیوی کر کے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔" وہ بغیر جھجک کر بولے۔

"کار روڈ ہے اسی لئے مگی ہوئی بھی ہے، ورنہ آپ کی تنکا تنکا سے تنگ آکر تو کبھی کی رفو چکر ہو گئی ہوتی۔"

"میں —— وہ بیچنے —— میں تنکا تنکا کرتا ہوں ——؟؟"

"اور کون کرتا ہے پیو ——" سراج تیزی سے بولا۔ "میں آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر ناہید سے آپ کو کیا شکایت ہے، آپ کا کون کام پورا نہیں ہوتا —— ناشتے میں دیر ہوتی ہے یا کھانا نہیں ملتا، یا نہانے کو گرم پانی نہیں ملتا۔ یا پھر اور کوئی شکایت ہے ——؟"

تھوڑی دیر بڑے میاں سوچتے رہے پھر سر ہلا کر بولے ——

"ایسی تو کوئی شکایت نہیں۔"

"تو پھر برسوں سے یہ جھگڑے رگڑے کیوں چل رہے ہیں ——؟"

ڈپٹی صاحب تیزی سے پیچھے ہٹے اور صفائی دینے کے انداز سے بولے۔ "ان مردودوں کی وجہ سے —— ان دو کمینوں کی وجہ سے —— اگر کیلی میم صاحب کا واسطہ ہوتا تو شاید میرا غصہ اتر بھی چکا ہوتا، مگر انھوں نے —— ان نامعقولوں نے میرا بھیجا آؤٹ کر رکھا ہے ——"

"کبھی ماں پر غصہ، کبھی بچوں پر —— بات ایک ہی ہے۔ دراصل آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے گھر سے چلے جائیں۔ یہ بہت دنوں سے یہ بات کہنی چاہتی تھی، آج بول ہی گئی۔"

"ہاں ہاں تمھارے باپ کا گھر نہیں، میرا گھر ہے۔ چلی جاؤ —— چلی جاؤ، ابھی اسی وقت۔ کون روکتا ہے۔ شہر میں بہت سے فلیٹ خالی ہیں۔"

سراج نے ناہید کو دیکھا —— ناہید نے سراج کو۔

تھوڑی دیر عجیب ہیبتناک خاموشی طاری رہی۔ پھر سراج رسان سے بولا۔

"تو یہ بات تھی پپا۔ ہمیں پہلے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ہم یوں آپ کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔ ورنہ آج سے سالوں پہلے گھر خالی کر چکے ہوتے۔ تھوڑی دیر رک کر وہ دھیرے سے بولا ——

"ہم کل یا پرسوں یہاں سے چلے جائیں گے ——!"

کئی سالوں بعد آج وہ دن طلوع ہوا کہ ڈپٹی صاحب کو سکون ملا۔ روزانہ تو صبح ہی سویرے وہ دونوں چوتا پوتی ہلڑ مچانے آن موجود ہوتے تھے —— آج ناہید کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تھا اس لئے اس نے دونوں کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔

"جو کمرے سے باہر قدم رکھا تو پیر کاٹ ڈالوں گی۔"

دونوں مرے مرے ہاتھوں سے سامان پیک کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب مزے سے، فخر سے، اپنے کاموں میں مگن

رہے، گویا ہر چیز کو کن انکھیوں سے دیکھے جاتے تھے۔

"دیکھ کیسے بھگا بھگا کر مجنوں کو مارا!"

دوپہر کے کھانے کے لئے ممی نے دروازہ کھلوایا تو دونوں کو چپٹی سی مل گئی۔ پھر دادا کے آگے پیچھے ہونے لگے۔ نیلی نالی پیٹ کر بولا۔

"ابا جی۔ ہم تو نئے گھر کو جا رہے ہیں؟"

"اور وہاں آپ تو ہوں گے بھی نہیں!" نیم نے فقرہ دیا۔

ڈپٹی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ "میں کون مرا جاتا ہوں تمہاری قربت کو؟"

ہفتے عشرے میں سراج فلیٹ ڈھونڈ آیا۔ نوکروں اور مالکہ نے مل کر پیکنگ ختم کی۔ دن بھر سارا اشہر اٹھلانے میں ٹوٹ گیا ——— دو اوں دوڑ کر مٹر مٹر کو دیکھتے کہ اب پپا آئیں گے اب پپا آئیں گے اور ماتھے پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"اسے تم دونوں بھی بس بچے سے ہی نکلے۔ کیا یوں گھر چھوڑ دیا کرتے ہیں ——؟"

مگر وہ تو دہن کرسی پر دھرنا دیئے بیٹھے رہے۔ بس نماز ادا کرنے کو اٹھے۔ پھر کرسی پر براجمان ——— ایک ایک کر کے سارا سامان بندھ گیا مگر ڈپٹی صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ٹرک ہی سامان لد گیا۔ پھر اسکوٹر چھاٹک میں داخل ہوا۔ تب بھی وہ وہیں جمے رہے ——— بینا دیدے گھما گھما کر دیکھتا رہا مگر وہ ہے تک نہیں۔

سب مرحلے طے ہو گئے تو پتے بیٹا بہو کو ملنے آئے۔ دور ہی سے رکھائی سے بولے۔

"جاؤ اللہ خوش رکھے ——— اور خوش کیوں نہ رکھے گا؟"

اسکوٹر میں بیٹھتے بیٹھتے تو بچہ گاہید کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"یوں گھر چھوڑنا کتنا برا لگ رہا ہے نا بچو۔" وہ دکھ سے بولی "یہاں ہم نے کتنے خوشگوار دن گزارے؟"

سراج کی خود حالت غیر ہو رہی تھی، مگر وہ پھر ہم ذاکم رکھنے کو بولا۔

"کاہے کے خوشگوار دن تھے، وہ رات تو کل کی گرتے تھے؟"

گو اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ "ہائے بے چارے پپا اکیلے کیسے رہیں گے۔ ان کے کھانے پینے کی کیا برابری ہو گی۔ جانے کیوں مجھ کم بخت کے منہ سے گھر چھوڑ دینے کی بات نکل گئی، سارا قصور میرا ہی تو ہے؟" وہ پھپک پڑی۔

سراج جھلا گیا۔ کیسی عورت ہے یہ۔ خواہ مخواہ اپنے سر قصور منڈھ رہی ہے۔ تیزی سے بولا۔

"یہ خیال تمہیں آنا چاہئے تھا۔ کمال کرتی ہو؟"

اسکوٹر پھاٹک سے نکلنے لگا تو اس نے جھک کر دیکھا، شاید پپا روک لیں۔ شاید ان کے چہرے پر غم کی چھاپ ہو! گو اسکوٹر دن سے باہر نکل گیا۔

———

دوسرا دن تو ڈپٹی صاحب کے لئے عید بن کر آیا۔ صبح ہی صبح اٹھے ——— مگر یہ کیا ——— ؟ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا چھوڑ پورا گھنٹہ گزر گیا مگر بیڈ ٹی اب آتی ہے نہ جب ———

"ہونہہ ——— ہم کب کسی کی پروا کرتے ہیں" جھلا کر اٹھے اور باورچی خانے کو چلے ——— ماما کو پکارتا تھا مگر وہ قطعی بے خبر تھی، یہ سارا کام دھام تو کلوتے کے ذمہ تھا جو اچھا خاصہ صاب لوگوں کا بیرا بن گیا تھا۔

ادھر پتیلی میں آنکھ مچولی میں لگ گئے ——— کتابیں تو ابھی شروع کہیں ——— ایک دو منٹ تو بڑی مستعدی سے پڑھتے رہے پھر طبیعت بھی لہر کرنے لگی۔ آدھ گھنٹے میں کتاب ٹیبل پر پہنچ گئی تھی اور یہ خود چلتا چلا کر ماما کو آواز دے رہے تھے گو ناشتہ میں کیا دیر باقی ہے۔

"آج کسقدر سکون ہے" انھوں نے بشاشت سے سوچا۔ چلو خادم عزیز کی خبر لے آئیں ——— باجی، جو عمر کی گرمی لے کر ڈربے کے پاس پہنچے ——— بڑے سکون سے مرغیوں نے دانہ چگا ——— پھر مٹھو کی یاد آئی۔ کٹوری کا پانی بدلا ——— ہری مرچیں کھلائیں۔ کچھ باتیں کیں۔ چلنے کو ہوئے تو وہ تیزی سے بولا ———

"پیا تو ل ——— پیا تو ل ———

یہ بھنا کر مڑے اور بری طرح چلائے "ابے بول۔ پنکی فول ——— پنکی فول ——— (یہ کالی اس کم بخت نے ہی سکھائی تھی نا ——— اور پھر وہ نامراد نیلم پری؟)

مٹھو اچھل اچھل کر بولنے لگا ———

"پنکی فول ——— پنکی فول"

پھر وہ بڑے اطمینان کے ساتھ باغ کو چل دیئے۔ جھاڑا لگا کر پانی دیا، پودوں کی کانٹ چھانٹ کی، پھر بیل کی خبر گیری پر لگ گئے۔ سارے مرحلوں سے نپٹ کر وہ مزے سے آرام کرسی پر دراز ہو کر پائپ پی رہے تھے ———

دوسرا دن بھی وہی سکون اور اطمینان لے کر طلوع ہوا۔ باجی کھاتے میں کوئی مرغی گرم مزاج کر دانا چگنے اور انڈے دینے کی بجائے کڑکڑانے لگی تھی۔ مٹھو سیدھے سامنے سجاوٹ میں کہہ رہا تھا ———

"ڈپٹی صاحب۔ مٹھو پیارے کو روٹی دیجئے"

کتابیں پیچھے سے دھکے دے دے کر گرائی جا رہی تھیں۔ انھوں نے دو چار صفحے الٹ کر کتابیں واپس رکھ دیں اور بلی کو گود میں لے کر اس کی نرم نرم پشم پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

تیسرا دن تو اس سے بھی زیادہ پر سکون نکلا۔ مرغیاں خاموشی سے دانہ چگتی ہی رہیں تو انھیں تنگ کر غصہ آ گیا۔ "بھلا ایسی مسلسل محنت بھی کس کام کی؟" مگر وہ کیا سنتیں، مزے سے چگتی رہیں۔ پودے اپنی جگہ جھومے جا رہے تھے، منہ پھٹے ہوئے، پھولی ٹوٹتے ہوئے۔ مٹھو بھی ادھر ادھر چک کر دلچسپی انداز سے مٹھو پیارے مٹھو پیارے کی رٹ لگائے تھا۔ بلی لگڑا کر چل رہی تھی نہ دانا کی کرسی کے پیچھے سے گھسیٹی جا رہی تھی۔ سارے میں ایسی خاموشی تھی کہ سوئی گرے تو آواز سن لو ——— مرغیاں تھیں سو پرلی طرف ——— بلی سو رہی تھی، اپنے خاموش کتابیں سوئی لسوئی ——— مٹھو ——— وہ گھر پروں میں سر دبائے اونگھ رہا تھا۔

گھر ڈپٹی صاحب تیزی سے اٹھے۔ پہلے تو مرغیوں کے پیچھے خوب دوڑے، اتنا کہ سانس الٹ گئی۔ پھر جھاڑے کو پانی بھر کر کیاری

بھٹکنے لگے ——— اپنے ہاتھوں پر دونوں کو نچایا، پھولوں کو گھسا، پھر چٹکی کی شامت آگئی ——— اس کی دم پکڑ کر ایسے گھمیئے دیئے کہ وہ چلا گئی۔ سہیلیوں سے کہا ہیں جان کر گرانی شروع کر دیں ——— سارا گھر درہم برہم ہو گیا! ——— اکبدم وہ لپک کر مٹھو کے پاس پہنچے اور پنجرے کو زور سے جھنجھوڑ دیا ——— سہما سہما مٹھو بری طرح جاگ پڑا اور ڈپٹی صاحب کی صورت دیکھ کر چیخنے لگا ———

"پنکی فول ——— نیلم فول"

دونوں ہاتھوں سے پنجرے کی سلاخیں تھام لیں اور مٹھو کے کان میں چیخے ——— "بول ——— پیارا فول ——— پیارا فول ——— مٹھو نے گھبرا کر انھیں دیکھا اور پھر دونوں مل کر زور زور سے چلانے لگے

"پیارا فول ——— پیارا فول ———"

اور چپ چپ موتی ان کی آنکھوں سے نکل نکل کر داڑھی میں جذب ہونے لگے ———

موت کا کنواں

احمد سعید

پٹ پٹ پٹ پٹ پٹ پٹ پٹ پٹ۔ پھر پھر پھر پھر۔ موٹر سائیکل کی آواز آنی بند ہو گئی۔ تھرتھلیوں سے گونج اٹھا۔ اچھل کر موٹر سائیکل سوار نے چاروں اطراف جھک جھک کر تماشائیوں کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن اس کی ساتھی نوجوان لڑکی کنویں کے دروازے کی طرف سکوتی ہوئی نگاہ تیزی سے لپکی۔

کنویں کا دروازہ کھلا۔ لڑکی نے اس سے باہر نکلنے کے لئے پہلے جلدی سے قدم اٹھایا۔ جب وہ باہر آئی تو باپ نے نگران در کے فوراً سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور منہ ہی منہ میں کلام پاک سے کچھ پڑھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

لڑکی شرما کر باپ سے الگ ہو گئی۔ اس نے کھلی فضا میں جانے کی کوشش کرتے ہوئے دہرایا۔

"بابا! کیا دنیا میں فقط تمہاری لڑکی ہی ایسی ہے جو موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتی ہے کہ نہیں ہزار....."

"شیطان اگویا۔ اب آ مجھ سے بھی شرمانے لگی ہے۔ تو کوئی خاص بڑی تو نہیں ہو گئی۔" بڈھے نگران در نے اس سے چشم بددور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"خان! مجھے بھی کبھی ایک آدھ چونک مار دیا کرو۔" رائیڈنگ ماسٹر نے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے کون سا ایسا کام کیا ہے کہ میں تمہیں دھائی دوں۔" بوڑھے نے ماسٹر کی جانب دیکھے بغیر لڑکی کے ہمراہ باہر جاتے ہوئے آہستہ سے جملہ ادا کیا۔

"بھئی خان اب تمہاری لڑکی کے ساتھ جان ہو ناشرع ہو گیا ہے۔" اپنی برچھیں سنبھالتے ہوئے ماسٹر نے طنزاً فقرہ کسا۔ اور جلدی جلدی نیچے کے باہر نکل گیا۔ وہ نیک ہی نیت میں اپنی ساتھی لڑکی تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے میں سے شور اٹھا۔

الٰہ خاں ماسٹر دلنواز خاں مالک ہیبت ناک موت کا کنواں کا دوسرا شو مکمل ہو گیا تھا۔ اسے اس کنویں میں موٹر سائیکل چلاتے ہیں برس ہونے کو آئے تھے پہلے وہ تنگ بھائی بیسے والے کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل کے کرتب اس سے ہی سیکھے تھے۔ خدا بخشی اور محنت پسند ہونے کے باعث اس نے اپنے سیکھے ہوئے کھیلوں میں مہارت تامہ بہم کی تھیں جلد ہی اکیلا ہی کھیل دکھانے لگ گیا تھا۔ اس کی تمام تر انتھک جدوجہد کی بدولت تنگ بھائی نے اس سے ماسٹر دلنواز کے حصے کے پچاس روپے ہفتہ وار کے بجائے ساٹھ روپے ہفتہ وار کر دیئے تھے۔ وہ بھی اس محنت میں جب وہ اپنا خاص کھیل دکھاتا۔ اس نے تنگ بھائی سے الگ ہو کر اور اس نے پانچ برس میں اپنا خیمہ قائم کر لیا۔ اس نے نوجوان نگران در اور اس کی نابینا لڑکی کو تھری سٹار سرکس پارٹی سے حاصل کیا تھا۔ اب باپ بیٹی دونوں ماسٹر کے ملازم تھے۔

ماسٹر کے کنویں پر کام کرنے سے پہلے مس اختر مرے بی اختر کے نام میں "گھوڑے کی پشت پر مختلف کرتب" دکھایا کرتی تھی۔ بعد ازاں وہ ترقی کر کے شیر کے پنجرے تک پہنچ گئی۔ اس میں وہ ۔ شیر ببر ۔ ں کے درمیان کھڑے ہو کر کرتب دکھایا کرتی تھی۔ تاہم جس نے ماسٹر کے کھیل زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز بنا کر اس کی پیشکش منظور کر لی۔

چنانچہ اس طرح بے بی اختر پانچ برس تک ماسٹر دلنواز کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کنویں میں چکر لگاتی رہی اور کرتب دکھاتی رہی ۔۔۔ اس کے آگے بیٹھ کر وہ بعض اوقات دونوں ہاتھ چھوڑ دیا کرتی۔ بعض اوقات پیچھے بیٹھ کر تماشائیوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کیا کرتی۔ کبھی وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر ان کی طرف ہاتی ۔۔۔ غرض ماسٹر نڈر شاگرد اور گرو ماسٹر نے منع نہ کرنا تو وہ انتیس چکروں سے گھٹنے سے بھی صریح نہ کرتی۔

بے بی اختر کی عمر جوں جوں بڑی ہوتی گئی اور ماسٹر اور شاگرد موت کے کنویں کے چکر لگاتے رہے ماسٹر کو احتلاج قلب کا عارضہ ہو گیا

"ایسی تکلیف ہوا بازی اور موٹر سائیکل چلانے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ماسٹر اگر زندگی چاہتے ہو تو یہ کام بند کر دو" بہت سے ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا تھا۔

"ابھی چند ایک سال اور باقی ہیں۔ یہ لڑکی تیار ہو جائے گی تو میں کاریوال کا کام شروع کروں گا"

"تو پھر زیادہ کام نہ کرو"

"مناسب نائب کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے۔ اسسٹنٹ تو میرے پاس ایک ہے اسے ٹریننگ دے رہا ہوں۔ اس اثنا میں لڑکی بھی پختہ ہو جائے گی" ماسٹر نے مزید جواب دیا۔

اور وہ دن دور نہ تھا جب وہ اپنا کاریوال نام کرے گا ۔۔۔ وہ "اختر اصاس کیا باپ ۔۔۔ تم اس کے حصے دار ہوں گے۔ وہ زندگی کتنی پر اسن ہو گی اب تو وہ تماشائیوں کی تالیوں سے بھی اکتا گئی تھی لیکن اس کے خواب کو مستند تعبیر ہونے میں ابھی کچھ کسر باقی تھی۔

شو اور ہوا جانے کے باعث تماشائی تیزی کے ساتھ باہر آ کر کنے ہو گئے تھے۔ مس اختر باہر جا رہی تھی جب اس نے تیزی کے ساتھ باہر قدم رکھا تو ماسٹر کا دل زیادہ تیزی سے دھڑکنے لگا بادامی آنکھوں۔ خلد رحیم اور پتلی کمر والی۔ دراز قد سولہ برس کی مس اختر اس وقت برس کی چہری ہوئی شیرنی معلوم ہوتی تھی جب سے اس نے عہد شباب میں قدم رکھا تھا اس کی تنخواہ پانچ روپیہ روز سے دس روپیہ کر دی گئی تھی۔ وہ ہے وہ پاک کی برس کی شہرت یافتہ مس تارا کی طرح موت کے کنویں کا ستارہ بننا چاہتی تھی مس تارا پہلی ہندوستانی عورت تھی جس نے برس کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔

اختر نے ملک کے ہر گوشے کی سیر کی تھی۔ اس نے اپنے ناظرین کو اپنے حیرت انگیز کرتبوں سے دنگ کر دیا تھا۔ اور اب اس دن کے منتظر تھے جب وہ مس اختر بن کر ان کے علاقے کا سپر چکر لگائے گی۔ مس اختر جمعے کے باہر نصب کردہ پلیٹ فارم پر اپنے باپ کے ہمراہ بھی نمودار ہا کرتی تھی جہاں ماسٹر دلنواز اس کے رکھوالے کی حیثیت سے اس کے ہمراہ وہاں آیا کرتا تھا۔

حسب معمول آج بھی ماسٹر اپنے آرٹسٹ کی سکی پشت کے مطابق سوٹ اور اوور جیکٹ سے خاطر تواضع کرنا چاہتا تھا۔ وہ گھوڑیوں کو ہمیشہ تازہ دم رکھنے کے معاملوں میں سے اسے بہت اہمیت دیتا تھا۔

جمعے کے باہر ایک نصب کردہ سٹیج پر ایک پہلوان نما لڑکا بیاڈین کا لباس پہنے تالیاں بجا بجا کر یہ اعلان کر رہا تھا۔

"آیئے آیئے تماشہ دیکھئے۔ یہی والی مس اختر اور ماسٹر دلنواز کے سر پھیر دیکھئے۔ انھیں موت کے کنویں میں لٹ پٹ جوتے دیکھئے۔ انھیں موٹر سائیکل پر ہاتھ چھوڑتے دیکھئے۔ انھیں ہوا میں قلابازیاں لگاتے دیکھئے ....." اس کے ذہن میں جو کچھ آتا تھا وہ بکتا جاتا تھا۔

مکمل دسویں شو کے بعد جس اختر پر ہم نظر آتی تھی۔ مسٹر جب اس کے قریب آنا چاہتا تھا، وہ اس سے اتنی ہی زیادہ پرے ہٹتی جاتی تھی اضطراب کے باعث مسٹر اپنے چھوٹے چھوٹے کندھوں کو اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو سکیڑنے جا رہا تھا۔ وہ اپنی پتلی ناک اور باہر کو نکلے ہوئے دانتوں کو اپنے چوڑے چکلے رومال سے بار بار پونچھتے ہوئے مس اختر سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اس کی ناراضگی اور بے چینی کی کیا وجہ تھی۔ وہ یکلخت اس سے کیوں خفا ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے برعکس وہ اپنے آپ کو سکیڑے جا رہی تھی۔ وہ نڈر لڑکی اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا گویا ڈر اس کا غلام ہے اور وہ اسکی مالکن۔

اس کے جسم سے باہر نکلتے ہوئے اس کے باہر کی جانی پہچانی اسٹریٹوں کے قسم قسم کی مختلف تصاویر پر لیک اپنی ہوئی نگاہ ڈالی۔ ان میں اسے موٹر سائیکل پر مختلف کرتب کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ وہ بھی ایک اور میں کے روپ میں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک مس اختر کی جسمانی ڈھانچے کا تعلق تھا اس کے بال گھنگھریالے اور سنہری تھے۔ آنکھ کشادہ، رنگت سپید، جو بن بھرپور۔ لیکن BANNERS میں اسکی جو تصویریں زیادہ نمایاں دکھائی گئی تھیں وہ اس طرح کی ہوں گی۔ اور لوگوں کو بھی۔ ان سے وہ قیمت کے اعتبار سے مس نادھ کمائی دیتی تھی، جو موٹر سائیکل پر بیٹھی فضا میں اڑتی دکھائی دیتی تھی۔

اس کے برعکس مسٹر فواز بھی پہچانا نہیں جاتا تھا۔ گو درحقیقت وہ اپنے فطری لیکن اسے کافی زیادہ دکھایا گیا تھا اور شکل و صورت کے اعتبار سے بھی خوبصورت۔

ریٹائرڈن کے لباس میں ہونے کی وجہ سے اسٹریٹ پر بھد کتا پھرتا تھا۔ وہ تماشائیوں کو مذکورہ بالا BANNERS دکھاتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا جاتا تھا۔ اس اثنا میں جب اختر کرتب دکھانے کے لئے وہاں نمودار ہوتی اور پھر بھیڑ کے نزدیک اپنے حلقے میں چلی جاتی۔

اس روز بھی دسویں شو کے بعد مسٹر کو باپ اور بیٹی کا روپ پسند آیا۔ ہاں اس روز وہ کسی عورت کو نہیں خفا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اب مس اختر موٹر سائیکل اور بوٹ کے کوس کا جوڑا نیفک بن گئی تھی۔

جب اس روز دسویں شو کو اچھوڑ کر مس اختر خیمے سے باہر نکلی تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جیسے وہ شرم کے مارے پانی پانی ہو رہی تھی حالانکہ جمعہ سٹرک کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں ہلاتے تھے تو اس کی انگلیاں بند ہونے سے ٹوٹ گئے تھے۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے ہاتھ سے دو گیند پھسل گئے ہوں۔ اگرچہ اس وقت اپنے سب تماشائی موت کا کنوں حقیقت میں منتقل ہو جاتا۔ اس وقت انفلاٹ ایبل BANNERS میں اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ لیکن اس کی تہہ کے اندر دبکے ہوئے کودنوں کو سنبھالنا کس قدر مشکل تھا۔

ایک سیکنڈ کے لئے موٹر سائیکل کو جھٹکا لگا۔

کوئی کے دروازے پر کھڑا گارڈ یکدم چلانے کی طرف لپکا۔

"ہا" تماشائیوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"خدایا رحم!" بوڑھا چلایا

دو ایک جھٹکے کے بعد مس اختر نے سر کو نیچے لٹکانے کے لئے کہا

"کیا بات ہے؟"

"کیا ہوا ہے؟"

"اوہ!"

"اوہ!"

تماشائیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ تالیاں کچھ کم گئیں۔ اس وقت اسٹیج پر جی چاہا کہ اس اختر کو شانوں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑ دے۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟"

لیکن اس کا ہاتھ رکے بغیر اور جلدی سے باپ کے سینے سے جدا ہوتے ہوئے وہ ایک ہی جست میں اپنے خیمے تک پہنچ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"کیا شو ختم ہو گیا؟"

"بھاپ ہضم؟"

خیمے میں سے تماشائیوں کی مزید آوازیں سنائی دیں۔

عقب میں اسٹیج پر بس اختر سے پوچھنے کے لئے اس کا القاب کہ ہاتھ کس نے تھپتھپا کر گیس منقطع کر دیا تھا۔

"اسٹرم جاؤ اور دوسرا گیس سلنڈر لے کر آؤ۔ میں جا کر پتا کرتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے؟" جیسے ہی وہ اسٹیج پر نوارد خیمے کے باہر نکلے اور اپنے اسسٹنٹ کو اندر بھیج کر اپنی جگہ پر آنے کے لئے ہدایتیں دیتے ہوئے جا رہا تھا کہ کسی کی کبھی وہ بھی تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ چونکہ وہ ابھی زیر تربیت تھا تماشائی اس کے کام سے لطف اندوز ہوتے۔ اس کے پیشِ نظر وہ اسٹرم اور نوارد بابس اختر کے لئے مطالبہ کرتے۔

"مس اختر! مس اختر!" "اسٹرم! اسٹرم!" مس اختر کے یکدم خیمے سے باہر چلے جانے اور اسٹرم کے اس کی جگہ پر آ جانے کے بعد تماشائی چلائے۔

مطالبہ سنکر اسٹرم مس اختر کے خیمے کی طرف دوبارہ لپکا۔

"اختر! اختر! سنو تم نے حد کر دی۔ تمہارے جاری عورت خاک میں ملا دی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا..... میں۔ میں..." اس نے اسکے پیچھے جا پردہ گرا نہ جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"باہر رہو۔ اندر سے جواب آیا۔ میں کپڑے بدل رہی ہوں۔"

خیمے کے باہر سے موٹر سائیکل چلنے کی آواز آئی۔ یہ حسب معمول شو شروع ہونے سے پہلے چلایا جاتا۔

خواتین و حضرات! آپ دیکھیں گے۔ موٹر سائیکل اسٹار مس اختر اور نوجوان موٹر سائیکل اسٹرم نوارد کے کرتب دیکھئے۔ موت کے کنویں کے اندر KISSING پیار بازی دیکھئے۔ آپ اس کو دیکھ کر خوف سے سن ہی بھول جائیں گے۔ کنواں شہر میں صرف دو تین روز رہے گا۔ یہ آخری موقع ہے کہ آپ یہ کرتب دیکھنے کی آرزو لے کر ہاتھ جھاڑ کر اٹھیں۔ ایک BANNER دکھایا گیا جس پر اسٹرم نوارد اور مس اختر کو موٹر سائیکل پر ایک دوسرے کو چومتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ کمپنی کے پبلسٹی منیجر کی حیثیت سے اس نے BANNER کے داخلی دروازے کے قریب ہی لگوا دیا تھا۔

"KISSING! KISSING!" جب اسٹرم اپنے اسسٹنٹ کو کنویں میں اسکی جگہ تمام کرنے کی ہدایت دے رہا تھا تو وہ یہ الفاظ سنکر چونک پڑا۔

"یہ کیا بے ہودہ باتیں کر رہے ہو؟"

"جناب۔۔ جناب۔ پبلسٹی کا کرتب! اور۔۔۔ اور۔۔"

"بکو مت!"

"خدا کرے۔"

"یہ خرافات بند کرو۔ ہم پبلک کو اس طرح دھوکہ نہیں دے سکتے۔"

"کوئی کھیل اس کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"وہ تصویر اتار دو۔" ماسٹر نے بوڑھی کو گدی سے پکڑ کر اسٹیج پر سے اٹھا کر تصویر کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا

اس عرصے میں بچے کے اندر سے ایک غوغا اٹھا۔

"ہمیں ایسا چھوکرے کا کھیل نہیں چاہیئے۔"

"ماسٹر کو بلاؤ۔"

"ماسٹر کو بلاؤ۔"

جواب میں ماسٹر باہر سے موٹر سائیکل پر آ بیٹھا۔

"پبلک سے کہہ دو آج کھیل نہیں ہوگا۔ وہ پیسے واپس لے لیں یا تو کسی دن پھر دیکھ لیں۔ آج ہمارے آرٹسٹ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے بچوڑے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"KISSING SHOW"

"KISSING"

"KISSING"

بچے کے اندر سے بچے اٹھنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"ان سے کچھ نا ممکن ہے نا ممکن۔ انھیں دھوکہ دیا گیا ہے۔"

"دھوکا"

"بچی کا علاج تماشائیوں کو خاموش کرانے کے لئے اندر گیا۔

ماسٹر چبوترے سے نیچے اتر آیا اور اپنے پرائیویٹ کمرے میں چلا گیا۔ اتنے میں اپنے نئے آرٹسٹ کو اس نے بتایا کہ اس اختر اور اس کا باپ کہیں چلے گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر ماسٹر کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے اور دل بیٹھ گیا۔ بچوڑے پر جھک کر اور اس کا سہارا لیتے ہوئے ماسٹر بمشکل اٹھا اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے باہر نکل کر تماشائیوں کو بتایا کہ وہ اگر اس کے شاگرد کا کھیل نہیں دیکھنا چاہتے تو وہ چند روز کے لئے اپنے ٹکٹ سنبھال کر رکھیں اور نئے شو کے اعلان کا انتظار کریں۔

"بات ہوئی نا"

"اڑیا اب چلیے۔ دراصل آج کا کھیل تو ہم نے نصف سے زیادہ دیکھ لیا ہے۔ اس لئے نکل بھی دیکھ لیں گے۔"

کچھ دیر بعد پولیس ٹرک آیا۔ اس نے ماسٹر کو اطلاع دی کہ اس کا ایسسٹنٹ اور موٹر سائیکل دونوں غائب ہیں۔ اس کے پیش نظر اس نے تجویز پیش کی کہ پولیس ہیڈ آفس کے خلاف رپٹ درج کرا دی جائے۔ لیکن ماسٹر نہ مانا۔

"مجھے شک ہے اس میں ضرور کچھ کالا کالا ہے۔" یہ کہتے انھیں غلط سمجھا۔ ماسٹر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

اس وقت اس کاشانگی میں اختر کے ساتھ نشاط ماحول میں بیٹھا اپنے گناہ شروع کرنے کا پروگرام مرتب کر رہا تھا۔

"میں نے ہر چیز کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"اگر تم نہ کرتے تو کون کرتے بھلا!" اختر نے جواب دیا

باہر خان بابا، اختر کا باپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن بیٹا، مسٹر کی تم کا حصہ دار نہیں! مسٹر نے بھی ہمیں کچھ سے اس شرط پر اکھاڑا تھا کہ وہ مجھے اپنا حصہ دار بنائے گا۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ ہم پہلے سے ہر چیز کی نکمت پڑھت کر لیں اور تم بنک میں ہمارے نام حساب کھلوا دو۔ زنگی کا کام کرے گی ..... تم بندوبست کرو۔"

"منظور! منظور!! بابا!! تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ معلوم تم نے کرتب کہاں سے سیکھا!" لیسنٹ نے جواب دیا۔

اس اختر نے باپ کے جانے کے بعد اسے یوں انگیز ہو گئی جیسے اس سے کبھی جدا نہ ہو گی۔ تب وہ منظور کھنے میں آیا جو لوگ نے BANNER پر جو یا تھا۔

تین روز بعد مسٹر دلنواز آفس بیٹھے کے آخری خاص کرتب دکھانے کے لئے شہر میں جگہ جگہ اشتہار لگ گئے۔ وہ کھیل پندرہ بیس بعد دکھایا تھا اس میں وہ بنک کے ریگ گھوڑے پر سوار ہو کر شریک ہوا تھا۔ اس میں بڑا بہت گنجائش تھا!

اس نے ایک گھوڑے کے لئے خیمہ لگا دیا اور شرکاء کا ٹکٹ چار گنا بڑھا دیا۔ چار آنے کی بجائے ایک روپیہ اور اعلیٰ درجوں کے نرخ اسی نسبت سے بڑھا دیئے گئے۔ شو کے لئے بجے رات کا وقت مقرر کیا گیا۔

آخر وہ وقت آ پہنچا۔

خیمے میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔

ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین! غیر متوقع طور پر گھنٹی بج اٹھی۔

شو کی تیاں گل کر دی گئیں ... صرف کنویں کو منور رکھا گیا۔

سفید لباس پہنے مسٹر دلنواز جگر میں نمودار ہوا۔

خیمہ استقبالیہ تالیوں سے گونج اٹھا۔

مسٹر نے جھک کر تماشائیوں کا شکریہ ادا کیا۔

تماشائی فقط نظارہ نفس روکے بیٹھے تھے۔ ان میں وہ بھی شامل تھے جنہوں نے چند روز قبل اس کا کھل شو دیکھا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔

مسٹر دلنواز نے آہستہ آہستہ کنویں کے چکر کاٹنے شروع کئے۔ دائیں بائیں، اوپر نیچے، سیدھا الٹا ہو کر۔ تب اچانک ہاتھ چھوڑ کر۔ وہ دس منٹ تک کنویں کے چکر لگاتا رہا۔ ہر کرتب پر تالیاں بجیں۔ مسٹر دلنواز نے ہاتھ اٹھا کر شکریہ ادا کیا۔ منور کنویں کے علاوہ تمام خیمہ تاریکی میں مستغرق تھا۔ اس میں تیزی سے گھومتے ہوئے موٹر سائیکل کے سبک نقرئی سائے تماشائیوں پر پڑتے اور غائب ہو جاتے۔ نمودار ہوتے اور غائب ہو جاتے۔ رفتار بڑھتی گئی۔

"لیڈیز!"

"بہت خوب!"

"واہ!"

"واہ!"

"کمال ہے"

"حیرت انگیز ہے"

نیچے میں سے آوازیں آتی سنائی دیں۔

پھر اچانک کسی نے نیچے کے کسی کونے میں سے فضا میں نوٹ اچھالے۔ اس پر تمام اطراف سے نوٹوں کی بارش شروع ہو گئی۔

"آگے شو کے لئے بھی کچھ سنبھال رکھو!"

خیمہ ایک دم ہنس پڑا۔

تب موعود کرتب شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔

ذرا سے پنجرے میں درجنوں کے حساب سے دوڑوں کے اردگرد مٹی کے تیل میں بھیگی ہوئی دھجیاں لپیٹ دی گئیں۔ پنجرے میں سیڑھی رکھے جانے کا انتظار کئے بغیر وہ اس کی دو نچلی پتریاں پکڑ کر اوپر چڑھ گیا۔ اس نے ماسٹر کی ہدایت کے مطابق مخصوص فاصلوں پر رکھے ہوئے سب کیئے۔ پھر ماسٹر سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے مناسب طرح سے مضبوطی سے باندھ دیا اور آگ لگا دی۔

اس نے نیچے اتر کر پہلے پنجرے کی نچلی زمین کو چھوا۔ پھر اپنی انگلیوں کے پوروں کا بوسہ لیا اور بجلی کی طرح سائیکل پر بیٹھ گیا۔

اس نے ایک بار اپنے اردگرد اور تماشبین دائروں کی طرف اچٹتی نگاہ ڈالی۔

اس نے انجن چلایا اور پل جھپکنے میں یہ جا وہ جا۔ ایک ـــ دو ـــ تین!

اس نے پہلے تو پنجرے کے آگے ترچھے نادیوں کے چکر کاٹے۔

پھر کسی بار مڑنے پر وہ تماشبین دائرے میں سے غائب ہو گیا۔

خیمہ تالیوں سے ایک منٹ تک تالیوں گونج اٹھا۔

"یا علی!" ایک طرف سے آواز آئی۔ اور نوٹوں اور روپوں پیسوں کی بارش شروع ہو گئی۔

چاروں طرف دھماکے نوٹ تیرتے دکھائی دیئے۔ جو پنجرے تک نہ پہنچ پاتے دھاگے سے لٹکا کر کھینچ لئے جاتے۔ ہر جگہ کاغذ ہی کاغذ تھا ـــ نوٹ اور پیسے اکٹھے ہوتے چلے گئے۔ لیکن بونا اور بچہ اس وقت تماشا دیکھنے میں مشغول تھے۔ اس لئے کہ دوسرے افراد انہیں کھینچے چلے گئے۔

اس اثنا میں پنجرہ میں ایک شعلہ اٹھتا دکھائی دیا اور اس کے ساتھ ایک دھماکے کی آواز سنائی دی ـــ موٹر سائیکل کو آگ لگ گئی تھی۔ تاہم ماسٹر گولیوں کے چکر کاٹتا رہا۔

ایک دو مرتبہ تالیاں گونج اٹھیں۔

تب کسی طرف سے ایک انسانی چیخ آتی سنائی دی۔

"ماسٹر!" یہ لڑکی کی آواز تھی۔

رھاسٹر کے وہ کرتب دیکھے آئی تھی جو اس نے نہ تو کسی کو سکھایا تھا اور نہ ہی مت ہوئی کسی کو دکھایا تھا۔ شعلہ ایک پل میں نیچے تڑپتے ہوئے

پانی تک اس کی لپیٹ میں تھا۔ تماشیوں میں کی آواز!

"آگ بجھاؤ!"

"آگ بجھاؤ!"

"پانی!"

"پانی!"

تماشائی جہاں سے پانی لے سکتے تھے وہ پنجرے کے اندر پھینکنے لگے..... یا اتفاق سے پنجرہ اصطبل کے پاس رکھا تھا۔ اس گھبراہٹ میں چند لوگوں نے ماشکیں اٹھا اٹھا کر پھینکنی شروع کیں

"آگ بجھاؤ!"

"نہیں بجھنے دو!" ماشکی پنجرے کے اندر سے آواز دی۔

اسے بچانے کے لئے پنجرے کے اندر دانہ گندم گرایا گیا۔ جب اسے بڑی مشکل سے تو گروگ اس کے اندر داخل ہوئے تو انھوں نے ماشکی کو ایک طرف پڑا پایا۔

موت کا کھیل سے اپنے تئیں اس کا دل بند ہو گیا تھا۔

"اگر اس کے دل کی حرکت بند نہ ہوتی تو وہ ضرور بچ جاتا۔" اس کے علاج نے کہا۔

———

جیجا بھائی

احمد شریف

پھپھی کے پیس کھلے بھر کیسے گفتگو کا موضوع بن گئی۔ پھر جیجا بھائی کی ہیٹ آپ ہی بھی کہ محلے کی کسی عورت کے دل میں اگر جھولے سے بھی پرائے مرد کا خیال آجاتا تو اس تک کی خبر وہاں پہنچ جاتی۔ میں جس وقت وہاں پہنچا، ضیاء پہلے ہونٹ پر انگلی رکھے ہوئے ہوئے باجی عنایت کی تصویر بنا کہہ رہا تھا۔

"ہائے فی فاکوں نے بے چاری کو چار حرفوں کی مار ماری۔ دیکھو تو بھلا اس غریب نے کیا ہی کیا تھا؟"

"ہاں ہاں اس بے چاری نے کیا ہی کیا تھا ــــ بس ذرا علی احمد کے ساتھ بھاگ ہی تو گئی تھی۔"

ضمیر نے بڑی سادگی سے کہا۔ جیسے اسے چھپانا اور باجی عنایت والوں سے ہمدردی ہو۔ یار لوگ اس کی سادگی پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں دانت نکالنے کے ایک طرف جو اخبار کرانہ جا بیٹھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد پتہ چلا کہ دوپہر کو جو کچھ محلے میں ہوا تھا۔ ضیاء اس کی تفصیل دیکھنے والوں کی زبانی سنا رہا تھا۔

"یہ جیسں وقت سے ہار پڑی گی کی ساری عورتیں چھت پر کھڑی ان کے صحن میں جھانک رہی تھیں۔"

نذر نے دل کتے کہ جھٹکا یا اور ضیاء کی داستان میں کچھ کمی محسوس کر کے اس نے بھی اپنی معلومات کا اظہار ضروری سمجھا۔ جیجا بھائی جو تکیہ اٹھنے کے سہارے لیٹا ہوا تھا، سیدھا ہو کر اٹھا اور پوچھنے لگا۔

"کس کو مار پڑی؟"

ضیاء نے اپنی لمبی ناک سہلائی اور گرد بیٹھے بیٹھنے والوں پر اس خیال سے نگاہ ڈالی کہ شاید کوئی جیجا بھائی کے سوال کا جواب دے مگر جب سب خاموش رہے تو اس نے گھما کر کہا۔

"جیجا کو"

"وہ کیوں؟"

"تمہیں پتہ تو ہے جس رات پیس والوں کے ہاں مولود شریف تھا، وہ علی احمد کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

"وہ تو پتہ ہے ــــ جب کوئی اور عصمت باقی نہیں رہتی تو دل والے یہی کیا کرتے تھے ــــ عقاب اسے اٹھا کیسے پڑی؟"

"آج دوپہر جو کچھ محلے میں ہوا تھا، تمہیں نہیں معلوم؟"

"نہیں تو، تم ہی لوگوں نے تو آکر جگایا ہے مجھے، میں تو دو پہر سے پڑا سو رہا تھا۔"

"تو پھر میرے سنو۔ یہ سارے واقعہ کا عینی گواہ ہے۔"

عنایہ سیلنگیہ اپنی طرف کھینچ کر اس کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ منیر نے اپنے اوپر خواہ مخواہ کے بزرگی کا احساس طاری کر لیا اور کسی داستان گو کے انداز میں محفل کا جائزہ لے کر کہنے لگا:

"آج صبح اسلم اور چچا جیم چھپا کو لینے علی احمد کے ہاں گئے تھے۔ سنا ہے کہ وہاں بھی بہت جھگڑا فساد ہوا۔ جب وہ اسے لے کر آئے تو میں دکان پر کھڑا تھا۔ گل کی نظریں اس نے ہتھکڑ کو پایا۔ جب چھپا کو بازو سے پکڑ کر اتارنے لگے تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ بس اسلم ہوٹل کے ساتھ والے نالے میں اندھا پڑا تھا اور چھپا چلا چلا کر تانگے والے سے کہہ رہی تھی۔ تانگے والے اللہ کے واسطے تانگہ دوڑا دے، میں ان ظالموں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا!"

میں نے حیران ہو کر جاوید اس کی بات کاٹ دی۔ دراصل واقعہ کے اس حصہ کا مجھے علم نہیں تھا۔ لیکن میں ایک دم سہم کر تن گوش ہو کر بیٹھ گیا اور سننے لگا۔

منیر افغان نے چھپے اسلم کے لات ماری تھی۔ چچا جیم چھپا کو چھوڑ کر اسلم کو سنبھالنے دوڑے اور پھر باپ بیٹے نے مل کر چھپا کو جوتا تانگے سے گھسیٹا ہے تو گھسیٹتے گھسیٹتے گھر تک لے گئے اور اندر لے جا کے تھا شما شا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

جیما بھائی بڑے اداس لہجے میں بولا۔ اس نے اٹھ کر کمبل کی تہہ لگا دی اور جوتا پہن کر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ اس کے یوں چپکے سے اٹھ کر چلے جانے سے محفل کو دھچکا سا لگنا پڑ گیا۔

کئی برس ہوئے وہ ہمارے محلے کی اس چھوٹی سی مسجد میں آکر آباد ہوا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں دو محلے والوں میں اس طرح گھل مل گیا کہ اب وہاں رات گئے تک شطرنج جمتی تھی۔ وہاں آنے جانے والے سب ہی جانتے تھے اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اور اگر کوئی تھا بھی تو اب عرت اس کی یاد باقی تھی۔

دوسروں کا غم اپنا پسینے کی طرح عادت تھی۔ محبت کے ناکام اور ادھورے قصے سن کر وہ ٹھنڈا سا ہو جاتا۔ آنکھیں ڈبڈبا آتیں اور وہ پلکوں پر لڑھکتے ہوئے آنسو کو ایک انگلی پر سنبھال کر پرے جھٹک دیتا۔ پھر دھوتی کے چوڑے زردوزے تاک صاف کر کے اپنے مخنی سے جسم کو تکیے پر جھکا کر کہتا۔

"محبت میں قسمت والے ہی سرخرو ہوتے ہیں۔"

اس وقت اگر کہیں شادو کا ذکر چھڑ جاتا تو رات گذرنے کا پتہ بھی نہ چلتا۔ شادو کی یاد اس کا سرمایہ تھی اور اب تو اسے غم بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں تھی۔

جیما بھائی کے جانے کے بعد منیر نے مضمحل سے انداز میں چرس کی اپنے قریب کھسکائی اور اس پر شطرنج کی بساط بچھانے لگا۔ مظہر نے چرس کی ایک طرف ہٹا دی اور میز سے بچے میں بولا۔

"ہٹاؤ یار۔ آگے بڑھائے" خواہ مخواہ کو بانسری بجائے۔ آج بھی کوئی شطرنج کھیلنے کا دن ہے۔ اس وقت تو وہاں مار مار کر رکھنے کو جی چاہتا ہے"

"اچھا تو شروع ہو جاؤ؟"

منیر نے ہنس کر ہتھیار ڈالنے پر آمادگی ظاہر کی۔

"ابے تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔ اس بے چاری کی ہڈیاں سرمہ ہو گئی ہوں گی"

اور محض پرنالہ گھڑ کر اسی بھاگی۔ وہاں کرن ایسا تھا جس نے دل ہی دل میں چھیا کی تمنا نہیں کی تھی۔ میرے اور اس کے گھروں کی چھتوں کے درمیان آدھ ہاتھ کی دوری ایک دیوار حائل تھی جس کی اوٹ میں بیٹھ کر میں نے چھپ چھپ کر سے کئی بار مجاز کا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں دھوپ میں بیٹھی، در گڑ شیرنے کر کچھ بنتی رہتی۔ جب تمانت کی وجہ سے اس کے رخسار تمتما اٹھتے اور پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھیل جاتیں تو وہ پڑھی سرکو دیوار کے قریب ہو جاتی اور ہمارے درمیان صرف دیوار کا فاصلہ رہ جاتا۔ اس وقت میرا دل چاہتا اس کو آہستہ سے پکار دوں۔ چھیا۔ مگر دل کی زور سے دھڑکن کہیں گھبرا جاتا اور اس کے جنبش کرتے گورے گورے ہاتھوں کو دیکھ کر رہ جاتا۔ اسے ان تنکے توڑنے میں بڑی لذت تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال بھی آتا یوں پرائی لڑکی کو کچا کھا جانا بڑی زبیل حرکت ہے۔ گرہ جانے کیوں مجھے ان دنوں یہ ذلت بھی گوارا تھی۔ اور جب میں نے اپنا وہ کیا کر دل مضبوط کر کے کسی وقت چھیا سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا وہ بھی احمد کے ساتھ بھاگ گئی۔

رات گئے تک ہم اپنی گم سم سے بیٹھے رہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی پیارا کھو گیا ہو۔ چھیا بھائی بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ آخر میں وہاں سے اٹھ کر گھر کی راہ لی۔ چھیا کے گھر کے قریب سے گزرا تو ایک بیری نگاہ کھل کھڑکی پر پڑی۔ دالان میں چھیا بھائی پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ چارپائی اور اسم بھی سوگوار سے اس کے پاس بیٹھے تھے۔ چھیا کی ماں دروازے میں ذرا سی جھری کئے انہیں تاک رہی تھی۔ چھیا بھائی نے دھوتی میں زور زور سے ناک صاف کر کے اپنے منحنی سے جسم کو آگے پیچھے جھلایا تو میں تنگے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے بعد کئی ہفتے اس بیٹھک میں چھیا بھائی کا تذکرہ ہوتا رہا۔ مگر چھیا بھائی کبھی نہ بیٹھا۔ ہاں میں نے دو چار خط ہوئے والے واقعات نے چھیا کو صحیح معنی میں گئی حقیقت بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے گرد ایک خول سا چڑھا لیا جس سے باہر جھانکتے سے ڈر محسوس ہوتا۔ اس کے بدلے ہوئے رویے سے سب کے طبیعت پر اداسی سی پڑنے لگی۔ مگر ایک روز عشا کے وقت بیٹھے بیٹھے جیسے نیلے کو آگ لگ گئی۔ ہم سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا

"تم سب بے غیرت ہو"

اس کی بڑھکائی پر مجھے بہت تاؤ آیا۔ دل پہلے ہی کچھا ہوا تھا۔ میں نے برافروختہ ہو کر پوچھا

"اور تم؟"

"میں بھی تو تم ہی میں سے ہوں"

"میں نادم ہو کر نہ ہو سکتا ہو" منیر نے پوچھا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"مجھ سے پوچھتے ہو!۔۔۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ ہمارے محلے کی لڑکی تو بھاگ بھاگ جائے اور ہم سینہ تان کر پھرتے رہیں

صحت ہے ہم سب پر؟"

نذر نے آگے کھسک کر کنکھا جھٹکا یا۔ آنکھیں جھپکا کر باری باری صورتوں کا جائزہ لیا اور پھر پوچھنے لگا۔

"تو پھر ہم کیا کریں؟"

"ارے ہم مرگئے ہیں کیا؟"

ضیاء نے کچھ دیر لے انداز سے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔ بھلا ہمارے مرنے یا جینے سے کیا ہوتا تھا۔ جیسا کی حالت سے آرہے ساما محلہ مرجاتا۔ وہ کسی کو منہ لگانے کو تیار نہیں تھی اور ادھر مروانگی کے جوش نے آپے سے باہر کر رکھا تھا۔ لیکن نذر نے اور بھی چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ کہنے لگا۔

"وہ ہمارے بس چڑھنے کی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں آزما چکا ہوں۔"

نذر نے بڑی معصومیت سے کہا اور گردن جھکالی۔ ہم سب کھسک کے اس کے قریب ہو گئے۔ سب ہی کو تفصیل معلوم کرنے کا اشتیاق تھا۔ ہمارے استفسار پر وہ شرما کر بولا۔

"ارے کچھ نہیں ۔۔۔ پرسوں وہ گڑگئی کی۔ اماں کے یہاں مرغیوں پر لے آئی تھی۔ واپسی پر جب بڑی ڈیوڑھی سے گذرنے لگی تو میں نے سوچا لاؤ ذرا اسے دیکھ ہی لیں۔ گروہ تو ساری حوالی کی طرح نیکل گئی میں پیچھے گئی۔ اور بھی گالیاں دینے ۔۔۔ حرامزادہ دیکھیے ۔۔۔ اور میں کھسیانی سے وہاں سے کھسک آیا۔"

"اچھا ۔۔۔ تب تو اس کا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

ضیاء نے سر ہلا کر کچھ کر گزرنے والے انداز میں کہا۔ لیکن حسیبا بھائی جو کافی دیر سے گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھا تھا۔ ایکدم برس پڑا۔

"بے شرمو! کچھ شرم کرو۔ سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کے گھر والے اس کے بیاہ کی فکر میں ہیں۔ اگر تمہاری باتیں کسی نے سن لیں تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔"

اس کی ڈانٹ سن کر سب خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر وہاں مٹیا گرب نے باری باری کھسک جانے میں ہی مصلحت سمجھی۔

ایک روز نہ جانے کہاں سے حسیبا بھائی کو شاید کے پتا سے آنے کی خبر ملی۔ وہ اسے دیکھنے کیلئے بے چین تھا۔ اس نے صبح سے دو سپرنگ میرے گھر کے تین چکر لگائے۔ مگر کرایہ کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ دو یہ بھی کہ جینے کے آخری دن تھے۔ اس کی بے قراری دیکھ کر میں نے اور ضیاء نے مل کر اس روپوں کا انتظام کیا اور اس کے منع کرنے کے باوجود اسے گاڑی پر بٹھانے اسٹیشن تک اس کے ساتھ گئے۔ گاڑی چھوٹنے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ اس نے کھڑکی سے سر نکالا اور جاتی مجھے دے کر کہنے لگا۔

"یہ لو چاول اور چل کر ٹھیک کھولو۔ ورنہ حرامزادہ بند دیکھ کر لوگ شک کریں گے۔"

"گاڑی چل جائے تو ہم بھی چلے جائیں گے۔"

ضیاء نے دانہ ڈبے سے انگلیاں ہٹا کر کھڑکی کے قریب کھسکتے ہوئے کہا۔ جس پر وہ جلدی سے بولا۔

"اسے تمہارے چلے جانے سے گاڑی راستہ تھوڑا ہی بھول جائے گی۔ تم لوگ جاؤ۔"
اور وہ کھڑکی سے ہٹ کر اندر جا بیٹھا۔

ہم پھر تے پھراتے ٹھیک پہنچے تو نذر ارجمند کے آگے تھڑے پر بیٹھا بے سری آواز میں گنگنا رہا تھا ہم دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھے۔ بادشاہ اور وزیر کو امور سلطنت سنبھالے کئی روز گذر چکے تھے۔ بساط بچھا کر میں اور نذر شطرنج کھیلنے بیٹھ گئے۔ ضیا ٹانگیں پھیلا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ ابھی پہلی بازی ہی جمی ہوئی تھی کہ ضمیر آگیا اور آتے ہی ضیاء سے مخاطب ہو کر بولا۔

"چوڑے ہو کر بڑے مزے لے رہے ہو یہاں۔ پتہ بھی ہے محلے میں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہونے دو جو کچھ ہو رہا ہے، اپنے کو کوئی دلچسپی نہیں۔"

ضیا نے اسی طرح لیٹے لیٹے بے پروائی سے جواب دیا۔ ضمیر آگے بڑھ کر پلنگ کی پائینتی جا بیٹھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور لاپرواہی سے کہا جیسے کسی سے بھی مخاطب نہ ہو۔

"کوئی اب بھی ملنے آتا ہے؟"

"ہیں۔ اب بھی ملنے آتا ہے۔ ارے نہیں یار۔"

ضیا اس طرح اچھلا جیسے پلنگ میں آگ لگ گئی ہو۔ بادشاہ اور وزیر دھڑے کے دھرے رہ گئے۔ نذر نے چوکی ایک طرف کھسکا کر اپنے گھٹنے کو بڑے زور سے جھٹکا دیا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔

"اڑے سچ سچ بتاؤ، کیوں دل جلی کر رہے ہو؟"

ضیا نے بڑی انکساری سے کہا اور آگے کھسک کر ضمیر کا شانہ ہلانے لگا۔ ضمیر نے اس کا ہاتھ الگ ہٹا کر کہا۔

"تم خدا کی سچ کہہ رہا ہوں۔ ان کے مکان کے پچھواڑے احاطہ ہے نا جس کی دیوار میرے قد کے برابر ہے وہاں ہو کر تڑکے اسے ملنے جاتی ہے۔"

اچانک ضیا نے بھینچ کر اپنے منہ پر ایک تھپڑ مارا جیسے سب کچھ اسی کی وجہ سے ہو رہا ہو اور خود کو گالیاں دینے لگا۔

"تف ہے تیرے منہ، اتر کے بچے۔۔۔ تف ہے تیری زندگانی پر ضیاء الرحمٰن۔"

ہم سب ہنسنے لگے تو وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"تم لوگوں سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ تم سب نامرد ہو۔ میں اکیلا ہی اسے اٹھا لاؤں گا۔"

اور پھر سر جوڑ کر چھیا کو اٹھانے کا منصوبہ بننے لگا۔ میں نے بے چین سا ہو کر پہلو بدلا۔۔۔ میں نے چھیا کو چاہا تھا۔ اس کی تمنا کی تھی۔ اس طرح اس کی رسوائی مجھے گوارا نہ تھی۔ میں نے انھیں اس حرکت سے باز رکھنے کے خیال سے کہا۔

"اگر کسی کو پتہ چل گیا تو بدنام ہو جائیں گے۔"

"ارے تو ہم کون سا شریف زادی کو اٹھانے جا رہے ہیں۔ اس نے غیر مرد کے پاس ہی تو جانا ہے۔ وہاں نہ گئی یہاں آ گئی۔"

میں ضیا کی ڈانٹ سن کر چپ ہو رہا۔ اتنے میں نذر نے پوچھا۔

"اسے اٹھا کر لائیں گے کہاں؟"

"یہیں ۔۔۔ اس خیمے میں؟"

"اور جیسا بھائی؟"

"جیسو بھائی گیا اپنی بیوی کے پاس پشاور۔"

ضیا نے بے پروائی سے تبصرہ کیا۔ نذر نے کچھ سوچ کر بکیا اپنی طرف کھینچا اور اونی ٹوپی آنکھوں پر سرکا کر لیٹ گیا۔ میں اس موقع میں حصہ لینا نہیں چاہتا تھا، مگر جب میں گھر آنے لگا۔ تو سب نے مل کر زبردستی مجھے روک لیا۔

رات ڈھلے جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، ہم جیسا کے مکان کے کچے احاطے میں بچھے بیٹھے تھے۔ اندھیری رات میں ستاروں کی مدھم روشنی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ نذر کٹے ہوئے پرکھل ڈالے دیوار کے قریب مورچہ سنبھالے بیٹھا تھا۔ ضیا، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس کے پاس جاتا، اور اس کا کندھا تھپتھپا کر واپس آجاتا۔ میں ایک طرف چپ چاپ بیٹھا، سردی کی وجہ سے میرا انگ انگ کانپ رہا تھا۔ منیر بھی ہم سایہ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کچھ ایسی بات ہو جائے کہ جماندار کے یکسانی طرح بیکار گی سرما ہو جائے اور ویران گلیوں کا سکوت ٹوٹ جائے۔

بیٹھے بیٹھے اکرم نے سگریٹ سلگانے کیلئے ماچس جلائی۔ لیکن ضیا نے لپک کر جلتی ہوئی ماچس کو ہاتھ مار کر بجھا دیا، اور غصہ ہو کر جیسی آواز میں بولا۔

"ابے سب کو نذر کرائے گا کیا؟"

اتنے میں میری نظر دور پر پڑی۔ ایک سایہ سا لہرایا اور نذر نے لپک کر جیسا کو بوتری کو کر لیا۔ اس کا جاندار سایہ اس طرح کمبل میں لپٹ گیا کہ بے چاری آواز تک نہ نکال سکی ۔۔۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ وہ دو ٹرک پیچھے گزر گیا جس کے نہ گزرنے کی میں نے دل ہی دل میں دعائیں مانگی تھیں۔ نذر اسے کندھے پر ڈالے تیز تیز قدم اٹھاتا احاطے سے نکل گیا اور میں تھوڑی دیر تک اس جگہ سے ہل بھی نہ سکا جہاں کانپی روح سے گھٹنے پیٹ سے لگائے بیٹھا تھا۔

اندھیری گلیوں میں ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے میرے ذہن میں ایک ہی خیال گونج رہا تھا ۔۔۔ جیسا کے ہاتھوں میں اب کبھی منہدی نہیں رچے گی۔

میں اپنی بے بسی پر جھنجلایا ہوا تھا۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا ۔۔۔ مجھے خیال آیا جیسا کے بھاگنے سے پہلے جو بات میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میں شاب اس سے کہہ ڈالے۔ جھنگ میں پہنچ کر اس کا ہاتھ پکڑ لوں اور سب کو مخاطب کر کے کہوں ۔۔۔ جیسا اور میں جنم جنم کے ساتھی ہیں ۔۔۔ پھر جو ہو سو ہو۔

جھنگ میں آکر نذر نے کندھے پر لدی ہوئی گٹھڑی پلنگ پر ڈھلکا دی اور ایک طرف ہو کر پھولی ہوئی سانس درست کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کمبل ہٹایا، اور جیسا کا ہاتھ پکڑ لیا ۔۔۔ مگر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ جیسا کی بجائے میرے سامنے پلنگ پر جیجا بھائی پڑا تھا۔ اس کے گلے میں سرخ رنگ کا ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔

شکست

نوید انجم

بی اماں کی زبان تھی کہ اہلی توپ!

یوں گٹ گٹ سر دے کی مانند چلا کرتی کہ سننے والے کا دل لکڑے لکڑے ہو کر رہ جاتا۔ بے چاری زرینہ تھی تو شکل ہی مگر جو اماں کو آتا اللہ سے لاہر تھا۔ بھلا اس میں اس کا کیا قصور تھا کہ یہ عمر ہونے کو آئی اور رشتہ کا نہیں ملا!

یہ بیٹے کا چکر بھی عجیب تھا ــــ ستم تو یہ تھا کہ برا بھلا کوئی بھی تو رشتہ نہ ملتا۔ بی اماں کی چھاتی پر مونگ دلنے کو جانے خدا نے یہ کھیل رچا رکھا تھا یا نصیب زرینہ کے نصیبوں ہی کا اس میں کوئی دخل تھا ــــ اب یہ کون کہے ــــ کون کچھ سوائے اس نبلے والے کے ــــ

بی اماں کو خدا نے ہر سال لڑکی پہ لڑکی دینے کی یوں ٹھان رکھی تھی جیسے اماں کو لڑکی سے گہرے کے سوا اور کچھ آتا ہی نہ تھا۔ ایک نہ دو ــــ دو نہ تین پوری سات لڑکیاں! یہ بات کا بتنگڑ بڑا ہی منحوس ثابت ہوا۔ اماں نے لاکھ جتن کئے مگر ایک بیٹا سر تک گھر نہ بسا ــــ سارے جہاں میں پگلا کھسیلی، اللہ نترا ہوا، بیٹھ بٹھا منگتا اس گھر میں تو جیسے آب حیات ہی پی کر سب پیدا ہوئے تھے!

زرینہ بے چاری کا قصور تھا تو صرف آنکھ مچولی کی ادا رکھی۔ پیدا ہونا ہی تھا تو بعد میں ہو جاتی آخر اتنی جلدی کیا تھی ــــ کیا خبر! اگر وہ اتنی جلدی نہ کرتی تو کوئی چاند سا بیٹا ہی پیدا ہو جاتا جو بعد میں جوان ہو کر کماؤ مرد بن جاتا اور اماں کی ہزاروں لکڑوں میں سے چند ایک تو دور کر دیتا۔

زرینہ کا رشتہ نہیں ملتا تھا۔ بات یہ نہ تھی کہ اس میں کوئی عیب تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو بڑی پیاری لڑکی تھی مگر وہ لڑکی نوجوانوں کی ماؤں کو بھلا کب پیاری لگتی ہے جو اچھا خاصہ جہیز ساتھ نہ لا سکے۔ اب سوچنے والا سوچے کہ قصور تو سارا بی اماں اور ان کے گرم مزاج پگلی کھانے کے شوقین میاں کا تھا وہ ہڈا وہڑا اولاد تو پیدا کرتے رہے لیکن جہیز جیسی اہم چیز کے لیے چم چم چمکتا سونا یا زر جمع کرنا تقریباً نظر انداز کر گئے۔

اس گھر میں نائن آنا جانا رہتی۔ جب وہ آتی تو زرینہ کا ننھا سا دل دھک دھک رہٹ کی طرح کھل کر مٹھی میں پڑے ہوئے پنچھی کی مانند سہم جاتا۔ امید کی کرن اندھیرے میں جگمگاتی ہوئی محسوس ہوتیں اور وہ دوسرے کمرے کے دروازے کی دراڑوں سے جھانک کر خاموشی کے ساتھ کان لگائے اماں اور نائن کی گفتگو سننے کی کوشش کرتی۔

اور عام طور پر گفتگو کچھ ایسی ہوا کرتی ــــ "بہن کچھ ہے لڑکے کی!" نائن ٹٹولنے کے انداز میں اماں سے کہتی "ارے اِن بہن کچھ ہے ــــ لڑکے کی ــــ"

اماں ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں ــــ "اِن دو جہیز ہے ــــ یعنی سلامی کا اور ــــ"

جان نہ پھلا کر بولی ۔ "بیگم جی! بشارت بہت اچھا ہے۔"

اماں کو تاؤ آ گیا ۔ "اے چل مردار کہیں کی ۔ ایک تو لڑکی دو ۔ اور ساتھ آٹا ڈھیر سا مار دیا۔"

اور کچھ دیر کے بعد نائن ڈھیلے ڈھالے جسم کو لڑکھڑاتی ہوئی کانخوں پر اٹھائے ہوئے میں کچھ کھاتی ہوئی گھر سے باہر نکل جاتی۔ اماں حسب معمول چارپائی پر پاؤں پسار کر بچھیا کاٹتی جاتیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے جاتے۔ ہزار دعاؤں اور صلاحیتوں نذیرہ اور اس کے ہونے والے شوہر کو دیتیں۔ انھیں نذیرہ سے بہت بڑا شکوہ تھا کہ وہ اپنے ساتھ اپنا نصیب اور لیا کیوں نہ پیدا کر کے لائی ۔ اور اگر وہ کم بخت پیدا ہوا ہی تھا تو کسی جانی پہچانی جگہ میں دارد ہوتا تاکہ شادی میں دیر نہ لگتی ۔!

نذیرہ رات کو کام کاج سے فارغ ہو کر جب اپنے بستر پر لیٹتی تو آنکھیں موند کر بچپن کی یادیں کھو جاتی۔ اسے بچپن کی معصوم شرارتیں، خوشی میں ڈوبے ہوئے قہقہے اپنے چاروں طرف گونجتے ہوئے محسوس ہونے لگتے۔ آہ وہ بھی کیا موسم تھی جب کوئی غم نہ تھا اور شادی بیاہ کے جھنجٹ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں نسلوں کی اداسیاں منڈلاتیں جیسے جھیل میں کسی مسافر کے گرنے سے اس میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ یونہی اس کے سراپا میں ایک بے چینی ایک بے کلی سی برپا ہو جاتی۔

ایک دن اماں کے نام ایک لفافہ آیا۔ اماں نے جلدی سے کرایا میاں سے پڑھوایا۔ "اے مبارک ہو بیگم ۔۔۔!" ابا نے روایتی انداز میں عینک کے شیشوں میں سے جھانک کر بولے ۔ "بھئی مبارک ہو۔"

پاس ہی دری بنتے ہوئے نذیرہ کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔ کھڑکی، مگر اماں خوب خوش تھیں۔ انھوں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے میاں سے پوچھا "اے ہے کچھ کہو تو ۔ کیسی مبارک ؟" اور منہ میں کچھ چبا یا ڈال کر کڑکڑ کرنے لگیں۔

"اے لعلے ۔ اے بھئی بشارت ہو گیا۔ لعلے ۔" ابا کو لکنت کا دورہ پڑا۔

"بشارت منظور گریا ؟ اے ہے" اماں کو تو یقین نہ آیا۔

"ہاں بھئی لعلے کرانے والے ۔ اے بھئی وہ جنگی کی بجائے نکاح کریں گے ۔ وہ نضولیات میں نہیں پڑنا چاہتے۔"

"اے ۔ اے ۔۔" اماں خوشی کے مارے کچھ بول نہ سکیں۔

"کیسں تاریخ رکھی ہے شادی کی ۔ اے اسی ماہ کی کیسں تاریخ مقرر کی ہے ۔" ابا میاں بولے۔

اماں کو جیسے ہوش آ گیا ۔ "اے واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آج دس تاریخ ہے ۔ ابھی اتنی جلدی کیسے تیاری ہو سکتی ہے ۔ ابھی تو نذیرہ کا کوئی کپڑا بھی نہیں بنایا۔"

اخبار کھول کر دیکھتے ہوئے بولے ۔ "غضب کرتی ہو بیگم!"

اں بات کاٹ کر بولیں "اے لو، اتنی جلدی میں شادی نہیں کرنے کی ۔ شادی نہ ہوئی گڑیا کا بیاہ ہو گیا۔"

"مگر سنو تو بیگم ۔"

"اے میں نہیں سننے کی ۔ لڑکی نہ ہوئی گڑیا ہو گئی ۔ شادی اتنی جلدی نہیں ۔"

"اب ابا بڑے" غضب کرتی ہو ۔ بات سنتی نہیں ۔ اے سنو تو زریں کی شادی ۔"

"تو اور کیا میں اپنی بات تھوڑا ہی کرتی ہوں۔ زرینہ ہی کی شادی ہوگی۔ میری تیری تو نہیں" اماں نے تیزی کے ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ "خیر اب کچھ ہوش کی دوا کرو۔ کپڑا لتہ۔"

بات کاٹ کر ابے نے بڑا منہ کھولا "ہوش کی دوا تم کرو بیگم بیاہ زرینہ کا نہیں۔"

اماں یوں سن سی ہو گئیں جیسے صاحبن کی جھاگ بیٹھ جائے۔ سارا جوش ختم ہو گیا۔ مرے مرے لہجے میں بولیں "تو اور کس کی شادی ہے؟ مبارک کیسی۔"

"ارے بھئی تمہاری باجی کی بیٹی۔ تمہاری بھانجی رضیہ کی شادی ہے۔"

سر جھکا کر زرینہ برتنوں کو دھیرے دھیرے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آنچل کا ایک کونا اس نے منہ میں ٹھونس کر کہیں ہچکیوں کی صدا اس کے دل کا حال ظاہر نہ کر دے۔

باہر اماں مدھم مدھم لہجے میں ابے سے کہہ رہی تھیں "میں بھی منظور نادر کے ہاں سے زرینہ کا۔"

ابے نے بات کاٹی "تم کو ہمیشہ کچھ اور ہی سجھا کرتی ہو۔"

"لے لو تم نے بات ہی ایسی کہی۔"

اور زرینہ نے رات میں منہ چھپا کر چھوٹ چھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

رضیہ کی شادی پر اس زرینہ کو ساتھ لے کر اماں آئیں۔ شادی بیاہ کا اتنا فائدہ تو ہوتا ہی ہے، کہ نئی نئی لڑکیاں نکل پڑتی ہیں نئے نئے لڑکے پسند ہوتے ہیں۔ اور بیسیوں سے مشورت کی بنیاد پڑتی ہے۔ پسند ناپسند پر بحث ہوتی ہے اور بڑی بوڑھیاں ٹھونک ٹھونک کر رشتے کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

رضیہ کا بیاہ ہوا، خوب شور مچا، دو سب جگمگاتے ہوئے جوانیے موقعوں پر ہوا کرتے ہیں اور زرینہ کو محسوس ہوا جیسے وہ بھی کسی کی نگاہوں میں سمائی جا رہی ہے۔

ڈھولک چھوڑ کر جب لڑکیوں نے گانا وانا کہنے شروع کئے تو وہ بھی آہستہ سے بولی "ہائے وہ تھا۔۔۔ اے وہی جس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔"

ایک نے ٹھوکا دیا "ارے ہاں! وہی سیلی سیلی آنکھوں والا گورا چٹا سا۔"

دوسری ہنسی "اس کو نام سہیل ہے۔ خاندیم کا بھائی ہے۔"

زرینہ نے سانس دبا کر کہا "سہیل۔ ہاں وہ سہیل۔"

"ارے بتاؤ نا۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔!" یہ مشکل تمام وہ یہ جملہ چھڑا کر وہاں سے اٹھ آئی۔۔۔ اس کے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی۔ تو وہ سہیل تھا۔۔۔ وہی سہیل جو اس کے ساتھ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔۔۔ تو کیا وہ اتنا بڑا ہو گیا۔۔۔ اتنا خوب صورت ہو گیا۔۔۔ ہائے وہ تو بڑا گندہ سا تھا۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے پھرا کرتا تھا۔ اتنا لڑا کا تھا۔ ایک بار اس نے میری وہ چوڑیاں توڑ پھوڑ دی تھیں جو میں نے مشکل پیسہ پیسہ جمع کر کے خریدی تھیں۔۔۔ ہائے تب سہیل

کتنا چھوٹا ہوتا تھا۔ کیا یہ وہی سہیل ہے۔ وہی۔ وہی۔

وہ بے چین سی ہو گئی۔ آنکھیں کسی شرابی کی سی۔ سرخ سرخ گہرے بال ڈھے آنکھوں میں کسی پرندے کی مانند تیرنے لگے۔ محسوس ہوا جیسے اس کی سانسوں پر کوئی انجانی مہک پھیل رہی ہے۔ اس کے ذہن کو جیسے پر لگ گئے ہوں۔ تاروں کی چھاؤں میں چمکتے ہوئے چاند کے پاس جو ہر روز ایک نئی شکل لے کر دنیا کے سامنے آتا ہے۔ ثریہ نے آنکھیں موند لیں۔ یہ دنیا کتنی حسین ہے جہاں سہیل جیسا حسین و جیہہ نوجوان ہو۔ وہ سہیل جو اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بچپن میں۔ بچپن میں۔!

جب وہ چھوٹی سی تھی تب اپنا لاہور ہی میں ملازم تھے اور وہ خالہ کے گھر میں ہی رہا کرتے تھے۔ بی اماں کی اچھی کاٹ گھر کوئی چھوٹا موٹا گھر تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو بہت ہی عالی شان کوٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد باغ تھا۔ کوئی ایسا ویسا باغ نہیں جہاں کچھ بھی نہ ہو۔ یہاں بہت کچھ تھا۔ گلاب، موتیا، نرگس، رات کی رانی، چھوٹی موٹی کی کئی جھاڑیاں سبھی کچھ تو موجود تھا۔ سرو کے اونچے اونچے درخت ارد گرد کھڑے پیار سے جھومتے رہتے۔

پڑوس ہی میں خالہ شمیم کی کوٹھی تھی۔ ان کا اکلوتا لڑکا تقریباً سا اسلام دان کے ہاں لڑنے جھگڑنے میں مصروف رہتا۔ کبھی کبھی ثریہ سے جھگڑ رہا ہے تو کبھی ثریہ سے بول چال بند ہے۔ ثریہ کا بھائی فیروز اور سہیل بڑے پکے دوست تھے۔ جہاں یہ جوڑی ایک لڑکے کے ساتھ بھی جھولا ہوئے ہوتی۔ دونوں ہی کو راکیس کورٹنگ کرنے۔ ان کی گرما جاتیں اور جب وہ آٹھ آٹھ آنسو روتیں تو وہ انگوٹھا دکھا دکھا کر چھیڑنے لگتے۔

اور جب ثریہ کے ابا کا تبادلہ پنڈی ہو گیا تو وہ کس قدر روئی تھی۔ ہائے رضو کو کیسے چھوڑ کر جاؤں۔ رو رو کر کہتی رہی۔ خالہ بھی بڑی اداس تھیں۔ اسے بڑا پیار کیا، بڑا دلاسا دیا۔

ثریہ کو اس چاندنی سے بھی جاگ کر کہے "ہم جا رہے ہیں پنڈی"

گئے جانے فیروز اور وہ کہاں غائب تھے۔ رات کو جب وہ رات کی رانی کی ادھ کھلی کلیاں آنچل میں بھر رہی تھی تو وہ نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔ "ہوں۔ اچھا تو یہ باغ کا ستیاناس مار رہی ہو۔ ابھی جا کر تمہاری امی سے کہوں۔"

ثریہ کے لئے وہ گھبرا گئی۔ پھر فوراً کہا "سنو۔ سہیلو۔ ہم جا رہے ہیں۔"

"کہاں؟" وہ اکھڑپنے سے بولا۔

"پنڈی" وہ آہستہ سے بولی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟ جاؤ۔ مرجاؤ۔"

"ہٹ بڑا آیا کہیں کا۔" وہ بھڑک کر بولی۔ "مرتو۔ تم مرو۔" اس نے گریبان شروع کر دی۔

"اچھا ذرا ٹھہرو تو سہی۔ سارے پھول توڑ دیئے۔ ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے دھمکی دی۔

وہ گھبرا گئی "دیکھ سہیل تو کتنا اچھا ہے۔ اور پھر دیکھ ہم جا رہے ہیں۔"

"اچھا" وہ سوچ سوچ کر بولا "پھر کب آؤ گی؟"

"یہ نہیں ابا میاں کہتے تھے۔ ابھی نہیں آئیں گے۔"

"اچھا" وہ آہستہ آہستہ بولنے لگا "اچھا تو پھر میں گے۔"

"سچ؟ سچ؟ کب آؤ گے؟"

ہیں نہیں" وہ بولا۔ پھر سوچتے ہوئے بولا "ارے تم بلاؤ گی نا ہمیں۔ جب تمہاری شادی ہوگی تو تم ہمیں بلانا۔ پھر ہم آئیں گے۔ بلاؤ گی نا؟"

اس نے سر ہلایا "ہاں گریا در کھنا۔ ضرور آنا ورنہ میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔"

پھر وہ دونوں دبلے دبلے قدموں کے ساتھ برآمدے میں جا کھڑے ہوئے۔ اندر بی اماں شاید لڑکی کو ڈانٹ رہی تھیں "اے لو مردار کو دیکھو۔ جہاں کھاٹ پڑی دیکھی وہیں اپنے سگے کو بچھ گئی۔ اٹھ مردار بستر باندھ اور ہوئی نذیرنہ کو ڈھونڈ جانے کہاں مر گئی ہے۔"

وہ سہم گئی "اماں ماریں گی" سہمی نظروں سے اس نے اپنے ساتھی کو دیکھا۔

سہیل نے جلدی سے انہی کی بھولی میں سے رات کی رانی کی کلیاں نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیں۔ وہ آہستہ سے چلائی "ہائے خوب ہو جائیں گی۔"

وہ بھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ لڑکی آواز سن کر اور بڑبڑاتی ہوئی "نکل" ایک تو بیگم نے جان کھالی دوسرے انہوں نے کام سے نکالا۔ اللہ میری۔ سارے باغ کا ناس مار ڈالا۔ چلو زنا پاشا کو تو ہو۔"

"سہیل نے رعب سے کہا" اے واہ۔ یہ میں نے توڑی ہیں۔"

وہ چپکی چپکی تھر تھر کانپا کی۔

"تو اور کیا۔ میں نے توڑی ہیں" وہ لڑکی بھی کیسی ڈھیٹ تھی۔ کہیں کی۔!

دونوں کو پکڑ کر وہ بی اماں کے سامنے لے گئی۔ اماں نے اسے دیکھتے ہی ایک دو رسید کر دیں۔ نذیرنہ بلبلا کر رونے لگی۔ وہ آگے بڑھ کر بولا "خالہ بھوں تو ہیں نے توڑے۔"

روتے روتے وہ خاموش ہو گئی۔ اور منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

پٹائی جانے کیلئے وہ اسٹیشن جانے لگے تو وہ سب سے ملی۔ بی رضو سے گلے مل کر کہیں میں روئی بی اماں کی نقل کرتے ہوئے خالہ کے گلے لگ کر بے سر و پا بین کئے "اللہ! میں اب کب ملوں گی۔ اللہ میری لاش پر کرن۔"

"ہٹ مردار کہیں کی۔" بی اماں نے پیٹھ پر ایک ہتڑ جڑ دیا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

رو دھو کر خدا خدا کر کے وہ چپکی ہوئی تو سہیل کا خیال آیا۔ رضیہ سے پوچھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ باغ میں ڈھونڈا پر وہ نظر نہ آیا۔ آخر کو جلی بھنی صلواتیں سنانے لگی۔ "جانے کہاں مر گیا۔ کمبخت کو ذرا بھی خیال نہیں آتا کہ میں جا رہی ہوں۔ پھر بھلا کب آؤں گی۔ ارے!"

ہا! اماں کو کہتے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ انہیں اپنی گھڑی نہیں مل رہی تھی۔ اسے کچھ یاد آیا۔ رضو کے پاس جا کر اس کے کان میں بولی "رضو! یاد رکھنا گھڑی کو روز پانی دیتی رہنا۔ کچھ دنوں بعد جب پیڑیاں گھڑیاں بکنی ترا کے لئے اچھی سی گھڑی توڑ کر پنڈی بھجوا دینا۔ اور میرے لئے بھی۔"

رضو نے سر ہلا دیا۔

اور پنڈی پہنچے پر وہ نہ جانے کتنے دن تک دوست سے توڑی ہوئی گھڑی کے انتظار میں رہی۔ مگر ہوئی رضو بھولی چور نکلی کی۔ بھلا ہے کہ گھڑی بھیجتی۔ وہ نہ جانے کس طرح سے خار لے ایک دنگ آوہ گھڑی بابا کو بھجوائی تھی اور لکھا تھا کہ یہ سب رضو اور نذیرنہ کی

کا رستہ تھا۔
بی اماں نے اس کی خوب خبر لی ۔۔۔ اور سہیل کا آکر کسی نے کیا ہی نہیں ۔۔۔ جو اس فساد کی جڑ تھا ۔۔۔ اسی نے تو انہیں گھر ہی سے نکالا تھا۔

اور وہی سہیل اب کتنا بڑا ہو گیا تھا ۔۔۔ وہی شریر نٹ کھٹ لڑکا اب کتنا خوب صورت ہو گیا تھا۔ رضیہ کی جمعہ ہی والے روز جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ رضیہ کرنے ہوئے باغ میں آئی تو وہاں لڑکوں کی ٹولی لئے ہوئے وہ نہ جانے کہاں سے آ پہنچا ۔۔۔

وہ تو اسے پہچان بھی نہ سکی ۔۔۔ لیکن وہ کیسے ٹکٹکی باندھ کے ساتھ اسے دیکھتا رہا ۔۔۔ شرم کے ساتھ ساتھ وہ خوشی سے لال ہو رہی تھی اگرچہ کسی سے کم تر نہ تھی ۔ تبھی تو وہ خوب صورت نیلے سوٹ میں ملبوس نوجوان اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ زرینہ کو یک دفعت اس کی نگاہیں بھول اور سوئیاں بن کر چبھنے لگیں ۔۔۔ وہ دیکھتا رہا اور وہ شرم و خفت کے ملے جلے اثرات کے ساتھ وہاں سے ہٹ میں بیٹھی رہی۔

ایک بولی "مردوں کو یہاں کس نے آنے دیا؟"
کوئی ڈھٹائی بولا "آپ ہی میں سے کسی نے بلایا ہے۔"
رضیہ کی چھوٹی بہن بولی "منہ دھو رکھیں ۔ ہمیں کیا پڑی ہے کسی کو جانے۔"

وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی آخر ان کے وہاں آنے سے کیا فرق پڑا تھا۔ فرق پڑا تو تھا۔ اسے ایک چاہنے والا مل گیا تھا ۔۔۔ وہی نیلے سوٹ والا گورا چٹا ۔۔۔ وہ اسے گھور رہا تھا۔ گھبرا کر وہ رضیہ سے بولی "رضو چلو! بی اماں کو پتہ چل گیا تو؟"

نیلے سوٹ والے نے فوراً بات کاٹ دی "جی ہاں! بی اماں بہت خوش ہوں گی۔"

وہ جھینپ کر رہ گئی۔ اس کے باوجود اسے نہ جانے کیوں اس کی آواز میں کوئی مٹھاس سی محسوس ہوئی۔

وہ سہیل تھا ۔۔۔ سہیل نیلے سوٹ میں ملبوس ۔۔۔ جو اسے گھور رہا تھا ۔۔۔ وہ جو ۔۔۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ایک دم ٹوٹ گیا بی اماں غالباً کے مکان اور ہر کوٹھی میں اسے اکیلا بیٹھے ہوئے دیکھ کر چھیڑ رہی تھیں ۔۔۔ "اللہ ری لڑکی تجھے ہو کیا ہے ۔۔۔ جامنوں میں بیٹھ برات آ گئی ہے ۔۔۔ باجی!" وہ غالباً کی طرف مڑیں "باجی کیا کہوں ۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں اس سے ۔۔۔ ایسی پاگل لڑکی ہے ۔۔۔ اکیلی اکیلی رہتی ہے ۔۔۔ اے اور سروں سے ملے جلے تو اور سروں کو بھی معلوم ہو کہ کسی گھر میں کوئی جوان چھوکری ہے۔"

زرینہ کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ بی اماں تو اس کو کسی نمائش میں لگا کر دوسروں کو دکھانا چاہتی ہیں ۔۔۔ کاش اماں کو معلوم ہوتا کہ اس کو اب کسی کی پسند ہی نہیں جا سکتی۔ اسے اچاٹ سا گیا ہے ۔۔۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جس کی اسے ضرورت تھی ۔۔۔ سہیل ۔۔۔ سہیل!

تھکے تھکے قدموں کے ساتھ وہ اور کوٹھی آئی یہاں رضیہ کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔ اسے شرماتے ہوئے دیکھ کر اسے خواہ مخواہ ہنسی آ گئی رضیہ نے منہ بنا کر اسے دیکھا تو وہ سوچنے لگی "کم بخت کیسی بن رہی ہے۔ بھلا میں نہیں جانتی کہ اپنی پسند کی شادی کر رہی ہے۔ سنا ہے تاکہ خود یوسف کی خریداری کو نکلی تھی۔ اب دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں لیکن منہ کیسے بنائے جا رہی ہے۔ میں تو یوں کبھی نہ کروں اگر ۔۔۔ ہاں اگر وہ مجھے مل جائے وہ جو میرا اپنا ہے ۔۔۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگا اس وقت ۔۔۔" وہ چونکی کمرے کا دروازہ کھٹک سے کھلا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا سہیل فیروز کے ہمراہ وہاں آن پہنچا ۔۔۔ زیر لب مسکراتے ہوئے وہ خود سے کہہ گیا ہوگا ۔۔۔ "بڑی عمر ہے ۔۔۔ ارے شیطان کا نام لو، اور وہ آ پہنچا۔"

اس کا آخر ہی جملہ تھا جو قدرے اونچا بولا گیا۔ سہیل نے جھنجھلا کر کہا "خوب! تو کوئی یاد بھی کرتے ہیں؟"
دفعتہً خندہ ہو گئی۔ ایک لڑکی پٹ سے بولی "اے لو بھلا لڑکوں کا یہاں کیا کام۔ نکلو، نکلو یہاں سے!"
زرینہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا "شکر ہے خدا نے شادی پر نہیں بلایا تو کبھی ۔۔۔ ورنہ آج کل تو لوگ ایسے ہیں کہ کیا کہیے!"
"کیوں ۔۔۔؟" کسی نے پوچھا
"ارے بھئی وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے بیاہ پر ضرور بلائیں گے مگر جانا تو درکنار وہ بیاہ ہی نہیں کرتے"
"تاکہ کہیں وہ خود دولہا بن کر نہ بیٹھ پڑیں" فیروز نے لقمہ دیا اور ایک قہقہہ پڑا۔
اور وہ کھو سی گئی ۔۔۔ کسی انجانے خیال میں!
پھر زرینہ کی رخصتی ہو گئی اور سارے گھر پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ برات کے جانے کے بعد بہت سے مہمان چلے گئے اور خالہ اپنی لاڈلی کو یاد کر کر کے قصے بیان کرتیں۔ بی اماں اپنی باجی کے غم میں برابر کی شریک تھیں۔ البتہ اپنے منہ سے وہ یہ ذکر کرنا نہ بھولیں "لڑکی تو جیسے پردے کے جوگے سسرال کی مالک ہوتی ہے ۔۔۔ اللہ نے فضل کیا باجی ۔۔۔ بڑھاپا عزت سے ۔۔۔ میری مشکل بھی خدا آسان کرے"
جتنی بھی عورتیں تھیں سب کے کانوں میں بھنک پڑی کہ بی اماں کی بھی ایک جوان جہان کنواری بھوکری زندہ موجود ہے ۔۔۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر زرینہ کو دیکھنے لگیں جیسے وہ کسی اخلاق دشمن کی کوئی عجیب مخلوق ہو"
دوپہر کی رات گھر گئی۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھپھو اپنی رنگت بدلنے لگا۔ ایک بولی "اے ہے لڑکی ذات کو دے" دوسری نے آہ بھر کی تیسری نے جھٹ کہا "لو اور سنو اچھی خاصی تھی" ایک بڑی بی زیادہ ہی غور سے معائنہ کرنے لگیں۔ باتوں ہی باتوں میں معلوم ہوا کہ ان کا پوتا جوان ہو چکا تھا ۔۔۔ وہ سہما کر کے باغ میں چلی آئی ۔۔۔

پھر کئی روز یونہی گزر گئے۔ بی اماں کو ان کی باجی نے نہ جانے دیا۔ انہیں اپنے فرزند کے لیے بھی ایک بہو کی تلاش تھی۔ بات چیت کے دوران بی اماں نے بہن کو اپنی جوان لڑکی اور اپنے سسکتے ہوئے پہاڑ کا احساس دلایا تو انہوں نے کچھ رغبت ظاہر کی۔
ایک روز بی اماں نے نہ جانے کیا سوچ کر زرینہ کو وہیں اپنی باجی کے ہاں چھوڑا اور خود اپنے خیال سے اس رشتے کے متعلق اپنے لیے لے پالک کی راہ لی۔
زرینہ عجیب مخمصے میں گرفتار ہو گئی۔ اسے جو کوٹھا رہنے کو ملا وہ سڑک کے اس طرف تھا جس کے بالمقابل سہیل کی کوٹھی تھی۔ وہ کھڑکی میں سے اسے روزانہ سائیکل پر ادھر ادھر جاتے آتے دیکھتی۔ وہ کیسا خوب صورت جوان تھا ۔۔۔ فیروز سے کہیں زیادہ ۔۔۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ فیروز کو بالکل پسند نہیں کرتی ۔۔۔ اسے سہیل چاہئے تھا ۔۔۔ اور افسوس کی بات تو یہ تھی کہ سہیل نے رضیہ کی شادی کے بعد کبھی بھی زرینہ سے ملنے کی کوشش نہ کی ۔۔۔
وہ تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا لیکن اگر بھولا بھی تھا تو شادی والے دن کیوں اس نے یہ فقرہ کہا کہ کئی لوگ اپنے بیاہ پر چلنے کا وعدہ کرتے ہیں مگر جانا تو درکنار وہ بیاہ تک نہیں کرتے ۔۔۔ آخر اس فقرے کا مطلب کیا تھا ۔۔۔ کیا یہ محض شرارت سے ۔۔۔ کیا وہ اسے بالکل نہیں چاہتا تھا؟

پھر وہ دیکھتی کہ وہ بے حد مصروف رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بہت ہی حسین لڑکی آیا جایا کرتی تھی ۔۔۔ زرینہ کو خواہ مخواہ اس کی

شکل سے نفرت ہوگی کیسی بے حیا لڑکی ہے، سر جیسے جھاڑو منہ پر من پاؤڈر تھوپا ہوا۔ پردے کا خیال نہ پاکیس عورت ——— ! نہ جانے وہ اسے کیسے برداشت کرتا ہوگا۔

بی اماں کو پتہ لگے کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ خالہ بی بھی اپنے بال بچوں کے سمیت کسی کام سے چلی آئیں۔ فرزند کو وہ راستہ اپنے ساتھ لے گئیں۔ زرینہ ساتھ اس لئے نہ گئی کہ کچھ اس کی اپنی مرضی نہ تھی اور کچھ خالہ بھی اس کا ساتھ جانا معیوب ہی خیال کرتی تھیں۔ ایک بڈھی کھوسٹ مائی اور زرینہ اتنی بڑی کوٹھی کی نگرانی کو رہ گئیں ——— باقی رہ گئے مالی ——— باغ کا بوڑھا مالی جو سارا دن گھاس کی روشوں پر گذارتا اور رات کھٹاک کے ساتھ چارپائی لگا کر سونے میں گذارتا ———

تین راتوں کے لئے زرینہ اکیلی تھی ——— ان تین راتوں کو وہ جاگ کر گذار سکتی تھی، سو کر گذار سکتی تھی! وہ ان تین راتوں میں بہت کچھ کر سکتی تھی۔ سب سے بڑی بات ——— وہ ——— وہ اسے ——— سہیل کو اپنے کمرے میں کھڑکی کے راستے بلا سکتی تھی ——— اسے بلا کر پیار کر سکتی تھی ——— خود کو اس کے حوالے کر سکتی تھی ——— خود کو ——— وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا دماغ جیسے پھٹنے لگا ——— دل چاہتا تھا کہ سہیل کو بلا لے ——— اس سے پوچھے کہ وہ اتنا سنگ دل کیوں ہے ——— زرینہ کی شادی ملے دن پریت کے چراغ بلا کر اتنی جلدی بجھانے کیوں لگا ہے۔ آخر زرینہ کو بھول ہی جانا تھا ——— اسے بھلانا ہی تھا تو پھر وہ چھیڑ چھاڑ کس لئے ——— وہ مذاق کس لئے ——— ہاں کس لئے کیا تھا؟

جذبات کی شدت سے اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ ہونٹ پھول کی پنکھڑیوں کی مانند لرزنے لگے۔ بال پریشان ہو ہو کر شانوں پر گر گئے۔ آنکھیں درخشش سی ہو گئیں!

اس نے گھبرا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ سہیل کے آنے کا وقت ہو چکا تھا ——— وہ آنے والا ہوگا، اسے دیکھ کر وہ یقیناً مسکرائے گا اور کھڑا ہو جائے گا۔ تب وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے بلائے گی ——— پھر وہ کھڑکی کے راستے سے اس کے کمرے میں آ جائے گا اور وہ پھر اس سے ——— رو رو کر پوچھے گی آخر وہ اتنے دن کیوں ہو گیا۔ کیا وہ اس سے محبت نہیں کرتا ——— اسے سمجھ کرے گی کہ وہ بی اماں سے اسے مانگ لے ——— وہ سوچنے لگی۔ دل میں اسے کہوں گی کہ تجھے اپنا لو ——— اپنی اماں کو بھیجو ——— میں تیرے ——— میں ——— اس کے خیالات ایک دم بکھر گئے۔ سہیل کی سیٹی کی آواز اس کے کانوں میں آئی ——— وہ کھڑکی کی طرف لپکی ——— لیکن قدم رک گئے جیسے شرم عورت اور خوف کی ایک مضبوط زنجیر نے اس کے پاؤں کو جکڑ لیا ——— وہ بے جان ہو کر رہ گئی۔ ساکت سی ہو گئی اور جب سانس لے کر اس نے کپکپاتی تمام اپنے حواس پر قابو پایا تو سڑک خالی پڑی ہوئی تھی ——— سہیل اپنے گھر میں جا چکا تھا ——— !

وہ اپنے بستر پر گر گئی ——— اسے کیا ہو گیا تھا ——— وہ اسے بلا نہ سکی تھی ——— آہ اس نے بات ضائع کر دی۔ وہ بات جو اس کی ویران زندگی میں خوشیوں کا ایک سمندر لا سکتی تھی! تمام رات وہ پچھتاتی رہی کبھی اس کا دل اسے ملامت کرتا اور کبھی اسے کہتا ——— کبھی وہ سوچتی کہ اس نے اچھا کیا کہ اسے نہ بلایا اور سرے ہی سے وہ اپنے اس خیال کو جھٹک کر اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرتی ———

جب رات اپنے لاکھوں ستاروں کے ہمراہ پھر آ گئی تو وہ رو نہ سکی اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ اپنے سہیل کو مجبور ہو جائے گی۔ دبلے قدموں کے ساتھ وہ اٹھی اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے سے پہلے ساتھ والے کمرے میں سوئی ہوئی مائی کو خراٹے لیتے ہوئے بغور دیکھا اور لوٹی ——— کمرے میں آ کر اس نے بتی بجھا دی اور کھڑکی کھول کر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ آرہا تھا۔ وہی تھا، بنگلے کے نیچے پیدل آرہا تھا۔ اس کے چلنے کا وہی انداز، وہی اوس چال۔۔۔ کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر وہ اشارہ کرنے لگی۔ سہیل نے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ رک گیا۔ زرینہ کا دل تیزی سے دھڑکا۔ کسی اور کے کہنے کی آہٹ سڑک پر سن کر زرینہ کا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا اور سہیل تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

زرینہ نے پھٹی آنکھوں کے ساتھ یہ دیکھا۔ کچھ لوگ سڑک پر سے گذر رہے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ انہوں نے اسے نہیں دیکھا۔۔۔

کچھ دیر کے بعد وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید وہ دوبارہ آئے۔۔۔ مگر رات گذرتی چلی گئی اور سہیل دوبارہ نہ آیا۔ وہ دل تھام کر رہ گئی۔۔۔

اور اب آخری رات تھی۔۔۔ آخری رات۔۔۔ اس نے مضبوطی کے ساتھ ارادہ کر لیا۔ "آج کی رات چاہے کچھ بھی ہو۔ میں اسے ضرور بلاؤں گی۔۔۔ ضرور بلاؤں گی۔۔۔ وہ میرا ہے صرف میرا!" اس نے خود سے کئی بار کہا۔ "زرینہ آج سہیل کو ضرور بلانا ہے۔۔۔ آج وہ یہاں آئے گا۔ ضرور آئے گا ورنہ۔۔۔ ورنہ ہم کبھی مل سکیں گے۔۔۔ ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔۔۔ پھر ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔۔۔ آج آخری رات ہے۔۔۔ آخری موقعہ ہے! آخری!"

گھر سے اندھیرا کر کے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگی۔ اس کا دل تیزی کے ساتھ ہر آہٹ پر دھڑکنے لگا۔ انتظار کس قدر صبر آزما ہوتا ہے۔۔۔ یہ گھڑیاں کتنی لمبی ہوتی ہیں۔۔۔ ایک ایک سیکنڈ کیسے کٹتا ہے۔۔۔ وہ بے صبری کے ساتھ انتظار کرتی رہی۔

اور وہ آ ہی گیا۔۔۔ آج پھر وہ پیدل تھا۔۔۔ چاند کی مدھم چاندنی میں وہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔۔۔ وہ اسے پہچان گئی۔۔۔ وہ اسے اندھیرے میں بھی پہچان جاتی۔۔۔ وہ آ رہا تھا۔۔۔ وہ آ رہا تھا! اور وہ اس کی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا۔ تیزی کے ساتھ زرینہ نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ایک لمحہ تاریک اور خاموش فضا میں پھیلا، وہ اسے پکارنے لگی "سہیل"۔ مگر اس کا گلا سوکھ سا گیا آواز نہ نکل سکی۔ دوبارہ زور لگا کر اپنی قوت کے ساتھ وہ چلانے ہی لگی تھی "سہیل" کہ سہیل نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بڑی بے جانی کے ساتھ ایک گندی سی سیٹی بجائی "میری جان"۔

ایک چیخ زرینہ کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔۔۔ "ذلیل! بے حیا! بے شرم! بے غیرت!" نہ جانے کیا کیا گالیاں نکالتے ہوئے اس نے کھڑکی کے پٹ زور کے ساتھ بند کر دیئے۔

کھڑکی بند کئے کچھ دیر کے لئے وہ ساکت و جامد کھڑی رہی اور پھر فرط غم میں منہ چھپاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر اس نے رونا شروع کر دیا

کلیمی احکام عشرہ

علی عباس حسینی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

محلہ دار پیشیں کرو بھی کچ کہنی کی دلیل ہے محبت دیگر۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم بہت جلد زوال پذیر ہو گئے۔ اصل بات یہی ہے کہ اگر ہم میں علم و فضل و کمال میں ترقی کا جذبہ موجود ہوتا تو ہم مغلوب ہوتے اور نہ وہ غالب۔ اور نہ ہم محکوم ہوتے اور نہ وہ حاکم۔

پھر ذرا نظر انصاف سے ملاحظہ فرمائیے کہ ہم نے اپنی اور مسلمانوں کی اور مصری کیوں مول لی یا کیا اسے کسی ذاتی منفعت کا خیال تھا یا کسی اس کے لئے اس کی قوم کو کوئی فائدہ پہنچتا تھا؟ جی نہیں اللہ پاک کے ان نیک بندوں نے جو کچھ کیا وہ صرف اللہ کیا یہ سارے پاپڑ بیلے بارے لئے اور صرف چلے لئے انسانیت اور محبت کے جوہر اجاگر اور خلوص کے مقصد سے۔ محض اس لئے کہ وہ بھی بہ حیثیت انسان کے اپنا جیسا جذب پائے!

یہی کیا کم تھا کہ ہمیں اللہ اس بے رنگ کا فرق تھا ہم کو گلے لگا لیا۔ ہم نا سمجھے آم کا اچار ڈالتا ہے پھر بھی چار ہم ہو گئی ہم کو گلہ وہ سرد مہری کا ہے ہمیں اپنے لگتے ہیں۔ اصل کر کے مزہ ہی تھی۔ وہ کس مزے سے اپنے بنائے دھن کے سامنے ہمیں ان سن کر کے پیش کرتا۔ ہم نے اس کے لئے کیا وہ ہمیں جذب پائے جو نہ ہوتے تو کیا مقصد جب اللہ پاکیزہ، طیب ہو تو فداکار کی بھی بندگی پر یا وہ دھیان نہیں دیا جاتا۔ ہر شخص زیر پیر چاہے اور نہ چاہے گا گذر گزرنے کے لئے ہی ایک راہ ضرور منزل تھی۔ ایک مقصد تھا۔ اس نے بھی جیالوں اور جیالوں کو روندی کا ذرہ ذرہ ہی سمجھنے میں ہم جیالوں کی خاطر دیکھی وہ برابر اپنے دائرہ اثر و نفوذ کو بڑھاتا چلا گیا۔ اس سے ایک دھن تھی، ہندوستان کے سارے مستشرقین ایک تہذیبی صفحے میں آجاتے۔ ایک تعلیمی رشتے میں بندھ جاتے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگوں نے اسے اپنی منزل پر کامیابی سے پہنچا دیا۔ اس نے انگلستان کی سیاسی اور وہ خوش خوش انسان دوستی کے فرائض انجام دینے لگے۔

ہمارے اسلاف میں سے جن بزرگوں نے اس پاک طینت کا سراغ پایا، انھوں نے ان صفات عالیہ مرتبوں کی پرکھ کرنا چاہا خلاق ارض کھلا انھوں نے کلام پاک کی طرح کو سچا کر دکھایا۔ وہ اپنے ملک کے دین پر چلنے لگے۔ انھوں نے دفاداروں کی طرح ۲۰ قرنوں کی پیروی کے اسلاف ہم گام زن ہو کر بڑے بڑے مراتب حاصل کئے۔ جلیل القدر جہدوں پر فائز ہوئے اور انتہائی خلوص سے کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی بھی پہچان رکھی۔ ٹاس کا ہیٹ پہن لیا۔ اپنا ڈھیلا ڈھالا جبہ چاک کر ڈالا۔ اور اپنے تمام ڈاڑھی کی ٹیڑیاں بھی گردنوں میں کس کس کر باندھ لیں۔ اور وہ اپنی زبان کی قوتوں میں سے سنہ گرکھ کھوں کا "ڈیم بھاڑی فول" ہونے لگے

اس نئی مصنوعی کھلونا تہذیب کی داڑی سے دکھائی دینے لگی تھی۔ ہمارے بڑے بوڑھے تک عمر سمجھتا ہی جاتے تھے تم کو دفعہ کچھ ہاں سر پھروں نے سودیشی تحریک چلا دی۔ وہ ساختہ جذبہ دھن پرستی بھر کر دوار قبلہ کی طرح بیچ میں حائل ہو گیا۔ اپنا مل، اپنا فن، اپنا ہنر، اپنی پوجی، اپنی دھوتی اپنی بولی کے جیکارے، کاش سے نکلنے لگے۔ عالیجاہ ذی حشم، اور مرتبیان لوح کے چہرے فق سے لگنا ہو گئے۔ اور انھوں نے ہماری زبیت سے اپنا آپ دست کشی شروع کر دی۔ یہیں جب بڑا وقت آتا ہے تو قوت سمجھی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے حصوں کو ناخوش ہی کر لیا۔ پاکستان کی بنا ۱۹۴۷ء میں نہیں اس ملک سے پہلے ہی گر گیا۔ اس کی جڑ سری اور شور پختی کے نتیجے میں ہم جذب ہی بن رہ گئے۔ اور ہم پورے مغربی نہ بن سکے اور نہ مکمل مغربی۔

یہ بات دوسری ہے مگر ہمیں دنیا کا ۲۰ ویں سال کا ہے۔ ہمیں نہ تیک دیکھ کی پہچان ہے۔ نہ حسن و قبح کی مستند حصار ہم محض دھن میں فرق کرتے ہیں جو نہ رفیق دو عالم ہیں اعتبار۔ ہم کو ہر رنگ دینے والے رنگ کی طرح پر بھروسہ نہیں کر سکتے ہم ہر چیز پر جھپٹتے رہتے ہیں کہ ہر قدیم ایام سے بیزار ہے ہم فعل چلے آتے ہیں۔ ہم مذاہب کے منبع ہیں اور فلسفہ کا مرکز۔ انبیا ہمیں نے پیدا کیے ہیں اور سنی ہیں ہم سے ہوئے ہیں۔ رام، گوتم، زرتشت، کرشن، عیسیٰ، محمد یہ سب کے سب ہمیں مشرقیوں کر تھے ہمارے ہی موسیٰ نے دریائے نیل میں فرعون کے لشکر کو غرقاب کیا تھا اور جادا ہی خضر آج بھی جب جوں تک راہنمائی کرتا پھرتا ہے۔

اس پر ہم مسلمان بادشاہ کی ہر زہ سرائی میں سب سے زیادہ طبلہ زن ہیں۔ وہ ہاں طبلے کی ہر ہر اس کے ادھی کے پر شدی "گھنیوں چلنے

والے شیر خوار کا جنت نذیر ہے۔ اتنی ہی اس کی زبان دراز ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کاسہ سرمایہ دوسروں کے خرمن کی خوشہ چینی کا مرہون منت ہے۔ اس کی زبان وہ کھچڑی ہے جس میں مساوات ہی امتزاج نہیں لے ہیں بلکہ اس میں ان گنت قسموں اور لفظوں کا غلط اکر شامل کر دیا گیا ہے۔ وہ ایک ایسی بونگی ہانڈی ہے جس میں اجنبیت محاورات کی سبزی تراکاری ڈال دی گئی ہے۔ اس کھچڑی میں ہی اس کو یہ گھمنڈ ہے کہ اس میں دنیا جہاں کی خوبیاں اکٹھا ہو گئی ہیں۔ اس میں ہر رنگ اور ہر ذائقہ کا مسالہ موجود ہے۔ وہ چٹ پٹی بھی ہے۔ کھٹی بھی ہے۔ تیکھی بھی ہے۔ کڑوی بھی ہے اور مزیدار بھی۔ اس میں لذت بھی ہے۔ حلاوت بھی ہے۔ آمد بھی ہے۔ آورد بھی۔ تصنع بھی ہے۔ سادگی بھی۔ تفکر بھی ہے۔ تازہ دلی بھی۔ یہ ہے اپنے مدعیان مٹھو بنانے والی کو کہتے ہیں۔ اپنے تنگ نظر ناقدوں کو اپنے لیے تم کے نقاد دن کو۔ اپنے مصدر جو بیجنبی نے منشاعروں کو وہ بڑے طمطراق سے مغرب کے شہ پارے، پیلی دمان کو دشان شاعروں کے سامنے پیش کر کے رجز خوانی کرنے لگی ہے۔ اس کی نظر عواقب پر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی نیم وحشیانہ طول کو تہذیب کا طرہ بتاتی ہے۔ وہ اپنی شاعری کو ہر عضو دجیں عضو بنانے تھے مغرب کے مجسموں کے ملیا میٹ کی جسارت کرتی ہے۔ اور اپنے متبدل پست اور شعر کے صحیح مفہوم سے نابلد شاعروں کے ساتھ ساتھ شیکسپیئر، ملٹن، دانتے اور گوئٹے کے اسمائے مقدسہ بھی بے دھڑکے لے ڈالتی ہے۔ ؎

نظر تو ان سے چرخ گرداں نظر

احسان فراموشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اردو داں نے صدیوں ہاتھ کر گلی میں وہ دلی محبت کو نچھاور کیے ہیں اور ہر توں کی قربت کی کوئی قدر کرتے ہیں۔ وہ اپنے دوغلے محاورہ اور ادبی تھوپی پر اتراتے پھرتے ہیں۔ ان کے پڑھے لکھے بھی ــــ حالانکہ ان کی سرکار تو ہی بین دانی زبان میں کوئی کرسی نہیں رکھتا ہیں ــــ بالکل جاہلوں کی سی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ نظم کے مفہوم و حقیقت سے واقف نہیں۔ وہ شعر کی صحیح تعریف سے آگاہ نہیں۔ پھر بھی وہ اپنی غزلوں کا نسخہ دوہ بیٹھے رہتے ہیں اپنے مرشد پر سر دھنتے ہیں۔ اور اپنی مشنویوں پر ہر گھانے کو تیار۔ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کو اس بیسویں صدی کی سینگ مدراگوں کے عصر میں۔ اور اہل مغرب کے علم جدید میں زیادہ ہنسنے کا حق نہیں۔ ان کا انداز تفکر آتا قدیم، فرسودہ اور پرانا زمانہ ہے۔ ان کا اسلوب اتنا غیر مسلسل اور غیر مربوط ہے۔ اور ان کا کلام اس قدر بد نکلی دوبے تر تیبی سے مملو ہے کہ ان کا کان ہو جاتا ہے یعنی اور الجھ کر رہ جاتا ہے اس کا سمجھ جانا قدری دشوار ہے۔

اردو کے ادیب اگر یہ نہیں چاہتے کہ وہ عرب نما کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں اور خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق نہیں تو ان کے لیے واحد سلامتی کی صورت ایک ہی صورت ہے۔ نہیں چاہیے کہ وہ فوراً اپنی تمام لغتیں، فاسد تحریروں اور تصنیفوں سے توبہ و استغفار کریں اور اس پر بے ساختہ طور سے جلد از جلد عمل پیرا ہو کر کے ہمعصر اقبال و جوانی حضرت کلیم الدین احمد کے دست مغرب پرست پر بیعت کریں اور ان پر صدق دل سے ایمان لائیں۔

جعفر زٹلی نے "ان سطور کا تابیدہ حلقہ گوش ہے" اردو شاعری پر ایک نظر" میں ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک نظر" کے دامن میں جو دو بیانیے لکھوں بکھیرے پڑے تھے۔ ان سے جدید کلی مکالمہ مشترہ بڑی محنت و جانفشانی سے تیار کیے ہیں۔ بعض اردو داں لیتے کی نجات دہندہ سمجھ کر ان خیالات سے دوچار ذلیل کیے جاتے ہیں۔ وعدہ ہے کہ ان پر عمل کرنے کی توفیق تیک عطا ہو۔ اردو مستقبل کے خطوط اور خطوں سے محفوظ رہے۔ ؎ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

وہ دس نئے کلیمی تو ابین یہ ہیں:۔

۱۔ مغربی زبانوں کا تمیز اس دنیا میں تیار نہیں کیا گیا ہے۔ یہ لفظوں اور جملوں کے لیے بنائی گئی ہیں۔ وہ آسمانوں سے ان کے مخصوص بندوں کے لیے اتاری گئی ہیں۔ اس کلیہ میں شک کرنے سے ایمان جاتا ہے۔

۱۔ مغربی زبان کے ادیبوں نے بیان و کلام کے جو اصول معین و مقرر کر دیئے ہیں وہ ابھی تک صحیح ہیں۔ ان میں کسی طرح کی رد و کد، ترمیم و تنسیخ محال ہے۔ ان کی صحت و جامعیت میں شک کرنا اسلام سازی میں شک کرنے کے مترادف ہے جو یقینی کفر ہے۔

۲۔ مغربی ادیبوں نے شاعری کو تین اصناف میں تقسیم کیا ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زبان کی شاعری کے لئے قانونی وفروعی ہے کہ وہ ان تین حدود کے اندر رہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے علاوہ کچھ اور بھی اصناف سخن ہیں جن میں عقل کا فتویٰ اور ایمان کا فساد ہے۔

۳۔ مغربی اصول ادب سے ناواقفیت جہالت اور گمراہی کی دلیل ہے اور غضب کلیمی کا مستحق بناتی ہے اور اس سے واقفیت کے باوجود اس پر نکتہ چینی یا کسی طرح کی تنقید نفاق کے مساوی ہے اور اس کی عقوبت سنگسار ہی ہے۔

۵۔ مغربی ادیبوں کے ساتھ ساتھ مشرقی ادیبوں کا نام لینا شرک کے حدود کے اندر آتا ہے۔ ایسی ساری تحریریں، تصنیفیں، تنقیدیں جن میں اس طرح کے سوء ادب سے کام لیا گیا ہو قابل سوختنی ہیں۔ انھیں جلد سے جلد نذر آتش کر دینا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۶۔ ہر مشرقی پر یہ فرض عین ہے کہ وہ مغربی ادیبوں کا نام لینے سے پہلے اپنے منہ کو تین بار غوطہ دیدیا کرے۔ ایسی حالت میں کہ وہ اردو غزل گنگنا رہا ہو کسی مغربی شاعر کا کلام پڑھنا چاہتا ہو اس پر غسل لازم ہے۔ اگر یہ ہدایت ان بحور میں سجائی جائے جو مغربی سواحل سے ٹکراتے ہیں، تو یہ فعل باعث زیادتی ثواب ہوگا۔

۷۔ مغربی ادب مشرقی ادب سے ہر حیثیت سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ایک مغربی سوشرقیوں پر فضل خداست، اس میں وہ اک میں جھاڑی ہے اس کے معمولی سے معمولی ادیب و شاعر کی معمولی سے معمولی تصنیف بھی اتنی بلند پایہ ہے کہ مشرق کے بہترین دماغوں کا تخیل و تصور بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ مغرب کی یہ سعادت بزور بازو نہیں ہے، خدائے بخشندہ نے بخشی ہے۔ ذالک فضل اللہ یعطی من یشاء کی آیت کریمہ میں اسی کی نص کی گئی ہے۔

۸۔ غزل اور شعر مغرب میں ممنوع ہے۔ اس کا ذکر مغرب کے کسی صحیفہ آسمانی میں نہیں۔ دیوتاؤں کی ہندو کتابوں میں وحشیوں کے داخلہ کی اجازت نہیں۔ اس لئے اس سے دور رہنا احتراز اجتناب واجب ہے۔ اس وحشی صنف کو پسند کرنا تہذیب ہی کو مشتبہ نہیں بناتا ہے بلکہ ایمان کو بھی مشکوک کر دیتا ہے۔

۹۔ مغرب مشرق کے لئے مخبر طاغیت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کی کورانہ تقلید نہ کرنا، اس کے پیچھے پیچھے بھولی بھیڑ کی طرح آنکھ بند کئے چلتے رہنا اپنے لئے الگ سات دوزخ تیار کرنا ہے۔ ایسے مخبروں کو عید قربان کا فدیہ بنا دینا ایک فعل مستحسن ہوگا۔

۱۰۔ مغرب ہمیشہ ہمیشہ بلند و ارفع رہے گا اور مشرق ہمیشہ ہمیشہ ذلیل و پست۔ یہ ابدی مقدر ہے۔ یہی ان کا مقسوم ہے۔ اس لئے مشرق کے لئے نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنی دیدہ بینا، عقل رسا، زبان گویا کو بند کر لے اور ہر وقت اور ہر آن مغرب کے دامان گیان میں بیٹھا رہے یا اس کے گن گایا کرے۔

ان نئے کلیمی احکام عشرہ کے اعلان کے بعد ہم اس خطرے سے بھی آگاہ کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ان احکام کا بلا چوں و چرا استعمال کرنے والوں کو کلیم ایسے کلیمی صاحبوں کا مستوجب و مستحق بنا سکتا ہے جو قوم موسیٰ کی طرح ان کے پورے طبقے کو ان واحد میں بلا کر خاکستر کر دے۔

پس بہتر ہے کہ ہم اپنی روحِ مجرد کی جگہ God save me from my friends کہہ کر دوستوں سے بچاؤ کی حکایت اور ارمغان میں داخل کر لی جائے۔ واعلیٰ ما اصطلاح!

ایک مناظرہ اور تین وعظ

ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ

محترم جانی!

السلام علیکم۔ "ظرافت نمبر" کا ارادہ مبارک ہو۔ یقیناً جسے کام کی چیز ہوگی خصوصاً اس نقطۂ نگاہ سے کہ ظرافت تنگ ہی ملحقہ والے اول تو ملتے ہی بہت کم اور جو ملتے ان میں سے کچھ تو نہ ہو گئے ہیں اور جو باقی ہیں انھیں غم دوراں نے یوں مسل ڈالا ہے کہ وہ سراپا فریاد بن کر رہ گئے ہیں اس لیے یہ نمبر ہمارے ادب کی اس مرحوم صنف کو ان معنوں میں زندہ کر دے گا کہ اس کے اوراق پریشاں مجتمع ہو جائیں گے اور گردو کی گرد آپ کے اس تازہ احسان سے درا اور دوب جائے گی۔

آپ نے مجھے بھی ظرافت نگاروں میں گھسیٹ لیا! جزاک اللہ۔ آپ کا اندازہ کچھ اتنا غلط بھی نہیں۔ میں شاعری کی طرح یہ شوق بھی وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میرے دو مضامین "مولانا" اور "مسلمہ" ۱۹۲۸ء میں "نگار" میں شائع ہوئے تھے۔ بعد میں جب حوادث دوراں نے مجھے تلخیوں کے سپرد کر دیا تو میری ظرافت نے طنز کا رنگ اختیار کر لیا۔ گو گذشتہ پچیس برس سے دونگر طنز میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہوں گفتگو میں ظرافت اور تحریر میں طنز۔

یہاں کھلیپور میں ایک نیم سرکاری اخبار "ترقی" نام کے نام سے از ۱۹۲۸ء تا سنہ ۱۹۵۱ء جاری رہا۔ آخری دس برس اس کی ادارت میرے پاس رہی۔ ہفتہ وار تھا مقصد اصلاح دیہات۔ میں اس کے ہر شمارے میں اداریہ کے علاوہ ایک طنزیہ مکالمہ یا مضمون بھی لکھا کرتا تھا۔ موضوع عموماً رسومات باطلہ، عقاید فاسدہ وغیرہ اور اس سلسلے میں کبھی کبھی نیم سنجیدہ ہو کر روح تبتا تھا اور کبھی کبھی نیم شاعرانہ۔ مگر دس میں سے نو کے لگ بھگ ہوگی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے جو اس اخبار کا باقاعدہ مطالعہ کیا کرتے تھے مجھے مجبور کیا کہ میں ان مضامین میں سے ساٹھ ستر لے انتخاب کروں جو عمومی نوعیت کے ہوں اور اشاعت کے لیے ان کے حوالے کر دوں لیکن فرصت ہی نہ مل سکی اور اخبارات کا وہ فائل گذشتہ چھ برس سے بری فرصت کا منتظر ہے۔

نگارشات کا مقصد اظہار دوران سے پٹے ہوئے قاری کو گدگدانا ہے۔ یہ گدگدی کبھی بیان کردہ واقعہ میں ہوتی ہے تو کبھی مخاطب۔ کبھی زیر لب آتے ہیں اور کبھی دانتہ نگار شوخی نگارش سے پیدا کرتا ہے۔ آپ کا خط ملے آج پانچواں دن ہے اور میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ تعمیل ارشاد کیسے کروں۔ تحریر میں شوخی بھی آتی ہے کہ طبیعت میں شوخی ہو۔ ۵۸ برس کی عمر میں یہ شوخی کہاں سے لاؤں! اپنی بیتی ہوئی زندگی پر نظر ڈالی تو ایک ہولناک بیابان ہیجم تخیل کے سامنے پھیلا ہوا نظر آیا۔ آوارہ لکھنے والے داد جمالیاتی جذبات

کے عنوان گنتاخوں کے گلے لگے، انا کی اجاڑ راہیں اور تماشیوں کے کوٹھے۔ ان میں سے کوئی عنوان موضوع تحریر نہ بن سکتا تھا۔ پھر ان واقعات کا جائزہ لینا شروع کیا جن کا تعلق دوسروں سے تھا۔ چن کر چار واقعات اس ناقل نظر گئے کہ قارئین "نقوش" کے سامنے پیش کیے جائیں۔

ان واقعات کو سمجھنے کے لیے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے قدیم مکاتب کے فارغ التحصیل طلبہ علماء یا مولوی کہلاتے ہیں۔ ان کا نصاب فارسی نظم و نثر، صرف و نحو، منطق، معقول، فقہ، لغات الحدیث اور تفسیر پر مشتمل ہوتا ہے ہر علم کی الگ الگ اصطلاحات ہیں جو عصر حاضر کی درسگاہوں میں استعمال نہیں ہوتیں مثلاً:

اصطلاحات فلسفہ۔ جوہر، عرض، واجب الوجود، علول وغیرہ۔

اصطلاحات تصوف۔ فنا، بقا، استغراق، فقر، کشف، وحدت الوجود، غنا، استغنا وغیرہ۔

اصطلاحات منطق۔ موجبہ کلیہ، موجبہ جزئیہ، کلی متواطی، تصدیق، مجہول، قضیہ وغیرہ۔

اصطلاحات عرف۔ صیغہ، باب، افعال، تفعیل، مہموز، اجوف، لفیف وغیرہ۔

کائنات کی ہر چیز بدل رہی ہے اور ہمارے ان قدیم علماء میں بھی اب کچھ تبدیلی آ رہی ہے ورنہ آج سے ربع صدی پیشتر ان حضرات کی گفتگو اپنی تحاریر بلکہ روزمرہ کی گفتگو تک میں ان اصطلاحات کو فیاضی سے استعمال کیا کرتی تھی۔ اس طبقہ کی دوسری خاصیت یہ تھی اور کسی حد تک اب بھی ہے کہ بحث میں اصل موضوع پر کبھی بات نہیں کرتے تھے اور حقائق کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے منطقی اصطلاحات سے فلسفیانہ اور لسانی گورکھ دھندوں میں الجھا دیتے تھے۔

ایک مناظرہ

یہ ۱۹۱۳ء[1] کی بات ہے جب میں اس وقت مساجد و مکاتب میں درس نظامی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور پھر پشیمان ہو گیا۔ لگا علماء کے پاس دوڑنے۔ ایک نے کہا کہ بیوی حرام ہو چکی ہے اور دوسرے نے جس کی خدمت میں اس شوہر نے دو روپے نذر اور کچھ شیرینی پیش کی تھی "طلاق کو رجعی" (جس میں شوہر مطلقہ بیوی کو نکاح کے بغیر اپنا سکتا ہے) بتایا۔ دونوں مولوی ایک ہی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ اس سے پہلے بھی بے شمار مسائل پر ان کا اختلاف ہو چکا تھا۔ مولوی رکن الدین جو بھی چوٹی دیتے مولوی قمر الدین اس کی مخالفت کرتے اور اپنے علمیہ نیز مہارت کے بعد مقتدیوں کے سامنے اپنے حریف کو بڑی طرح لتاڑتے۔ اس کی جہالتوں پر بحث کرتے اور اس کے اساتذہ کو نالائق بتاتے۔ اگر مولوی رکن الدین استفتا کرتے وقت صرف "دیوبندی ثم سہارنپوری کان اللہ لہ" لکھتے تو یہ "الحقیر المقصر المذنب" سے شروع کرکے "الدیوبندی ثم سہارنپوری ثم الحنفی ثم الجشتی السہروردی القادری المجددی عفی عنہ" پر جا کر ٹوٹتے۔ وہ "ولا الضالین" پڑھتے وقت "ضاد" کی نکالتے تو یہ "دال" کی کہ وہ "آمین" بالجہر پڑھتے تو یہ بالسر۔ وہ نہیتے میں سر کو چار مرتبہ موڑتے تو یہ آٹھ مرتبہ وہ ریش مبارک کو خضاب لگاتے تو یہ حنفی الفرق ورنہ کے سوا ان میں کوئی چیز قطعاً مشترک نہ تھی۔

---

[1] یہ نام فرضی ہیں۔ (مرتب)

جب یہ طے ہو گیا تو فضل خان الجھن میں پڑ گیا کہ کس کی سنے اور کس کی نہ سنے اور جب تک یہ دونوں مولوی اتفاق نہ کریں اس کے لیے بیوی کو گھر میں لانا مشکل تھا۔ گاؤں میں اچھی خاصی حیثیت رکھتا تھا۔ چالیس ایکڑ زمین بھی تھی اور ایک عدد گھوڑی بھی تھان پر بندھی رہتی تھی۔ اس نے مولوی قوالدین کو یہ ناری وزیر مجبور کیا کہ وہ اس کے گاؤں میں آ کر مولوی رکن الدین سے بالمشافہ بحث کریں اور معاملے کو نپٹائیں۔ پہلے تو وہ ٹالتے رہے لیکن جب فضل خان نے سلوے، مرغے، مکھن، گاڑھی لسی اور کنویں پر توشت کی گھنی چھاؤں کا سبز باغ دکھایا تو مولوی صاحب کے منہ میں اس قدر پانی بھر گیا کہ باچھوں سے بہ نکلا۔ انھوں نے "ہاں" کر دی اور جمعہ کا دن بحث کے لیے مقرر ہو گیا۔

چار دن باقی تھے فضل خان ضیافت و پذائش کے انتظامات میں لگ گیا۔ سات آٹھ مرغے خرید لے، پلنگوں پر چادریں بچھائیں، طاقتوں کے لیے کرسیاں، چارپائیاں اور مونڈھے اکٹھے کیے۔ اُدھر گاؤں میں ہر گھر اور ہر چوپال میں اسی بحث کا ذکر تھا۔ آخر وہ دن آیا۔ صبح سویرے فضل خان نے مولوی صاحب کے لیے گھوڑی بھیجی اور خود بارہ بجے کے قریب تیس چالیس آدمیوں کے ہمراہ گاؤں سے میل بھر دور آپ کی پیشوائی کو گیا۔ مولوی صاحب پہنچے تو سب نے باری باری آپ کے پاؤں لیے اور ہاتھوں کو چوما اور آپ بڑی شان سے گاؤں میں وارد ہوئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سارا مجمع مسجد میں گیا۔ مولوی صاحب کے ساتھ چار طلبہ نے کتابوں کی چار گٹھڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ بعد از نماز جمعہ دس گز لمبی چٹائی کے ایک طرف یہ بیٹھ گئے اور دوسری طرف مولوی رکن الدین بن کے سامنے کتابوں کے دو بڑے بڑے انبار لگے ہوئے تھے۔ بزرگانِ طرفین بطور خان نمبردار صدر مجلس قرار پایا اور وہ بیچ بیچ پر جا بیٹھا۔ اب مسجد میں مکمل سکوت تھا۔ سب بحث کے منتظر تھے اور اس انتظار نے گہری خاموشی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دونوں مولوی صاحبان سر جھکائے ہوئے تھے اور ان کی نظریں زمین پر مرکوز تھیں۔ جب دو تین منٹ گذر گئے اور سلسلۂ بحث کا آغاز نہ ہوا تو صدر نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "جناب مولی صاحبان! مہربانی کر کے گلاں باتاں شروع کرو۔" لوگوں نے کہا: "بیشک۔ بیشک۔" اس پر دونوں مولویوں نے پہلو بدلے، سر اوپر اٹھایا۔ پہلے ایک نے اور پھر دوسرے نے منڈھے ہوئے صفا چٹ سر سے عمامہ اتار کر سامنے رکھ لیا۔ اس کے بعد دونوں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ایک دوسرے کو چبھتے ہوئے بیل کی طرح گھور کر دیکھا اور پھر اک ایک گرج دار کھنکورا لگایا۔ یہ کھنکورا گویا آغازِ جنگ کا بگل تھا اور بحث یوں شروع ہوئی۔

رکن الدین: السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔[1]

قوالدین: لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

رکن الدین: مولانا آپ آغازِ سخن زیرِ بحث کریں۔

قوالدین: آپ بڑی کریم زوجہ مطلقہ فضل خان کان اللہ لہٗ ہیں اور لزوم اثباتِ دعویٰ بہ ذاتِ مدعی عاید ہوتا ہے اس لیے

---

[1] رکن الدین، ق۔ قوالدین

[2] حضور سلم غیر مسلموں کو خطوط لکھتے تو یہ سلام لکھتے۔ ترجمہ یہ ہے "اس پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے"۔

آغاز بحث آپ کریں۔

ر : لیکن آپ بھی تو مدعی حکمت زوجۂ مطلقہ ہیں اس لیے ابتدائے بحث کا وجوب حسب اصول علم مناظرہ آپ پر عائد ہوتا ہے۔

اس مرحلہ پر صدر نے مولوی رکن الدین سے التجا کی کہ اس مسئلہ کو طول نہ دیں اور وہی بحث شروع کریں۔ مولوی صاحب نے بہت اچھا کہہ کر اپنے مقابل سے پوچھا:

"مولانا! آپ مباحثہ کریں گے یا مناظرہ یا مکالمہ یا مجادلہ یا مکابرہ یا مقابلہ؟"

ق : آپ سب سے پہلے ان اصطلاحات میں فرق بتائیں۔ نیز "مناظرہ" کی تعریف کریں۔

ر : آپ یہ بتائیں کہ علم مناظرہ پر عربی زبان میں کون کون سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں؟

ق : آپ یہ بتائیں کہ علم مناظرہ کا واضع کون تھا، کہاں کا رہنے والا تھا، کس کا شاگرد تھا اور کس صدی میں پیدا ہوا تھا؟

ر : آپ یہ بتائیں کہ حرف واو کا موجد کون تھا اور محمولہ و ماخوذ کی تعریف کیا ہے۔

اس مرحلہ پر دونوں حضرات کھسکتے کھسکتے ایک دوسرے سے روگز کے فاصلہ پر آ چکے تھے۔ غیض و غضب سے دونوں کے چہرے سرخ تھے اور آنکھیں لال، سانس تیز تھی، گھنگھرے پر گھنگھرا چل رہا تھا اور دونوں بار بار نسوار کی ڈبیا نکالتے، چٹکیاں بھر بھر کر منہ اور ناک میں ڈالتے اور زور زور سے سامنے رکھی ہوئی گتابوں پر ہاتھ مارتے تھے۔

ق (رک کر): تم یہ بتاؤ کہ عموم مانعۃ الجمع اور مانعۃ الخلو میں کس قسم کی تنافی پائی جاتی ہے۔

ر : یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے البتہ تمہاری جہالت رفع کرنے کے لیے بتا دوں کہ ان دونوں میں تنافی فی الصدق و الکذب بطلقاً اعتبار کی جاتی ہے۔ اول الذکر میں جانب کذب میں اور موخر میں بجانب صدق بالکل حکم نہیں کیا جاتا لا بالتنافی ولا بعدم التنافی۔ اسی طرح سالبہ لزومیہ میں سلب لزوم اور منفصلہ میں سلب انفصال کا حکم ہوتا ہے اور حملیہ میں افراد پر اور شرطیہ میں تقادیر متصدرہ پر حکم ہوتا ہے۔ فافہم و تدبر۔

ق : اندریں مسئلہ محقق طوسی اور میر زاہد کا مذہب بتاؤ۔

ر : طوسی کا قول یہ ہے کہ بدون اعتبار حکم اطراف قضیہ شرطیہ کا بعد التحلیل مدار ملفوظ ہے خصر صاحب اطراف قضایا مشتمل علی النسبۃ التقائمہ نہ ہوں اور میر زاہد کا مذہب یہ ہے کہ حکم شرعی استقلال محکوم علیہ کا مقتضی ہے اور کذب اطراف مانع حکم اذعان ہے۔ پھر جب سلب کو ایجاب کلی پر داخل کیا جاتا ہے تو وہ سالبہ کلیہ بن جاتا ہے اور موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ جزئیہ ہوتا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ علت غائیہ وغائیہ میں کیا فرق ہے اور ان کی تعریف کیا ہے۔

ق : بقول فخر الرازی علت غائیہ علیتہ علت فاعلیہ کی علت فاعلیہ ہوتی ہے۔

ر : غلط بالکل غلط۔

ق : یہ بالکل صحیح ہے۔

ر : اگر صحیح ہے تو بتاؤ کہ "معاویۃ" کون سے ادوات ہیں؟
ق : تم بتاؤ کہ "مائۃ عامل" میں "کے اور اذن" کو حروفِ معتبر کیوں کہا گیا ہے اور "اِمتیا" کیا صیغہ ہے؟
ر : "لشقوتی" کیا صیغہ ہے؟
ق : لم اور لم میں کیا فرق ہے؟
ر : تم میں اور ابوجہل میں کیا فرق ہے؟
ق : تم میں اور حمار میں کیا فرق ہے؟
ر : تم شیطان الرجیم ہو۔
ق : تم ملعون و مردود و منکوب و مکروہ ہو۔
ر : تم الشقی الغبی العصی العمی ہو۔

اس مرحلہ پر دونوں ایک دوسرے کے پاس آ چکے تھے۔ آوازوں میں گرج اور ہاتھوں میں لرزش تھی۔ شدتِ غیظ کی وجہ سے گردن کی ہر رگ تڑپ رہی تھی۔ دونوں کے منہ سے گالیوں کا لاوا بہہ رہا تھا۔ دونوں بیک وقت اٹھے، بیساختہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ ہاتھ ریش و گریبان تک جا پہنچے۔ پہلے ایک دوسرے کو جھٹکے دیے، پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ نوبت لاتوں اور مکوں تک پہنچی۔ گریبان پھٹ گئے، داڑھی کے بالوں کے گچھے ہوا میں ادھر اُدھر اڑنے لگے۔ دونوں کے منہ سے خون اور دانتوں سے فسوار بہ نکلی۔ ایک دو آدمی انھیں چھڑانے کے لیے آگے بڑھے تو صاحبِ صدر نے کہا "خبردار پاس نہ آنا۔ بحث بڑی تپی ہوئی ہے، فیصلہ ہونے دو۔"

تین وعظ

اوّل۔ یہ غالباً ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ میں ایک ہائی سکول میں مدرس تھا۔ پاس ہی سب ڈویژنل آفیسر کی عدالت تھی جس کے احاطہ میں ایک مسجد بھی تھی۔ متعدد مرتبہ اسی مسجد میں نماز ادا کر لیتے تھے۔ یہاں صلوٰۃ جمعہ بڑے اہتمام سے ادا کی جاتی تھی۔ متعدد مرتبہ دوستوں کے علاوہ سکول کا سٹاف، علیہ اور اردگرد کے لوگ بھی یہیں آ جانے اور اچھا خاصا مجمع ہو جاتا۔ ایک جمعہ کو ہم اس مسجد میں پہنچے تو امام صاحب غائب تھے۔ جب کافی وقت گذر گیا اور امام صاحب نہ آئے تو کسی نے ایک متشرع قسم کے آدمی سے کہا: "مولوی صاحب! آپ ہی تکلیف کریں اور نماز پڑھا دیں۔" یہ مولوی صاحب سب ڈویژنل آفیسر کے ریڈر تھے۔ شکل و صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کسی یتیم خانہ کے مہتمم رہ چکے ہیں۔ منبر پر آئے، حمد و ثنا کے بعد یہ آیت پڑھی "اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ ....." اور پھر یوں گویا ہوئے:

"برادرانِ اسلام! میں اس تھوڑے سے وقت میں صرف اسی آیت کی تفسیر پیش کروں گا۔ ایک زمانہ تھا کہ جب خدا اور فرشتے رسول اللہ صلعم پر درود بھیجتے تھے تو مکہ و مدینہ بلکہ ایران و عرب تک کے مسلمان ساتھ شامل ہو جاتے تھے اور آج ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو درود بھول ہی گیا ہے۔ اسلام ہی نہیں رہا درود کہاں سے آئے۔ یہ لوگ جو اس وقت میرے سامنے نہایت خضوع و خشوع کی حالت میں مٹھے ہیں بظاہر بڑے پارسا نظر آتے ہیں لیکن اے اللہ ان کی ظاہری سنکھی سے دھوکہ نہ کھانا' اندر سے یہ بڑے ..... زادے' ..... کے پٹھے اور ..... کی نسل ہیں۔ یہ سب کے سب تیرے نام اور تیرے قرآن کی قسم کھا کر ابھی ابھی میرے سامنے جھوٹی شہادتیں دے کر آئے ہیں۔ ان میں کوئی چور ہے' کوئی زانی' کوئی بدمعاش اور کوئی اپنے بھائی کا قاتل۔ کیا مسلمان ایسی قسم کے ہوتے ہیں؟ لعنت ہے ان پر' ان کی ہزار پشتوں پر اور آنے والی لاتعداد نسلوں پر ....."

اس مرحلہ پر میرے بیٹا ماسٹر نے جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے چپکے سے کہا: "چلو چلیں۔ آج اتنی ہی گالیاں کافی ہیں۔" چنانچہ ہم اٹھے اور دبے پاؤں جا رہے تھے کہ مولوی صاحب کی نظر پڑ گئی۔ چند آوازے کسنے لگے:

"اے اللہ! وہ دو ملعون تیرا مقدس کلام نہیں سننا چاہتے۔ ان ..... ذاتوں کا نام نوٹ کر ....."

دوم:۔ یہ غالباً اپریل ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے۔ مسند صدارت پر آنریبل سر میاں محمد شفیع جلوہ افروز ہیں۔ سٹیج پر اکابر و مشاہیر تشریف فرما ہیں۔ بشمول حکیم مشرق علامہ سر محمد اقبال' سر عبدالقادر' خواجہ دل محمد' سید احمد شاہ بخاری پطرس' ڈاکٹر تاثیر' علامہ عبداللہ یوسف علی' پروفیسر فیروز الدین مراد' مولانا حسرت موہانی' مولانا شمس العلماء اور نسی واشالہم۔ ان دنوں کالج کے ایک طالب علم عزیز پاشا کا طوطی بول گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بہت بڑا مقرر اور سمجھنے لگا تھا۔ جلسہ کے دوران میں وہ دو ہی کام کرتا تھا۔ اوّل پنڈال کے نیچے دبے پاؤں ہر شخص کے پاس جاتا' اپنی روی ٹوپی آگے بڑھاتا' حسب توفیق آنہ دو آنے وصول کرتا اور جب ٹوپی بھر جاتی تو سٹیج پر جا کر سکرٹری کے سامنے انڈیل دیتا۔ دوم جب کسی مقرر کی تقریر ختم ہوتی تو عزیز پاشا شور مچا دیتا کہ "اب میری باری ہے۔" دو ایک بار سٹیج پر جا بھی چکا۔ سکرٹری صاحب لاکھ روکتے' لیکن وہ دو تین منٹ ہی میں ایک دھواں دھار تقریر جھاڑ دیتا۔ تقریر کچھ اس قسم کی ہوتی:

"اس وقت دنیا کی سیاست کا توازن' اقتصادیات کا توازن' اخلاقیات کا توازن' یہاں تک کہ دال روٹی اور آٹو کا توازن' اس سکرٹری کے دماغ کا توازن مجھے تقریر سے روکتا ہے۔ مسلمان اور ہندو کا توازن' تمہارے اور ہمارے پیٹ کا توازن سب کچھ بالکل سب کچھ خدا کی قسم سب کچھ (جوش' منہ سے جھاگ' میز پر زور زور سے مکے) تہ و بالا ہو گیا ہے۔ لاؤ فاروق اعظمؓ کا دُرّہ' لاؤ لاؤ عصائے موسیٰ' لاؤ لاؤ جبریل کے آنسیں کوڑے' لاؤ لاؤ میرے گھر سے ڈنڈا' میں تم سب کا پلستر بگاڑ دوں گا'

بھیجا بلیا کر دوں گا ..... فنا کر دوں گا، وہیں فضا میں بکھیر دوں گا ..... تو نے مجھے
کچھ کیا ہے ..... وہ اسٹیج ڈسمیٹ کر دیتے جاتے ہیں اور وہاں سے بھی تقریر کی آواز
چند لمحات تک آتی رہتی ہے، ہیں تم سب کا پلستر ....."

مولانا حسرت موہانی مسئلہ جبر و اختیار پر تقریر کر رہے تھے۔ چونکہ خلفشہ مزاج سے اس مسئلہ کا گہرا تعلق تھا اس لیے آپ اصطلاحات غیر مانوس فراوانی سے استعمال کر رہے تھے اور غالباً اباب اعتزال کے عقاید یونانیوں کے تصورات مابعد الطبیعہ، غزالی، رازی، ابن قیم، شعرانی، حسن بصری اور ائمہ کلام و فلسفہ کی آرا پیش فرما رہے تھے۔ ہر چند کہ تقریر نہایت عالمانہ و فلسفیانہ تھی لیکن سامعین کے فہم و ادراک سے بہت بالا تھی۔ میں اس وقت کھڑکی کے ایک بیچ پر بیٹھا ہوا جمائیاں لے رہا تھا۔ اتفاقاً جب ہی فرش پر بیٹھے ہوئے ایک مولوی صاحب پر نگاہ پڑی جو بڑے انہماک سے یہ تقریر سن رہے تھے اور بعض نکتوں پر کبھی سر دھنتے جاتے اور کبھی "سر جا جزاک اللہ" کہتے۔ عین اس وقت عزیز پاشا چندہ جمع کرنے کو تے مولوی صاحب کے پاس آ گیا اور ٹوپی آگے بڑھائی۔ مولوی صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ایک تو ان کی محویت کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ دوسرا کچھ جیسے دینا پڑتا تھا "معاف کر دیجیے" عزیز پاشا نے آسانی سے ٹلنے والا کب تھا "کیوں معاف کروں۔ کیا تم مفت تقریریں اور نکتے سنا جاتے ہو، میں مفت خوروں کو یہاں کبھی نہیں بیٹھنے دوں گا" اور پھر کڑک کر "چندہ نکالو۔ جلدی لاؤ ..... ورنہ ....." شور کی وجہ سے ارد گرد کے لوگ متوجہ ہو گئے۔ مولوی صاحب نے جھک کر "کواس بند کرو اور یہاں سے چلے جاؤ" اس پر عزیز پاشا آپے سے باہر ہو گیا۔ لگوں سے بھری ہوئی ٹوپی مولوی صاحب کے سر پر دے ماری، تیزی سے بیٹی کی طرف میں دیا اور بلند آواز سے کہنے لگا:

"غضب خدا کا، میں نے چندہ مانگا تو یہ مجھے کہتا ہے کہ واس بند کرو اور (عورتوں کی سی نقل
کی طرف اشارہ کر کے) یہ ..... (ناقابل اشاعت) ..... آدمی دو گھنٹے سے کواس سن کر
کچھ نہ کچھ (شبہ) کر رہا ہے اور اسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سر شیخ! (اس مولوی کی طرف اشارہ
کر کے) یہاں ایک غوڑہ بیٹھا ہوا ہے اس کے لیے پولیس منگاؤ۔ لاؤ لاؤ سیر الٹھا۔ لاؤ لاؤ
ڈرمہ ماروتی لاؤ لاؤ شعلے (بجلیاں) آگ بم (طوفان) سیلاب ....."

اور پھر اپنا سر ہنس ہنس کے مولوی صاحب کو لگا ہوں سے ڈھونڈھ رہا ہے جن کے لیے ڈنڈے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

سوم: یہ ۱۹۲۵ء میں سلسلہ فاروقیہ کی ایک گدی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں میں وہاں جانا ہوا تو اس وقت پیر زادہ محمد امین صاحب گدی نشین تھے۔ وہ خود تو انتقال فرما گئے ہیں لیکن ان کے صاحبزادے بدر امین خان بانکی ہیں اور ان کے بھائی خورشید محمد امین ماڈل ٹاؤن لاہور میں مکونت پذیر ہیں۔ بندہ صاحب سے ۱۹۲۳ء کے بعد ملاقات نہیں ہوئی البتہ خورشید صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پاکپتن میں اس گدی کے ساتھ ایک لنگر خانہ ایک زمانہ ایک خوشنما وسیع مسجد اور ایک دینی درس گاہ بھی تھی۔ میرے بڑے حقیقی بھائی نور الحق جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر رہے (وفات ۱۹۵۱ء) ان دونوں پاکپتن کی اسی درس گاہ میں معلم تھے۔ طلبہ کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں تھی۔ دراصل اس درس گاہ کا مقصد صاحبزادوں کی تعلیم و تربیت تھا۔ یوں سمجھیے کہ میرے بھائی

ان صاحبزادوں کے نانا تھے۔

۱۹۳۶ء میں تعطیلاتِ گرما کے لیے سُول بندر ہوا تو چالیس فی صدی بھائی صاحب کی اور ساٹھ فی صدی آموں کی کشش مجھے بٹالہ لے گئی۔ ایک روز معلوم ہوا کہ باہر کے کوئی خوش گلو واعظ رات کو شگر خانہ کی مسجد میں وعظ کریں گے۔ میں بھی اس محفل میں پہنچ گیا۔ واعظ صاحب کا اندازِ بیان یہ تھا کہ آیات، ترجمہ آیات اور مثنوی کے اشعار ترنم سے پڑھتے اور ادھر اُدھر کی کہانیاں سُناتے۔ وعظ تخلیقِ آدم سے شروع ہوا، معجزاتِ موسےٰ و عیسیٰ علیہما السلام، آتشِ نمرود، برقی طور، قیامت کی نفسا نفسی، شفاعتِ رسولؐ، کرامات خواجہ غریب نواز، خواجہ اجمیری، مسائلِ وضو، غازہ، جنازہ اور فرائض تک سے ہوتا ہوا چندہ کی اپیل پر جا ختم ہوا۔ اس درمیان میں گلستان، بوستان، مثنوی مولانا روم اور دیگر کتابوں کی مثالوں حکایات بیان ہوئیں جن میں سے ایک یہ تھی:

"ایک آدمی ایک سیر گوشت پکانے کے لیے گھر لایا۔ اس کی بیوی بلّی قسم کی عورت تھی جو بلّیاں کو خور کھا گئی اور خالی شوربہ میاں کے سامنے رکھ دیا۔ میاں نے پوچھا "بوٹیاں کہاں ہیں؟" کہنے لگی "گوشت ہی کھا گئی تھی اور یہ شوربہ صرف مسالے کا پانی ہے۔" اتفاقاً اس وقت بلّی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ میاں اُٹھے اندر سے ترازو لائے اور بلّی کو پکڑ کر تولا۔ وہ بلّی ایک سیر نکلی۔ میاں نے حیرت سے کہا (بقول حکایت نگار) ؎

ایں اگر گوشت است گربہ کجاست
ایں اگر گربہ است گوشت چہ جاست

(اگر یہ گوشت ہے تو بلّی کہاں گئی اور اگر بلّی ہے تو پھر گوشت کہاں گیا)"

مولانا نے اس خارجی شعر کا ترجمہ اُردو شعر میں فرمایا اور کافی پراثر رکھ کر مثنوی کی لمبی زبان میں اس طرح مجسم تجسم کر گویا کہ ساری کائنات پر وجد سا طاری ہو گیا ؎

گربہ بلّی ہے تو گوشت ہے کہاں
گر یہ گوشت ہے تو بلّی ہے کہاں

صحن مسجد کے کنارے کسی کاج کے چند طلبہ کھڑے تھے۔ انھوں نے اس شعر پر پہلے تو تالی بجائی، پھر مکرر مکرر کا شور مچایا۔ مولوی صاحب بار بار شعر کو چرچ رہے تھے، مسکرا مسکرا کر اس بے پناہ داد کو وصول فرما رہے تھے۔ اِدھر طلبہ کے لئے کہاں کا شور ان کی فرمائشیں اور ساتھ ہی قہقہے بڑھتے ہی جا رہے تھے اور مولوی صاحب اس بے اندازہ "حوصلہ افزائی" سے یوں جھوم رہے تھے جیسے ہیں کے سامنے سانپ ناچ رہا ہو۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک آواز آئی "ذرا مجمع کے دوسری آواز" ذرا ہٹ کے "تیسری" میرے پیچھے "چوتھی" میرے نکلیے"۔ مولوی صاحب گرم ہو گئے "نعوذ باللہ خدا میں یہ کہا مذہب ہے تو مذہب بھی سیکھی ہے یا خالی پیٹوں ہی رہنا جانتے ہو۔ لاحول ولا ..... نعوذ باللہ ..... لعنت اللہ ..... اور وعظ کے بل کر سر اچھلا ہے الجھا، جیب میں پڑا رہا نہ میں ٹیلا نگاتے ہوئے مسجد سے نکل گئے۔

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غلام احمد فرقت کاکوروی

اب چاہے آپ نہیں یا ناظرین مگر میں یہ کہوں گا کہ بنیاد ایماندار اور شریف قسم کا انسان ہوں۔ سوائے بیوی کے کسی سے جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا۔ حد یہ کہ زندگی میں کبھی سے جھوٹ نہیں بولا اور اگر دوسرے تیسرے جھوٹ بولنا بھی پڑتا ہے تو محض حکمت عملی کی غرض سے یہ سوچ کر کہ بہرحال ہم کو اسی دنیا میں اور کرانی پڑی زندگی گزارنا ہے۔ ہلدام کس طرح دنیا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھ سکتے ہیں۔ مگر دعوٰی کا دینے کی کوشش سے صاف اپنا دامن بچا کر گستاخی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ہیں بھائی اب تک تلی ہے۔ دوست احباب اور عام رشتہ داروں کے ساتھ بھی ہمارا ایمانداری کے ساتھ معمول رہا کہ اگر کوئی جھوٹ بات کبھی طور پر ہمارے منہ سے نکل گئی تو کبھی ہم نے اس کی تردید نہیں کی اور قول مردان جان دہد و سد کے اصول پر قائم رہے۔ اگر کسی دوست نے ہماری جیب سے ہم کو سیٹی دکھانے پر آمادگی ظاہر کی تو ہم نے کبھی اس کا دل میلا نہیں ہونے دیا۔ پھٹی کے تختے پر چڑھ کر کبھی برت بدی، فیشن، شطرنج، پچیسی یا اسی نوعیت کی دوسری مہذب سماجی نشستوں میں ہم آخر دم تک دوستوں کے ہمراہ کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھے رہے۔ اور ناک سے ناک ہوتے ہوئے بھی ان میں شرکت سے نہیں بھاگے۔

اتنا بھی ناری ظاہری برائیوں سے بے حد الرجک اور ناخوش ہونے کے باوجود ہماری نیک اور شریف النفس بیوی اس کی گواہی دیں گی کہ بھری عدالت میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ الحمد للہ جب ہمارے والد مرحوم آخری مرتبہ حج سے دو روز بعد سکرات کے عالم میں مبتلا کیے اور ہم کو دیوبند بھیجا گیا تو وہاں ہم اقرار نامہ اور محض کھیلے ماؤں کے بدلے دل نہ میلا کرنے کی خوشی سے فلش کی ایک تہائی رقم میں شریک ہو گئے اور جب دوسرے روز خاکم بدہن ہم تیرستان میں والد مرحوم کی تیرہے پٹ کر ہاتھ میں ہار دے رہے تھے اس وقت بزرگ تو بزرگ کوئی خورد تک ہمارے دل و دیدہ کو نمی نہیں دکھا سکتا۔ ہائے ہم پر نصیب کو ابا کا اکلوتی دیا بھی نصیب نہ ہوا۔

اس کا اقرار تو ہم پھر بھی ایمانداری کے ساتھ یہاں سے خدا کے گھر تک کہنے کو تیار ہیں کہ ہم نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، رمضان کی تراویح میں حصہ نہیں لیتے۔ اور اپنے پیسے سے فاتحہ اور درود نہیں کرتے مگر آپ ہمارے بچوں کا ہاتھ پکڑ کر انھیں قبلہ رو کھڑا کر کے خدا تعالیٰ سے عبادت نہ لیجئے کہ اس مرتبہ بھی رمضان میں افطار کے وقت ہم تین دن میں کسی ایک بھی دسترخوان پر سے غیر حاضر نہیں پائے گئے۔ ان بچوں میں سے دو ایک تو غیر حاضر رہے ہوں تو دوسری بات ہے مگر ہم ہمیشہ واحد حاضر ہوتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ کوشش میں رہتے ہیں کہ پہلے سے ہمارا دسترخوان کبھی کوئی شب کسی سال بغیر سحری کے نہیں گزری۔

مذہب کے تقریباً تمام ہی سانچے باوجود مذہب اور ہر عبادت کو ہم دنیا کی بہترین عبادت تصور کرتے ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ

تمام جلسے، ذکر مجلس اور میلاد شریف سے ہم کو بے لوث عقیدت ہے۔ ہم ہمیشہ اُن میں اُس وقت شریک ہوتے ہیں جب پڑھنے والا "اب دھاگے نے اٹھا" ہاتھ" والا فقرہ ادا کرکے لمبر باجو کی پہ آنے لگتا ہے۔ چونکہ ہم ہمیشہ اپنے نہ ہی عقائد کو دوسروں کے عقائد سے علیٰ اور برتر سمجھتے ہیں اس لئے ہم ہونگ پھلی، کھجوری روٹی، کھچڑے اور اسی طرح کی چھوٹی موٹی اور پچھلے جلسے کی مجلسوں میں شرکت سے گریز کرتے ہیں اور گھر جاکر شاہی ٹکڑوں والی محفلوں میں شریک ہوکر تمام دن ہر دُھر حصہ لینے والوں کی تشکیل بنانے کی سخت میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کرنا ہمیں ہمارے مذہب انسانیت کچھ اور مجلسوں اس وقت بھی سکھاتے ہیں جب ہم ایک ہاتھ باہر نکال کر دوسرا ہاتھ کسی کی بغل سے نکال کر پابندی سے دو جیتے وصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ تبرک حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کہ معاذ اللہ دھوکا دہی یا فریب۔ زیادہ تبرک حاصل کرنے سے انسان کی نیت خراب نہیں ہوتی ہے۔ دل دماغ باغ باغ ہو جاتا ہے۔ رہا رشتی، جھوٹ، مکر و فریب، دھوکہ دہی جیسے سفلے اور پست جذبات تھے پڑھتے ہیں۔ جیسے پر شکنتلا، خون میں ہابیل، ہاتھ پاؤں میں جیسی، عام کا چیز میں حیلت پیرت، آنکھوں میں چمک اور اعضا میں توپیدا ہو جاتی ہے۔ اور عام فلسفے اور دور کرنے والے مذہبوں سے عقیدت ہٹھا شروع ہو جاتی ہے۔ سچا اب ہی اضمحلے سے بتلاتے ہیں کہ اس میں ہم کون سے گن ہیں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اور کیا ذاتے ہیں دین کے عالم اور شرع کے پیشکے دار دعویٰ اس سکے کے کہ اگر کوئی شریف مرد اپنی بیوی کے اس تقدس پر کہ ہم اس بیاہی رانڈ، مُلّا دیکھیں گے یہ کہے کہ "اور کہیں دوتی کرلی" سو یہ تماشا تو ہمارا دو تین مرتبہ کا دیکھا ہوا ہے اور بعد پھر ہے۔ خواہ ہم نے اس تماشہ کو ایک مرتبہ بھی نہ دیکھا ہو تو کیا ہمارے اس کہنے کو جھوٹ یا معاذ اللہ فریب نصر کیا جائے گا۔ جب کہ یہ کہتے وقت کفایت شعاری کا جذبہ ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔

اب رہا یہ کہ ہم نے دیوالی اسپرے میں ہم ساری رقم ہار کر اپنی دونوں اندھیر کرکے گھر پہنچے ہیں اور خوش جھگڑا ختم کرنے کی خوش سے ہم نے بیوی سے کہدیا کہ دھلوا میں حاضری لے کر آرہے ہیں تو اس میں کون سا جرم ہو گیا۔ دھلوا میں سے کہ کر دو تین گھنٹے کے بعد آنے میں ان کی نظروں میں ہر چیز حتیٰ کہ جوا تک سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم کسی مشاعرہ میں معاوضہ پر بلائے گئے اور ہم نے گھر آکر کہدیا کہ آج ہم نے مشاعرہ میں سوائے واہ واہ کے کچھ ہاتھ نہیں لگا تو اس میں دروغ گوئی کا کونسا پہلو نکل آیا۔

خواتین معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ مرد کا کہنا ہے کہ عورت بے وقوف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اُس سے کچھ کہی بات کہہ کر اک ذرا معاندہ دلے پہلو کی چالیں تو اس میں ہرج کیا ہے۔ ایجاد کا کون سا پہلو کہاں سے پیدا ہو گیا، یا خیر سے دانت گئے گھر آنے پر اکثر ہوتی۔ بلا سوچے اور ملائے آنکھ کو نکھول دیئے اور ہم انگوٹھوں پر اپنی تمام بدا عمالیوں کا بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ گھر میں داخل ہوئے تاکہ کسی کی نیند خراب نہ ہو۔ اور اس دبے پاؤں، آنکھ کی چنگ سے بیوی کی آنکھ کھل گئی اور اس نے کہا: "اس وقت تشریف لائے ہیں آپ! کیا بجا ہے؟ ہم نے اپنی پوری حاضر جوابی کو کام میں لاتے ہوئے جھٹ ہی جواب دیا کہ کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت ہوگا تو اس میں ہم نے کون سا زہر ملا دیا۔ ہم نے تو ذرا سی اپنی گھڑی کی سوئی ہی گھما دی ان کو کیسے بڑے بڑے گھنٹے غلط بجاتے ہیں۔

ریڈیو پر ہم جیسے تقریر کرتے ہیں۔ اس کے بعد اگر ہم گھر آکر بیوی سے کہدیں کہ ریڈیو کی تقریر میں آج یہ پہلا اور آخری موقعہ ہے کہ ایک شخص سے تقریر بھی کرائی گئی اور اسے پیسے بھی نہیں دیئے گئے محض اس جرم میں کہ نہ کام کی زیادہ سے اس کی آواز ریڈیو پر فٹ نہیں آتی بھلا تم ہی بتاؤ کہ اس میں ہماری آواز کی کیا غلطی! مگر نہیں صاحب پیسے نہیں دیں گے۔ ہم نے بھی غصہ میں کہدیا کہ اچھا جانے دیجئے نہ دیجئے اصل بات یہ کہ

کر گھر واپس چلے گئے؟ اب ہمارے اس کہنے کے بعد بھی اگر کوئی ہم پر دانت پیسے یا غصہ گری کرے تو بتایئے ہم کیا کریں۔ اگر ہم کوئی ناقابل یقین بات کہتے تو ہم اور ہماری تین پشتیں بے وقوف۔

ہم لوگ عیدین پر ذبیحہ کی زیادتی کے قائل نہیں۔ ذکر کرنے کے جو قدر قلت میں ہم سے اعلیٰ ہونے کے باوجود بعض چیزوں میں ہم پر فضیلت رکھتا ہے۔ مثلاً ہم کل دو انگلیں رکھتے ہیں۔ اس کے چار ہوتی ہیں۔ ہمارے سر پر سینگ نہیں ہوتے وہ ماشاء اللہ دو دو سینگوں کا مالک ہوتا ہے۔ ہمارے دم نہیں ہوتی۔ اس کے ماشاء اللہ دُم ہوتی ہے۔ اس کے دو کان ہمارے پورے خاندان کے کانوں کو جوڑنے کے بعد بھی دو چار انگل پڑے ہی بچیں گے۔ اس کی کھال ہماری کھال سے کہیں زیادہ موٹی اور جاڑے میں لحاف اور دوسرے کاموں اور جوتوں میں استعمال کی جاسکتی ہے جب کہ ہماری کھال کے معمولی چپل بھی نہیں بن سکتے۔ رنگ و روغن کے لحاظ سے بھی وہ ہم سے کہیں خوبصورت اور حسین ہوتا ہے۔ پھر جو آپ نے وہ ہنگ کر آپ ایک فرلانگ سے سن لیں۔ ایسی صورت میں ہم ازراہ ہمدردی اس کی زبانی کو اپنی زبانی سمجھتے ہیں تو ہم کیونکر دل اور مذہب ناحق شناور قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

کیا آپ ہماری اس بات کو بزدلی یا معاذ اللہ کاہلی پر محمول کریں گے کہ اگر رات میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی اور ہم نے لحاف کے اندر سے کہہ دیا "دیکھو سردیوں میں کہاں کون دیکھتا ہے کون ہے؟ اگر ضرورت پڑے تو مجھے بھی آواز دے لینا" تو اس میں ہم نے کون سا ہنر دکھایا۔ مگر ہمارے اس کہنے کو بھی لوگ ہمارے ڈرپوک ہونے پر محمول کرتے ہیں جبکہ ہم محض اپنی بیوی میں ہمدردی، مردانگی، جرأت اور ہمت کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے ایسا کہتے ہیں۔

ہم کسی کا کوٹ، پینٹ، جوتا یا ٹوپی بلا اس کی اجازت کے یہ سوچ کر اپنے استعمال میں لے آتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح دوسروں کی چیزیں استعمال کرتا ہوگا کیونکہ انسان انسان سب بھائی ہیں۔ صاحب اس طرح کی مساوات پر ہماری شدت سے بھروسہ اور ایمان پکے پر پوٹیاں نوچا کیں جتنے ہم اگر گھر میں سوتے ہوئے بستر پر پڑے پڑے بیوی کے بچوں سے بھر لیتے ہیں تو ان کو کام کرنے کی مشق ہی تو کرتے ہیں خدانخواستہ کاہل تو نہیں بناتے پھر اگر اس پر کسی کا خون کھولے تو اس میں ہماری کیا غلطی؟

آپ خیال فرمایئے کہ ہم پوری ایک رات اور تقریباً پورے ایک دن کے جاگے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ پلکیں نیند سے بوجھل ہیں۔ جمائیوں پر جمائیاں آرہی ہیں۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ پلنگ ملے اور ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو جائیں اس پر بھی نارسائی ہے۔ جاگنے کی وجہ بھی اس لیجئے کسی بے کار کام کے لئے جاگے ہوں تو ہم پر زمین آسمان ٹوٹ پڑیں۔ لیٹے لیٹے چھت پر کمر رم کی مشق کر رہے ہوں تو چھت پھٹ پڑے۔ روپیہ پیسہ کمانے میں کسی قسم کی کوتاہی برتتے ہوں تو قابل گردن زدنی۔ یہ تو آپ سب لوگ ہی جانتے ہیں کہ بیوی کے والا اپنی عاقبت پر نگاہ رکھتے ہے۔ روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑے بڑے عہدے حاصل کرتا ہے۔ جدوجہد کرتا ہے زندگی ہے کیا؟ ایک جوا ہے۔ اچھے پتے ہاتھ لگے تو پو بارے ورنہ کنگال۔ تخت یا تختہ اسی کا نام زندگی ہے۔ پھر یہ تو انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے۔ اور اگر رہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ اپنی ذات سے کسی کے جذبات کو مجروح نہ کرے اور کسی کا دل نہ دکھائے۔ اگر ہم ہر چیز دوسروں کے شریک ہوں گے تو دل دوسرے ہمارے شریک ہوں گے۔ اب سنئے ہم دفتر سے گھر واپس آرہے ہیں کہ ہم کو ہمارے ایک مخلص ترین دوست مل جاتے ہیں اور ہم سے اصرار کرتے ہیں کہ چلو تمہاری کی ایک سالانہ نشست میں شریک ہو لیا جائے جو اللہ بخشے ہمارے ایک مرحوم دوست کی برسی کے سلسلہ میں منعقد ہوئی تھی کیونکہ ہمارے دوست کا ہمارے گھیلے ہی گھیلے موکب قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا تھا۔ اب اس میں ہماری عدم شرکت کے معنی یہ ہوتے کہ

ہم خاتمہ درود اگر خود نہیں کرتے تو اُس میں شرکت تک نہ کریں چنانچہ ہم بھی میں شریک ہوئے۔

ہی کے بارے میں جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ ارم سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جنت۔ لہٰذا اس کھیل کو ہم ایک قسم کی عبادت سمجھتے ہیں اور اسی لئے بجائے ہی کے اسے ہم اور ہمارے دوست جنتی کھیل کہتے ہیں اور اسے زمین پر کھیل کر جنت الفردوس کے مزے لوٹتے ہیں۔ ذکا الحیش نصف الحیش ماالسان جنت ہی کی خاطر باعث کرتا ہے نمازیں پڑھتا ہے سجدے کرتا ہے۔ دعائیں مانگتا ہے، درگاہوں اور مزاروں کی خاک چھانتا ہے گن ہو لے سے توبہ کرتا ہے۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ مُنّا اور دکن پہلو بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ سنبھال کر تو سانس لینا پڑتی تھی کہیں دھیان ہٹ جائے اور غلط پتہ ہاتھ سے نکل جائے۔ موقع کا پتہ چلنا اور اٹھانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس میں کامل یکسوئی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے درویشوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ دنیا اور مافیہا سے بے نیاز ہونا اس میں پہلی شرط ہے۔ اس میں ساری ذاتوں کو اکھٹا کرنا پڑتا ہے۔ پوری کھیلی ہوئی بازی اور چلے ہوئے پتوں کو دھیان میں رکھنا ہوتا ہے۔ دائیں بائیں ہر شخص کے چہرے پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے ساتھیوں کے جذبات کا احترام کرنا ہوتا ہے۔ ایک ایک چال میں ذہن اور یادداشت کو سینکڑوں ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں ان حالات میں بیچارے کیا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ پتے کھیلنا بڑی بے قراری کا کام ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دفعتہً بھی کی درخواست دینا بھی بھول گئے اور نشست میں سو روپے ہار گئے۔ اب انصاف فرمایئے کہ ہم پر ایک طرف تو چار چار غم لدے ہوئے ہیں اول ملازمت چھٹنے کا خدشہ، دوسرے سو روپے ہارنے کا غم، تیسرے نیند کا غلبہ اور تکان اور خدا آپ کا بھلا کرے ہوتے اس ڈیڑھ دو درجن کے حلقہ میں جو ایک کھیل تک نہ کوگی ہو جسکے سبب چھوٹی اُمت بڑی اُمت کو کھائے جا رہی ہے۔ چنانچہ جب ان چار غموں کے بوجھ میں لدے پھندے ہم گھر پہنچے تو گھر میں ہم پر صلواتیں شروع ہو گئیں اور وہ جو ہماری دفینۂ حیات کے نام سے موسوم ہیں انھوں نے تو تہا ہم کو گھر لیا۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے ہم نے بھی ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے ہم نے بھی ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا

جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

مگر ان کا فیصلہ کے طوفانوں سے سناٹی کے بعد سے چوکڑی دن بمصطر پڑ رہا ہے اس لئے سب ہمارے سامنے کوئی حرکت نہیں کرتے ہم ایسے طوفانوں کو ایک نقرے میں کالعدم کر دیتے ہیں چنانچہ ہم نے جھٹ تیور بدل کر غصہ کم کرنے والے انداز میں کہا۔ "صرف اپنی کہہ جاؤ گی یا دوسروں کی بھی سنو گی۔" بولیں "کہئے نا" ہم نے کہا، "ہم خدانخواستہ کسی جماعتی میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ کسی رنڈی منڈی کے پاس نہیں گئے تھے کسی چوری ڈکیتی میں شریک نہیں تھے۔ بلکہ ایک سرکاری کام سے بیلاری میل الکشن کے کام سے سرکار نے بھیجے ہوئے گئے تھے۔ جس کا حکم کو معاوضہ ملے گا اور اب کی تنخواہ میں ساٹھ سو روپے زائد ملیں گے جس سے تمہارے سونے کے ہار کی ڈیفشن پوری ہو گی۔ اس پر کھسیانی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ "تو گھر میں بتا دیا گیئے کہ فلاں جگہ جا رہوں۔" ہم نے کہا کہ "نہیں ابھی حکم ہوا کہ چلے جاؤ چنانچہ ہم کو جانا پڑا" اس پر دوبارہ مسکرا کر بولیں "مگر آج ایک کام آپ کو میری خاطر سے ضرور کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ فقیر محمد شاہ کے لئے پرسوں سالگرہ ہے اس میں بچوں سے مراد پوتے لئے اور تھوڑا سا تبرک ضرور لیتے آیئے۔ آخر آپ کو خدا کے گھر جانا ہے یا نہیں۔ دنیا چند روزہ ہے۔ عبادت نہیں کرتے تو مزاروں ہی پر ہو آیا کیجئے۔ آخر کسی کی دعا لیجئے ورنہ بچے کی آپ ہی جیسے ہو کر رہ جائیں گے۔" ہم نے بدلتے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ "بہر حال تبرک تو ہم لائیں گے مگر ہم کسی بچے کو یا تم کو کھانے نہیں دیں گے کیونکہ وہ نہ جانے کتنے ہیضوں کی دکھی ہوئی ریوڑیاں ہوتی ہیں جو تبرک کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہیں جو چڑھاوا چڑھتا ہے اس کا حساب کتاب تم کو معلوم نہیں! ہوتا یہ ہے کہ درگاہ کے باہر حلوائی والے ریوڑیاں رکھے ہوتے ہیں وہ لوگ وہیں کے ہوی جاتے

ہیں لوگ ان سے بڑھ بڑھ کر نذریں چڑھاتے ہیں اور جب مزار پر سن ڈیڑھ سن بکروں کا ڈھیر لگ جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے دکانوں پر چادروں میں بھر بھر کر بار بار بکنے بھیجے جاتے ہیں اور اس طرح چوبیس گھنٹے کے اندر ایک ایک بوڑھی مزارات دوکان لگ کر پھر سے کرنی ہے۔ یہی ابتدائی کے ذریعے ہیں جو مزار والوں کو ہوتے ہیں۔ اولیں یہ سب بھی ہے بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے ہم نے کہا کہ ابھی پچھلے سال کیا ہوا؟ اخباروں میں چھپا تھا کہ فلاں فلاں مزار سے واپسی پر ترک مذہب کر لیتے ہی ایک بوڑھا ان معذوروں کے مرگیا۔ اس پر گھبرا کر خادم مزار پر اس نے بچوں کو ہرگز ہرگز مزار پر نہ جانے دوں گی! ہم نے کہا "بھلے کیا ہوتا ہے۔ مزار پر فاتحہ پڑھ کر چلے آئیں گے" بولیں "نہیں اگر ان میں سے کسی نے ترک کی فرمائش کر دی اور آپ نے ہی دلوا دیں اگر میں تو بچوں سے ہاتھ دھو کر بیٹھ جاؤں گی آپ کا کیا جاتا ہے۔ ہم نے کہا کہ تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو کیا یہ ضروری ہے کہ تمام مزاروں پر ایسا ہی ہوتا ہو اور ترک مذہب دلوایا جاتا ہو۔ اتفاق تھا جو ایک آدھ ویرانی سر گنگی اور سجادہ نشین اور دوکاندار صاحبان کی نظروں سے چوک گئی اور وہ جھانک کر بھیک نہ سکے۔ گرد کسی حرج نہ مانا تھیں نہ آئیں۔

خدا جانے کہاں سے والدہ عشق و محبت کا کیڑا اتھا اور سنتے جاتے جس میں کہ آپ حضرت کی جان سے دور ہم ہوت کے مزیں جاتے جاتے رہ گئے۔

اگر خدانخواستہ آپ سب شادی شدہ ہیں تو صاحب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ شادی کے ابتدائی چھ ماہ کہ عوات شوہر کی نظروں میں اوج پر ہوتی ہے۔ سال سوا سال گزرنے کے بعد پوری ہو جاتی ہے۔ ایک اولاد کے بعد اور بھی۔ دوسری کے بعد مرات اور اس کے بعد عورت ارمان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب وہ جوڑے دریچے میں ہوتی ہے تو اپنے شوہر سے کیسے کیسے شوخ غمزے کرتی ہے اور شوہر ہمارے کس انداز میں ناز نخروں کے ساتھ لیس دینے کی کوشش کرتے ہیں بس یہی حال ہمارا سمجھ لیجئے کہ شادی کے تیسرے دن ہمیں خیال فرمانے کہ شیریں نے زیادہ فرمائش کی کہ ہم سیکنڈ شو سینما دیکھیں گے۔ یہاں جب ابھی تک چاند ہے کہ مالک اللہ یوں کا ہر حکم ان کے بچوں کی طرح انہیں کو ذکر ان لیتے ہیں آس وقت تو بہر حال آپ سب حضرات صاحب دل ہیں مگر مصیبت یہ تھی کہ ایک جان، نوالی پر تین تین ساریاں اڑی جا رہی تھیں۔ ایک ان کی چھوٹی خالہ جان سے عمر میں چھوٹی تھیں اور دوسری پھوپھی یا خالہ ساس اور تیسری ان سے بھی کوئی اور ہوئی تھیں مع اپنے ایک دو سال کا بھی صفت بچے کے جانے پر مکر بستہ تھیں اور دو ہم دونوں۔ یہ چاروں ساریاں ایک تانگہ پر سکیڑ سکڑا کے بیٹھیں اور ہم دونوں سائیکل پر روانہ ہوئے۔ اتفاق ان عورتوں میں کوئی نہ تھا جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں وہ بارے گھر سے نکلنے کا مقصد تو تھا کہ تھوڑے زمین و آسمان ایک دوسرے سے جگمگاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیڑھ بجے شب کو جب فلم ختم ہوئی تو ہمارے خالہ خاص اپنی بیماجزادے کو اٹھانے لگے۔ خدا جانے کب کہاں کا ہیضہ سمجھ کر یہاں پیدا ہو گئے تھے۔ اس بری طرح پھولا تھا۔ اندازہ فرمائیے کہ جب اور اسکی ماں کو بس اتنی بھی اس کا اٹھانا بھاتا نہ تھا اور وہ دھوپ کے وقت وہ پسینے پسینے ہو جاتی تھیں تو ظاہر ہے کہ ہم کس شمار قطار میں ہیں بس وہ تانگ گھڑیاں ہیں ہمارا

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

اس پر تو کوئی ظاہر ہے کہ ہم اپنی سعادت مندی کے پیش نظر اپنی حوصلت کتر کو آٹھ نہ رہتے ہیں لیتے اور نہ ان کی خالہ کی جرأت ہاتھ لگانے کی اجازت دے سکتے تھے۔ لہٰذا فقیر درویش پر جان درویش

سب جس بار نے گرانی کی
اسکو یہ ناتواں اٹھا لایا

چنانچہ مگرمچھ بڑھتے ہوئے سب سے پہلے ہم نے اپنے دل میں بارگاہِ ایزدی کے روبرو اپنے گھٹنے گاں ہوں کا صدق دل سے اقرار کیا۔ اس کے بعد اپنے حواس درست کئے۔ جسم کے رگ و پٹھوں کا دیرینہ سستی سے عنقریب یہ ہونے والی بیزاری پر نگاہ کی۔ آخری بار عالم کی بے ثباتی پر غور کیا اور اکڑی پڑی۔ دو چار اور چھوٹی چھوٹی آیتیں، جو رد بلیات والی یاد تھیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کیں۔ اس کے بعد یہ سوچ کر کہ موت برحق ہے۔ ایک ان ہر پیدا ہونے والی چیز کو یہ دن دیکھنا ہے۔ چنوائی ہوئی آنکھوں سے اس عزرائیل یعنی بچے کو دیکھا۔ اس کے بعد گھبرا کر دست بچہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں یا علی کہتے ہوئے ہاتھی کو جنبش دی تو بیڑہ گھوم تو گیا مگر موزی اسٹارٹ نہیں ہوا۔ اب ہم نے دوبارہ پورے اخلاص کے ساتھ یا علی خیر شکن کہہ کر جو ہاتھ کو جنبش دی تو وہ اسٹارٹ ہو گیا اور ہم نے اس کو اپنی پوری جان پر مسلط کر لیا۔ بہرحال ہم نے اس کو لے تو لیا مگر لینے ہی ٹنشن کے مریض کی طرح ہم کمان کی شکل میں توس قزح بننے لگے۔ ہماری حالت اس وقت عبرت ناک تھی کہ ہماری بیوی اور ان کی خالہ نے بڑھ کر ہاتھوں کا سہارا دیا ہم نے دونوں ہاتھ ہاتھی کے لنگر روکنے میں لگا دیئے اور اس آپ گم کی بھی پروانہ کی جس سے اس کا چلانا تو بہتر تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ چوتھی کی دلہن کی مانند ہم پندرہ منٹ تک بال سے باہر تک دس گز زمین طے کر کے ہموار زمین تک پہنچے۔ اس وقت سڑک پر صرف وہی تانگے تھے جن پر شہد کی مکھیوں کی طرح لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور تانگے والے زمین و آسمان کے بھاؤ بتا رہے تھے۔ ایسی وہ مواقع ہیں جہاں بڑے اچھے بھلے انسان کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہماری محترمہ اور ان کی خالہ بوقت پوشش ہونے کے سبب تانگے والوں سے ہم کلام نہیں ہو سکی تھیں اور مردوں سے دور تجرد نمونہ بنی کھڑی تھیں۔ ہم چونکہ فلک سے میدان بدے ہوئے تھے یعنی ایک پہاڑ اٹھائے کھڑے تھے اس لئے ہم پر سکوت کا عالم طاری تھا اب سوال ان تانگے والوں تک پہنچنے کا تھا۔ اول بھیڑ کو چیرتا پھرتا تانگے والوں تک رسائی، اس کے بعد بڑی بولی بول کر تانگے والوں کو بھیڑ سے چھانا۔ یہ ہفت خواں طے کرنے کے لئے ایک اچھے بھلے انسان کی ضرورت تھی نہ کہ ہم جیسے بار بردار کی۔ ہم پہاڑ کے نیچے دبے ہوئے بار بار پوچھ رہے تھے کہ ہائے کیسی چوک ہو گئی بوالدہ سے چلتے وقت دعوہ نہ سختوالیا۔ ہم اسی غور و فکر میں بیٹھے رہے ایک بھیڑ کے برابر پہنچ گئے۔ ہاتھی نے ٹھنڈک سے بچھلے کے بچھلے کو ہلا کر ہماری گردن میں سانپ کی طرح دونوں ہاتھوں سے گنڈی مار لی۔ اور ہماری سانس جو جسم سے بھاگ کر حلق میں پناہ گزیں ہوئی تھی گھٹنے لگی۔ مگر جب اسٹین گراڈ پر بھی دشمن کا دباؤ پڑنے لگا تو ہماری آواز میں نہیں میں کچھ ترنم پیدا ہو گیا۔ اور پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں دور پر کسی بدنصیب بھیڑ بندر کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ ہمارے تھے بیک وقت اتنی سانس لینے کے بھی عادی نہ تھے۔ اُن کا یہ عالم تھا کہ پھٹے جا رہے تھے۔ غور میں دور کھڑی سمرزیم کی منت کر رہی تھیں۔ ہماری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آیا جا رہا تھا۔ دل نے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہونے کو کہا۔ "ابے! پورے لنگر کو سنبھالتے ہوئے بیٹھ جا ورنہ ہم تیرے بیٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ جائیں گے۔" چنانچہ ہم نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور آہستہ آہستہ پیروں کو گھٹنوں کی مدد سے کمان بناتے ہوئے موری کے لنگر پر جہاں کہ ہم کھڑے ہوئے تھے بیٹھنے کی کوشش کی تو ہمارے ہاتھ پیروں کے سارے لنگر ٹوٹ گئے اور جب ہماری آنکھ کھلی تو بدحواس تانگہ والا ہم کو گھورتا تانگے سے اترے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میاں کے کپڑے لت پت ہو گئے ہیں ان میں بتلون تو بالکل ہی گندا ہو گیا ہے۔"

چونی پر جب ہاتھی کو لاد دو گے تو چونی کا پتلون گندا نہ ہو گا کیا ابھی پر چڑھ کر بے داغ اترے گا

گزر گئے دن

منظور الٰہی

جانی کے نام

میں ایک عظیم الشان تہذیب کے عظیم سرگوں کھنڈروں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ یہاں اتنا سناٹا ہے کہ اپنی سانس کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ لیکن ہر ہفتہ اس کے کروموٹو دیکھ کر روتی ہے۔ گزشتہ شب کھانے کے بعد میں نے دیکھا کہ میری ہم ناموسی اداس ہے۔ بھوکے ننگے حبشیوں نے مجھے تاج پہنایا، اور خوشی سے میرے اردگرد ناچنے لگے۔ وہ ناچتے ناچتے تھک کر سو گئے اور پھر بھوک اور پیاس بھول گئے۔ بھوم موس کی مشکل میں شہر کے بڑے دروازوں سے گدھے ہر جگہ دیکھے جاتے تھے اور سواری پر پھولوں کی ارزانی ہو گئی۔ لیکن مجھے احساس تکلیف دینا کم کر سب کچھ خاک ہے۔ بھوکے ننگوں کا بادشاہ بننا کیا چیز ہے؟ بلوگ اس شہر شہر پر پہنچنے کے لئے آگ اور خون کا دریا پار کر چکے تھے۔ انہوں نے وہ جانگداز سختیاں صرف اس کے لئے برداشت کی تھیں کہ ان کا شہر سے شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ پھر کون مناسب ہوا تھا؟ بلکہ بار بار یہ خیال آیا کہ جدا ہونے کے باوجود میں بلیس ہوں اور اپنی مملوک اموال دنیا کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ خیال ایک OBSESSION بن کے عذاب بن گیا۔ لوگ میری بے بسی سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ میری تنہائی کم کھلی ہے۔ لیکن ہم اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ میری ذمہ داریاں تو پہ لیتے، مجھے نہیں اٹھا لینے کا جذبہ ان میں مر گیا تھا۔

ان میں مفلس بھی تھے بیمار بھی تھے
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے تھے

اب وہ بے حس تھے، بے جان بے روح۔ اکیلے مقصد، اجاڑ حیات انھیں قبر طیبی کی طرف کشاں کشاں لے جا رہا تھا۔ تسخیر یروشلم کے بعد میں نے فاتح کو منہ اندھیرے سونے کا تاج پہنانا چاہا۔ اس نے آہستہ سے کہا کہ "جہاں میرے آقا میرے خداوند کو کانٹوں کا تاج پہنایا گیا۔ میں وہاں سونے کا تاج نہیں" اور اس نے کانٹوں کا تاج سر پر رکھ لیا تھا اور ہی تاج میں نے حکومت کی۔

اب میں سوچتا ہوں کہ کانٹوں کا تاج کیا ہے؟ اسی سوچ میں یہ سوال بھی ابھر آیا ہے کہ انسانی راحت کی اکسس کیا ہے؟ مذہب کا کہنا ہے کہ یہاں دکھ سہا تو بھے دوگنے کے لئے حیات بعد الموت ایک جہان زندگی ہو گی اور اس زندگی کی کلفت بھر وصل جائے گی۔ مارکسیت نے کہا کہ نوعی کا سرچشمہ ایک اینڈیل حاصل انتظام ہے جس میں تمام پیداوار لوگوں کے اپنے ہاتھوں ہوں۔ سرمایہ داری تو بے چارگی کس گنتی شمار میں ہے۔ ان ملیہ بانگ دعاوی کے علاوہ کیا انسانیت کی دامنی کوئی ایسی جہاں بھی نہ انصاف اور ادب پنج کے لئے کوئی جگہ نہ ہو؟ گمنام مسائل میں الجھ کر تعداد مذاکرات پریشان کن دل! اب سے پہلے جو جیتے تھے وہ کسی تھے یا سما کی ان بہم عمل پر اکتب ہوئے؟

پھر جب ہم نے نوجوانوں کے قدیم شہر میں قدم رکھا تو سید ڈنگ رہ گئیں ایسی حسین سلطنت یوں ہی بھی تھیں۔ میں نے دلی، آگرہ اور بیجاپور کے کھنڈر دیکھے ہیں لکھنؤ میں بہت سی بھی ایک دو کو تو یاں ہیں، ان کو جانتی ہوں ان کی تاریخ سے واقف تھا جو عمارتیں ہیں مگر ان کے شاندار نقش تیسیں علم ہو کر ان کے بھی مضمون، مجھے ان وحشی جنگ کے اصولوں سے ناواقف ہوتے۔ انھوں نے اپنے بھائی کو کاٹ کے لئے دشمن پر تیز کیا۔ کبھی ایک گھر سے جو دو لاشیں ملی تھیں، ایک بوڑھی عورت کی لاش نذر کیا تھا، جو وہ شہید ہو چکا جانتے تھے پر اڑ چکے۔ ایسے ہی زندگی کو جتنا سے نکال ایک پہچانے والے لوگ اس سے سمجھ ہی سے منہ پھیر گئے آداب سپہ گری سے ناواقف تھے یا ان میں وہ شدت کا اور بربریت نہ تھی جو حملہ آوروں میں تھی۔ اس انقلاب نے میرے ایک ایک پیلو کو جا چلنا اور سالہا سال پہنچا ہر انسان دہن سکا جند حسن شیات کے سوا ترقی سکوں میں فرق نہ آیا۔

زندگی میں کئی مقامات ایسے بھی آئے جس پر ایسے زندگی کی کشتی ڈوبتی ہوئی جا رہی ہو۔ انگل اور مسرت کا گھیں۔ یوں لگتا جیسے دیمک ہوئے، وحشت سے چکرائیں۔ اب جو پلٹ کے دیکھتی ہوں تو ان یادوں میں بڑا دکھ ہی نہیں پاتی ہوں جیسے بہتے پانی کی وادی میں سنگ بہ سنگ ہو گئے زخمی سے بہت یادیں محبت سے عاری ہیں۔ ان میں رنج ہے نہ راحت۔ جس ہو آبی گیلے۔ میں نے بھی تنگ کی کبھی پروا نہیں رکھی مگر جو شکوا ساری ہیں وہ وقت بن انتظار کی جب چاند کی کرنیں سمندر کی لہروں سے اٹکھیلیاں کھیلتیں۔ اسلام کے بادلوں میں گھرا ہوا ہمالیہ کا پہاڑ ایک لمحے کے لئے سیاہ بادلوں کی آڑ سے نمودار ہوتا تو گویا حد سمندر کو دور تک قدموں میں بچھا دیتا اور یاں یا زندگی میں رہ جاتے۔ یہ نظارے دل سے گھسی گوشے میں محفوظ ہو گئے اور ایسا بھی ہوا کہ ایسے جاں فزا مناظروں کی اداسی نے سے دنیا کی کلفت دھل گئی اور گرد و رت کا غبار چھٹ گیا۔

ایسے دن بھی آئے جب فسردگی ہر ہاتھ کی طرح روح کے رگ رگ پر لپٹ گئی۔ یہ وہ دن تھے میرے انتہائی غم پر ہی آنا تھے کبھی حیات وقف ہو رہی تھی کبھی ساتھ چھوڑ زندگی لٹک جاتی۔ یہ آگ بھی بہتی مسرت یاب ہوتے کا زمانہ تھا۔ یہ بھی کے مرنے اور مریک کے جینے کا زمانہ تھا۔

مجھے ایک دفعہ کسی نے کہا ہم جو دراصل محبت کر سکتے ہیں؟ تم تو عداوت کی باتیں کرتی ہو۔ محبت سلوک حال ہوتی ہے، دو رخ ہوتی کا ایک حقیقی جانتے ہیں جسم سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہی سرا گرا کا ایک بھرت ہی تو انسان کے قریب سے آنے والی نگ ہے۔ مجھے نے کبھی محبت کی جو احساس نگ میں جھلک کر نہ رہ گئے۔ اگر محبت میں رشک بھی صداقت تھی تو رنج کا ہی کیا انداز ہو؟ ہم اس ایک ہستی کے معنی پہ سمجھے ہیں۔ خود غرضی اور نفس پرستی کے مقصد سے فقط ایک انسانی مجبوریوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ دیکھیں تو ایک ہی مجبوری ہوا کرتی ہے۔ بالکل ہی محبت کا جو تمام محبت صالح کمال ہوتی ہے، اس کا آخر تا عمر قائم رہتا ہے۔ بہن بھائی کی محبت، ماں باپ کی محبت، خاوند بیوی کی محبت، سوچو تو ان میں کچھ فرق نہیں صرف شکل بدلی ہی ہے جیسے قلب ہستی کی مختلف اوقات در حقیقت ایک ہیں۔ یہ احساس ایک جگہ تمام نہیں کی اور دن سے اس پہ ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ دہوات اب تک نہیں بھولا جب تم نے سے کہیں بیٹھے ہوئے کہا تھا۔ بعض دفعہ میں چاہتی ہوں کہ میں مر جاؤں اور آپ مجھ پر اچھا سا مضمون لکھیں۔ تم نے کتنی عظیم بات کہہ دی۔ تم پھر کبھی عاشقوں کی صف میں داخل ہو گئیں۔

مجھے ہمیشہ گلہ رہا کہ میں نے تمہاری محبت کی پاکیزگی کو نہیں سمجھا، لیکن پھر کیا کرو تم فلسفہ ہو گئیں۔ ...... دستر خوانے دور

عورتوں کے متعلق لکھ کر میں تم اپنے پیار کا اعلان نہیں کرتا۔ اگر میں نے بھول کر یہ بات کہہ دی اور اس شدت کے ساتھ کہہ دی جس نے اس وقت محسوس کی تھی تو دنیا کہے گی کیا! مجھے یہ پن سے بچھا نا زیب ہوتا اور دنیا والے کب زمانہ سازی۔ وہ جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

تم کبھی بری خاموشی سے بدگمان ہو جاتی ہو پر اس ان کی ازلی تنہائی کو کیا کہیے جو خیمہ کمین گاہوں سے لے کر مرتع خورد و نوش پر شب خون مارتی ہے جو چاہے تو بھری محفل کو سُونا کر دے۔ ایک بھیس جو بے پاؤں اگر ہاری کو سفیروں میں زمزمہ گھول دیتی ہے۔ یہ جنبشِ مژگانِ ناز ہے یا تیرِ نیم کشیدہ کا فراق ہے یا قربِ حضوری سے بُعد!

آمدشِ ہر خار را از نصف ما مستحق
در بیابانِ جنوں بُردی و رسوا ساختی

جس دم کی یاد بخش میں یہ مزا لی کیف وہ ایسا ہی ناقابلِ فراموش تھا۔ ہم تو قافلوں کے دو لفظوں کے جوش پہلے ہی بک چکے ہیں۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم
آتش بسنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

کچھ دیر ایک دفعہ الوداع کہتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں اندوہ شفق کی چمک اتر آئی تھی۔ تمہیں اک جانکاہ مرحلے سے گزرنا تھا جس سے ہر عورت گزرتی ہے۔ کیا ہم پھر مل سکیں گے؟ یہ تھی ان کہی بات جو لبوں تک آ کر لوٹ جاتی تھی۔ تمہارے کانپتے ہاتھ کا ایک سال پرانا ہمراہ ہاتھ لگا جس کو ہم محبت کا امیگہ کہہ رہے تھے۔

انسان دوستی کا وہ خواب یاد کرنا جو ہم نے دیکھے ہیں میں انانیت کی تھی اور دیوانہ وار وہ ٹیس جو کسی اور کے لئے اٹھی، وہ اشک جو دل کے ہاں خلوص سے تڑپ کے ابھرا۔

"در غمِ ہم نفساں اشکِ رواں چیزے ہست"

یوں تو کون کسی کا غم اپنا سکا۔

جب زمان و مکان کی حدیں بٹ جائیں اور چشمِ بصیرت وا ہو جائے جب ہم اپنا جسمانی لبادہ کینچلی کی طرح نہ پھینکیں تو ان مدتوں کی تفاوت دیا ہم نے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے طے کیں۔ وہ جی تک از خود پہنچ جیسے امکان میں نہ ہوتا۔ میری روح کو "عجز و نیاز کی جستجو ہو تو چند آں زماں دل من پے عجز نگاشتے" کی نہیں۔

تم جنبشِ غم ہو جس نے محبت کی ادا سے دل میں دفن کر دیا، تم وہ شوخ رمشنگ (آگ) ہو جسے میں نے VOLCANO (آتش فشاں) کے خطاب سے نوازا۔ تمہاری وفا نے ہی یاد دلائی ہے جو اس لفظ سے وابستہ تھی۔ تم سب کچھ ہو اور کچھ بھی نہیں کہ دوئی کا حجاب درمیان سے اٹھ چکا اور میں تمہاری محبت کے مرغزاروں میں ہم خوابوں سے بے نیاز سنہرے سپنوں کے جال بُن رہا ہوں۔ میرے خیالوں میں میرے تصور میں تیرِ ہستی نہیں چبھی نہیں تمہاری پیاسے لبریز آنکھوں میں میں نے شانتی پائی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے شکر گذار ہونا چاہیئے کہ تم نے مجھے نا امید محبت کی یا اس بات سے کہ یہ خاطر کی باتی سب درد نامے مجھ پہ نہ گزریے

تمہاری محبت میں مبہم کی تندی نہیں بلکہ آتش فشاں کی حدت نہیں تمدن بھری رات کی آسودگی ہے۔ ایک دن میری اس اندھا دھند کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ مگر کی ملکہ کا راج ختم ہو جائے گا۔ یہ دلچسپیاں، یہ قہقہے اور بے قصور وقت کے بے پناہ خلا میں جذب ہو جائیں گے پھر اس مقام سے جہاں حیات و ممات کے دائرے ملتے ہیں ایک نئی سمت طلوع ہو گی۔ ہم کے ٹوٹے آئینے گے اور ہم بے خوف و خطر راہِ بیچ خطہ در پیش پر کل دا ایک نئی منزل کی جانب سرگرم سفر ہو گئے۔ میں بے راہ روی کی خجالت عام نہ پھیلا سکوں گا۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں نے تمہارا غم پالیا ہے۔

تا منزلِ جاناں ساتھ ہو اک نقشِ قدم رہبر دل کا
شوقِ پا نہ قدم کھینچے ہی کہ پلٹا ہی کئے ہر گام سے ہم

امان اللہ کے نام:

پائیں باغ کا ایک حصہ مجھے کمرے سے نظر آرہا ہے اور میں سوچتا ہوں۔۔۔۔ اگر تنگدستی میرے نصیب میں نہ ہوتی تو اس میں فطرت کا کیا قصور؟ فطرت تو بخیل نہ تھی۔ جالی دار دروازے کے باہر ناصفہ سرخ اور سبز رنگ کا امتزاج نظر آرہا ہے۔ لوگن ویلا کی ٹہنیاں اپنے سرخ رنگ کے پھولوں سے جھکی پڑتی ہیں جیسے خون ٹپک رہا ہو۔ میرے پسندیدہ درخت نے پت خزاں زدہ برادہ بکھیر دیا ہے اور اپنی ہریالی میں مگن ہے۔ یہی درخت زمستاں کی ٹھنڈی شاموں میں حسرت و یاس کا مرقع تھا اور اندھیری راتوں میں جب سرد ہوائیں چلتیں تو اس کے پتے کھڑکتے اور گرتے رہتے تھے۔ صبح جب میری آنکھ کھلتی تو اسی درخت پر نظر پڑتی اور شاید عین سلسلے ہونے کی وجہ سے یہ باقی منظر پر چھا جاتا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ سرگوشی کے انداز میں اسے کہہ ڈالوں۔ "میرے ہم خزاں کے یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے۔" اور آج جب دروازہ سے باہر نگاہ جاتی ہے تو لوگن ویلا کی ٹہنیاں مستانہ وار جھومتی ہیں۔ درد نظریں گلابی سے پتے ہوئے تختوں کے ساتھ ہم کنار ہو جاتی ہیں۔ آسمان پر اُڑتی اودی گھٹائیں ہیں جیسے حسین منظریں اسی چیز کی کمی تھی۔ چند روز ہوئے باغ میں ٹہلتے ایک ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ روپوشی کا ایک گریز پا لمحہ ——— اور میں نے سوچا تھا صبح اس سے کہیں زیادہ حسین بھی ہو سکتی ہے۔

"وہی صبح پانچ بجے کا جانفزا وقت ہے۔ چائے کی پیالی سامنے دھری ہے۔ تلخ چائے کے گرم گھونٹ جان کو فراوت بخشتے ہیں اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر کبھی کیف و رنگ و بو میں اور کبھی اس جانے بوجھے ذائقہ میں ہو کام و دہن کو لذت بخشتا ہے گم ہو جاتا ہوں۔ یہ لطیف خیالات کے نزول کا وقت ہے جو دھیرے دھیرے آن دیکھے شبنم آسا شیشۂ دل پر اترتے ہیں۔ یہ ہیں گراں بار زندگی سے چھپے ہوئے کم یاب لمحات جو مرہونِ زندگی ہیں۔

جب سے بے تن پیالیاں پی چکتا ہوں تو

نازِ بر فرقِ دو عالم بر ستارا کنم

کی کیفیت ہوتی ہے۔

آنہا کہ آمدند سبک در نظر مرا — بیچارگاں بہ کوئے مغانم ندیدہ اند

تو اے کہ سر کشند: نخوت بر آسماں — بر آستانِ میکدہ شانم ندیدہ اند

اک عجب طرح کی آسودگی اور بے طلبی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک سرخوشی اور لطافت جو دنیاوی آلودگیوں سے ماورا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ اس کا انحصار چائے پینے پر ہی ہو میرے لئے یہی بس ہے کہ چائے سامنے دھری ہو۔ یہ از خود باعثِ طمانیت ہے۔

سچ پوچھئے تو خوشبودار چائے کے متعلق بھی عجیب ردِ عمل ہوا۔ ایک کرم فرما نے بڑے تحفہ کی اور تیز پکی بھی۔ تیز چمک اور ذائقہ میں کڑواہٹ کی بجائے حلاوت۔ جب میں نے دو چار دن لگاتار پی تو کچھ عاجز آگیا جیسے ہتھاس سے جی بھر جائے۔ اور میں نے سوچا گرمیوں کی تپتی ہوئی شام کو تو میں چائے گوارا کروں کہ مرجھائی ہوئی طبیعت شاداب ہو سکے۔ لیکن صبح کے لطیف جھٹپٹوں میں اس کا کیا کام؟ اس وقت تلخ چائے کی خواہش اذعانی لے کر بیدار ہوتی۔ تلخیوں کی جستجو اور تلخ چائے کی آرزو بعض اوقات ہے یا کردگی، تضاد! زندگی کی تلخیوں کو میں نے اپنانا چاہا اور نہ اپنا سکا۔ ہر وہ شے جسے خوش قسمتی اور کامرانی سے تعبیر کرتے ہیں

مجھے علیم بعد جہد کے بغیر ودیعت کر دی گئی۔ حالاں کہ میری خواہش تا بچہ تھیں یوں سمجھنے کو جو کبھی کے لئے معراج کمال ہوتا میرے لئے بھی یاد آور دھا۔ بعض دفعہ انسان نہیں جانتا کہ بھی یاد آور دکو کیا کرے۔ قدروں کے تعین میں مجھے اپنے ہم عصروں سے شدید اختلاف رہا اور میں نے من آسانوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا کبھی کبھار میں نے اپنے آپ پر سختی روا رکھی تا کہ مظلوم اور زیر دستوں کو بہتر سمجھ سکوں لیکن ایک گونہ ذہنی قربت کے سوا میں اُن میں سے ایک نہ ہو سکا۔ سڑک کے کنارے چھوٹے قہوہ خانوں میں اور ریلوے ٹی سٹال پر لاتعداد مرتبہ چائے کی پیالی پی اور مجھے ہمیشہ ایک گونہ اطمینان بخش مساس ہوا کہ سخت کوش، جفاکش لوگوں میں اور مجھ میں کوئی شے مشترک ہے۔ چائے دکانوں کی برادری، ٹھاٹھ دار ریستوراں اور بجلے کیلئے تک ہی محدود نہیں۔ آپ کی رہ بات یاد آتی ہے تو پھڑک اٹھتا ہوں کہ کوئی جلت نہ لگی ہو تو زندگی دو بھر ہو جاتی ہے زندگی خود ایک بڑا المیہ ہے۔ مسلسل اجتناب سے درپے ننگ ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لئے میں نے اپنے آپ کو سگریٹ نہ پینے پر کبھی شاباش نہیں دی۔ بوعلی سینا نے کسی کے لڑکے پر خوب کہا تھا۔ «بوضع حیات می خواہیم۔ بوضع حیات می خواہیم» اس کا اشارہ اغلباً تعریحات کی طرف تھا۔

پائن باغ سے شروع ہو کر بات کہاں جا پہنچی۔ کھڑکی سے دیکھتا ہوں بادِ سحر کے جھونکوں نے ریت کے تودوں پر خوبصورت لہریں بنا دی ہیں۔ ان گنت حسین لہریں متنوع شکلیں بناتی ہوئی لہریں جیسے کسی چابک دست مصور کی مرہونِ منت ہوں۔ جب جھلتی ہوئی لُو چلے گی۔ ایک ضرب کے ساتھ بالائی حصہ کی ریت غیر مرئی طور پر اڑے گی اور ریت کے ذرے ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ لیکن ایک روز یہ منتشر اجزا یکجا ہو کے رہیں گے۔ خوبصورت شکلیں پھر بن جائیں گی۔ مرنے کے بعد روحیں ایک دوسرے کو تلاش کریں گی۔ ہماری حسین دوستی قائم رہے گی۔ فراق کے بعد وصل دوام، انتشار کے بعد تصل ذرے جھونکوں کا نازِ دلبری ہے۔ دقت کی بے رحم ضربوں کا تاثر عارضی ہے۔ وہ حقیقت کو کیسے پامال کر سکتی ہیں؟

عالمِ شوق میں آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ ملتفت ہوں یا نہ ہوں میں بات کئے جاؤں گا۔ جب وہ نامہ یاد کرتا ہوں جو آپ کی محبت میں گذاشتے اختیار دل سے ہوک اٹھتی ہے تب حبیب صدیقی کی قدیم نظم یاد آتی ہے اور مدتوں نائے دوم گاہ بصورتِ دو زبان ہو جاتا ہے

"انعام دو دلیم دانستم تو دوست"

اس موضوع پر تنقیحی کے دو شعر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ای ہم نفسانِ محفلِ ما — رفتید و نے ز دلِ ما

گر خاطرِ تنگ دوستانِ نرمید — بر خاک نیز چرخ مرا آنِ ما

اور جگر کی یہ سطریں یوں یاد کرتے ہیں۔

حریفانِ باده باطرب رفتند و رفتند — نبی خم خانه با گردند و رفتند

یہ پیامِ شوق ہوش کے قطعہ پر ختم کرتا ہوں۔

ساحل پہ ہو جب ہوائے سنبل — ہو دامنِ رنگ نادۂ گل

ساقی کی نظر میں ہو تغافل — سینے پہ مچل رہی ہو کاکل

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا

نئی کتابیں

بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک: مصنف ڈاکٹر سید اختر احمد اختر اورینوی ایم اے ڈی لٹ۔ صفحات ۲۰۸ قیمت مجلد ۸ روپے پتہ: لیٹریری ایجنسی۔

امتحانی ضرورت سے قابل اساتذہ کی نگرانی میں اکثر تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں جن میں سے بعض کام کے مقالے چھپ کر مصنف علمی حلقے کا باعث ہوتے ہیں۔ دکن میں اُردو ادب کی ارتقا پر شمالی ہند کے شاعری اور گجرات کے نثر نگاروں کے بعد بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک بھی اسی قسم کا ایک مقالہ ہے جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے اختر اورینوی کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری دی ہے۔ اس مقالہ میں بہار کے محدود رقبے کی علمی اور ادبی نسبات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقدمہ میں فلسفہ زبان و اقوام اور اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر بحث ہے۔ پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ عالمگیر کے عہد سے لے کر انگریزی دور تک کس طرح اُردو زبان بہار کی مقامی بولیوں پر اثر انداز ہوئی۔ دوسرے باب میں مرزا عبدالقادر بیدل سے لے کر تاریخ تکملہ تک کوئی پچھتیس شاعروں کے حالات اور کلام سے تعارف کرایا گیا ہے۔ پھر بہار کے مرکزی نگار شعراء کا حال ہے۔ اس کے بعد صفائی، تحسینیہ و ندوی چند شعرائے شاہجہان آباد کا تذکرہ ہے جو عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ایک باب بہار میں اُردو نثر نگاری کے لیے وقف ہے۔ اختتام پر بہار کے عام میلانات ظاہر کیے گئے ہیں جو بہت ہی مختصر ہیں۔ مصنف کی اس معذرت کے باوجود کہ "اس کتاب میں بہتیرے شعرا کا ذکر نہیں اور بہت سے شامل کیے جانے کے لائق جو شریک انجمن ہوئے بھی ہیں ان کے کلام و سخن کی پوری نمائندگی نہیں ہو سکی۔ بعض اہل قلم کی تاریخ وفات یا تاریخ وفات یا وجود کوشش کے معلوم نہ ہو سکیں۔" یہ کہنا حقیقت سے خالی نہ ہوگا کہ سب کچھ کر گزرنا آسان بھی نہ تھا۔ جو کچھ اور جتنا کچھ ہے وہ بھی اختر صاحب کی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ تاریخی مواد کی فراہمی کوئی آسان کام نہیں۔ کوہ کندن و کاہ برآوردن والی بات ہوتی ہے۔ اس میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ نقش ثانی اس سے بدرجہا بہتر ہوگا۔ موجودہ صورت میں بھی بہار کی ادب پر اس سے بہتر کتاب نظر سے نہیں گزری۔

شرح دیوانِ غالب: مؤلفہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ ضخامت اکتالیس سائز کے ۵۵۲ صفحات قیمت مجلد آٹھ روپے۔
ناشر کردہ: عشرت پبلشنگ ہاؤس سہتیال روڈ انارکلی لاہور۔

اردو میں دیوانِ غالب کو کلاسیکی درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوا صدی کی یادگار غالب کی اشاعت کے پہلے سے لے کر اب تک دیوانِ غالب کی بیسیوں شرحیں لکھی جا چکی ہیں لیکن عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی نے غالب کے فکر و فن، طرز خیال اور اسلوب سے ناواقفیت کی بنا پر اس کی روح میں بیٹھنے سے احتراز کیا ہے۔ کسی نے یہ کہہ کر کہ غالب کے فن کے مقابلے میں اس کا تخیل زیادہ بلند ہے غالب کے عجز اور اپنے کمال کا مظاہرہ کرنے کی خاطر لے دے کر جا بجا غلط معنی لکھے اور غالب پر تو اعراض کے اعتراضات وارد کیے ہیں غرض ہر دور کے شارحین نے اپنے طرف داری سے غالب کو ماپنے کی کوشش کی ہے اور جب تک بیان و معانی کا ارتقاء جاری ہے نئی نئی شرحیں منظر عام پر آتی رہیں گی۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی اردو کے معروف اہل قلم، شاعر اور مصنف ہیں۔ وہ فلسفہ اور شعر و ادب کا لطیف ذوق رکھتے اور کلام غالب کے شارح کی حیثیت سے علمی اور ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں ان کی مبسوط شرح دیوانِ غالب اس لحاظ سے ایک قیمتی اضافہ

کہی جا سکتی ہے کہ:

(۱) کتاب کے شروع میں پروفیسر صاحب نے ۴۲ صفحات کا ایک طویل مقدمہ رکھا ہے جس میں غالب کے سوانح حیات، شخصیت، تصنیفات، اس عہد کے سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی حالات، غالب کے فن، ذہنیت اور شاعری کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ہی غالب کے کلام کی خصوصیات، غالب کی مقبولیت کے اسباب اور شعرائے ہند پر ان کے اثرات واضح کیے ہیں۔ پھر چونکہ غالب نے اپنے اشعار میں جابجا وحدت الوجود کا فلسفہ پیش کیا ہے اس لیے پروفیسر صاحب نے اس فلسفہ کے اصول و مبادی بیان کیے ہیں۔ اگرچہ فلسفہ کی اس بحث میں چند مقامات نہایت مشکل اور گنجلک ہو کر نوشیح کے محتاج ہو گئے ہیں تاہم اردو میں اس نوع کی یہ اس قسم کی عالمانہ بحث کی پہلی مثال ہے جو اس سارے مقدمے کی جان ہے۔ اس کو زینہ نشین کر لینے کے بعد نہ صرف غالب بلکہ خواجہ میر درد اور دوسرے صوفی شعرا کا کلام بھی آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

(۲) ہر شعر کا مطلب بیان کرنے کے بعد اس کا مبادی تصور بھی چند لفظوں میں لکھ دیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض طبائع کو سر فیصد اس نتیجے سے اتفاق نہ ہو۔

(۳) جن اشعار میں تعقید لفظی پائی جاتی ہے ان کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے تاکہ بات جلد سمجھ میں آ سکے۔

(۴) آسان اشعار کا مطلب چند سطور میں لیکن مشکل اشعار کا مطلب وضاحت سے درج کیا گیا ہے۔

(۵) کلام کے محاسن و معائب پر رائے ظاہر کرتے وقت غالب کے نقادوں کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے لیکن یہ پسند اور ناپسند کا مسئلہ بھی ایسا ہے کہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہر وقت باقی ہے۔

شرح کا انداز نگارش دلکش ہے۔ کتابت طباعت جو ارزاں نہیں۔ طلبہ اور شائقین کلام غالب اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

خزینۂ معارف

علامہ احمد بن مبارک سجلماسی الجزائر المالکیہ کے شہر فاس کے رہنے والے ایک متبحر عالم دین تھے۔ آپ نے ۱۲۰۳ھ میں ابرز کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اپنے مرشد سید عبدالعزیز دباغ مغربی کے حالات و زندگی، کرامات و ملفوظات درج کیے تھے۔ بعض احادیث نبوی اور آیات قرآنی کی تشریحات اور باطنی علوم و احوال کے بارے میں استفسار کر کے عارفانہ جوابات بھی نقل کیے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نادر و نایاب مسائل کا مجموعہ اور علم و عرفان کا گنجینہ ہے۔ تیس چالیس سال قبل مولوی عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے اس کے بعض حصوں کو چھوڑ کر باقی کتاب کو اردو میں منتقل کیا تھا مگر یہ ترجمہ اب بازار میں نہیں ملتا۔ مولوی سردار محمد نے ڈاکٹر پروفیسر محمد حسن ایم اے پی ایچ ڈی سے مکمل کتاب کا از سر نو ترجمہ کرا کے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ترجمہ کرتے وقت چھوٹے چھوٹے عنوانات قائم کیے ہیں اور الگ الگ سرخیاں دے کر کتاب کو جدید طرز میں پیش کیا ہے۔ جن علماء، صلحاء اور بزرگوں کا کتاب میں ذکر آیا ہے ان کے متعلق مختصر حواشی دے دیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پروفیسر صاحب نے بیس صفحات کا دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ ہمارے بزرگ کس طرح کتاب و سنت کی پیروی کرتے اور دوسروں کو اس پر چلنے کی تلقین کرتے تھے۔

دیباچہ وغیرہ کو چھوڑ کر اصل کتاب ۶۱۶ صفحات پر مشتمل ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول کا ہدیہ ۵/۸ روپے اور حصہ دوم کا ۴/۸ روپے ہے۔ مجلد کی قیمت بارہ روپے ہے۔ چھپائی اور کاغذ کے اعتبار سے بھی کتاب معیاری ہے۔ علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

(م۔ع۔ق)

ہماری تنقیدی کتابیں

اچھی تنقید ہی سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ فلاں ادبی شاہکار کا ادب میں کیا مقام ہے اور یہ بھی کہ ہمارا ادب ترقی بھی کر رہا ہے یا نہیں۔ اپنے ذہنی تراز کی جلا کے لئے یہ کتابیں پڑھیں۔

اندازے

فراق گورکھپوری بلاشبہ بڑا نقاد ہے۔ اندازے اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو تنقید میں اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

قیمت -/۵

اُردو غزل گوئی

غزل کی ہیئت اور اس کی تاریخ پر اتنا ہی بڑا نقاد بھی ہے، اس کی تمام تر باتیں غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جس میں مغربی اور مشرقی تنقید کا کارچوبا خاص ملتا ہے۔ فراق کو پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے قابل ذکر تمام لٹریچر کا مطالعہ کر لیا۔

قیمت -/۲

ہماری داستانیں

اگر آپ کو داستانوں سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس لئے کہ سید وقار عظیم نے ان کا علمی مرتبہ معین کرنے میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے اور ہمیں بتایا ہے ہزاروں لاکھوں صفحات پر بکھری ہوئی داستانوں میں کیا کچھ ہے۔ قیمت -/۵

انتقاد

سید عابد علی عابد نامور شاعر و بہترین انشا پرداز اور بے مثل نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں روایتی نقادوں کی طرح ثقالت اور یاوہ گوئی نہیں ہوتی۔ یہ جو بات بھی چلاتے ہیں اس کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین کی یہ کتاب مقبول ہو رہی ہے۔

قیمت -/۳

ادارہ فروغ اردو لاہور
ایبک روڈ
(انارکلی)

ہماری کتابیں

(تصانیف شوکت تھانوی)

نیلوفر، شوکت صاحب کا یہ تازہ ترین ناول بے حد مقبول ہو رہا ہے۔ یہ ناول ہے بھی ان کے پہلے ناولوں سے زیادہ دلچسپ اور معیاری اگر آپ نے اسے اب تک نہیں پڑھا تو آپ مزاحیہ ادب کی ایک نادر کتاب کے مطالعہ سے محروم ہیں۔ قیمت -/۶

دوسری کتابیں

مولانا	۳/۸
غوالہ	-/۶
خدانخواستہ	-/۳
سودیشی ریل	-/۳
کتیا	۳/۸
سائے کو آنچ	۳/۸
سسرال	۲/۴
کارٹون	۳/۸
بابدولت	۳/۸
بقراط	۳/۸
جوڑ توڑ	-/۳
مضامین شوکت	۳/۸
قاضی جی (نئی چھپے)	۳/۸
غالب کے ڈرامے	۳/۸
وغیرہ وغیرہ	-/۳

ادارۂ فروغ اردو لاہور

ہماری بلند پایہ کتابیں

رونق: اس دور کے جن بہت کم شاعروں کو پڑھ کر کامیابی نصیب ہوتی ہے ان میں قتیل کا نام قابل رشک حیثیت کا مالک ہے معلوم ہوتا ہے ترنم اور مترنم غزلوں کے زیر و بم قتیل شفائی کے ساتھ گرویدگی کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔"

(قرآن گورکھپوری)

قیمت -/۳

نبی امی	عمر احمد انصر	-/۵
خلفائے محمد	"	-/۱۰
شعلۂ طور	جگدیش آزاد	۸/۷
امراؤ جان ادا	رسوا	-/۴
غنڈہ	ابو سعید قریشی	۴/۴
قتل مقرار	ندیم	-/۳
بیچ و خم	ندیم	-/۳
سرکنڈوں کے پیچھے	غنڈہ	-/۳
آنچل	احمد ندیم قاسمی	-/۳
بازار حیات	"	-/۳
عزیزم کے نام	ڈاکٹر کاشمیر	-/۳
یزید عصا	عابد علی عابد	-/۵
سیاست الٰہیہ	امام ابن تیمیہ	۸/۲
نقوش لطیف	مرتبہ احمد ندیم قاسمی	-/۶
عصا ہیں جمال الدین افغانی		-/۴
پندرہ اگست	رشید اختر ندوی	-/۳

صاحب: اپنے نگاری پر بے مثال کتاب۔ مدیر نقوش کے انشائیوں کا مجموعہ جس کی بڑی دھوم ہے اس لیے کہ مدیر نقوش نے اب تک یہ نہیں سیکھا کہ وہ کسی کی خواہ مخواہ تعریف کریں یا بلاوجہ موقعا بن جائیں۔ جو کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ قیمت -/۳

ادارۂ فروغ اُردو لاہور

پطرس کی شخصیت کے کئی پہلو تھے

★ باغ و بہار شخصیت

★ اردو کا مزاح نگار

★ بے مثال مترجم

★ انگریزی کا ادیب

★ فاضل استاد

★ قابل منتظم

★ شگفتہ مقرر

★ ذہین مدبر

پطرس کے انہی تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے ہم

پطرس نمبر

نکال رہے ہیں۔ جس سے مرحوم کی عظمت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

نقوش کا آئندہ شمارہ "پطرس نمبر" ہو گا